مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: خلیل جبران اور انتظار حسین کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

عثمان غنی

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: خلیل جبران اور انتظار حسین کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار

عثمان غنی

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: خلیل جبران اور انتظار حسین کا تقابلی مطالعہ

پیش کار: عثمان غنی رجسٹریشن نمبر: 724/P/U/S18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر نعیم مظہر ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) ____________________

ریکٹر

تاریخ ____________________

اقرارنامہ

میں، عثمان غنی حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

عثمان غنی

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	ix
باب اول: تعارف و بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۱
iii. مقاصد تحقیق	۲
iv. تحقیقی سوالات	۲
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۳
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii. تحدید	۵
ix. پس منظری مطالعہ	۵
x. تحقیق کی اہمیت	۶
ب : مذہبی روایت اور ادب کا تعلق	۶

i. مذہبی افکار اور فکری انسلاکات ۱۲
ii. مذہبی افکار کے اسلوب پر اثرات ۱۸

ج: داستانوی روایت اور ادب کا تعلق ۲۱

i. داستانوی افکار اور فکری انسلاکات ۲۶
ii. داستانوی افکار کے اسلوب پر اثرات ۳۰

د۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کی سوانح و تصانیف: اجمالی جائزہ ۳۲

i. خلیل جبران ۳۲
ii. انتظار حسین ۳۷

حوالہ جات ۴۳

باب دوم: خلیل جبران اور انتظار حسین کے مذہبی افکار کے فنکارانہ اظہار میں تصورِ حیات کا تقابل ۴۸

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں تصورِ حیات کا مطالعہ ۴۸

i. انسان کا وجود ۵۰

ii. انسانی زندگی کا مقصد ۷۰

iii. انسان کا معاشرتی کردار ۹۱

۱۱۱

ب۔
انتظار حسین کے افسانوں میں تصورِ حیات کا مطالعہ

i. انسان کا وجود ۱۱۲

ii. انسانی زندگی کا مقصد ۱۳۹

iii. انسان کا معاشرتی کردار ۱۵۸

ج۔ خلیل جبران اور انتظار ۱۷۶
حسین کے افسانوں میں تصورِ حیات: تقابلی مطالعہ ۱۷۶

۱۹۴

i. انسان کا وجود: تقابلی مطالعہ

ii. انسانی زندگی کا مقصد: تقابلی مطالعہ

۲۱۳

iii. انسان کا معاشرتی کردار: تقابلی مطالعہ ۲۲۹

حوالہ جات

۲۳۹

باب سوم: خلیل جبران اور انتظار حسین

کے مذہبی افکار کے فنکارانہ اظہار میں اخلاقی اقدار کا

۲۳۹

تقابل

۲۴۰

۲۵۶

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کا

۲۷۹

مطالعہ

i. گناہ و ثواب کا تصور ۳۰۰

ii. شخصی اوصاف ۳۰۲

iii. جزاو سزا کا تصور ۳۲۰

۳۳۸

ب۔

انتظار حسین کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کا مطالعہ ۳۵۴

۳۵۴

i. گناہ و ثواب کا تصور

۳۶۸

ii. شخصی اوصاف

۳۷۹

iii. جزاو سزا کا تصور

ج۔ خلیل جبران اور انتظار حسین ۳۹۷

کے افسانوں میں اخلاقی اقدار: تقابلی مطالعہ

۴۰۶

i. گناہ و ثواب کا تصور: تقابلی مطالعہ

ii. شخصی اوصاف: تقابلی مطالعہ

۴۰۶

iii. جزاو سزا کا تصور: تقابلی مطالعہ

حوالہ جات ۴۰۷

۴۲۲

باب چہارم: خلیل جبران اور انتظار حسین کے

۴۳۸

افسانوں میں داستانوی افکار کے فنکارانہ

اظہار کا تقابل ۴۳۸

۴۴۸

۴۵۶

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں ۴۵۶

داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا مطالعہ ۴۶۸

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار ۴۸۱

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار ۴۸۸

ب۔ انتظار حسین کے

افسانوں میں داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا مطالعہ ۴۸۸

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار ۴۹۳

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار ۴۹۵

ج۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کے

افسانوں میں داستانوی افکار افکار کا فنکارانہ اظہار: تقابلی مطالعہ

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار: تقابلی مطالعہ

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار: تقابلی مطالعہ

حوالہ جات

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

الف: مجموعی جائزہ

ب: نتائج

ج: سفارشات

ABSTARCT

Title:Artistic expression of religious and anecdotic ideas: a comparative study of Khalil Jibran and Intizaar Hussain :

Comparative research, simply put, is the act of comparing two or more things with a view to discovering something about one or all of the things being compared. This technique often utilizes multiple disciplines in one study. When it comes to method, the majority agreement is that there is no methodology peculiar to comparative research. The

multidisciplinary approach is good for the flexibility it offers, yet comparative programs do have a case to answer against the call that their research lacks a "seamless whole". Religion, Sharia all these words mean "path". The word religion is used for it which is the Italian word Religio which means "restraint and prohibition".

A narrative, story or tale is any account of a series of related events or experiences, whether nonfictional (memoir, biography, news report, documentary, travelogue, etc.) or fictional (fairy tale, fable, legend, thriller, novel, etc.).Narratives can be presented through a sequence of written or spoken words, still or moving images, or any combination of these. The word derives from the Latin verb narrare (to tell), which is derived from the adjective gnarus (knowing or skilled).Along with argumentation, description, and exposition, narration, broadly defined, is one of four rhetorical modes of discourse. More narrowly defined, it is the fiction-writing mode in which the narrator communicates directly to the reader. The school of literary criticism known as Russian formalism has applied methods used to analyse narrative fiction to non-fictional texts such as political speeches.

Intizaar Hussain's father was a religious figure and a religious man who would never deviate from the principles of religion. He adhered to religious values and slogans so strictly that even if he was called a fundamentalist, it will not happen and Intizaar Hussain himself has called this attitude fundamentalism in today's context. He was such a strict Muslim that he considered reciting poetry to be a crime. We also find a lot of use of religious values and slogans in the case of Khalil Jibran. The reason for the use of these religious metaphors and symbols is the religious imprint and religious color on his mind. Jibran has been close to religion since his childhood. However, the mother was also a religious woman who filled Gibran with closeness and love of religion by telling him religious folk tales and religious songs and prayers.

The comparison takes into account the time, education, domestic situation, pre-migration and post-migration time and environment of the two fiction writers and the comparison is advanced in contexts as the comparison is not only between two human beings or two fiction writers. However, the comparison also highlights the values and lifestyles of two civilizations, two cultures and the nations of the two countries and the

similarities and differences between the thinking, writing, reading, eating, drinking and liking of the people of the two nations. That is why the fictions of both fiction writers were examined and it was seen that the echo of religious elements in the fictions of Jibran has been a special subject of their fictions and short stories.

Comparing the anecdote (Tale and Story), if the fictions of the two short story writers are looked at from a anecdotic point of view, then in the anecdotic series, Intizaar Hussain is known as a great short story writer than Khalil Jibran. The both short story writers examine the religious elements of social values, the concept of life, the existence of man, the purpose of human life, the social character of man, the concept of sin and reward, the concept of retribution, personal attributes and every aspect of moral values has been discussed.

اظہارِ تشکر

الحمدللہ!

میں سب سے پہلے اپنے اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کا شکر گزار ہوں کہ مجھے اس کام کی تکمیل کی توفیق اور ہمت عطا فرمائی۔ اس کے بعد اساتذہ اکرام کی محنت اور توجہ کہ انھوں نے مجھے ہر ہر گام اپنی قیمتی آراء سے نوازا جس سے آج میں اس قابل ہوا کہ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کو مکمل کر سکا ہوں۔ اپنی والدہ کا شکر گزار ہوں کہ ہمیشہ انھوں نے اپنی نیک دعاؤں سے نوازا اور مجھے کام کے دوران ہمیشہ فرصت بہم پہنچائی تا کہ میں اپنا تحقیق کا کام آرام سے مکمل کر سکوں۔ والدِ محترم (مرحوم) خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت

نصیب فرمائے کہ انھیں میرے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا مگر قضا و قدر کو کچھ اور منظور تھا اور وہ میرے ڈاکٹر بننے سے قبل ہی دوسرے جہان چلے گئے، ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مجھے محنت کا درس دیا۔ اپنی شریکِ حیات کا ممنون ہوں کہ وہ کبھی بھی میرے کام میں مخل نہیں ہوئیں اور معاون بن کر میری معاونت کرتی رہیں۔

استادِ محترم اور میرے مقالے کے نگران ڈاکٹر نعیم مظہر کا شکریہ کہ جنھوں نے محنت، مشقت اور جانفشانی سے میری سپروژن کی اور ہر گام پر مجھے نہ صرف سمجھایا بل کہ کئی ایک کوتاہیوں کو بھی درست فرمایا جس کی بدولت آج یہ مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز (سابقہ صدرِ شعبہ)، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم اور ڈاکٹر عابد سیال (صدرِ شعبہ اردو)، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر ظفر احمد اور دیگر اساتذہ کا بھی ممنون ہوں کہ مقالے کی تسوید و تحقیق میں ہر صورت میری رہنمائی فرمائی اور مجھے اس منزل تک پہنچایا۔

اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہر صورت مجھ پہ فرض ہے کہ ان کے بغیر یہ سپاس نامہ ادھورا ہے۔ سب سے پہلے جناب محمد عاطف سعید کہ ہر کتاب کو پیدا کرنا اور اسے کسی محقق تک پہنچانا ان کا مرغوب مشغلہ ہے اور مجھے ان کی نہ صرف رہنمائی رہی بل کہ ہر گام مدد بھی ملتی رہی۔ اس کے علاوہ نوید احمد چیمہ، ہارون انصاری، عبداللہ محفوظ، رانا محمد ولید، عاقب یعقوب، احمد اسامہ کوکب، پروفیسر جمشید انجم، پروفیسر مستغفر اعتزاز، جناب جبران احمد، جناب ساجد اقبال قیس، ڈاکٹر عامر ابراہیم (چین)، حسیب جعفر (ملائیشیا)، زبیر احمد (سعودی عرب)، سید ہادی شاہ بخاری (سعودی عرب)، نوید احمد سرا (دبئ)، عمر سیال، احمد مرزا، محمد ناصر، عمر فاروق مغل، قیصر علی بھٹی، یزدان اشرف تارڑ اور قیصر شہزاد کا ممنونِ احسان ہوں اس کے علاوہ ہر وہ شخص جس نے کسی بھی طرح میری مدد فرمائی اس کا شکر گزار ہوں۔

حافظ عباس علی اور عبداللہ عمر عالم کا ممنون ہوں کہ تحقیق کی گتھیوں کو سلجھانے اور دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کی تفہیم میں میرے معاون رہے اور مجھ سے کئی دفعہ افسانے سنے اور ان پر تبصرہ بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تحقیق کے دوران مجھے ایک محقق جناب حسن نواز شاہ کی بھی ہر گام پر مدد اور معاونت حاصل رہی کہ جنھوں نے اپنے قیمتی وقت سے ہمیشہ میرے لیے چند گھڑیاں نکالیں اور میری رہنمائی فرمائی۔ اپنے چاروں ہم جماعتوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے ہر ملاقات اور کال پہ کام کے متعلق

اچھے مشوروں سے نوازا یعنی محمد عبد اللہ غازی، خلیق الرحمٰن، مظہر حسین اور ساجد اقبال آپ کا بہت بہت شکریہ!

ادارہ برائے فروغِ قومی زبان کی لائبریری، نذیر لائبریری نمل، ایسٹرون کالج ، سکستھ روڈ کی لائبریری، ٹارشیا ایجوکیشن سسٹم، سکستھ روڈ کی لائبریری، کنسیپٹ کالج، ہارلے سٹریٹ کی لائبریری، پیڈا گوجیا ایجوکیشن سسٹم، اسلام آباد کی لائبریری اور دی قویسٹ ایجوکیشن سسٹم، نیو مور گاہ روڈ کی لائبریری سے میں نے مقدور بھر استفادہ کیا۔ اس لیے ان اداروں کا اور ان کے سربراہان کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر کتاب اور حوالے کے لیے مجھ سے تعاون فرمایا۔

آخر پہ میں ان تین ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنھوں نے کرونا وبا کے دوران اور اس کے بعد میری خدمت اور حوصلے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، یعنی عزیز از جاں بھانجیاں محترمہ زینب آصف، مریم آصف اور فاطمہ آصف کہ مقالے کی تکمیل تک اس کی طرف نہ صرف توجہ دلاتی رہیں بل کہ آسانیاں بھی پیدا کرتی رہیں۔

عثمان غنی

باب اول: تعارف و بنیادی مباحث

الف۔: تمہید

i. تعارف

کوئی بھی فنکار اپنے خیالات اور جذبات کو بیان کرنے کے لیے فنونِ لطیفہ کا سہارا لیتا ہے۔ اسی طرح ادیب بھی اپنے خیالات اور جذبات کو بیان کرتے ہوئے انتہائی فنکارانہ چابکدستی سے مختلف پیرائے اور اسلوب استعمال کرتا ہے۔ بعض ادیب علامت، رمز اور کنائے میں بات کرتے ہیں تو بعض کھل کر اپنے خیالات کو علی الاعلان واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ کا لہجہ رومانوی اور کچھ کا حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض ادیب اپنے جذبات، خیالات اور مقصد کو بیان کرنے کے لیے مذہب اور مذہبی روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ مذہبی روایات کو داستانوی انداز اور کہانیوں میں بیان کرنا ایک انتہائی فنکاری کا متقاضی ہے جس کے لیے کسی منجھے ہوئے اور مشاق فنکار کا ہونا بہت ضروری ہے۔ مجوزہ تحقیقی مقالہ بھی اردو اور عربی کے ایک بڑے اور اہم داستان گو اور کہانی نویسوں کے تقابل پر مشتمل ہے جنھوں نے اپنی مقصدیت کے لیے اور فن کے اظہار کے لیے مذہبی واقعات کو داستان کے انداز میں پیش کیا۔ یہ مقالہ اپنے عنوان اور تحقیق کے لحاظ سے بالکل نیا اور اچھوتا موضوع ہے جس سے اردو ادب میں عالمی سطح کے دو بڑے فنکاروں کے ہاں مذہبی اور داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا دلچسپ مطالعہ سامنے آیا ہے۔

ii. بیانِ مسئلہ

دنیا کے ہر خطے میں رہنے والے لوگ داستانوں اور مذاہب سے کسی نہ کسی طریقے سے ضرور جڑے ملتے ہیں۔ اس لیے دنیا کے بڑے ادب میں مذہبی روایات کا استعمال ضرور ملتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ داستان کی سی فضا، کرداروں کا داستانوی طلسم جن کا استعمال قاری کو اپنے سحر میں مبتلا ہی نہیں کرتا بلکہ اسے جلد

اپنے مقصد کے حصول کی طرف بھی گامزن کرتا ہے۔۔بلاشبہ خلیل جبران کو دنیا کے ادب میں کلاسک کا درجہ حاصل ہے اس کی کہانیوں میں بھی داستانوی اور مذہبی رنگ پایا جاتا ہے۔اس طرح اردو کے نابغہ انتظار حسین کے ہاں بھی مذہبی اسلوب اور داستانوی رنگ کی روایات کا بہ کثرت ذکر ملتا ہے تو ان دونوں کا تقابل کر کے عالمی سطح پر دیکھا گیا ہے کہ دو مختلف مذاہب،ملکوں اور تہذیبوں کے ادیبوں کے ہاں کس انداز کے ساتھ مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔

iii. مقاصدِ تحقیق

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد پیشِ نظر رہے:

۱۔اردو ادب کی روایت میں مذہبی اور داستانوی روایات کے فنکارانہ اظہار کی صورتوں کا تعین کرنا۔

۲۔اسلام اور عیسائیت کی روشنی میں تصورِ حیات اور اخلاقیات کا جائزہ لیتے ہوئے دونوں ادیبوں کے ہاں تصورِ حیات اور اخلاقیات کا جائزہ لینا۔

۳۔مذہبی اور داستانوی روایات کے تناظر میں خلیل جبران اور انتظار حسین کے باہمی تقابل سے اشتراکات و اختلافات کا تعین کرنا۔

iv. تحقیقی سوالات

مجوزہ کام میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیشِ نظر رہے:

۱۔اردو ادب کی روایت میں مذہبی اور داستانوی روایات کے فنکارانہ اظہار کی صورتیں کیا رہی ہیں؟

۲۔خلیل جبران اور انتظار حسین کے ہاں مذہبی اور داستانوی روایات کے فنکارانہ اظہار کی صورتیں کیسی ہیں؟

۳۔دونوں ادیبوں کے ہاں مذہبی اور داستانوی روایات کے فنکارانہ اظہار میں اشتراکات اور اختلافات کیا ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

انسان چاہتے نہ چاہتے کسی نہ کسی عقیدے سے ضرور منسلک ہوتا ہے۔ جو اس کے شعور سے لاشعور میں ہر وقت موجزن رہتا ہے۔ خلیل جبران کی والدہ تو باقاعدہ ایک عیسائی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، ڈاکٹر اشفاق احمد نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالے بعنوان: " جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت "(صفحہ نمبر: ۱۲۵) میں اشارہ کیا ہے کہ خلیل جبران کے پاس مذہبی اور داستانوی افکار کا اظہار پایا جاتا ہے۔ انتظار حسین کی کہانیوں کا خمیر نہ صرف نانی کی زبانی سنیں کہانیوں سے اٹھا بلکہ نانی کی مذہبی وراثت بھی منتقل ہوئی، اس کے علاوہ قرآن، گیتا اور بائبل کی مذہبی داستانوں سے کہانیوں کے تانے بانے بنتے نظر آتے ہیں جس کی طرف اردو ادب کے ناقدین نے اشارہ کیا ہے۔ خصوصی طور پر "ادبیات" رسالے کے انتظار حسین نمبر، میں مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر اقبال آفاقی، ڈاکٹر سلیم اختر، محمد حمید شاہد اور محمد عاصم بٹ کے نام شامل ہیں۔ اسی لیے دونوں ادیبوں کے ہاں مذہبی اور داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا جائزہ لینے سے اردو ادب میں اہم ادیبوں کے تقابل کا نیا در وا ہوا ہے۔

دونوں افسانہ نگاروں کا تقابل کرتے ہوئے Siegbert Salomon Prawer کی کتاب Comparative Literary Studies: An Introduction کو مدِ نظر رکھ کر موضوعاتی سطح پر مذہبی اور داستانوی افکار کو پرکھا گیا ہے اور مصنف موصوف کا بیان کردہ اصول "معروف شخصیات کی ادبی نمائندگی" ہی ملحوظ رہا ہے اور اسی کے تحت مجوزہ موضوعات، فکر اور اسلوب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ Susan Bassnett کی کتاب Comparative Literature: A Critical Introduction سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جس سے تحقیق کے اندر موضوعات کی سطح پر اور اسلوب کی سطح پر متون کی تقابلی تفہیم کے معیارات مقرر کر کے اس پر نقد کیا گیا ہے۔

.vi تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: خلیل جبران اور انتظار حسین کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے لہٰذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب، مطالعہ، تجزیہ اور تقابل کیا گیا ہے۔اس میں تاریخی و دستاویزی تحقیق اور تجزیاتی و تقابلی مطالعہ زیادہ معاون طریقے ثابت ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اور داستانوی عناصر کا تقابل کرتے ہوئے James George Frazer کی کتاب The golden bough : a study in magic and religion اور کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو زبان اور فنِ داستان گوئی" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

بنیادی ماخذات میں مذکورہ دونوں ادیبوں کے کلیات کا مطالعہ کر کے منتخب افسانوں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔جب کہ ثانوی ماخذات میں ان کے فکر و فن سے متعلق چھپنے والے مضامین، کتب اور رسائل کا مطالعہ، سرکاری و نجی کتب خانوں سے رجوع کرنے کے علاوہ ویب گاہ اور دیگر ماخذات سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا گیا ہے۔

.vii مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ موضوع پر اس طرح کا کوئی تحقیقی کام نہیں ملتا۔البتہ انفرادی سطح پر خلیل جبران اور انتظار حسین کی کہانیوں پر مذہبی روایات اور اثرات پر مضامین ملتے ہیں۔ مثلاً

Descriptive study on Gibran Khalil Gibrans' Point of view about Religion and Religious Thought,

By:Abdolah Rahimi PHD student in theology, Arak branch, Islamic Azad Included: European Online University, Arak, Iran daneshjooee@iau-arak.ac.ir, Journal of Natural and Social Sciences 2013; Vol.2, No.2 Special Issue on Teaching and Learning.

پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ بعنوان "جبران خلیل جبران: شخصیت اور فن" مقالہ نگار: اشفاق احمد ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنو، انڈیا۔ انتظار حسین پر بھی اس موضوع کے لحاظ سے کوئی تحقیقی کام تاحال راقم کی نظر سے نہیں گزرا، البتہ ان کی افسانہ نگاری کے لحاظ سے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان "انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ" مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی۔ نگران: محمد اقبال حسین صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ،انڈیا،۲۰۱۷ء۔ اس کے علاوہ ایک تحقیقی مقالہ ایم۔اے کی سطح کا بھی ملتا ہے۔ جو بعنوان "انتظار حسین کی افسانہ نگاری" مقالہ نگار: سائرہ بانو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان ،۱۹۸۱ء۔ اس کے علاوہ کچھ تحقیقی مضامین ملتے ہیں مثلاً" انتظار حسین: تہذیب، معانی اور تجربہ" از اقبال آفاقی، مشمولہ ادبیات (انتظار حسین نمبر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔"انتظار حسین کا افسانہ: تخلیقی امتیازات" از محمد حمید شاہد، مشمولہ ادبیات (انتظار حسین نمبر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔"انتظار حسین کا تصورِ تہذیب" از ڈاکٹر ناہید قمر، مشمولہ ادبیات (انتظار حسین نمبر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔"انتظار حسین: علامت یا روایت" از ڈاکٹر تحسین بی بی، مشمولہ ادبیات (انتظار حسین نمبر)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

viii. تحدید

مجوزہ تحقیق میں خلیل جبران کے افسانوں کی کلیات اور انتظار حسین کے افسانوں کی کلیات شامل رہیں۔ مذکورہ ادیبوں کے افسانوں کے اندر ہی مذہبی اور داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا تقابل پیش کیا گیا ہے اور میری تحقیق ان کے افسانوں تک ہی محدود رہی۔

ix. پس منظری مطالعہ

خلیل جبران عالمی کلاسک کا درجہ رکھتا ہے اور انتظار حسین بھی عالمی سطح پر شہرت رکھنے والا اردو کا ایک معتبر فکشن نگار ہے۔ دونوں پر بلاشبہ تحقیقی کام ملتا ہے مگر تقابلی سطح پر یہ پہلا اور اپنی نوعیت کا منفرد کام

ہے۔ خلیل جبران پر پی ایچ۔ڈی کا مقالہ اور کچھ مضامین ملتے ہیں مثلاً: اشفاق احمد،ڈاکٹر، خلیل جبران: فن اور شخصیت، دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ،١٩٨٠،

Descriptive study on Gibran Khalil Gibrans' Point of view about Religion and Religious Thought,

By:Abdolah Rahimi PHD student in theology, Arak branch, Islamic Azad Included: European Online University, Arak, Iran daneshjooee@iau-arak.ac.ir, Journal of Natural and Social Sciences 2013; Vol.2, No.2 Special Issue on Teaching and Learning.

"انتظار حسین کا تصورِ تہذیب" از ڈاکٹر ناہید قمر، مشمولہ ادبیات(انتظار حسین نمبر)،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد۔"انتظار حسین: علامت یا روایت"از ڈاکٹر تحسین بی بی، مشمولہ ادبیات(انتظار حسین نمبر)،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر،انتظار حسین اور ان کے افسانے،ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،١٩٨٦۔کتاب اور ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کی کتاب" انتظار حسین: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"بھی شامل ہے۔

.X تحقیق کی اہمیت

خلیل جبران بلاشبہ عالمی سطح کے کلاسک مانے جاتے ہیں جن کی کتابوں کے تراجم تقریباً سو سے زیادہ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مشرق و مغرب میں پڑھے جانے والے دنیا کے تیسرے بڑھے لکھاری ہیں جن کے افکار پر مذہب کے بہت زیادہ اثرات ہیں۔عیسائیت،اسلام،تصوف اور یہودیت کے مذہبی اثرات ان کی کہانیوں میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔جن کو ایک انتہائی ماہر اور مشاق فنکار کی طرح انھوں نے اپنی کہانیوں میں برتا ہے جن کی اظہاری صورتیں جتنی متنوع ہیں اتنی ہی دلکش اور دلچسپ ہیں۔اسی طرح انتظار حسین بھی ایک عالمی سطح کے افسانہ نویس ہیں جن کی کہانیوں میں مذہبی رنگ چھایہ ہوا ہے جن میں زیادہ تر اسلام،تصوف،ہندومت اور عیسائیت شامل ہیں۔اردو زبان وادب کے واحد لکھاری ہیں جو مین بکر زایوارڈ کے لیے نامزد ہوئے اس لیے ان کی کہانیوں کی عظمت عالمی سطح پر بھی مانی گئی ہے۔عالمی سطح کے ان دو مذکورہ

لکھاریوں کے ہاں مذہبی اور داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کو سمجھنا، جاننا اور ان کا تجزیہ تحقیقی سطح پر انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

ب۔ مذہبی روایت اور ادب کا تعلق:

مذہب کسی بھی معاشرے کی اساسی اکائی ہے اور دنیا کا ایسا کوئی معاشرہ نہیں جہاں کسی نہ کسی طرح یا کسی نہ کسی طریقے سے مذہبی رسومات یا عبادات کی ادائیگی نہ ہوتی ہو اس لیے مذہب کو ہم مختلف زاویوں اور تعریفوں سے جانتے ہیں اور اسے پوجاپاٹ، آسمانی حکموں کو ماننے، فرائض کی ادائیگی، موت کا اقرار اور موت کے بعد کی زندگی، باطنی صفائی جیسی اخلاقی تعلیمات، مقدس، بالا اور اَن دیکھی قوت کے وجود کا اقرار، حقیقی مقاصد کا حصول، مافوق الانسانی قوتوں کی رضا جوئی، کامل احتیاج اور انحصار، قدیم زمانے کے انسان کی دہشت، نفسیاتی عدم توازن کے مماثل سمجھنے، بندش اور پابندیِ اذہان، ہمارے اور کائنات کے مابین ہم آہنگی کے ذریعے، ایک عقیدے اور ایمان بالغیب جیسی ماورائی باتوں پر سرِ تسلیم خم کرنے کو کہتے ہیں۔

مذہب، شریعت اور طریقت کے الفاظ کا معنی ہے "راستہ "[۱] مگر یہ کیسا راستہ ہے اور اس کی باقاعدہ اور منظم تعریفیں کیا ہیں اس کے لیے پہلے ہم اس لفظ کے بارے میں مختصر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی " طریقہ، روش، اصل، عقیدہ اور مسلک " کے ہیں۔[۲] اور انگریزی میں اس کے لیے Religion کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مادہ اطالوی لفظ Religio ہے جس کا مطلب "امتناع اور پابندی" ہے۔[۳] اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہم جان لیں کہ علی عباس جلال پوری نے اس لفظ Religion کا مادہ اطالوی زبان کے ہی لفظ Relegere کو قرار دیا ہے جس کا مطلب ہے "نگرانی کرنا"۔[۴] ان دونوں الفاظ کے معانی کو سمجھیں تو اس کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کے تحت اجازت اور پابندی پر مبنی احکامات کی نگرانی اور دھیان رکھنا ہی مذہب ہے۔ وگرنہ انسان گناہ کا مرتکب ہو جائے گا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مطابق لفظ Religion کی تعریف کچھ یوں ہے:

"Religion: Human beings' relation to that which they regard as holy, sacred, absolute, spiritual, divine, or worthy of especial reverence. It is also commonly regarded as consisting of the way people deal with ultimate concerns about their lives and their fate after death. In many traditions, this relation and these concerns are expressed in terms of one's relationship with or attitude toward gods or spirits; in more humanistic or naturalistic forms of religion, they are expressed in terms of one's relationship with or attitudes toward the broader human community or the natural world. In many religions, texts are deemed to have scriptural status, and people are esteemed to be invested with spiritual or moral authority. Believers and worshippers participate in and are often enjoined to perform devotional or contemplative practices such as prayer, meditation, or particular rituals. Worship, moral conduct, right belief, and participation in religious institutions are among the constituent elements of the religious life".(۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق Religion کی تعریف کچھ یوں ہے:

"مافوق الفطرت قوت کو اطاعت، عزت اور عبادت کے لیے بااختیار تسلیم کرنے کا عمل؛ اس قسم کی مختار قوت کو تسلیم کرنے والوں کا یہ احساس یا روحانی رویہ اور اس کا ان کی زندگی اور طرز زیست سے اظہار؛ متبرک رسوم و رواج یا اعمال کے سر انجام دیے جانے کا عمل؛ خدائے واحد و مطلق یا ایک یا زیادہ دیوتاؤں پر ایمان لانے اور ان کی عبادت کا ایک مخصوص نظام۔"(۶)

مندرجہ بالا تعریفوں اور لفظی مطالب سے یہ بات تو سمجھ آگئی کہ مذہب سے انسان کسی مافق الفطری قوت کے زیرِ سایہ بل کہ اس کی اطاعت میں آجاتا ہے اور پھر انسان تمام عمر اسی مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتا رہتا ہے اور اسی کے اصول و ضوابط کے مطابق زندگی گزارتا ہے اس کے اصولوں سے انحراف گناہ اور بعض اوقات گناہِ کبیرہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے بھیانک اور دہشت ناک سزاؤں کی وعیدیں بھی سنائی جاتی ہیں۔ ایک کہانی کار یا داستان گو کا مذہب سے جڑ جانا بالکل فطری سا عمل ہے۔

انسان نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور خود کو معاشرے میں یہ ہوش و حواس پایا ہے یہ اپنی مصروفیت کے لیے کہانی، داستان یا قصہ گوئی کرتا ہی رہا ہے۔ اس لیے یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ انسان نے کہانی کہنا اور داستان گوئی کا فن کب، کہاں اور کیسے سیکھ لیا۔ مگر اس میں یہ بات اپنے تمام تر تقاضوں کے ساتھ آموجود ہوئی کیوں کہ وقت گزاری کے لیے کوئی اور کام یا مصروفیت اس کے پاس نہیں تھی اس لیے کہانی ،داستان یا پھر قصہ بہت طوالت کی شکل بھی اختیار کر جاتا جس کے بیان کے لیے ہفتوں، مہینوں لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن جب جب وقت گزرتا گیا اور داستان گو کو اپنی ضرورتوں کے تحت اس کو مزید چیزیں استعمال میں لانی پڑیں تو وہی کہانی کا وقت تقسیم ہوتا گیا اور کہانی جو ایک عظیم اور بے پناہ پلاٹ، بے شمار بھانت بھانت کے کرداروں پر پھیلی ہوئی تھی اس کا کینوس سکڑنا شروع ہو گیا اور وہ جو کہانی صرف داستان یا پھر قصہ گوئی ہی کہلاتی تھی اپنی ہئیت، مقدار اور طوالت کے لحاظ سے مختلف ناموں میں بدلتی گئی اور بدلنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں نے بھی اس پر اثر اندازی کی اور موقع بہ موقع داستان گو اس میں اپنی ضرورتوں کے تحت

تبدیلیاں کرتے رہے اور یہ کہانی چلتی چلتی داستان،لوک کہانی،قصہ گوئی، مثنوی،ناول،ناولٹ اور آج کے افسانے سے ہوتی ہوئی افسانچے تک پہنچ گئی۔ سامنے کی چند اصناف کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کہ کتنی ہئیتوں اور شکلوں کی تبدیلی کے بعد یہ کہانی، داستان یا پھر قصہ گوئی آج کی اس کہانی کی ہئیت تک پہنچی۔

کوئی بھی مصنف، ادیب یا شاعر اپنے زمانے کا نباض اور عکاس ہوتا ہے اور ادب کو معاشرے کا عکس بھی کہا جاتا ہے اس بات کو اگر ہم اپنے پیشِ نظر رکھیں تو ہر اہلِ علم کو ماننا پڑے گا کہ ہر ادیب یا شاعر اپنے زمانے کو اور اپنے آپ کو ہی بیان کرتا رہا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ادیب، شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کے تخلیق کیے فن پاروں کو سمجھا جاتا ہے اور فن پاروں کو سمجھنے کے لیے اس فن پارے کے دور ،زمانے، معاشرے، سماج، سیاست، معاشرت اور معاشی حالات کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحانات کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے کیوں کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی زمانہ مذہب اور مذہبی خیالات سے مبرا یا ماورا نہیں رہا، پھر چاہے کوئی ادیب اور شاعر کسی آسمانی خدا کو اپنا معبود مانتا ہو یا زمین پہ اپنے ہی ہاتھوں سے تخلیق کردہ کسی بُت یا صنم کو اپنا خدا تسلیم کرتا ہو۔ کسی ماورائی قوت کا ادراک کر کے سر بہ سجود ہوتا ہو یا کسی مرئی قوت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتا ہو۔ آسمان پہ موجود چاند، ستاروں کو اپنا قبلہ مانتا ہو یا پھر سورج کو یا اس کی چمکتی روشنی اور چمک دمک کو اپنا معبود جانتا ہو، ہر انسان کسی نہ کسی طریقے اور ایقان کی وجہ سے وہ کسی ایمان اور مذہب کا حصہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اگر کوئی انسان یہ کہتا ہے کہ میرا کوئی مذہب نہیں اور میں کسی عقیدے سے جڑا ہوا شخص نہیں تو دراصل اس کا یہ کہنا کہ میں کسی عقیدے کو نہیں مانتا یہ نہ ماننا بھی اس کا ایک عقیدہ ہی ہے جس سے وہ منسلک ہے اور اسی بنیاد پر اپنی زندگی گزار رہا ہے۔

عقیدہ اور مذہب کسی بھی معاشرے کا ایک عظیم، اہم اور خاص الخاص رکن ہے بل کہ بعض دنیا کے معاشرے ایسے بھی ہیں جن میں مذہب ہی غالب اور اغلب ہے جب کہ معاشرے کے دوسرے ارکان ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں مسلم، ہندو، عیسائی اور یہودی معاشرے سرِ فہرست ہیں، بدھ مت اور جین مت کو بھی ان میں جزوی طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مذہب کی ضرورت کسی بھی معاشرے کے نظام کو

بہتر سے بہترین اور ایک لڑی میں پرونے کے لیے انتہائی ضروری ہے وگرنہ ایک معاشرہ کبھی بھی تمدنی سطح پر ایک جیسا نہیں سوچ سکتا اور اس کی ترقی اور ترویج کے امکانات روشن نہیں ہو سکتے۔ مذہب کی اہمیت کسی معاشرے کے لیے کتنی ضروری ہے اس کے بارے منشی عبد الرحمٰن شوقؔ امرتسری لکھتے ہیں:

> "مذہب ایک ایسا امر جامع ہے جو اپنے ماننے والوں کو ایک روش اور ایک لائن پر قائم رکھتا ہے اور ایک دوسرے کی ضرورت کے وقت اس کی دست گیری اور اعانت کی تعلیم کرتا ہے۔ ورنہ ہر شخص فرداً فرداً خود غرض ہے، یہی چاہتا ہے کہ میری بہتری ہو۔ کسی دوسرے کے فائدے اور نقصان کی پرواہ نہیں کرتا۔ لہٰذا مذہب ہی ایک ایسا قانون ہے جو سب کے ساتھ ہمدردی اور باہمی میل جول اور اتحاد قائم کرنے کا سبق دیتا ہے کیوں کہ جب تک کوئی سوسائٹی قائم نہ اور اس سوسائٹی کا کوئی دستور العمل نہ ہو ایک دوسرے کی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ پس اصولِ معاشرت کے قائم رکھنے کے لیے مذہب کا ہونا بہت ضروری ہے۔"[۷]

مندرجہ بالا اقتباس اور بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مذہب کسی بھی معاشرے کی اساسی اکائی ہے جو معاشرے کے استحکام اور استقلال کے لیے بہت ضروری ہے لہٰذا اس تناظر میں کوئی بھی ادیب جس بھی معاشرے میں رہ کر ادب تخلیق کرے اسے چاہتے نہ چاہتے مذہبی اقدار کے دامن سے واسطہ پڑتا ہی ہے اور ہاں! اگر کوئی سیکولر ذہن کا آدمی بھی کوئی ادب تخلیق کرے تو وہ اپنی ذہنی عقیدت کو ضرور سامنے رکھتا ہے تو وہ مذہب کے حق میں نہیں تو خلاف لکھتے ہوئے بھی مذہب ہی سے ہو کر گزرتا ہے چاہے ذرا دور کا واسطہ رکھتا ہے۔ ایسے ادب میں بھی مذہبی حوالے بہ کثرت مل جاتے ہیں جن سے مذہب کی عکاسی کسی نہ کسی صورت ہوتی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ باقی مذہبی اقدار کے مطابق اور مذہبی معاشروں کو سامنے رکھ کر تبلیغ کے لیے، اخلاقیات کے لیے اور کسی خاص مذہبی حوالے سے لکھا ہوا ادب تو باقاعدہ مذہبی ادب کہلاتا ہے۔

مذہبی ادب کی ضرورت کسی بھی معاشرے کو رہتی ہے کیوں کہ معاشرے کا استحکام مذہب سے ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مذہب اور اس سے متعلق اخلاقی، صفاتی اور تبلیغی عناصر کی ترویج و ترقی کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس میں ان مذہبی اقدار کو ایک کہانی اور قصے کی صورت میں بیان کر کے لوگوں کے اندر اخلاقی و ہم دردی اور خدا کے تصور و تعلیمات جیسی صفات کو زندہ رکھا جا سکے۔ اس لیے مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے لوگوں کو اخلاق کی قوت اور انصاف کی طاقت سے روشناس کروایا جائے اور انھیں مذہبی حوالے سے مضبوط ذہن ساز ادب مہیا کیا جا سکے تا کہ ان کے اندر مذہب کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے نہ کہ وہ ایمان اور ایقان کے باوجود متزلزل رہیں۔

اس لحاظ سے اگر ہم دیکھیں تو ہر وہ ادب جو مذہب کی عکاسی کرے یا پھر مذہبی اقدار کا آئینہ ہو ہم اسے مذہبی ادب کہہ سکتے ہیں۔ اس تناظر میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنے مشہورِ زمانہ مضمون " مذہب اور ادب" میں یوں رقم طراز ہے:

> "When I am considering Religion and Literature, I speak of these things only to make clear that I am not concerned primarily with Religious Literature. I am concerned with what should be the relation between Religion and all Literature." (۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ ہر وہ ادب جس میں مذہبی حوالہ موجود ہو اور وہ ادب کسی نہ کسی حوالے سے کسی بھی مذہب سے جڑا ہو تو ہم اسے مذہبی حوالے سے بھی جان سکتے ہیں اگرچہ وہی ادب کسی اور معتبر حوالے سے بھی جانا جاتا ہو۔

کسی بھی ادیب کا اپنا ذہنی ربط اور فکری انسلاک کسی بھی مذہب یا پھر کسی مذہبی عقیدے سے ہوتا ہے جس کو وہ چاہتے نہ چاہتے بیان کرتا ہی رہتا ہے اور وہ ادیب اپنی ہی فکر کے مطابق مذہبی حوالوں کو ادب میں جگہ دیتا ہے۔

i. مذہبی افکاراور فکری انسلاکات:

انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ انسان جس ماحول اور تربیت میں رہتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے یا پھر ویسا ہی سوچنا شروع کر دیتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ویسی ہی عادتیں اور خصائل آدمی میں پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ انسان کی فکر بھی اسی طرح پروان چڑھتی ہے۔ کسی پر تربیت کا اثر، کسی پر صحبت کا اور کسی پر کتابوں کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ تمام عمر انسان ویسا ہی ہو کر جیتا رہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان بچپن میں جو سیکھ لیتا ہے پھر ساری عمر وہ اس کی عادت بن جاتی ہے اور وہ چاہ کر بھی ان عادتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ کیسا ہی ماحول کیوں نہ ہو وہ خواہشیں اور عادتیں اس کے اندر مچلتی رہتی ہیں اور وہ ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہی کچھ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہوتا ہے کہ ادیب یا شاعر جس طرح کا بچپن گزارتا ہے اور جیسا اسے ماحول میسر آتا ہے وہ ویسا ہی سوچنے لگتا ہے حتیٰ کہ ادیب شاعر تو معاشرے میں ہونے والے جبر، ظلم اور ناروا سلوک بھی ایسے ہی بیان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں جیسے وہ ظلم یا ستم کسی اور پر نہیں بل کہ خود ان کی ذات پر ہوا ہے اسی لیے تو شاعر اور ادیب کو معاشرے کا نباض اور عکاس کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض ادیبوں اور شاعروں کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہوتا ہے کہ انھیں بچپن میں گھر سے ہی مذہبی ماحول ملا ہوتا ہے یا پھر ان کی زندگی میں کسی ایسے آدمی کی آمد ہوتی ہے جو ایک خاص قسم کے نظریات کا حامل ہوتا ہے اور اسی کی قربت میں رہتے رہتے وہ ادیب اور شاعر بھی ویسا ہی سوچنے لگتا ہے۔ کسی استاد کی زندگی میں اس طرح آمد بھی سخت اثرات مرتب کرتی ہے کہ طالبِ علم تمام عمر ان خیالات سے نکل

نہیں پاتا اور اسی طرح سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ لوگ اس طالبِ علم کو اپنے استاد کا چربہ بھی پکارنا شروع کر دیتے ہیں اور وہی اس طالبِ علم کی پہچان بن جاتی ہے۔

فکر کے پروان چڑھنے اور اس کے ارتقا میں انسانی معاشرے، لوگوں، کتابوں اور علم کا بہت عمل دخل ہے۔ یا تو آدمی ایک ماحول میں رہ رہ کر ویسا ہو جاتا ہے یا پھر اس ماحول کے خلاف ہو جاتا ہے اور اس کی خامیوں خوبیوں پر اچھی طرح خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ اسی لیے ایک صاحبِ علم شخص ساری عمر لوگوں اور کتابوں سے سیکھتا رہتا ہے اور اس کے نظریات میں بھی بدلاؤ آتا رہتا ہے اور اگر کسی انسان کی زندگی میں فکری ارتقا نہیں ہو رہا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان نہ مشاہدے کی قوت رکھتا ہے اور نہ ہی اس نے اپنی صحبت کو بدلا ہے اور نہ ہی مزید اس نے مطالعہ کیا ہے۔ گویا انسانی فکر اور میلانات کا ارتقا اس کی صحبت، علم اور پرورش و تربیت پر منحصر ہے اور پھر یہ ویسا ہی سوچتے ہوئے ویسا ہی ادب تخلیق کرے گا۔

مولانا مودودی ایک ادیب کے اسی میلان اور فکری رویے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”درحقیقت ادیب کا تخلیقی عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ادیب کے فکر کی کیفیت حمل کی مانند ہوتی ہے جس سے بالکل فطری ولادت ہوتی ہے۔ ادیب جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے وہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ ادیب ایک انسان ہوتا ہے۔ انسان کے اندر مختلف میلانات پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک ادیب کے اندر گمراہی کے میلانات ہیں، وہ دنیا میں فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتا ہے تو اس کے اندر بری نیتوں اور برے ارادوں کا حمل قرار پاتا ہے اور اس کے نتیجے میں لازماً وہی چیز پیدا ہو گی جو ان تمام مضرتوں کی حامل ہو۔“[۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی فکر اور میلان کی وجہ سے ہی انسان ویسا سوچتا ہے اور پھر اگر وہ ادیب ہے تو فطرتاً پھر وہ اپنی سوچ اور فکر و میلان کے مطابق لکھتا ہے اور اس کا ایسا لکھنا بھی بالکل فطری عمل ہے۔ اقتباس میں مولانا نے ایک بڑے ادیب کی مثال دی ہے بالکل اسی طرح اگر ادیب

اچھی طبیعت، اچھی فکر اور اچھے میلان کا حامل ہے تو وہ ہمیشہ سوسائٹی کے لیے بہتر اور اچھا ادب ہی تخلیق کرے گا اور اس کی ہر تحریر میں تعمیری جذبہ زیادہ ہو گا اور تعمیری جذبے کے تحت ہی اس کا سارا ادب تخلیق ہو گا کیوں کہ اس کی فطرت میں برا میلان اور بری سوچ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ ایسا ہر ادیب کے ہاں پایا جاتا ہے مگر یہاں صرف انتظار حسین اور خلیل جبران کے ہاں ایسے خیالات، فکر اور میلان کے پروان چڑھنے کی وجوہات کو دیکھا جائے گا اور انھیں میلانات کے حوالے سے بات کی جائے گی۔

انتظار حسین کے والدِ گرامی ایک مذہبی شخصیت تھے اور ایسے مذہبی آدمی کہ کسی طور بھی مذہب کے اصولوں سے پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ اتنی سختی سے مذہبی اقدار اور شعار کا پاس ولحاظ کرتے تھے کہ انھیں بنیاد پرست کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہو گا اور انتظار حسین نے خود اس رویے کو آج کل کے تناظر میں بنیاد پرستی کہا ہے۔ اس قدر سخت مسلمان تھے کہ شعر پڑھنا کروہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انتظار حسین کو جو کہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، ایک پکا سچا مسلمان بنانا چاہتے تھے اور زبردستی اسے قران مجید پڑھایا اور نہ صرف ناظرہ بل کہ قران ترجمے کے ساتھ بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر مذہبی رنگ، آہنگ پیدا ہونا شروع ہوا اور اسی کی وجہ سے انھوں نے عمر بھر مذہبی مطالعہ نہ چھوڑا اور مذہبی علامتوں کو اپنے افسانوں میں ہر طرح سے استعمال کیا۔ خود ہی اپنے بارے کہتے ہیں:

> ”اور لیجیے یہاں سے میری کہانی میں میرے والد کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ مگر کیسے؟ قصہ کہانی کو تو وہ خرافات جانتے تھے۔ کیا قصہ کہانی، کیا شاعری، یہ سب چیزیں ان کے حساب میں لہو ولعب کے ذیل میں آتی تھیں، اور شاعری تو وہ شے تھی کہ اگر روزے میں خدا نخواستہ وہ شعر پڑھ لیتے تو روزہ مکروہ ہو جاتا تھا۔ اس لیے رمضان کے دنوں میں بالخصوص شاعری سے اجتناب برتا جاتا۔ بس انھیں طہارت پسند مسلمان چاہیے۔ اب اس رویے کو بنیاد پرستی کہتے ہیں۔ میں اکلوتا بیٹا، اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔“(۱۰)

مندرجہ بالا اقتباس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کم عمر بچے کے ذہن میں کس قدر مذہبی اقدار اور شعار کو ماننے اور تسلیم کرنے کا رعب اور دبدبہ تھا۔ مگر والدِ محترم یہیں تک نہیں رکے اپنے اکلوتے بیٹے کو لے کر اس قدر محتاط تھے کہ اسے نئی تعلیم کے پاس تک پھٹکنے نہیں دینا چاہتے تھے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بل کہ کہتے تھے کہ اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہی ہے تو اسے عربی کے ساتھ پڑھا جائے، یعنی عربی پڑھنا لازم ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اسکول میں داخل نہیں کروایا بل کہ خود ہی گھر پر معلم بن بیٹھے یعنی استاد بھی ایک مذہبی آدمی۔ دوسرے علوم بھی پڑھاتے تھے مگر زور صرف عربی پر اور قران ترجمے کے ساتھ بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ انتظار حسین کی زبانی سنیے:

"طے کیا کہ بیٹے کو نئی تعلیم کی لعنت سے بچاؤ۔ انگریزی بے شک پڑھاؤ مگر عربی کے ساتھ۔ سو اسکول میں داخل نہیں کرایا، گھر ہی پر تعلیم کا اہتمام کیا۔ معلم خود بنے، تھوڑی انگریزی، حساب اور ایسے دوسرے مضامین، مگر زور عربی پر۔ سو میرا بچپن ضَرَبَ، یَضرِبُ کی گردانیں حفظ کرنے میں گزرا۔ ساتھ میں معنی کے ساتھ قران پڑھانا شروع کر دیا۔"(۱۱)

اس اقتباس سے بھی اندازی لگایا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین کے ذہن پر بچپن سے ہی مذہبی اقدار اور مذہبی ادب کا سایہ تھا اس لیے ان کی کہانیوں میں مذہبی رنگ ہونا اور مذہبی علامتوں کا ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ انتظار حسین نے اپنے بچپن میں ہی نہ صرف قران و حدیث کو مع ترجمے کے پڑھ لیا تھا بل کہ انھوں نے مذہبی ادب کا بھی اچھا خاصا شعور حاصل کر لیا تھا۔ جس کے بارے میں محمد ارسلان رضا لکھتے ہیں:

"جس عمر میں بچے کھیلنے میں مصروف ہوتے ہیں اسی دوران میں انتظار حسین نے اپنے والد کی لائبریری کی تمام اسلامی کتب پڑھ ڈالیں۔ انتظار حسین کے والد منظر علی مذہبی آدمی تھے۔"(۱۲)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کی فکر، ذہنی میلان شروع سے مذہب کی طرف ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے ان کی کہانیوں میں مذہبی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

خلیل جبران کے ہاں بھی ہمیں مذہبی اقدار اور شعار کا کثرت سے استعمال ملتا ہے ان کے ہاں بھی ان مذہبی استعاروں اور علامتوں کے استعمال کی وجہ ان کے ذہن پر مذہبی چھاپ اور مذہبی رنگ کا ہونا ہے۔ خلیل جبران اپنے بچپن سے ہی مذہب کے قریب رہا، ماں بھی ایک مذہبی خاتون تھی جس نے خلیل جبران کو مذہبی لوک کہانیاں سنا سنا کر اور مذہبی گیت و مناجات سنا سنا کر اس کے ذہن میں مذہب کا قرب اور محبت بھر دی تھی۔ اس کی ماں چرچ میں ایک نن بھی رہ چکی تھی اور وہ عیسائیوں کے قدیم مسلک اور چھوٹے فرقے میرونی کی پیروکار تھی۔ جس کی تبلیغ اس نے اپنے بیٹے کو بچپن سے ہی کی اور اسی فرقے کی مذہبی تعلیمات کا اثر عمر بھر خلیل جبران کے دل و دماغ پہ چھایا رہا حتیٰ کہ خلیل جبران کا ناول "ابنِ آدم" انھیں عقائد کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ ناول میرونی عقائد کے مطابق جنابِ عیسیٰؑ کی سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ماں ایک راسخ العقیدہ پادری کی بیٹی تھی جس کی گھر سے ہی تربیت مذہب سے شروع ہوئی اور مذہب پر ہی ختم ہوئی۔ اس کے علاوہ بہت سے عربی لکھاریوں اور فلسفیوں کا اثر خلیل جبران کے ذہن و دل پر تھا۔ اس بارے میں Homam Altabaa اور Adham Hamawiya لکھتے ہیں:

> " In addition to the influence of his mother and of nature, Arab culture in general and Islamic mysticism played a vital role in shaping the creative mind of Gibran. The influences of Arab writers and mystics include, but are not limited to, ʼAl-Mutanabbī (915-65), ʼAl-Maʻarrī (973-1057), Ibn Sīnā (980-1037), ʼAlGhazālī (1058-1111), Ibn ʼAl-Fāriḍ (1181-1234) and Ibn Khaldūn (1332-1406). Divine love, as inspired by Islamic culture, became

a constant feature in the writings of Gibran. The stress of Islamic mysticism on knowledge and spirituality has also influenced Gibran. Similarly, Christianity and the New Testament held an unparalleled sway over Gibranian thought. The author claims that Jesus became "Gibran's best friend" since childhood, with Christian teachings leaving an indelible mark on his min(۱۳)"

فطرت جب لالے کی حنا بندی کا کام شروع کرتی ہے تو اس کا اہتمام بھی خود ہی کرتی ہے۔ خلیل جبران کا والد ایک سخت مزاج، اکھڑ اور گمنڈی قسم کا آدمی تھا جسے اپنی بیوی اور بچوں سے کچھ لگاؤ نہ تھا، فطرتی تقاضا ہے کہ باپ سخت ہو تو بچے ماں کے بہت نزدیک ہو جاتے ہیں اور خلیل جبران کے باپ کی سختی کی وجہ سے ہی وہ اپنی ماں کے بہت قریب تھا بل کہ انتہا درجے کی محبت اپنی ماں سے کرتا تھا مگر یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے باپ سے نفرت بھی نہیں کرتا تھا۔ماں کے قریب ہونے کی وجہ سے ماں نے اپنے لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو بچپن میں ہی مذہبی لوک کہانیاں اور بائبل کے قصے سنا سنا کر اس کے ذہن کی مذہبی نشوونما کی۔ حیدر جاوید لکھتے ہیں:

"کاملہ ایک مہربان، شفیق اور محبت کرنے ولی خاتون تھیں جب کہ خلیل جبران کے والد اکھڑ مزاج، بادہ نوش اور قمار باز شخص کی شہرت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کرنا بہت ہی دشوار تھا۔۔۔۔۔۔ اپنے والد کے مقابلے میں جبران والدہ کے زیادہ قریب تھے۔ انھیں اپنی والدہ سے بے حد محبت اور لگاؤ تھا۔ عربی اور فرانسیسی روانی سے بولنے والی کاملہ رحمت نے بلادِ عرب اور بالخصوص لبنان و شام کی لوک کہانیاں اور بائبل کے قصے کچھ اس طرح جبران کو سنائے کہ ان سے جبران کے فن کارانہ تخیل کو جلا ملی۔"(۱۴)

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ خلیل جبران کی ذہنی فکر اور میلانِ طبع کا رجحان مذہب کی طرف اپنی ماں کی وجہ سے بچپن سے ہی تھا۔ جو ساری عمر خلیل جبران کے ساتھ رہا اور اس کی کہانیوں اور شاعری میں بارہا نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ خلیل جبران جس علاقے " بشریٰ" میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا وہ میرونی عیسائیوں کا مرکز اور گڑھ مانا جاتا تھا جس وجہ سے اس کے خیالات پر مذہبی رنگ اور بھی نمایاں ہو گیا اور شدت اختیار کر گیا۔

ii. مذہبی افکار کے اسلوب پر اثرات

اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ انسان کی سوچ، طبیعت، میلان اور فکر کا اثر اس کی گفتگو اور تحریر پر ضرور پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفے کا طالبِ علم فلسفی بننے کا سوچتا ہے اور ادب کا طالبِ علم ادیب و شاعر بننے کا متمنی ہوتا ہے۔ یہی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اسی طرح ایک آدمی مذہب سے میلان رکھتا ہو تو اور وہ ادیب بھی ہو تو اس کی تحریر و ادب میں مذہبی استعاروں، کنائیوں، تشبیہوں، رموز اور علائم کا آنا بالکل فطری عمل ہو گا۔ ایسی فکر رکھنے والے ہر ادیب کے ہاں ایسا ہوتا ہے مگر ہماری مراد یہاں صرف انتظار حسین اور خلیل جبران کی مذہبی فکر اور میلان کے تحت اسلوب پر آنے والے مذہبی اثرات کا جائزہ لینا ہے کہ مذہبی طبعی رجحان کے تحت ان کی کہانیوں میں کس کس طرح مذہبی حوالوں کی آمد ہوئی ہے اور انھوں نے انھیں کس طرح برتا ہے۔

انتظار حسین کے اسلوب پر تو بے شمار مذہبی استعاروں، کنائیوں اور علامتوں کا سایہ ہے یعنی ان کی کئی کہانیوں کے اندر ایسی علامتیں، استعارے اور رموز مل جاتے ہیں جن کا سیدھا سیدھا مذہب سے تعلق ہوتا ہے۔ مثالیں دینے سے قبل انتظار حسین کا اس بارے خود کا بیان بھی دیکھ لیتے ہیں:

”سو اسکول میں داخل نہیں کرایا، گھر ہی پر تعلیم کا اہتمام کیا۔ معلم خود بنے، تھوڑی انگریزی، حساب اور ایسے دوسرے مضامین، مگر زور عربی پر۔ سو میرا بچپن ضَرَ بَ، یَضرِبُ کی گردانیں حفظ کرنے میں گزرا۔ ساتھ میں معنی کے ساتھ قرآن پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی سورہِ بقر پر تھا کہ ایک آیت پر آکر ذہن اٹک گیا اور تخیل بھٹک گیا، یعنی اس بستی کے ذکر پر جس کے باسی احکاماتِ خداوندی سے نافرمانی پر تلے رہتے تھے، اور کیسے کیسے مکر کرتے تھے کہ سبت کے دن مچھلیاں پکڑنا منع تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ سب بندر بن گئے۔ وکونو قردۃً خاشعین۔ اس مقام پر میں آکے پکڑا گیا۔ عجب ثم العجب۔ آدمی کی کایا کلپ اس طرح بھی ہوتی ہے۔“(۱۵)

اسی ہی قرآنی واقعے کے بعد انتظار حسین کے ذہن میں کہانی ”آخری آدمی“ آئی اور انھوں نے اتنی عمدگی سے الیاسف کے کردار سے یہ سارا واقعہ بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا سارا واقعہ بخوبی سمجھ جاتا ہے۔ کہانی کی بنت سے نافرمانی کرنے والوں کے بندر بننے کا دلچسپ، حیرت انگیز اور دلدوز واقعہ بیان کیا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس دیکھیے:

”اور اس قریئے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغوں کو خراب کرتے تھے، نابود ہو گئے۔ اس پر اس شخص نے جو انھیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا۔ یہ کہا کہ بندر تو تمھارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہکیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا ہے کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔“(۱۶)

اس کہانی کے اسلوب میں جو کردار الیاسف، الیعذر، الیاب اور ابن زبلون کا استعارہ اور تلمیح استعمال کی گئی ہے وہ بنی اسرائیل (سورۃ البقرہ) کی طرف اشارہ ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ اس افسانے میں

داستانوی انداز میں اس مذہبی واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ''زرد کتا''، ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''، ''کنکری''، ''وہ جو کھوئے گئے''، ''شہرِ افسوس''، ''شرم الحرم''، ''کانا دجال''، اور ''کایا کلپ'' کے علاوہ کئی اور افسانے ہیں جن میں داستانوی، مذہبی اور اساطیری رنگ غالب نظر آتا ہے۔

اسی طرح خلیل جبران کے اسلوب میں بھی مذہبی رنگ اپنی پوری آب و تاب میں نظر آتا ہے چوں کہ خلیل جبران کا بچپن، تربیت اور تعلیم بھی مذہبی ہی رنگ میں ہوئی اس لیے ان کی کہانیوں میں بھی مذہب کا رنگ آنا بالکل فطری سی بات ہے۔اپنے افسانے'' شیطان'' میں ایک مذہبی پادری کو ایک نام نہاد عالمِ دین اور موقع پرست لالچی شخص بنا کر پیش کیا ہے جو معصوم لوگوں سے دولت اور موسمی پھل ہتھیا لیتا ہے اور فقط دعاؤں کی پوٹلی انھیں بھیک میں دے دیتا ہے۔ایسے لوگوں کے بارے میں ہر دین اور مذہب میں برے انجام کی وعید سنائی گئی ہے اور انھیں بالکل بھی مذہب کی آڑ استعمال کر کے ذاتی مفاد حاصل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ایسے آدمی پر لکھتے ہیں:

> ''سمعان پادری روحانیات کی باریکیوں کا عالم تھا اور لاہوتی مسائل کا بحرِ بیکراں، صغیرہ وکبیرہ گناہوں کا رمز شناس۔۔۔۔۔۔ دیہاتی، سمعان پادری کی بے انتہا عزت کرتے اور سونے چاندی کے عوض اس کی دعائیں اور نصیحتیں حاصل کر کے خوش ہوتے۔''(۱۷)

خلیل جبران کی اور بھی کہانیوں میں مذہبی حوالے ملتے ہیں جن میں ''دوراستے ایک منزل''، ''نغماتِ حیات''، ''ادیب آفندی''، ''فرید و عیبس''، ''ہوس اقتدار''، ''اطمینان اور بے اطمینانی'' قابلِ ذکر ہیں۔اس کے علاوہ خلیل جبران کے ناولوں میں بھی بھرپور مذہبی حوالے اور عکاسی ملتی ہے۔جن میں ''ابنِ آدم'' میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور مذہبی حوالہ ملتا ہے۔''النبی'' میں عیسائیوں کے عقائد کی تبلیغ اور اس عقیدے پر قائم معاشرے کی تصویر ملتی ہے اور ''جنتِ ارضی'' میں بھی مذہبی حوالے سے شرفِ آدمیت کو بیان کیا ہے۔اس ساری بحث کو ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی نے اس طرح سمیٹا ہے:

"اس(خلیل جبران) کی تحریریں حق وصداقت اور نور وہدایت سے معمور نظر آتی ہیں۔مذہب کا احترام اور عظمت بھی اس کی نگاہوں میں بہت زیادہ تھا۔دشوار راہوں پر ایمان اور صبر اور عزمِ محکم کے ساتھ چلنے پر بھیاسی لیے اس نے بہت زیادہ زور دیا ہے۔اکثر مقامات پر اس نے مطالب کی تشریح اور وضاحت کی غرض سے ان مقدس کتابوں کی مثالیں اور رموز پیش کیے ہیں۔"(۱۸)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل جبران کے ہاں مذہبی حوالے پائے جاتے ہیں اور یہ ان کے طبعی میلان اور رجحان کا فطرتی اثر ہے۔

ج۔ داستانوی روایت اور ادب کا تعلق

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے اسے اپنے ارد گرد بہت سی کہانیاں اور واقعات سننے کو ملتے ہیں جن کے درمیان یہ جی رہا ہوتا ہے۔شاید اس کی وجہ ماحول کا اثر یا پھر ثقافت کی گرفت ہے جس سے کوئی بھی معاشرہ اپنا دامن بچا نہیں سکتا۔یہی داستانیں، کہانیاں اور باتیں قدیم دور میں تو تھیں ہی تھیں مگر اس جدید دور میں بھی ایسی باتیں مل جاتی ہیں جن پر لوگ کثرت سے یقین بھی رکھتے ہیں۔یہی باتیں اور واقعات چلتے چلتے ایمان اور ایقان کا حصہ بنتے گئے جس سے سوسائٹی کے لیے قانون وانصاف کے پیمانے بھی بنے اور کئی مذہبی عقائد بھی تشکیل پائے اور انسان اپنی تہذیب، تمدن اور معاشرت کی وجہ سے ان پر ایمان بھی رکھتا ہے۔مل جل کر رہنا انسان کی مجبوری اور ضرورت ہے اور اسی وجہ سے اکثر مقامات پر ثقافت، مذہب پر غالب آجاتی ہے اور ایسی ہی باتیں ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی ماننا پڑ جاتی ہیں۔

داستان فارسی کا لفظ ہے۔داستان، کہانی کو کہتے ہیں اور گو کا مطلب ہے کہنے والا یا سنانے والا۔اس کا مطلب؛داستان گو کے معنی ایسا شخص جو داستان سنائے یا کہے۔ہمارے ہاں جو اردو داستان مشہور ہے وہ ہندوستانی داستان گوئی ، درباری داستان گوئی یا ہندوی داستان گوئی بھی کہلاتی ہے داستان گوئی کی اصل عرب

ہے اور اسلام جب ایران میں پہنچا تو داستان کا فن بھی ایران پہنچا اور پھر ایران سے ہندوستان پہنچا۔ ماہر بشریات غوث انصاری کہتے ہیں:

> ”داستان گوئی کی جڑیں قبل از اسلام عرب سے ملتی ہیں۔ پھر اسلام کی اشاعت نے اس فن کو ایران تک پہونچایا اور ایران والے ہندوستان دہلی لیکر آئے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جب لوگ دہلی سے لکھنؤ پہونچے تو دوسری اصناف ادب کے ساتھ ساتھ داستان گوئی بھی لکھنؤ گئی۔“ (۱۹)

ایک بات بہت دلچسپ ہے کہ دنیا میں موجود تمام قوموں اور تہذیبوں میں داستانوں اور قدیم کہانیوں کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ اور ان داستانوں میں بہت سی ایسی باتیں اور واقعات مل جاتے ہیں جن کے مطالعے سے لگتا ہے کہ یہ قصہ پہلے پہل کسی نے گھڑا ہو گا اور بعد میں یہ قوتِ متخیلہ کا حصہ بن گیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے ہر خطے، قوم اور تہذیب کی اپنی ہی کہانیاں اور داستانیں ہیں جو بعد میں مذہبی رنگ اختیار کر کے مذہبی معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔ ظاہر ہے شروع میں یہ تمام داستانیں زبانی، کلامی اور سینہ در سینہ ہی چلتے رہے اور بعد میں وقت کی ضرورت کے تحت ان کو قلم بند کر لیا گیا جو آج ایک علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بن کے ہمارے سامنے موجود ہے اور یہی کلاسیکی ادب اور لوک ادب کا بھرپور حصہ ہے۔ اب داستان کا لغوی معنی و مفہوم جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

قاموس الاصطلاحات:

داستان: (ف۔ مو) قصہ۔ کہانی۔ حکایت۔ نقل۔ طویل قصہ۔ لمبی کہانی۔ (۲۰)

جامع اللغات:

داستان: (ف۔ مو) کہانی۔ حکایت۔ نقل۔ طویل قصہ۔ لمبی کہانی۔ قصے کہانیاں۔ (۲۱)

جامع نسیم اللغات:

داستان:(ف۔مو) قصے،روایات۔اگلے لوگوں کے قصے کہانیاں۔[۲۲]

لغات سے لغوی معنوں کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ مختلف انسائیکلوپیڈیاز، تنقیدی اور اصطلاحات کی مبنی کتابوں پر سے بھی تعریفیں یہاں نقل کی جائیں تا کہ داستان اور داستان گوئی کا مفہوم اور بھی واضح ہو سکے۔

ادبی اصطلاحات کا تعارف میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

"داستان کسی خیال اور مثال کی وہ کہانی ہے جو محبت، مہم جوئی اور سحر و طلسم جیسے غیر معمولی عناصر پر مشتمل اور مصنف کے آزاد اور زرخیز تخیل کی تخلیق ہو۔داستانوں میں مافوق الفطرت اشیاء،واقعات،مقامات اور کرداروں کی کثرت ہے،جادو کی چیزیں،جادو کے واقعات، طلسمی شہر طلسمی خزانے عام ہیں۔جن بھوت اور پری جیسی مخلوق سے اکثر واسطہ پڑتا ہے،علت اور معمول کا رشتہ قدم قدم پر ٹوٹتا ہے۔"[۲۳]

قومی انگریزی اردو لغت:

"Tale ,n.: قصہ؛ کہانی؛داستان؛ان واقعات کی سرگزشت جو ہو چکے ہوں یا جو خیالی طور پر واقع ہوئے ہوں؛ خیالی قصہ؛ مختصر کہانی، سچی یا جھوٹی؛خبر کا ٹکڑا جو گپ شپ سے عبارت ہو؛افواہ؛ جھوٹ؛بطلان؛افسانہ؛ کتھا؛من گھڑت۔"[۲۴]

پنگوئن ڈکشنری آف لٹریری ٹرمز اینڈ لٹریری تھئیری:

"Tale: A narrative written (in prose or verse) or spoken. When in prose, barely distinguishable from a short story. If there is a difference, then a tale perhaps suggests

something written in the tone of voice of someone speaking."(۲۵)

یہ بات سچ ہے کہ داستانوں کا تعلق دنیا کی مختلف تہذیبوں ثقافتوں اور اقوام کے ساتھ ساتھ مذاہب سے بھی ہے اور اسی لیے یہ انسانوں کے اجتماعی لاشعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسی لیے دنیا کے کسی بھی مذہب میں کسی نہ کسی طور یا کسی علائم و رموز کے ضمن میں داستان کا عکس ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ان کے مطالعے کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ داستانوں میں قوموں کے اجتماعی قوتِ متخیلہ اور شعور کی لے ملتی ہے۔ کلیم الدین احمد اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

" "قصے کہانیاں (داستانیں) اپنے فنی اور ادبی نقائص و حدود کے باوجود بھی ایسی چیزیں نہیں کہ انھیں یک قلم ناقابلِ اعتبار سمجھا جائے۔ ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں وہ م ختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیار ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کی ابتدائی نوخیز قوتِ پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی آئینہ میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن میں وہ قوم شروع میں دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی اور جذباتی قوتوں پر پُرزور محرکات کا کام کرتی تھیں۔ اسی آئینہ میں وہ سب باتیں نظر آتی ہیں، جن میں اسے یقینِ کامل تھا اور جنھیں وہ حقیقت اور جامعیت کا جامہ پہناتی تھی اور اسی آئینہ میں وہ مافوق العادت ہستیاں، واقعات، چیزیں، وہ وہم و گمان کے مرقعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں جنھیں وہ صحیح سمجھتی تھی۔ "(۲۶)

اسی خیال کو مدِ نظر رکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارے شعور کو اس بات کی ضرورت تھی کہ ہم اپنے بارے، ماحول اور ہونے نہ ہونے کی بابت معلوم کر سکیں تو اس لیے انسان نے انھیں سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی خاطر بہت سی کہانیاں اور داستانیں گھڑلیں۔ اس بارے میں کیرن آرم سٹرانگ کی رائے دیکھیے:

"لہٰذا داستانوں اور کہانیوں کا مقصد لوگوں کو پیچیدہ انسانی مخمصوں سے عہدہ بر آ ہونے اور دنیا میں اپنے مقام کے تعین اور اپنی صحیح پہچان میں مدد دینا ہوتا ہے۔ہم سب جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں لیکن چونکہ ہماری اول ترین ابتدا زمانۂ قبل از تاریخ کے دھندلکوں میں کھو چکی تھی،اس لیے ہم نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں داستانیں گھڑ لیں جو تاریخی ہستیاں نہیں تھیں،ان داستانوں نے ہمیں ہمارے ماحول ہمارے ہمسائیوں اور رسم و رواج سے متعلق ایک خاص طرزِ عمل اپنانے میں مدد بہم پہنچائی۔"(۲۷)

اس کے علاوہ آج کے جدید دور میں بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں تمثیلی حکایت یا داستان کی ضرورت نہیں رہی یا ہم اسے گھٹیا بھی نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ انسان اب ایک عقل و منطق کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ داستان گوئی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ تاریخ نویسی کی ابتدائی کوششوں کا حصہ ہے اور نہ ہی اس بات کا اعلان کیا کہ یہ کوئی معروضی حقیقت ہے۔(۲۸) اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ داستان ہماری کایا کو اسی وقت پلٹے گی جب ہم اس کی ہدایات پر عمل کریں گے۔ایک داستان یا دیومالا، دراصل ایک رہنما ہی ہوتی ہے۔یہ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیں ایک کامیاب و کامران زندگی گزارنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟(۲۹) داستانوں کے مطالعے اور اہمیت کے متعلق کیرم آرم سٹرانگ مزید لکھتی ہیں:

" دورِ جدید میں ہم نے داستان سے جتنی بے اعتنائی اور دوری اختیار کی ہے اس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔پرانے زمانے میں داستان یا دیومالا کو ایک ناگزیر ضرورت سمجھا جاتا تھا،اس سے لوگوں کو نہ صرف اپنی زندگی کے مفہوم سے آگاہی حاصل ہوتی تھی بلکہ اس سے انسانی ذہن کے ایسے گوشے بھی منکشف ہوتے تھے جو بصورتِ دیگر ہمیشہ ناقابلِ رسائی رہتے۔یہ دراصل اس دور کے علمِ نفسیات کی ایک شکل ہوتی تھی۔"(۳۰)

داستان کی جامعیت اور ہمہ گیریت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو یا پھر کوئی بھی کام ہو، عقیدہ، مذہب ہو یا فلسفہ، کوئی قانون ہو یا پھر عقلی دلائل پر مبنی صحیفہ یا پھر کوئی سائنس ہو، ادبِ عالیہ ہو یا پھر کسی معاشرے کا اجتماعی شعور ہر چیز کی کڑیاں جا کر داستان سے ہی ملتی ہیں۔ اس کی دلچسپی اور کشش کے بارے میں محمد کاظم نے عرب مردوں کی مثال دی ہے کہ جو کبھی صرف جنگوں اور لڑائیوں کا شیدا ہوا کرتا تھا اور رزمیہ شاعری و نثر کا دلدادہ تھا داستانوں کو سننے کے بعد میدانِ جنگ کے علاوہ بازاروں اور چوکوں میں بھی ملنے لگا اور محفلیں سجانے لگا:

"داستانوں اور کہانیوں کے سحر سے کون بچ سکا ہے؟ یہ کہانیاں جب عربوں کے کانوں تک پہنچیں تو انہیں ان کا اسلوب اور اندازز ایک بالکل انوکھی چیز لگی۔ چنانچہ انہیں کہانیوں کی بدولت عرب کے شہروں میں داستان گوئی کی ایک باقاعدہ روایت کا آغاز ہوا اور عرب کا وہ داستان گو جس کی ضرورت پہلے صرف جنگ کے مواقع پر کبھی کبھار پڑا کرتی تھی اور جو صرف افواج کے کیمپوں میں قدیم عرب سورماؤں کی بہادری کے متفرق واقعات سنا سنا کر لڑنے والوں کا خون گرمایا کرتا تھا، اب شہروں کے بازاروں اور چوکوں میں بھی محفل سجانے لگا۔"(۳۱)

داستانوں میں اہم عناصر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کے مطابق درج ذیل ہیں:

"مافوق الفطرت اشیاء، واقعات، کردار۔ جادو کی چیزیں۔ جادو کے واقعات۔ طلسمی شہر طلسمی خزانے۔ جن، بھوت اور پری جیسی مخلوق سے اکثر واسطہ۔ علت اور معلول میں عدم مطابقت۔ خیالی اور مثالی دنیا کا قیام۔ مبالغہ۔ طوالت کا اہتمام۔ شاعرانہ عدل وانصاف۔ تدبیر پر تقدیر کو غلبہ۔ تخیل کی جولانیاں۔ عصری معاشرت کی ترجمان۔ جنسی معاملات میں بے باکی۔ پندونصائح کا دفتر۔"(۳۲)

داستانوی افکار اور ادب کا تعلق بہت پرانا ہے اور اسی طرح اردو ادب اور داستان کا تعلق بھی بہت جاندار اور کامیاب ہے۔ داستان نے ہر دور میں انسان کو سوچنے سمجھنے اور نت نئے خیالات کے سات نئے نئے موضوعات بھی دیے ہیں۔ ایک عام انسان سے لے کر ایک معتبر انسان کا داستان کے ذریعے اپنے ماحول کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کو سمجھنا اور ان تک پہنچ کوئی معمولی بات نہیں۔

i. داستانوی افکار اور فکری انسلاکات

انتظار حسین اور خلیل جبران کے بارے میں اوپر لکھا جاچکا ہے کہ دونوں کو بچپن سے ہی مذہب سے واسطہ رہا اور اسی وجہ سے دونوں کہانی نویسوں کے ہاں کسی نہ کسی طرح سے مذہب اور مذہبی حوالوں کی بازگشت بار بار ملتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ جس شخص کو مذہب سے واسطہ ہوتا ہے اسے ضرور بالضرور داستان سے بھی واسطہ پڑتا ہے جس کو داستان کی مباحث میں تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ اس لیے دونوں کہانی کاروں کے ہاں داستان کے عناصر بھی ملتے ہیں جو ان کی فکر کے عکاس ہیں۔

انتظار حسین کی افسانہ نگاری کی ابتدا تو "قیوما کی دکان" افسانے سے ہوئی اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی طرح ان کی کہانیوں میں بھی ہجرت کے مسائل اور فسادات کے موضوع پائے جاتے تھے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں تو بچھڑی سرزمین کو ہی دریافت کرنے کی کوشش بار بار ملتی ہے۔ مگر ان کے تیسرے افسانوی مجموعے "آخری آدمی" نے سب کو چونکا دیا اور ان کے اندر موجود کربلا اور مہابھارت کا جو لاوہ پک رہا تھا وہ اس کتاب کی کہانیوں کی صورت میں باہر آگیا اور سب میں داستانوی افکار کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ جس کے بارے میں نذیر احمد اس طرح کہتے ہیں:

> "انتظار حسین کے شروع کے افسانے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے "آخری آدمی" میں ایک بہت بڑی تخلیقی چھلانگ لگائی ہے۔"(۳۳)

اسی افسانوی مجموعے سے انتظار حسین کا داستانوی افکار کے ساتھ مضبوط رشتہ بننا شروع ہوا اور تاعمر قائم رہا۔ انتظار حسین نے دو داستانوی افکار کے سلسلوں سے اپنا تعلق زیادہ استوار رکھا۔ اسلامی داستانوی افکاراور ہندی داستانوی افکار۔ اسلامی داستانوی افکار سے مراد صوفیا کے ملفوظات،لوک روایات کے ساتھ ساتھ آسمانی صحیفوں میں بیان ہونے والی روایات بھی ہیں۔ عام انسانی اوہام، شیعی عقائد میں غیاب اور ظہور کے ساتھ امام مہدی کے تصور، انسانوں اور داستانوں میں بیان رسم ورواج بھی شامل ہیں۔ انتظار حسین نے خود اپنی ذہنی فکر کے بارے میں ایک انٹرویو میں یوں کہا:

> ”خالص اسلامی تہذیب کی اصطلاح نہ اس وقت میری سمجھ میں آتی تھی اور نہ اب آتی ہے کیوں کہ میرا خیال ہے کہ اسلام جہاں جہاں بھی گیا ہے اس کا وہاں کی سرزمین سے، جغرافیہ سے، پرانی داستانوں اور حکایتوں سے میل رہا ہے جیسا کہ ایران میں ہوا اور جیسا کہ ہندوستان میں ہوا۔ تو یہ دو مثالیں تو ہمارے سامنے ہیں اور اگر کہیں ایسا نہیں ہوا تو میرے خیال میں وہاں اسلام کا تجربہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ یہ تجربہ وہیں کامیاب ہوا ہے جہاں اس سرزمین سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تو مجھے اسلام کی کامیاب شکلیں ایران اور ہندوستان میں نظر آتی ہیں۔“(۳۴)

انتظار حسین کے اپنے بیان سے پتا چلتا ہے کہ ان کا اسلامی تہذیب اور تمدن کے بارے میں کیا خیال تھا اور اسی کی بنیاد پر ان کی فکرِ رسا پروان چڑھی۔ اسی تہذیب کے تناظر میں ان کے افسانے سے ایک داستانوی فکر کا ٹکڑا دیکھیے:

> ”ماجوج نے اپنی اپنی زبانیں نکالیں اور سدِ سکندری کو چاٹنے کی بجائے عالمِ غیظ میں ایک دوسرے کو چاٹنے لگے،وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یاجوج ماجوج کے چاٹنے سے ماجوج، یاجوج انڈے کی مثال رہ گئے۔“(۳۵)

اسی افسانے کا ایک اور اقتباس دیکھیے:

"بوڑھے نے انھیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا" چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے، وہ سدِ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔"(۳۶)

اس کے علاوہ بھی انتظار حسین کے کئی افسانوں میں داستانوی عناصر ملتے ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے وہ یہ ہیں۔

"آخری آدمی، زرد کتا، کایا کلپ، سوئیاں (آخری آدمی)، شرم الحرم، کانا دجال، دوسرا گناہ، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، شہر افسوس، سیڑھیاں، دہلیز، کٹا ہوا ڈبہ (شہر افسوس)، کچھوے، رات، دیوار، خواب اور تقدیر، کشتی، پتے، واپس (کچھوے)، خیمے سے دور، انتظار نرناری، پورا گیان، برہمن بکرا، دسواں قدم (خیمے سے دور)، پچھتاوا، نرالا جانور، مشکند، بندر کہانی، طوطے مینا کی کہانی (خالی پنجرہ)، جبالا کا پوت (مکالمہ، کراچی، شمارہ ۱)، مورنامہ (مکالمہ، کراچی، شمارہ ۲)۔"(۳۷)

خلیل جبران کے ہاں بھی ایسی ہی داستانوی فکر کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی مذہبی علوم اور مذہب کا سایہ ہے کہ تمام عمر خلیل جبران بھی مذہب ہی کو پینٹ کرتا رہا، مذہب ہی کی تمثالیں شاعری میں پیش کرتا رہا اور اپنی کہانیوں میں بھی مذہبی داستانوی روایات اور مذہبی خیالات و فکر کو بیان کرتا رہا۔ خلیل جبران میرونی عیسائی تھا اور جس کی تربیت اس نے اپنی ماں اور مدرسے سے باقاعدہ حاصل کی تھی۔ اس کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی تشبیہات ہوتیں جن میں مذہبی استعارے اور داستانوی رنگ جانوروں کی کہانیوں کے انداز میں جھلکتا۔ جس کی وجہ خلیل جبران کا مدرسے میں عربی ادب کا خصوصیت سے مطالعہ تھا جس کے بارے میں حیدر جاوید لکھتے ہیں:

"۱۹۰۲ء میں وہ ایک بار پھر اپنے مادرِ وطن لبنان پہنچے جہاں انھوں نے "مدرستہ الحکمت" میں داخلہ لیا۔ "مدرستہ الحکمت" ۱۸۷۵ء میں ایک میرونی پادری یوسف الدبس نے

> قائم کیا تھا۔ یہاں داخلہ لینے کا مقصد عربی میں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل کرنا تھا۔ "مدرسۃ الحکمت" میں تعلیم نے ان کی فکری اٹھان میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس درسگاہ میں ان کے استاد فادر یوسف حداد تھے۔ فادر حداد کی رہنمائی میں انھوں نے " کلیلہ ودمنہ "، "مقدمہ ابنِ خلدون "، "المتنبی کی شاعری" کے علاوہ توریت کا بھی مطالعہ کیا۔ "مدرسۃ الحکمت" میں قیام کے دوران ہی انھوں نے فطری سائنس، مختلف اقوام کی تاریخ، رسوم، کردار اور اخلاقیات کا عمیق مطالعہ کیا۔ جو آگے چل کر ان کی فکری اٹھان میں معاون ثابت ہوا۔ "(۳۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ خلیل جبران کی فکر میں داستانوی رنگ "کلیلہ و دمنہ"، "توریت" کی روایات کی بدولت آیا ہو گا۔ بائبل اور مذہبی گیت و لوک داستانیں اس نے بچپن سے ہی اپنی والدہ سے سن رکھی تھیں (جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے)۔ اور دوسری اقوام کی تاریخ اور مقدمہ ابنِ خلدون پڑھنے سے واقعی میں خلیل جبران کے ہاں کہانیوں میں امثالی، داستانوی، حکائی اور تمثیلی رنگ پیدا ہوا۔

ii. داستانوی افکار کے اسلوب پر اثرات

انسان کے مطالعے اور فکر کا اثر اس کی باتوں اور عادتوں پر پڑتا ہے اور وہی انسان اگر ادیب یا شاعر ہو تو اس کی فکر اور سوچنے کا ڈھنگ اس کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی ادیب اور شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کے اسلوب کو بھی سمجھتے ہیں تاکہ پتا چل سکے کہ یہ ادیب دوسرے ادیبوں سے کس طرح مختلف ہیں اور ان کی تحریر کی پہچان کیا ہے۔ انتظار حسین نے مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، روایتوں، داستانوں اور قدیم متون کے مطالعے اور اپنی کہانیوں میں اس کے استعمال سے ایک کمال داستانوی اسلوب تیار کیا ہے جس کے بارے میں حامد رضا صدیقی کہتے ہیں:

> "انتظار حسین نے مختلف روایتوں، تہذیبوں، داستانوں، قدیم متون اور اساطیر کی مدد سے ہیئت، تکنیک اور اسلوب کی سطح پر جو نت نئے تجربے کیے ہیں ان تجربوں سے نہ صرف

اردو افسانوی ادب میں وسعت، گہرائی، تہہ داری اور تنوع پیدا کیا۔ بل کہ افسانوی ادب کو فنی وجمالیاتی اقدار سے سرفراز بھی کیا۔ ساتھ ہی افسانوی ادب کو فکر کی گہرائی، نفسیاتی اور فلسفیانہ جہات سے روشناس کرایا اور اسے نئی تخلیقی نہج عطا کی۔"[۳۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے انتظار حسین کے داستانوی اسلوب پر خوب روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انتظار حسین کے اسلوب نے اردو ادب اور خصوصی طور پر افسانوی ادب کو متاثر کیا ہے۔ اپنے افسانے " ہڈیوں کاڈھانچ" میں لکھتے ہیں:

"وہ شخص جو مر کر جی اٹھا تھا، بھوکا تھا۔ اس نے کھانا مانگا۔ مر کر جی اٹھنے کے بعد یہ ان پہلی خواہش تھی۔ جب سامنے کھانا آیا تو وہ اس طرح ٹوٹا جیسے صدیوں سے بھوکا چلا آتا ہے۔ کھاتے کھاتے اسے پسینہ آگیا اور دستر خوان خالی ہو گیا۔ شام کو اس نے اس سے بھی زیادہ کھایا اور دوسرے دن اسے پچھلے دن سے بھی زیادہ بھوک لگی۔ پھر وہ ہر وقت بھوکا رہنے لگا۔"[۴۰]

انتظار حسین کے پاس کئی داستانوی اسلوب کے شاہکار موجود ہیں۔ جن کو پڑھتے ہوئے آدمی کھو سا جاتا ہے اور اسلوب کو ایک نیا پن ملنے لگتا ہے۔

خلیل جبران کے اسلوب سے عربی ادب کو ایک نیا پن تو ملا ہی اور عربی ادب کے ساتھ ساتھ جبران نے انگلش ادب میں بھی اپنی یادگار کہانیاں چھوڑیں اور اپنے دلکش اسلوب سے آج بھی دنیا بھر کو متاثر کر رکھا ہے۔ اس کے اسلوب اور کہانیوں میں ایسا کمال ہے کہ آج بھی شیکسپئیر اور لاؤ تاز کے بعد دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا لکھاری ہے۔[۴۱] ڈاکٹر اشفاق ندوی جبران کی انھیں تشبیہات واستعارات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”آسان اور عام فہم زبان میں جبران نے اپنے افکار کو خلوص و محبت، پاکیزگیِ ذوق، احساس کی گہرائی اور تشبیہات کی جدت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی تحریر کوئی کہانی نہیں ایک حقیقت، زندگی کی سچی حقیقت بن جاتی ہے۔“(۴۲)

اس بات میں شک نہیں کہ خلیل جبران نے عربی ادب کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔ اپنی کہانیوں کے ذریعے اس نے عرب و عجم کو متاثر کیا۔ اس کی کہانیوں پر بھی روایات، اساطیر اور داستانوں کا اثر پڑا۔ جس کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے۔ عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبان روانی سے بولنے والے خلیل جبران نے تینوں زبانوں کا قدیم ادب اور ان کی داستانیں بھی پڑھیں اور جس بھی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اس میں اپنے خیالات کے نقوش ثبت کیے۔ اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ خلیل جبران کسی بھی زبان کے بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتے بل کہ ایک عام فہم اور سادہ سے انداز میں کہانی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی کہانی ”شاہ اردوس“ میں داستانوی انداز میں کہتے ہیں:

”ایک دفعہ اردوس کے زعما بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے، اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنی مملکت میں ایک ایسا فرمان جاری فرمائے جس کی رو سے رعایا کے لیے تمام قسم کی شرابیں اور دیگر منشیات ممنوع قرار دی جائیں۔“(۴۳)

ایک اور کہانی ”دل کی گہرائی“ میں دیکھیے:

”پہلے وہ ایک ابابیل اتنا تھا۔ پھر کوے جتنا اس کے بعد ایک شاہین کے برابر۔ اور پھر اتنا بڑا ہو گیا۔ جتنا کہ ابرِ بہار اور پھر اس نے ستاروں سے بھرپور آسمان کو ڈھانپ لیا۔“(۴۴)

خلیل جبران کی پیش کردہ امثال اور داستانوی کہانیاں جیتی جاگتی تصویریں لگتی ہیں اور ان کے اسلوب پر توریت اور انجیل کی روایات کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کا بھی اثر لگتا ہے۔ جبران کی کہانیاں تشبیہات، رموز، تلمیح اور استعارات کے رنگ میں تعلیماتِ مسیحی اور کلیلہ و دمنہ کے اسلوب سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتیں۔

د۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کی سوانح و تصانیف: اجمالی جائزہ

i. خلیل جبران

جبران خلیل جبران کے بارے عرب دنیا سے جو کتابیں شائع ہوتی رہیں ان میں خلیل جبران کے خاندان کے بارے لکھا ہے:

> "یہ خاندان سولہویں صدی میں ملکِ شام سے اٹھ کر شہر "بعلبک" میں آ گیا اور اس کے بعد لبنان کے ہی ایک گاؤں" بشعلہ" میں آباد ہو گیا۔ سترہویں صدی ۱۶۷۲ء میں کسی حادثے کے تحت ان کا سارا خاندان بکھر گیا اور یہ منتشر زندگی گزارنے لگے۔ اور ان کے خاندان کے دو آدمیوں ابورزہ بشعلانی اور ان کے بیٹے امیر یونس کو کسی سیاسی سزا کے طور پر طرابلس میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پھر یوسف اومان کے دونوں بھائیوں موسیٰ اور میخائیل نے لبنان کے مضافات میں واقع مقام بشاری (Bshrri) کو اپنی مستقل جائے پناہ بنا لیا۔"(۴۵)

خلیل جبران ۶ جنوری ۱۸۸۳ء کو یہیں لبنان کے دور افتادہ قصبے بشاری میں پیدا ہوا۔ مگر کچھ محققین نے خلیل جبران کی تاریخِ پیدائش کو ۶ دسمبر بتایا ہے جن میں سید بشیر ہندی اور ڈاکٹر اشفاق احمد بھی شامل ہیں:

> "اسی سرزمین (بشاری) پر ۶ دسمبر ۱۸۸۳ء میں جبران خلیل جبران نے آنکھ کھولی اور بچپن کا بیشتر حصہ یہیں کی آب و گل میں بسر کیا۔"(۴۶)

یہ قصبہ وادیِ قادسیہ کے ساتھ ہی ہے اور اس وادی کو خوبصورتی کی وجہ سے وادیِ مقدس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ایک ہموار قطعے پر آباد ہے۔ خلیل جبران کے سوتیلے بھائی بطرس نے اس کے لیے "عنتر" نام سوچا تھا مگر باپ نے خاندانی نام کی مناسبت سے اس کا نام خلیل جبران رکھا۔ عربی تصانیف میں خلیل جبران

کا پورا نام "جبران خلیل جبران" ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے مگر انگریزی کتابوں پر اس کا نام صرف خلیل جبران ہی لکھا جاتا ہے اور پوری دنیا میں اس نے اسی نام سے شہرت پائی۔

خلیل جبران کا والد ایک کٹر عیسائی ہونے کے باوجود ایک عیاش، قمار، بادہ نوش اور اکھڑ مزاج کا حامل شخص تھا۔ جس کا نام خلیل جبران تھا۔ جو قصبہ بشاری میں محصولات جمع کرنے کا کام کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کی بھی چند ایکڑ اراضی تھی اور اخروٹوں کا باغ بھی تھا۔ مگر اس کی والدہ نہایت شفیق، ہمدرد اور رحم دل خاتون تھی یوں کہو کہ ایک مثالی عورت تھی اور یہ قدامت پرست میرونی عیسائیوں کے پادری کی صاحبزادی تھی۔ جس کا نام پادری استفیان تھا۔ خلیل جبران کی والدہ کا نام کاملہ رحمت تھا اور یہ ایک راسخ العقیدہ عورت تھی۔ اس کی پہلی شادی اپنے چچازاد حنا عبدالسلام رحمت سے ہوئی جو برازیل میں وفات پا گیا تھا ۔جس کے بعد کاملہ کی دوسری شادی خلیل جبران کے والد سے ہوئی۔ اور کاملہ عیسائیوں کے اس قدیم فرقے کی ایک عبادت گاہ سینٹ سائمن کے گرجے میں نن بھی رہ چکی تھی۔ والدہ پر اپنی والدہ کے مذہبی عقائد کی گہری چھاپ تھی۔ چوں کہ والد کے سخت ہونے کی بنا پر یہ اپنی ماں کے زیادہ نزدیک تھا۔

خلیل جبران نے اپنے قصبے میں زندگی کی بارہ بہاریں گزاریں اور یہیں مدرسے میں عربی زبان کے ساتھ ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ خلیل جبران ایک زرخیز ذہن کا مالک تھا اس لیے عربی زبان وادب نے اس کے دماغ پر علم و معرفت کے دروازے کھول دیے۔ اسی وجہ سے خلیل جبران دوسرے بچوں سے مختلف تھا اور کھیل کود کے علاوہ سنجیدہ موضوعات میں دل چسپی لیتا تھا۔ اس تناظر میں ڈاکٹر اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> "یہ خداداد ذوقِ سلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ جب اس کے ہم عمر بچے اپنا وقت کھیل کود میں گزارتے وہ کتابوں کے مطالعہ میں غرق اور ان کو طرح طرح کی تصویروں سے آراستہ کیا کرتا تھا۔ تعلیمی مشاغل کے سوا اسے ہر چیز سے نفرت تھی۔ ناسمجھی اور معصومیت کے اس دور میں جب کہ بچہ کو خود اپنی ہی فکر نہیں رہتی۔ جبران ملکی اور دوسرے مختلف مسائل کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔"(۴۷)

۱۸۶۰ء کی دہائی میں لبنان کے اندر جو فرقہ وارانہ فساد پھیلے وہ پر تشدد ہنگاموں تک پہنچ گئے اور لبنان میں حصولِ روزگار کے مواقع محدود سے محدود ہوتے گئے جس کے تناظر میں بہت سے لبنانی خاندان مقدس وادی قادسیہ اور بشاری سے ہجرت کر کے یورپ اور امریکا میں جانے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں جب خلیل جبران کی عمر ابھی صرف ۱۲ سال تھی وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر امریکا منتقل ہو گیا۔ یہاں آکر خلیل جبران کی والدہ نے پھیری والوں کی طرح گھر گھر جا اپنا مال اور اشیا فروخت کیں اور اس کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی کا کام بھی کرتی رہی۔ بوسٹن کے کوئنسی سکول برائے طلبا میں خلیل جبران کا داخلہ ہوا تو اس سکول میں داخلے کے وقت ہی انھوں نے خلیل جبران کا نام مختصر کر کے خلیل جبران کر دیا۔ یہاں پر گزری غرب زدہ زندگی کے دو سال خلیل جبران ساری عمر نہ بھول سکا۔ یہاں بہ امرِ مجبوری خلیل جبران نے ماڈلنگ بھی کی مگر اسے بطورِ پیشہ نہ اپنایا۔ امریکا میں آکر بھی مہاجر لوگوں کے دلوں سے اپنے وطن سے محبت کا جذبہ ماند نہیں پڑا تھا۔

خلیل جبران یہاں بھی صرف پڑھائی کرتا تھا جس پر ایک دن ماں نے کہا کہ اپنے بھائی بطرس کی مدد کرنے کے لیے اس کی دکان پر جایا کرو جہاں وہ کپڑے کا کام کرتا تھا مگر خلیل جبران نے اسی وقت ماں کو کہا:

> "مصور کی ایک انگلی ہزار تاجروں کے برابر ہوتی ہے اور شاعری کا ایک ورق گوداموں میں بھرے تمام سامانوں سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔"(۴۸)

خلیل جبران نے اپنے وطن کی محبت اور عربی ادب میں گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لیے ایک بار پھر لبنان کا رخ کیا اور لبنان آکر "مدرستہ الحکمت" میں داخلہ لے لیا اور یہاں اسے فادر یوسف حداد جیسے قابل عالم فاضل استاد کی شاگردی حاصل ہوئی۔ اپنے اسی استاد کی زیرِ نگرانی خلیل جبران نے کلیلہ و دمنہ، مقدمہ ابنِ خلدون اور المتنبی جیسے عظیم شاعر کے ساتھ ساتھ فطری سائنس، مختلف اقوام کی تاریخ، رسوم و رواج، کردار اور اخلاقیات کا عمیق مطالعہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ اس نے عرب صوفیا، شعرا اور دوسرے مفکرین کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنے ذہن و قلب کو مزید منور کرنے کے لیے جہاں قدیم لبنانی علما کے کام سے واقفیت حاصل کی وہاں عیسائیت اور اسلام کا بھی مطالعہ کیا۔ پھر بدھ

مت، یہودیت، کنفیوشس، ہندومت اور دوسرے مذاہب کا بھی بطورِ خاص مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ مغربی مفکرین میں روسو، نطشے اور ایمرسن کے حقیقی ماخذوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ فلسفہِ محبت میں فرانسیسی ادیب فرانس مراش کا اتنا گہرائی سے مشاہدہ کیا کہ " دنیا محبت کے دم سے قائم ہے" کی فکر کے علمبردار بن گئے۔

ایک شاعر، ڈراما نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، مفکر ، فلسفی، مصور اور خداداد صلاحیتوں کا حامل خطیب، عربی ، انگریزی اور فرانسیسی روانی کے ساتھ بولنے والا جبران خلیل جبران اپنی علمی، ادبی، سیاسی، مہاجرانہ اور مصورانہ زندگی گزار کر ۱۰ اپریل، ۱۹۳۱ء کو نیویارک میں دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ جس کی آخری خواہش تھی کہ مجھے میرے ہی ملک لبنان میں دفن کیا جائے۔ جس کا اہتمام ان کی دوست میری ہیسکل نے کیا اور ۲۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو ان کا تابوت بحری جہاز پر رکھ کر لبنان کی طرف روانہ کیا گیا جو ۲۱ ،اگست ۱۹۳۱ء کو لبنان پہنچا جسے سرکاری طور پر وصول کر کے اسی شام میت کو ان کے آبائی گاؤں بشاری میں پہنچایا گیا۔ جہاں ۲۳، اگست ۱۹۳۱ء کو پاک اور مقدس صنوبروں کے سائے میں اسے دفن کر دیا گیا۔

تصانیف:

خلیل جبران نے چوں کہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں اپنا علمی سرمایہ چھوڑا ہے تو لہٰذا کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

۱. الموسیقی (۱۹۰۵ء)
۲. عرائس المروج (۱۹۰۶ء)
۳. الارواح المتمردہ (۱۹۰۸ء)
۴. الاجنحۃ المتکسرۃ (۱۹۱۲ء)

۵. دمعۃ وابتسامۃ (۱۹۱۴ء)

٦. المواکب (۱۹۱۹ء)

۷. العواصف (۱۹۲۰ء)

۸. البدائع والطرائف (۱۹۲۳ء)

انگریزی تصانیف:

1. Spirit Brides (1906)
2. Spirits Rebellious (1908)
3. A Tear and a Smile (1914)
4. The Madman (1918)
5. The Forerunner (1920)
6. The Prophet (1923)
7. Sand and Foam (1926)
8. Jesus The Son of Man (1928)
9. The Earth Gods (1931)
10. The Wanderer (1932)
11. The Garden of the Prophet (1933)

ii. انتظار حسین

انتظار حسین ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ کے پاس ایک ضلع بلند شہر کے گاؤں ڈبائی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منظر علی نہایت نیک، پارسا اور پاکباز شخص تھے اور اسی لیے نئی تعلیم خصوصاً انگریزی کو ناپسند کرتے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ صغریٰ بیگم بھی ایک پارسا خاتون تھیں۔ اسی لیے گھر میں مذہبی ماحول تھا۔ والد خود تو تجارت اور زراعت کا کام کرتے تھے مگر اپنے بیٹے کو مذہبی تعلیم دلوا کر واعظ بنانا چاہتے تھے۔

”میرے والد تعلیم کی جو قبا مجھے پہنانے کے درپے تھے اس کی وجہ سے یہ سوال اٹھنا ہی تھا، اصل میں میرے والد اپنے اسلامی مطالعے کے زور پر مولویوں سے بڑھ کر مولوی تو بن ہی چکے تھے سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ کسی بھلے وقت میں وہ شیعہ کانفرنس کی شروع کی ہوئی تحریک میں بھی سرگرم عمل رہے تھے۔ وہیں سے شاید یہ جذبہ لے کر واپس آئے کہ اپنے فرزند دلبند کو ابتدائی عربی پڑھا سکھا کر مدرستہ الواعظین میں داخل کرادیا جائے کہ وہاں سے عالم فاضل بن کر نکلے گا اور مجتہد بن جائے۔ تو ابھی میں تختی پہ ا،ب،ت لکھ رہا تھا اور بغدادی قاعدہ ختم کر چکا تھا کہ انھوں نے مجھے ایک ”الصرف“ نام کی کتاب پکڑا دی۔“(۴۹)

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انتظار حسین کے والد انھیں ایک عالم فاضل بنانا چاہتے تھے مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مگر ان کے خاندان میں صوفی بزرگ، فقیر درویش اور بڑے بڑے متقی ہو گزرے تھے جن کا صوفیانہ اور تقویٰ پر مبنی خون ان کی رگوں میں بھی دوڑ رہا تھا اپنے خاندانی پس منظر کے تناظر میں کہتے ہیں:

”میں بچپن میں سنتا رہا ہوں کہ ہمارے خاندان میں ہر نسل میں کوئی نہ کوئی بڑا فقیر درویش یا صوفی، جو آپ کہنا چاہیں، ہوتا رہا ہے۔ میرے ایک بزرگ تھے، میرے والد صاحب کے ماموں، جو بڑے عالم قسم کے آدمی تھے اور پورے علاقے میں ایک صوفی اور بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ جہاں تک میرے والد صاحب کا معاملہ ہے تو افسوس ہے کہ وہ اس روایت میں نہیں تھے۔ وہ کچھ واعظ اور مبلغ قسم کے آدمی تھے۔“(۵۰)

انتظار حسین نے ابتدائی تعلیم تو گھر ہی میں حاصل کی۔ رسمی تعلیم تو ان کے والد اور معاشرتی تقاضوں کے درمیان ایک کشمکش کی وجہ بن گئی۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ یہ مدرسے میں داخل ہو کر ایک واعظ بنے

مگر بڑی بہن اپنے بھائی کو نئے زمانے کی تعلیم دلوا کر کلیکٹر بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے اصرار کر کے بھائی کو اسکول میں داخل کروا دیا۔ اس طرح انتظار حسین کی رسمی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

"انتظار حسین نے ۱۹۴۲ء میں آرٹس کے مضامین کے ساتھ انٹر میڈیٹ اور ۱۹۴۴ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں میرٹھ کالج سے اردو میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔"(۵۱)

انتظار حسین نے افسانے سے پہلے لسانیات میں طبع آزمائی کی اور ایک کتاب فسادات سے پہلے مکمل بھی کر لی تھی مگر وہ فسادات کی وجہ سے ان کے پاس محفوظ نہ رہ سکی اور نہ ہی ان کے پاس کوئی اس کی نقل تھی اس کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی دلچسپی لسانیات سے ختم ہو گئی۔ تخلیقی دنیا میں آتے ہوئے پہلے شاعری بھی کی اور " ن۔م۔ راشد" کی "ماورا" سے متاثر ہو کر آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن جلد ہی شاعری چھوڑ افسانے کی طرف آ گئے۔

اپنا پہلا افسانہ " قیوما کی دکان" انھوں نے ۱۹۴۷ء میں لکھا جو دسمبر ۱۹۴۸ء کے "ادبِ لطیف" لاہور میں شائع ہوا۔ یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ حالانکہ اس دوران ہندوستان کے حالات بالکل ناساز تھے اور ہر طرف افراتفری کا علم تھا اور فسادات عروج پر تھے مگر مضافات میں ان کا اثر ذرا دیر سے پہنچا۔ اپنی افسانہ نگاری کے بارے کہتے ہیں:

"اردگرد یہ فضا دیکھ کر میں نے ایک روز قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گیا جب لکھ چکا تو میں نے اک اک کر کے اپنی تحریر کو پڑھا۔ ارے! یہ تو میں نے افسانہ لکھا ہے۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں ادب میں کہاں کہاں منھ مار رہا ہوں۔ میں اگر کچھ لکھ سکتا ہوں تو وہ افسانہ ہے۔"(۵۲)

یہیں سے انتظار حسین کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔

انتظار حسین کی زندگی میں اہم ترین موڑ ہجرتِ پاکستان تھی۔ ایک نو آزاد مملکت کی طرف ہجرت کوئی آسان کام نہ تھا۔ اپنے متعلق لکھتے ہیں:

"میرٹھ سے لاہور آنے کے لیے محرک بننے والے شخص محمد حسن عسکری تھے جنھوں نے لاہور آکر ریڈیو پاکستان، لاہور سے اعلانات کا سلسلہ شروع کیا اور پیغام بھیج کر یہاں آنے کی دعوت دی۔ بس! اسی دعوت کو قبول کر کے میں نئے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ عمل چاہے جتنا ہی مشکل تھا مگر اس کے نتائج بہت دور رس تھے۔"(۵۳)

پاکستان آکر انھوں نے ہفت روزہ "نظام" کے مدیر کے طور پر ملازمت اختیار کر لی اور اس کے بعد ان کا روزگار زیادہ تر صحافت سے ہی وابستہ رہا۔ انھوں نے مختلف اخبارات میں ملازمت کی جن میں:

روزنامہ "امروز"، لاہور بہ حیثیت سب ایڈیٹر، ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء۔

روزنامہ "آفاق"، لاہور بہ حیثیت سب ایڈیٹر اور کالم نگار، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۷ء۔

روزنامہ "مشرق"، لاہور بہ حیثیت کالم نگار، ۱۹۶۳ء تا ۱۹۸۸ء۔(۵۴)

اس کے علاوہ ماہنامہ "ادبِ لطیف" کی ادارت بھی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی اخبارات میں بھی کالم لکھتے رہے۔ جن میں Civil and Military Gazette، Frontier Post اور Dawn News شامل ہیں۔

انتظار حسین کا نام "بکر پرائز" (The Man Booker Prize) کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان، اسلام آباد نے آپ کو "کمالِ فن" ایوارڈ سے نوازا۔ حکومتِ پاکستان نے آپ کو "ستارۂ امتیاز" کے اعزاز سے نوازا۔

انتظار حسین ایک بھرپور ادبی و علمی زندگی گزارنے کے بعد ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو لاہور میں وفات پاگئے۔

تصانیف:

انتظار حسین نے افسانے، ناول، کالم (اردو، انگریزی)، ڈرامے، مضامین (تحقیقی و تنقیدی)، تراجم اور سفر نامے تحریر کیے۔ یہاں افسانوں اور ناولوں کی کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں:

افسانوی مجموعے:

١. گلی کوچے (١٩٥٢ء)
٢. کنکری (١٩٥٥ء)
٣. آخری آدمی (١٩٦٧ء)
٤. شہر افسوس (١٩٧٢ء)
٥. کچھوے (١٩٨١ء)
٦. خیمے سے دور (١٩٨٦ء)
٧. خالی پنجرہ (١٩٩٣ء)
٨. شہر زاد کے نام (٢٠٠٢ء)

ناول اور ناولٹ

١. چاند گہن (١٩٥٣ء)
٢. دن اور داستان (١٩٥٩ء)
٣. بستی (١٩٥٩ء)
٤. تذکرہ (١٩٨٧ء)
٥. آگے سمندر ہے (١٩٩٥ء)

پورے باب کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کسی بھی معاشرے کا بنیادی جزو ہے جس سے جہاں ایک عام آدمی تاثر لیتا ہے اس سے کہیں زیادا ایک ادیب اور شاعر مذہب سے متاثر ہوتا ہے اور انھیں وجوہات کی بناپر اس کی تحریروں اور تقریروں میں مذہبی رنگ آنا ایک فطرتی سی بات ہے۔ اس لیے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ادب اور مذہب کا بڑا گہرا تعلق ہے اور اس کو جدا نہیں کیا سکتا کیوں ادب اور مذہب دونوں ہی معاشرے کی اقدار کے اہم ارکان ہیں۔

جو ادیب، شاعر یا کوئی اور شخص مذہب، تہذیب اور ثقافت کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس بات سے بخوبی واقفیت حاصل کرتا ہے کہ مذہب کی اصل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے داستان اور روایات کی دنیا سے بھی واسطہ قائم کرنا پڑے گا۔ اس لیے ہر وہ ادیب یا شاعر جس کی شاعری یا کہانیوں میں مذہبی رنگ ہو اس کی کہانیوں میں داستانوی اور قصص کا رنگ بھی پایا جائے گا۔ داستانیں ہمیں قانون، مذہب، معاشرت، سائنس اور فلسفے کو صحیح معنوں میں سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ دنیا بھر کی تہذیبوں، ثقافتوں، مذہبوں اور معاشروں کی اپنی اپنی داستانیں ہیں جو باہم مل کر ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعے کا بھی در کھولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں ادیب عالمی سطح کے جانے اور مانے ہوئے ادیب ہیں۔ دونوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں مذاہب اور داستانوں کے علم سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ دونوں کے بچپن سے ہی مذہب نے انھیں اپنے حصار میں لے لیا اور مذہبی سوچ ان کی فکر پر مکمل طور پر غالب رہی۔ دونوں مہاجر ادیب تھے اور دونوں کو تمام عمر اپنے اپنے وطن کی یادیں ستاتی رہیں ایک لبنان کی وادیوں کو ترستا رہا اور اپنی کہانیوں میں پینٹ کرتا رہا اور دوسرا اپنی سرزمین بلند شہر اور گاؤں ڈبائی کو یاد کر کر روتا رہا اور اپنے لوگوں کو، اپنی جگہوں اور مناظر کو اپنی کہانیوں میں پینٹ کرتا رہا اور روتا رہا۔ دونوں ادیب ہی ایک طرح کے ناسٹلجیا کے شکار تھے۔

دونوں ادیبوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے افسانے، ناول اور مضامین سے مدد لی۔ خلیل جبران کے ہاں شاعری آخری عمر تک ساتھ چلتی ہے مگر انتظار حسین نے شروع میں شاعری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ دونوں کی کہانیاں ہی اپنے اپنے وقت کی نمائندہ اور اپنے اپنے ادب میں معتبر مقام کی حامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، تخلیقات بیگم روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۲

۲۔ وحید الزماں، مولانا، القاموس الوحید، ادارہِ اسلامیات پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۲۷

۳۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%B0%DB%81%D8%A8 ۲۳ مارچ، ۲۰۲۰ء 2:35pm,

۴۔ علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، ص ۱۳۲

۵۔ https://www.britannica.com/topic/religion ۲۳مارچ،۲۰۲۰ء, 7:55pm

۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،۱۹۹۱ء، ص ۱۰۲۷

۷۔ شوقؔ، منشی عبدالرحمٰن، قوم اور مذہب، پبلک بک ڈپو و مسلم ٹریکٹ ایجنسی،امر تسر، س ن، ص ۵

۸۔ T.S. Eliot, Religion and literature, in Faith that illuminates, V.A. Demant (ed.), Centenary Press, London, 1935, Page 39

۹۔ ابوالاعلیٰ مودودی،سید، اسلام پسند ادیب اور اسلامی ادب، مشمولا: اسلامی نظریہ ادب، سید اسعد گیلانی، اختر حجازی (مرتبین)، ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰-۱۹

۱۰۔ انتظار حسین، میری کہانی، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات (انتظار حسین نمبر)، شمارہ ۱۱۲-۱۱۱، جنوری تاجون، ۲۰۱۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۲۔ رضاؔ، محمد ارسلان، کچھ انتظار حسین کے بارے میں، مشمولہ: انتظار حسین کہانی اور تفہیم، محمد ارسلان رضاؔ، ثنا طارق، دلاور عباس (مرتبین)، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴

۱۳۔ Homam Altabaa and Adham Hamawiya, The Life and Works of Kahlil Gibran: A Critical Review, ASIATIC, VOLUME 13, NUMBER 1, JUNE 2019, International Islamic University Malaysia

۱۴۔ حیدر جاوید سید، خلیل جبران ایک تعارف، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴

۱۵۔ انتظار حسین، میری کہانی، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات (انتظار حسین نمبر)، شمارہ ۱۱۲-۱۱۱، جنوری تاجون، ۲۰۱۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۵

۱۶۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷۵

۱۷۔ کلیاتِ خلیل جبران، مترجم: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۶

۱۸۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۷-۱۲۶

۱۹۔ غوث انصاری، ہمارے آس پاس، راج محل پبلشرز، جموں کشمیر، ۱۹۴۵ء، ص ۵۰

۲۰۔ منہاج الدین، پروفیسر شیخ، قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۴۹۸

۲۱۔ عبد المجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد اول)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۲

۲۲۔ قائم رضا نسیم امروہوی، سید، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید (مرتبین)، نسیم اللغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۳۷

۲۳۔ حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۴

۲۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۳۳

۲۵۔ Cuddon , J.A. The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory. London: Penguin books, 1992, P:899.

۲۶۔ کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فنِ داستان گوئی، ادارہ فروغِ اردو، لکھنو، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲-۱۳

۲۷۔ کیرن آرم سٹرانگ، داستان کی مختصر تاریخ (مترجم: محمد یحییٰ خان)، نگارشات، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۔ ۱۲

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۵

۳۱۔ محمد کاظم، عربی ادب میں مطالعے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸

۳۲۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، ص ۲۲۴-۲۲۵

۳۳۔ نذیر احمد، انتظار حسین کے افسانے: ایک مطالعہ، مشمولہ: انتظار حسین ایک دبستان، مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۹۱

۳۴۔ الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۸

۳۵۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۹۶

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۹۶

۳۷۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، ص ۱۶۵

۳۸۔ حیدر جاوید سید، خلیل جبران ایک تعارف، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷

۳۹۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، نگران: محمد اقبال حسین صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۶

۴۰۔ انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۴۰۴

۴۱۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Kahlil_Gibran ۲۶ مارچ، ۲۰۲۰ء، 9:05pm

۴۲۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۳-۱۲۲

۴۳۔ کلیاتِ خلیل جبران، مترجم: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۰۴

۴۴۔ کلیاتِ خلیل جبران، مترجم: حیدر جاوید سید، ص ۴۰۵

۴۵۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، ص ۲۹

۴۶۔ بعض محققین اور نقادوں نے خلیل جبران کی پیدائش کی تاریخ ۶ دسمبر لکھی ہے جن میں بڑے معتبر محقق جنھیں فنا فی الجبران بھی کہا جاتا ہے، سید بشیر ہندی بھی شامل ہیں۔(دیکھیے کتاب؛"جبران: سوانح عمری" از سید بشیر ہندی، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۱۲)، اس کے علاوہ ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی جنھوں نے خلیل جبران پر ہی پی۔ایچ۔ڈی کا عربی ادب کے تناظر میں مقالہ لکھا تھا۔(دیکھیے کتاب: "جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت"، از ڈاکٹر اشفاق احمد ندوی، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۲۹)۔ کیوں کہ خلیل جبران نے بھی اپنی تاریخِ پیدائش ۶ جنوری کو ہی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاریخِ پیدائش اس لیے بھی مستند مانی جاتی ہے کہ اس تاریخ کو امریکا کی یونیورسٹی آف میری لینڈ میں قائم خلیل جبران ریسرچ اینڈ سٹڈیز پروجیکٹ کی سند بھی حاصل ہے۔ لٰہذا پوری دنیا میں اب جبران کی متفقہ طور پر تاریخِ پیدائش ۶ جنوری مانی جاتی ہے اور وکی پیڈیا پر بھی ۶ جنوری ہے اس لیے میں نے اسے ہی مناسب سمجھا ہے۔https://en.wikipedia.org/wiki/Kahlil_Gibran

۴۷۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، ص ۳۳

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۱

۴۹۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار (انتظار حسین)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳

۵۰۔ انتظار حسین، میری کہانی، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات (انتظار حسین نمبر)، شمارہ ۱۱۲-۱۱۱، جنوری تا جون، ۲۰۱۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۱۵

۵۱۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار (انتظار حسین)، ص ۱۴

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۵۳۔ انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۵۹

۵۴۔ آصف فرخی،ڈاکٹر،چراغِ شبِ افسانہ:انتظار حسین کا جہانِ فن،،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۲۹

باب دوم:

خلیل جبران اور انتظار حسین کے مذہبی افکار کے فنکارانہ اظہار میں تصورِ حیات کا تقابل

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں تصورِ حیات کا مطالعہ:۔

خلیل جبران کے افسانوں میں مذہبی افکار میں تصورِ حیات کا جائزہ لینے سے پہلے خلیل جبران کے اس مذہبی تصورِ حیات کی بابت جاننا بھی ضروری ہے۔ قومیں، معاشرے اور ان کے سربراہ جب عروج کی بلندیوں کو چھوتے ہیں تو ان میں عیش و عشرت کی عادت آجاتی ہے۔اسی عیش و عشرت میں کھو کر سربراہ اپنی عوام سے

بالکل غافل ہو جاتے ہیں تو عوام کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوتا اور جو کوئی سربراہ سے عوام کے حق کی بات کرے تو اسے سرِ عام سزا دے کر عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ مگر فطرت کے تقاضے ہیں کہ ہر فرعون کے لیے موسیٰ کا جنم ہوتا ہی رہا ہے اور ایسا ہوتا بھی رہے گا۔ یہی وہ شخص ہوتا ہے جو قوم کو اشرافیہ کی رائج کردہ غلط رسومات سے آگاہ کرتا ہے اور انھیں بھٹکے ہوئے راستے سے دوبارہ صراطِ مستقیم پر لے کر آتے ہیں۔ ماحول میں پیدا کردہ گھٹن زدہ اور خود ساختہ قوانین کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں۔ جن سے معاشرہ بالکل تعفن زدہ اور بدبودار ہو چکا ہوتا ہے۔ تو ہی ایسا مصلح پیدا ہوتا ہے جو اپنی غیر مرئی لیکن بھرپور طاقتوں سے وقت کے فرعونوں کی نام نہاد شان و شوکت پر ایسی ضرب لگاتا ہے جس کی شدت سے وہ تڑپ تڑپ اٹھتا ہے اور ان کا سارا غرور و تکبر پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔

ایسے میں لوگوں کا طرزِ حیات اور تصورِ حیات بالکل بدل جاتا ہے۔ لوگ اپنا اصل مقصدِ زندگی بھول جاتے ہیں، لوگ اپنے وجود تک کو سمجھ نہیں سکتے اور اپنی اصلیت اور وجود کو صحیح استعمال میں نہیں لاتے اور خرافات میں پڑ کر اپنی عظمتِ انسانی کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اس طرح انسان معاشرے میں اپنا کردار صحیح طریقے سے ادا نہیں کر پاتے اور زمانہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔

اس معاشرے میں نیک لوگ بھی ہوتے ہیں، شاعر، ادیب بھی ہوتے ہیں، مصلح اور بڑے بڑے عالمِ دین اور مذہب کے ٹھیکیدار بھی ہوتے ہیں۔ مگر سب کے سب اپنے فرائض بھول کر زمانے کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ اس لیے معاشرہ گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ خلیل جبران نے جس ماحول میں جنم لیا وہ بھی ایسی ہی گراوٹ کا شکار تھا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کے نصف آخر میں حسین و جمیل لبنان ایسے ہی درندوں کے جبڑوں میں جکڑا ہوا تھا اور سرزمینِ لبنان کی خوب صورت وادیاں ایسے ہی ننگِ انسانیت اور درندہ صفت شیطانوں کے سائے میں سسکیاں بھر رہی تھی، اسی تڑپتے، سسکتے اور

گھٹے ہوئے ماحول میں جبران خلیل جبران نے سانس لی اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرق و مغرب کی لامحدود وسعتوں پر چھا گیا۔"(۱)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جبران کا عہد ہر لحاظ سے ایک انتشار ،بد امنی، مذہبی پیشواؤں کی بد کرداری، اقتصادی زوال کے ساتھ ساتھ معاشرتی گراوٹ کا عہد تھا۔ جب ہر طرف ناانصافی اور اخلاقی پیچ پن کا دوردورہ تھا۔ لوگ جہاں اپنے آپ سے ناآشنا ہو چکے تھے وہیں معاشرے میں اپنے کردار سے بھی نابلد تھے۔ لوگ اپنے شخصی اوصاف تک بھول چکے۔ اسی لیے جبران اپنے ماحول کی پیداوار تھا اور مستزاد اس پر یہ کہ اسے گھر میں والد سے پیار نہ ملا اور ماں کی قربت نے اسے مذہب کے قریب کر دیا جس سے چھوٹی عمر میں اس نے عدل وانصاف اور اخلاقیات کے دروس پڑھے اور گیت سنے ۔ مگر معاشرے میں یہ ساری چیزیں ندارد۔ اس لیے ذہنِ جبران میں معاشرے کا درد پنپنے لگا۔ جس کی جھلک اس کی ساری کہانیوں اور شاعری میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جن میں تصورِ حیات بہت نمایاں ہے یہاں ان کہانیوں کا تجزیہ پیش کیا جائے گا جن میں تصورِ حیات کی عکاسی کی گئی ہے جس کو سمجھنے کے لیے ہم اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے دیکھتے ہیں۔

i. انسان کا وجود

انسان صرف ترقی یافتہ حیوان نہیں ہے بل کہ اس کی بناوٹ، ساخت اور عقل سے لگتا ہے کہ یہ کسی ارفع و اعلا کام کے لیے دنیا میں آیا ہو گا۔ شاید اسی لیے مذہبی نکتہ نظر سچ لگتا ہے کہ خدا نے اسے اپنی شناخت اور پہچان کے لیے دنیا میں بھیجا اور اپنے نائب ہونے کا لقب دیا۔ یعنی یہ کسی ادنا کام کے لیے دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ مگر دنیا میں آ کے انسان مادیت پرستی میں کھو گیا اور روحانیت و معرفت سے کوسوں دور ہو گیا۔ جس کے تناظر میں نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

"انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اخلاقی حس اور خیر و شر کی تمیز کا ارتقا کر کے اسے اس کے خالق نے اپنی خلافت و نیابت کے لیے مامور کر دیا ہے۔ اب اس کا مقصدِ وجود ربِ کائنات اور رب الناس کی رضا کے مطابق زندگی کی تعمیر کرنا ہے اور یہ اس کے لیے پوری طرح ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔"(۲)

اس اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے وجود کا مقصد دنیا میں خدا کی نیابت ہے تو اس کے لیے معاشرے میں اپنا تعمیری کردار ادا کرنا چاہیے۔ انسانی جود کتنا قیمتی اور کتنے بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اس کے لیے جبران ایک افسانہ "پروانہ سے" سے لکھ کر ہمیں تمثیلی انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کتنا چھوٹا اور عام سا کیڑا ہے مگر اس نے اپنے وجود کا کتنا اچھا استعمال کیا ہے، جب دنیا کی ہر چیز محوِ خواب و استراحت ہوتی ہے تب بھی وہ اپنے مقصدِ حیات کے گرد طواف کرتا رہتا ہے اور اپنا فرضِ منصبی نہیں بھولتا کیوں کہ یہ ایک عزمِ آہنی لے کر پیدا ہوا ہے اگرچہ اس کی زندگی نہایت مختصر اور تھوڑی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"ننھے سرفروش! اس بے قراری سے شمع کا طواف کیوں کر رہا ہے مطلوب کے قریب پہنچ کر بھی اتنی بے چینی اس قدر آہ وزاری۔۔۔۔۔ لیکن تیری یہ شب بیداری کیسی؟ تُو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں۔۔۔۔۔۔ اللہ اللہ! یہ وارفتگی کہ دہر میں دم بھر کا قیام بھی بارِ خاطر ہے۔ دل صد پارہ میں اک عزمِ آہنی ہے اور روح کی گہرائیوں میں ملکوتی درخشانی۔ کتنی مختصر ہے تیری زندگی لیکن کس قدر شاعرانہ اور بعید از وسعتِ خیال۔"(۳)

پروانے کی زندگی اگرچہ مختصر ہے مگر جبران کے نزدیک اس نے اپنے وجود کی عظمت کو سمجھا ہے اس لیے وہ مختصر ہوتے ہوئے بھی ایک عظیم وجود کا حامل کردار ہے۔ اس نے اپنی عظمت کو سمجھا اور خود کو جاوداں کر لیا۔ اسی طرح جو انسان بھی اپنے وجود کی حقیقت کو سمجھ جاتا ہے وہ دنیا میں ضرور ایسے اعمال کرتا ہے کہ

رہتی دنیا تک اس کا نام زندہ رہ جاتا ہے۔ پھر وہ مختصر ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ رفعت اور بعید از خیال ہو جاتا ہے۔

جبران نے اپنے اس افسانے میں ایک تمثیلی انداز اپنا کر ہمیں وجود کی عظمت کو سمجھنے کی تلقین کی ہے۔

جبران کا اپنے ایک اور افسانے میں انسان کو وجود کی عظمت سمجھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ افسانہ "شرابِ کہنہ" میں اس نے ایک ایسے امیر کا کردار پیش کیا ہے جس کے پاس دنیا کی نایاب، قیمتی اور پُر لطف شراب موجود ہے۔ مگر وہ یہ شراب کسی بڑے آدمی، خاص مہمان یا پھر سب سے سمجھدار آدمی کو پیش کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس شراب کو پیتے ہی اس امیر آدمی کو داد وستائش سے نوازے اور اس شراب کی جی کھول کر تعریف بیان کرے، مگر ہوتا کیا ہے کہ شہر کا سب سے بڑا پادری اس کے گھر مہمان آتا ہے مگر وہ یہ قیمتی شراب اس کے سامنے پیش نہیں کرتا کہ یہ پادری اس شراب کی عظمت سے ناواقف ہے، پھر اپنے بھتیجے کی شادی پر آنے والے تمام معزز مہمانوں کو بھی وہ اس وہ اس قابل نہیں سمجھتا، حتیٰ کہ اس ملک کا شہزادہ بھی اس کے یاں مہمان بن کر آیا مگر اس نے وہ قیمتی شرابِ کہنہ پیش نہ کی کہ شہزادے کو اس شراب کی عظمت اور قدر کا اندازہ نہیں۔ خیر! ایک دن وہ بوڑھا امیر آدمی مر گیا تو اس کے سرد خانے سے عام شراب کے مٹکوں کے ساتھ وہ قیمتی "شرابِ کہنہ" بھی لائی گئی جسے نواح کے دیہاتیوں اور کم عقل، ان پڑھ جاہلوں نے آپس میں بانٹ کر رات بھر جام بھر بھر پیا۔ جن کے نزدیک وہ صرف شراب تھی۔ اقتباس دیکھیے:

> "ایک امیر آدمی کو اپنے سرد خانے اور اپنی پرانی شراب پر بڑا ناز تھا۔ اس کے پاس پرانی شراب کا ایک بہت بڑا خزانہ تھا جو کسی خاص تقریب کے لیے جس کا صرف اسے ہی علم تھا۔ سرد آب میں مدتوں سے رکھا تھا۔

شہر کا حاکم اس کے پاس آیا۔۔۔۔۔کلیسا کا بر اپادریاس کی ملاقات کو آیا۔۔۔۔۔اس ملک کا شہزادہ اس کے یہاں کھانے پر آیا۔۔۔۔۔یہاں تک کہ اپنے بھتیجے کی شادی پر جہاں بڑے بڑے رئیس وامر امدعو تھے۔اس نے اپنے آپ سے صرف یہی کہا۔

"نہیں، ان مہمانوں کے لیے ہر گز میں اپنی پرانی شراب کا پیمانہ نہیں کھول سکتا۔""(۴)

یہ کہانی ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے وجود کو کسی دوسرے کے کام میں نہیں لاتے اور اپنے آپ کو زمانے سے جدا سمجھتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ آج اگر وہ کسی کے کام آئیں گے اور اپنے وجود کو لوگوں کے لیے استعمال کریں گے تو کل کو ان کے چاہنے والے بھی اچھے سمجھ دار اور نیک لوگ ہوں گے۔ہمارے ہاں ایسے بہت سے لوگوں ہوتے ہیں جو اپنے وجود سے لوگوں کو بہت حقیر اور کم تر سمجھتے ہیں۔جس سے ان کی زندگی میں کسی کی اہمیت نہیں رہتی نہ وہ کسی کی مدد کرتے ہیں اور نہ کسی کو اپنی مدد کے قابل سمجھتے ہیں۔جس سے معاشرے کے اندر بہت بڑا خلا اور اونچ نیچ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔مگر افسانے کی رو سے ایسے لوگوں کا انجام نہایت مفلسی اور گھٹیا حالت میں ہوتا ہے اور ایسے مواقع پر ان لوگوں کا خاتمہ ہوتا ہے جب ان کا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

جبران کے ہاں تمثیلی اور امثالی انداز کے افسانے کئی کہانیوں اور اسلوب میں ملتے ہیں اور ہر کہانی میں تشبیہیں، رمزیت اور استعارے دوسری کہانیوں سے مختلف اور ایک خاص انداز میں پائے جاتے ہیں جو پڑھنے والوں کو جہاں مسحور و مسرور کرتے ہیں وہاں وہ ایک نیا جہانِ معنی بھی پیدا کرتے ہیں۔جبران کے اسلوب کی اسی رمزی کیفیت کے بارے ہی ڈاکٹر اشفاق احمد لکھتے ہیں:

"جدید عربی ادب میں رومانی تخیل آمیز رمزیت سب سے پہلے جبران کی تحریروں میں ظاہر ہوئی۔جبران کے اس اسلوب سے صرف مہجری ادبا ہی نہیں بلکہ مشرقی ادبا، شمالی افریقہ اور خاص طور پر تیونس کے بہت سے اہلِ قلم متاثر ہوئے۔نامناسب نہ ہو گا اگر کہا جائے کہ رمزی طرزِ نگارش جبران کا ایک اپنا نظریہ فکر ہے۔"(۵)

اس اقتباس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ جبران کے ہاں رمزی و کنائے پر مبنی اپنا ایک خاص اسلوب ہے اور جبران اسی اسلوب کو ایک خاص تکنیک اور ہئیت سے برت کر نت نئے مضامین باندھتے نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک خاص رنگ اور آہنگ کے تحت جبران نے کہانی "گل خزاں رسیدہ" لکھی۔ جس میں جبران ایک پھول کے کردار کے ذریعے ایک خاص رمز میں انسان کو اپنے وجود کی حقیقت بتاتے ہیں اور اسے سمجھاتے ہیں کہ انسانی زندگی واقعی میں جتنی بھی حسین ہو جائے مگر اسے ہر لمحے موت کا خدشہ تو رہنا ہے اور دوسرا وہ اس کہانی میں انسان کو اپنے وجود کی بے ثباتی کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بے کار، ناکارہ اور مردہ سمجھنے سے بھی باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جتنی بھی زندگی ہے اپنے وجود کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے خوشی خوشی گزارنی چاہیے اور خوشی تو لوگوں کی سیوا اور خدمت میں ہی ملے گی۔ کہانی میں لکھتے ہیں:

> "آج سے ایک روز پہلے وہ اس چمن کا حسین ترین غنچہ تھا۔ بھونرے اس کے گرد بیتابی سے طواف کرتے اور آفتابی کرنیں بار بار اپنی رفاقت کا احساس دلاتیں۔
>
> اس کا ننھا سا قلب صد چاک تھا اور روح فضاؤں میں آوارہ۔
>
> "میری ہستی بے کار ہے۔ غنچہ ہائے نو دمیدہ میں مجھ مردہ کا کیا کام۔" اس نے رنجیدگی سے اک جھرجھری لیتے ہوئے کہا اور ہوا کا شوریدہ جھونکا اس کی باقی پتیوں کو بھی اڑا لے گیا۔"(۶)

خود کے وجود کو بے کار اور مردہ نہیں سمجھنا چاہیے نہیں تو آنے والے حالات آپ کو اور بھی مایوس اور تباہ کر سکتے ہیں۔ جیسے پھول کو ہوا کے جھونکے نے مزید تباہ کر دیا۔ کیوں کہ وہ خود کو بے کار اور مردہ سمجھتا تھا۔

جبران نے انسانی زندگی کے وجود میں آنے اور وجود میں آنے کے بعد جو تصورِ حیات بیان کیا ہے اس کی مکمل تصویر کشی اور خاکہ ان کے افسانے "انسان کی تکمیل" میں ملتا ہے۔ اپنے اس افسانے میں جبران نے پہلے روح کا ذکر کیا ہے کہ وہ خدا کی ذات سے علیٰحدہ کی گئی اور پھر خدا اسے حسن و جمال عطا کیا۔ غمِ دیروز اور غمِ

فردا بھلانے کے لیے عشرت کا جام اور زندگی کی مسرتوں کو سمجھنے کے لیے غم جیسی سوغات عطا کی۔ پھر آسمانی علم دے کر اسے بصیرت سے نوازا گیا۔ تمنا کا لباس، حیرت کی تاریکی اور پھر نور کا سایہ عطا کیا۔ قہر و غضب کی بھٹی سے آگ، جہالت کے صحراؤں سے ہوا، اپنائیت کے ساحلِ سمندر سے ریگ اور زمانے کے قدموں سے مٹی لے کر انسان کو مکمل کیا۔

پھر زندگی پیدا کر کے اسے موت کا سایہ بھی ساتھ میں دیا۔ اور آخر میں خدا نے ہنس اور رو کر ان دونوں کو آپس میں ملا دیا:

> "خداؤں کا خدا پہلے ہنسا۔ پھر رو دیا، اس نے محبت کا بے پایاں جذبہ محسوس کیا پھر انسان اور اس کی روح کو آپس میں ملا دیا۔"(۷)

اس افسانے میں انسان کے بننے کے مراحل انسان کو زندگی میں درپیش مسائل سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ ایک مکمل بیانیہ افسانہ ہے۔ جس میں خوشیوں اور غموں کے ساتھ ساتھ انسانی دوسرے مراحل کا بھی ذکر حسین پیرائے میں ملتا ہے اور یہی جبران کا تصورِ حیات ہے جس میں ہمیشہ غم کی پرچھائی بھی انسان پہ منڈلاتی رہتی ہے اور عشرت کدوں کی رونق بھی اس کے لیے کھلی رہتی ہے۔ آسمانی علمِ لدنی بھی اسے عطا ہوتا ہے جہالت کے اندھیرے بھی۔ یہ مٹی بھی ہے اور آگ، ہوا اور پانی بھی۔ اب یہ سارے مراحل علامتی ہیں یہ جیسا چاہے اپنا انتخاب کر لے۔ اور زندگی کو نبھاتا رہے۔

جبران کے ہاں انسانی وجود اور انسانی زندگی کی اہمیت و مرتبے پر بڑے اچھے اچھے خیالات اور کہانیاں ملتی ہیں جسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ایک فنکار اپنے فن سے مرجھائے ہوئے پھولوں پر تازہ شبنم کے چھینٹے چھینک رہا ہے کہ اسے پھر سے زندگی سے روشناس کروا دے۔ اسی طرح جبران کے ہاں زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جھوم کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور ایسی باتوں سے باتیں اختراع کرتا ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ جیسے اندھیرے کے اندر سے کوئی روشنی کی کرن نکال لائے۔

ایسی ہی جبران کی ایک کہانی ”آتشیں حروف“ ہے، جس میں اس نے بڑے ہی خوش آئند اسلوب کے ساتھ زندگی کو بامعنی ثابت کیا ہے اور ہمارا وجود ہمارے ساتھ ساتھ زمانے کے لیے بھی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اس کہانی میں زندگی کو مختلف زاویوں سے پیش کر کے اس کی عظمت کے گن گائے گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

”کیا انسان اسی طرح رہے گا؟ اس بلبلے کی مثال، جو تھوڑی دیر کے لیے سطح سمندر پر نمودار ہوتا ہے، لیکن جب ہوا کے جھونکے آتے ہیں، تو پھوٹ جاتا ہے۔ گویا کبھی تھا ہی نہیں!

نہیں! اپنی زندگی کی قسم! کبھی نہیں! زندگی کی حقیقت زندگی ہے، وہ زندگی، جس کا آغاز رحمِ مادر سے ہوتا ہے، نہ خاتمہ قبر میں۔“(۸)

اس افسانے کے آخر پہ بڑے ہی خوبصورت انداز میں دنیا میں محنت و مشقت کرنے والوں کے لیے جبران لکھتا ہے کہ محنتی لوگوں کا نام ہمیشہ کے لیے دنیا میں رقم ہو جاتا ہے چاہے وہ دنیا سے چلے بھی جائیں اور یہ وجود مرنے کے بعد بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔ اگر اس وجود نے زندگی میں کچھ کیا ہو۔ شاعر کیٹس کی مثال دیتے ہو مصنف نے ہمیں علامتی طور پر سمجھایا ہے اور کیٹس کے بارے یوں رقم طراز ہیں:

”جان کیٹس۔۔۔۔ وہ بلبلِ خوش نوا، اگر یہ جانتا کہ اس کے نغمے انسان کے دل میں ہمیشہ محبت، حسن و جمال سے محبت کی روح پھونکتے رہیں گے، تو کہتا:

”میری قبر پر کندہ کر دو:

یہاں اس شخص کی ہڈیاں ہیں، جس کا نام آسمان پر آتشیں حروف سے لکھا گیا ہے۔“““(۹)

دنیا میں اسی کا وجود باقی و پایندہ رہے گا جو محنت کرے گا اور اپنے وجود سے دوسروں کو فائدہ بہم پہنچائے گا۔

جبران انسانی وجود کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے اور اس کے بہتر سے بہترین استعمال کے لیے طرح طرح کی کہانیاں گھڑتا اور اپنے معاشرے کے مسائل سے ہمیں سمجھاتا اور ہمارے واجود کو ہمارے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے فائدہ مند بنانے کی عمر بھر کوشش کرتا رہا۔ جس کے کیے اس کے اسلوب میں سختی، درشتی، تخاطبِ اہانت آمیزی، طنز کے نشتر اور انتہا پسندانہ خیالات نے جنم لیا۔

ایسی ہی ایک کہانی ”قیدی بادشاہ“ ہے۔ یہ اپنی طرز کی منفرد اور دلچسپ کہانی ہے جس میں مصنف نے خود کو ایک شاعر کے طور پر استعمال کیا ہے اور دوسرا کردار بادشاہ ہے جو کسی جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید ہے۔ ساری کہانی بادشاہ اور مصنف شاعر کے درمیان مکالمہ ہے مگر کہیں بھی بادشاہ کی طرف سے ایک بھی جملہ سننے کو نہیں ملتا۔ بلکہ بادشاہ صرف باتیں سن رہا ہے اور شاعر بادشاہ سے صرف تسلیوں کے انداز میں باتیں کر رہا ہے۔ کیوں کہ بادشاہ کو تخت سے اتار کر جیل میں ڈال دیا گیا ہے اور ساتھ میں شاعر بھی ہے۔ تو اس لیے شاعر بادشاہ کو تسلیاں دیتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ ہم کو قید کرنے والے اپنے وجود کی عظمت سے غافل ہیں اور انھوں نے آپ کو کثرتِ تعداد کی وجہ سے قید کر لیا ہے نہ کہ بلند حوصلوں کی بنا پر۔ ان لوگوں کے وجود انھیں کے لے بوجھ اور ان کے سر انھیں کے کندھوں پر ایک اذیت ہیں۔ ساری کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے مگر جہاں مصنف بطور شاعر کہانی میں بتاتا ہے کہ باہر والے نگران اور حاکم کیسے وجود کے مالک ہیں تو وہاں کہانی میں ایک گوناں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے:

> ”۔۔۔۔۔۔ان میں بہت سے اپنی بزدلی کی بنا پر خرگوش، بہت سے اپنی مکاریوں کی وجہ سے لومڑی اور بہت سے اپنی خباثت کے سبب سانپ ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں خرگوش کی صلح پسندی، لومڑی کی ذہانت اور سانپ کی دانائی ہو۔
>
> دیکھ! اس شخص کو دیکھ! جو اپنی گندگی کی بنا پر، خنزیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اس کا گوشت اس قابل نہیں کہ اسے کوئی اپنی غذا بنائے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو اپنی بے وقوفی کے اعتبار سے گدھا معلوم ہوتا ہے، لیکن دو ٹانگوں سے چلتا ہے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو نحوست کے لحاظ سے کوا ہے لیکن اپنی کائیں کائیں کو عبادت گاہوں میں فروخت کرتا ہے۔

اور اب اس شخص کو دیکھو! غرور ناز میں طاؤس سے مشابہ ہے لیکن اس کے پَر مانگے تانگے کے ہیں۔"(۱۰)

بنیادی طور پر جبران نے ہمارے معاشرے میں موجود گرے پڑے اور گراوٹ کا شکار وجودوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اپنے مطلب کی غلط غلط روشیں تو سیکھ لیتے ہیں مگر جس سے معاشرے کو فائدہ ہو ایسی کوئی بھی حکمت اور دانائی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ کتوں سے کاٹنا تو سیکھ لیتے ہیں مگر کتوں سے وفاداری نہیں سیکھتے۔ مانگے تانگے کی چیزوں پر ہی عیاشی کرتے ہیں اور اپنی قوتِ بازو سے کچھ حاصل کرنے کی وقعت نہیں رکھتے۔ ایسے وجود سوسائٹی پر نہ صرف بوجھ ہیں بلکہ ننگِ معاشرہ بھی ہیں۔ اس افسانے تو یہی لگتا ہے کہ افسانہ نگار بادشاہ کو تسلی نہیں دے رہا بلکہ ہمیں تسلی دے رہا ہے کہ اٹھو! اور ایسے سب لوگوں کے خلاف متحد ہو جاؤ جو ہم پہ حاکم ہیں کیوں کہ یہ سب اوپر سے شیر اور اندر سے گیدڑ اور بزدل ہیں۔

خدا کی تمام مخلوقات ہی خدا کو عزیز ہیں۔ سب برابر ہیں، بس! کسی کو کوئی خوبی دے دی اور کسی کو کوئی۔ مگر کون کتنا بہتر اور خدا کے قریب ہے یہ راز وہ خود ہی جانتا ہے، مگر ہمیں ایک دوسرے سے حقارت اور نفرت کا رویہ برتنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ اسی طرح کچھ انسان ظاہراً تندرست اور اونچے قد کے ہوں تو انھیں پستہ قد اور کم زور لوگوں کا، ذاق نہیں اڑانا چاہیے اور امیر حضرات کو کبھی بھی غریب و مفلس لوگوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے اور نہ ہی انھیں حقیر سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ اس کا وجود سوسائٹی میں کتنی اہمیت کا حامل ہے یہ ہم نہیں جانتے مگر پیدا کرنے والا بخوبی جانتا ہے کیوں کہ اس نے کوئی بھی چیز بے کار اور فضول پیدا نہیں کی۔

ہمارے معاشرے میں ایسے ہی وجود کی بنا پر ایک دوسرے کو حقیر سمجھنے کی روایت موجود ہے جس پر جبران ایک دلچسپ اور کمال کہانی "عقاب اور لوا" لکھی ہے۔ جس میں عقاب خود کو بڑا اور عظیم سمجھتا ہے اور لوا جو کہ ایک چھوٹا سا چڑا نما پرندہ ہوتا ہے، اسے حقیر اور کمتر سمجھتا ہے اور اس کا مذاق اڑانے کے ساتھ ساتھ اس کی تذلیل بھی کرتا ہے اور خود کو لوے کے خاندان سے ہونے کا انکار کر دیتا ہے کیوں کہ عقاب اور لوا دونوں ہی پرندے ہیں، مگر عقاب اسے اپنے خاندان کا نہیں مانتا اور اسے نفرت سے دھتکار دیتا ہے۔ اس پر لوا انتقام لیتا ہے اور اس کی قمر پر چپک کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے پر نوچتا ہے کہ ایک چیونٹی اس عقاب پر ہنستی ہے تو عقاب اسے کہتا ہے کہ کیوں ہنستی ہو یہ تو ہمارے اپنے گھر اور خاندان کی بات ہے، جاؤ اپنی راہ لو اور اپنا کام کرو۔

اس کہانی کے آخر میں صرف لوے کے انتقام کی کاروائی کے بارے یہاں لکھا جاتا ہے:

"اس پر لوا اٹھ کر عقاب کی پیٹھ پر آن بیٹھا اور لگا اس کے پَر نوچنے۔۔۔۔۔ عقاب جھنجھلا کر اونچا اونچا اڑنے لگا کہ کسی طور اس حقیر لوے سے پیچھا چھڑائے۔ مگر لوا ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ آخر اسے ہی ہار کر نیچے اترنا پڑا۔ عقاب پہلے سے بھی زیادہ غصے میں بھر گیا۔ اس بری گھڑی کو کوسنے لگا جب اس حقیر چڑے (لوے) کو اپنی پیٹھ پر لیے اسی چٹان پر اترنا پڑا جہاں سے اس نے پرواز کی تھی۔

اس وقت جانے کہاں سے ایک چھوٹی سی کھچوی (چیونٹی نما) نکل آئی اور اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ کر کچھ اس طرح ہنسی کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ عقاب نے بڑی نخوت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او زمین پر رینگنے والے کیڑے، بھلا تمھیں کس بات پر ہنسی آرہی ہے۔"

کھچوی بولی۔

"اس بات پر کہ تم گھوڑا بن گئے ہو۔ ایک ننھا ساچڑاتم پر سواری کر رہا ہے اور وہ ننھا چڑاتم سے افضل ہے!"

اس پر عقاب بولا۔

"ارے راستہ ناپو تم۔۔۔ راستہ! یہ ہماری گھریلو بات ہے، میری اور میرے بھائی لوے کی۔۔۔!"""(۱۱)

کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، کہیں یہ نہ ہو کہ شرمندگی سے بچنے کے لیے آپ کو دوبارہ اپنی ہی کہی ہوئی بات کو واپس لینا پڑے۔ کوئی بھی وجود چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بلکہ بنانے والے نے سب میں اپنی اپنی خسوبیاں رکھ دی ہیں۔ جن سے انکار خدا کے وجود اور دین سے انکار ہے۔

انسان بھی بڑی عجیب شے ہے اور حیران کن مخلوق بھی۔ اس کو جو چیز جتنی آسانی اور محبت سے ملتی ہے یہ اس کی اتنی ہی ناقدری کرتا ہے اور اس کی اہنیت سے کبھی بھی واقف نہیں ہوتا۔ مگر جو چیز اسے جتنی ہی تگ ودو، مشقت اور کوششوں کے بعد ملتی ہے یہ اس کی اتنی قدر کرتا ہے اور اسے اتنا ہی عزیز رکھتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے اور اس سے کبھی بھی انسان خود بھی فراموشہ اختیار نہیں کر سکتا۔

انسان کی اسی فطرت پر اور وجود کی عظمت کو سمجھانے کے جبران ایک افسانہ "انار کی قیمت" لکھا ہے۔ یہ ہے تو بڑا مختصر اور سیدھا سادا، سپاٹ سا افسانہ، مگر اس میں مصنف نے بڑے گہرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

اس افسانے میں ایک شخص جس کا اناروں کا باغ ہوتا ہے وہ اپنے گھر کے باہر سب سے اچھے انار ،چاندی کی پلیٹ میں ڈال کے رکھ دیتا ہے اور ایک تحریر بھی درج کر دیتا ہے کہ جسے جتنے بھی قیمت میں انار پسند ہو وہ لے سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر اتنے اچھے سیب بھی کوئی نہیں لیتا بلکہ لوگ اس طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس شخص نے ایک ترکیب نکالی۔ مصنف کی ہی زبانی سنیے:

"آخر سوچ سوچ کر اس آدمی نے ایک ترکیب نکالی اور اس سال فصل کے موقع پر چاندی کے تھالوں میں پکے ہوئے سرخ انار رکھنے کی بجائے ایک تختہ اونچا کر کے لٹکا دیا۔۔۔اس پر لکھا تھا ہماری یہاں بہترین قسم کے انار ہیں اور ان کی قیمت بھی ملک بھر کے دوسرے اناروں سے زیادہ ہے۔اس عبارت کو دیکھ کر دور دور سے عورتیں اور مرد سبھی انھیں خریدنے کے لیے آنے لگے۔"(۱۲)

اس افسانے اور اقتباس سے ہمیں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ کبھی بھی اپنے وجود کو ارزاں نرخوں پر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں تو لوگ کبھی بھی آپ کی قدر نہیں کریں گے اور آپ کی قیمت سے آگاہ نہیں ہو پائیں گے۔انسان اپنی اور اپنے وجود کی قیمت خود ہی بڑھاتا ہے اور خود ہی گراتا ہے۔اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس جانب رجحان رکھنا پسند فرماتا ہے اور کیا پسند کرتا ہے۔

انسانی وجود ایک بیش بہا اور انمول خزانہ ہے۔ مگر ہم لوگ اپنی کج فہمی اور نادانی سے اس کا صحیح استعمال نہیں کر پاتے یا پھر اس کو مایوسی و ناامیدی میں گنوا دیتے ہیں۔اس بات کا قلق جبران کو بہت زیادہ ہے اور اس کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ جبران کے نزدیک انسان ہی اپنا مسیحا اور مددگار ہے۔یہ جب کوشش کرتا ہے تو کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے۔اس لیے وہ طرح طرح سے انسان کو اس کے وجود کی عظمت طرف راغب کرتا ہے اور بار بار آواز دیتا ہے کہ اپنے وجود کی عظمت کو سمجھو۔

جبران کا افسانہ "مامتا" ایسے ہی خیالات کی بہترین وضاحت ہے۔جس میں ایک ماں کا بچہ بخار کی وجہ سے مر جاتا ہے تو وہ مامتا سے مجبور ہو کر روتے ہوئے طبیب سے کہتی ہے کہ میرا بچہ کیوں مرا اور کس نے مارا تو طبیب کہتا ہے بخار کی وجہ سے۔پھر ماں کے استفسار پر وہ بتاتا ہے کہ بخار ایک عام اور ادنیٰ چیز ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ صبح ہونے کے بعد پادری افسوس اور دعا کے لیے ماں کے پاس آتا ہے تو وہ بھی کہتا ہے کہ آپ کا بچہ خدا کی منشا کے مطابق فوت ہوا۔تو ماں پوچھتی ہے یہ خدا کون ہے تو پادری کہتا ہے کہ وہ بہت بڑی طاقت ور

ہستی ہے اور عظیم قدرت والا ہے۔ مگر ہم اسے اپنی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس پر ماں اور بچے کی نانی کا انسانی وجود پر دلچسپ تبصرہ سماعت فرمائیں:

"ممتا چلائی۔

"ایک بہت ہی حقیر شے نے بہت ہی بڑے کی مشیت سے میرے لال کی جان نکال لی ہے۔ تو پھر ہم کیا ہیں؟"

"ہم کون ہیں؟"

بچے کی نانی۔ بالے کا کفن لیے اندر سی رہی تھی۔ اس نے طبیب کے الفاظ بھی سنے تھے ۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"میری بچی! ہم ہی بہت حقیر ہیں اور ہم ہی بہت بڑے ہیں۔۔۔۔۔ اور ہم ہی ہیں ان دوضدوں کے مابین ایک اٹل راستہ!""" (۱۳)

یہ بات بالکل بجا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ انسان خود ہی ہے۔ جیسا یہ سوچتا ہے اور جیسا یہ خود کو بنالیتا ہے، ویسے ہی اس کے ارادے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اپنے وجود کی عظمت کو سمجھے نہ کہ دوسروں پہ انحصار کرے۔ یہی کسی بھی دین اور مذہب کا اسلوب اور طریقہ کار ہے۔

جبران نے انسانی وجود اور اس کی عظمت کو ایک حقیقی سچائی اور سچے خواب کی طرح مانا ہے اور عمر بھر اس بات پر مصر رہا کہ زندگی کا وجود تمام حقیقتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس حقیقت اور سچائی سے جبران نے دنیا بھر کو خوگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی عظمتوں کا سامنا کیا ہے۔ جبران نے نہایت کمال سے اپنے افسانے "خطاب بہ لحد" میں ایک متکلم کردار کے طور پر برادلچسپ اور دلیرانہ مکالمہ کیا ہے اور لحد کو بتایا ہے کہ وہ مانتا ہے کہ میں تیری وحشتوں اور خوفناک گھاٹیوں سے واقف ہوں مگر میں زندگی کو تیرے ڈر میں تباہ

نہیں کر سکتا۔ زندگی کو موت پر ہی ختم کرنے پر راضی نہیں۔ اور عمر بھر کی ریاضت کا نتیجہ موت ہی کیسے ہو سکتا ہے۔ جبران کہتا ہے:

"اپنے خوف ناک تصور سے مجھے بار بار نہ ڈرا! تیرے وجود سے میں بے خبر نہیں! اپنی وحشت ناک گہرائیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے خود بھی اس کا پوری طرح اندازہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آہ! میں نہیں مان سکتا کہ صحیفہ حیات سورہ موت پر ہی ختم ہوتا ہے۔

اف! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اس قدر جدوجہد کا نتیجہ اسے کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔

ہر تاریک بادل کے پیچھے چمکتا ہوا سورج موجود ہے تو "درجاتِ فنا" طے کرنے کے بعد "حیاتِ لافانی" کیوں کر نہ ملے گی۔

آہ! اس کے ماننے میں مجھے تامل ہے اور سکوت!

غارت گر دپر اسرار لحد! مجھے اپنی فتنہ سامانی سے نہ ڈرا۔ وقفہِ حیات کو میں خاتمہ زیست پر محمول نہیں کر سکتا۔

آہ! میں اپنے تخیلات کو اس طرح متزلزل کر دینے سے معذور ہوں۔"[۱۴]

انسانی وجود کی عظمت تو اسی میں ہے کہ انسان اپنے وجود کو بعد از مرگ بھی کمزور اور کم تر نہ سمجھے۔ بل کہ انسان اپنی عظمت کے پیشِ نظر زندگی میں بھی بڑے بڑے کام کرے اور مرنے کے بعد بھی اچھی ہی توقع رکھے۔ اگرچہ وہ قبر کی ہولناکیوں سے واقفیت رکھتا ہو۔

جبران نے انسانی وجود اور کائنات اور خدا کے بارے کئی ایک مکالمے بھی کیے ہیں اور ان کے مابین تعلقات کو سمجھنے کی اور سمجھانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے اور اپنی ذات اور خدا کی ذات پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خدا کے بارے اگر کوئی حقیقت اور صحیح رائے ہمارے پاس موجود نہیں تو نہ سہی۔ مگر انسان

کے پاس اس کے اپنے وجود کے بارے تو کچھ حقائق موجود ہونے چاہییں، جن سے وہ تمام عمر اپنا محاسبہ اور تصفیہ کرتا رہے۔ ایسے کئی سوالات پر مبنی ایک افسانہ "یہ دنیا ہماری" میں جبران نے لکھا ہے۔

اس افسانے میں جبران نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے لوگوں کے رویوں اور سلوک پر گفتگو کی ہے اور خدا سے مکالمہ کیا ہے کہ سب دھوکے، فساد، انتشار اور لوگوں کا تیرے بارے انکار اور الحاد بالکل تیری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے تو تو کیوں خاموش اور چپ ہے اور اگر کوئی مصلحت ہے اس میں تو انسان تو بے چارہ کسی کھاتے کا نہیں اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اس لیے اپنی ذات پر سوال اٹھاتا ہے کہ پھر میں کیوں ہوں، کیا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ افسانے کا اقتباس دیکھیے:

"اے خدا یہ ہے ہماری کائنات، ہماری متمدن اور مہذب دنیا جو عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔

یہ قادرِ مطلق کے باغ کا پختہ ثمر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور اس کی بہترین تمنا۔

مگر اے خدا میں یہاں کیوں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں جو ناکام خواہشوں کا ناقص بیج ہوں۔

ایک آوارہ طوفان ہوں۔

ایک ٹوٹے پھوٹے سیارے کا ٹکڑا جو ہواؤں میں پریشان ہے اور جو نہ مشرق کو تلاش کرتا ہے اور نہ مغرب کو۔

اے گمشدہ روحوں کے خدا۔۔۔۔۔۔۔تو جو دیوتاؤں کے ہجوم میں گم ہے، بتا میں یہاں کیوں ہوں۔"(۱۵)

واقعی میں انسان اس دنیا میں اپنی حقیقت، اپنی پہچان اور اپنے اصل مقام کے لیے سرگرداں ہے۔ مگر خدا کی کیا مصلحت ہے کہ انسان دنیا میں مشرق و مغرب بس بھاگتا اور گھومتا ہی گزار رہا ہے۔ یہ ہواؤں کا ٹکڑا

ہے اور وہ بھی آوارہ ہواؤں کا ٹکڑا۔ جو دیوانوں کی طرح اپنا سر مارتا رہتا ہے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا سوائے اپنا سر پھوڑنے کے۔

جبران ایک انقلابی فکر کا حامل اور باغی طبیعت کا شخص تھا جس نے اپنے آباؤ اجداد کی رویات اور مروجہ معاشرتی نظام سے نہ صرف انحراف کیا بل کہ اس کے خلاف ایک علمِ بغاوت بھی بلند کیا۔ جبران نے اپنے اسی نظریے اور سوچ کو پروان چڑھانے کے لیے انسانی وجود کی عظمت اور بڑائی پر کئی افسانے لکھے اور اپنی کہانیوں میں انسانی وجود کی طاقت سے استفادہ کرنے کا بھرپور درس بھی دیا۔

جبران کی انھیں تخیلات پر مبنی ایک کہانی" میں اور دانائی" بھی ہے جس میں جبران دانائی کے ساتھ مکالمہ کر کے انسانی وجود کی عظمت وبڑائی کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ اس کہانی میں جبران واحد متکلم کے طور پر دانائی سے چند سوالات کرتا ہے اور پھر دانائی ایک دانا شخص کی طرح اسے اس کے جواب دیتی ہے۔ جبران کے سوالات تو بہت سے ہوتے ہیں جو مختلف پہلوؤں میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں جن میں انسانی وجود کی اہمیت، اپنے ہونے نہ ہونے کا مخمصہ، میرا اس جہانِ فانی میں آنے کی وجہ، میرے دل و دماغ میں ابھرنے والی بے شمار تمنائیں اور امیدیں، ضخیم کتابوں کے ڈھیروں کی حقیقت، خیالات کی اصلیت، اَن سنی آوازوں کی حقیقت، یہ ہولناک دنیا اور اس کی اصلیت، جوانی اور اس کی بھری ہوئی خواہشیں، زمین کی حقیقت اور اس کے کام کرنے کی وجہ اور کئی سوالوں کے ساتھ جبران دانائی سے کہتا ہے کہ اے دانائی ان سب باتوں کے اسرار مجھ پر منکشف کر دے۔

اس کے بعد دانائی جبران کے تمام سوالوں کا جواب دیتی ہے اور اسے یہ بھی بتاتی ہے کہ انسانی وجود اور انسان کی ہستی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے اور اسے کس طرح زوال آسکتا ہے اور آج اس کت زوال کی وجہ کیا ہے اور اب اسے کیسے عروج بخشا جا سکتا ہے۔ دانائی کہتی ہے:

"اور وہ دنیا جو تمہارے ساتھ گھومتی ہے وہ تمہارا اپنا دل ہے جو بجائے خود ایک دنیا ہے
اور انسان جس کو تم اتنا کمزور اور حقیر سمجھتے ہو وہ خدا کا نور کا پرتو ہے جو اس دنیا میں رنج و

غم برداشت کر کے مسرت کی حقیقت سے ہمکنار ہوتا ہے اور جہالت سے جنگ آزما ہو کر علم و فراست حاصل کرتا ہے۔

آگے بڑھتے چلو اور کہیں مت رکو۔ تمہارا مقام ہر مقام سے آگے ہے بڑھتے رہنا ہی ترقی ہے۔ اس لیے آگے بڑھے چلو اور زندگی کے راستے میں پڑے ہوئے کانٹوں اور پتھروں کی قطعاً پرواہ نہ کرو۔"(۱۶)

افسانے کے اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ جبران کے ہاں انسانی وجود کی بڑی قدر و قیمت ہے اور وہ اسے ہر صورت میں کامیاب اور باوقار دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ اسی لیے دانائی سے مکالمے کے ذریعے بہت خوبصورت تکنیک سے اپنے پڑھنے والوں کو سمجھایا ہے کہ انسان تو خدا کا ہی ایک عکس ہے جو دنیا میں خدا کی ہی ترجمانی کرنے کے لیے تشریف لایا ہے تو اسے مسلسل آگے بڑھنا چاہیے نہ کہ بے ہمت، مایوس اور ناامید ہو کر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ انسان کے دل کا گھومنا ہی دنیا کے گھومنے کے مترادف ہے۔ جہالت سے لڑ کر ہی انسان آگے بڑھ سکتا ہے اس لیے اسے راستے میں آنے والے پتھر اور کانٹوں سے بچ بچا کر منزل کی طرف بڑھتے رہنا چاہیے کیوں کہ انسانی وجود کوئی حقیر اور کم تر شے نہیں ہے۔

جبران کے ہاں جہاں انسانی وجود کی عزت، تقیر اور عظمت سمجھنے کے بارے میں خیالات اور کہانیاں ملتی ہیں وہیں اس کے پاس انسانی وجود کے غلط استعمال پر سرزنش اور پھر اسی وجد کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے کا درس بھی ملتا ہے۔ انسانی وجود مصنف موصوف کا خاص موضوعِ فلسفہ رہا ہے اور وہ اسے بار بار کہانیوں میں مختلف انداز میں پس کرتا نظر آتا ہے۔ جبران کے ہاں ایسی ہی ایک کہانی "انسان اور فطرت" دکھائی پڑتی ہے جس کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ مصنف ہمارا دھیان اس بات کی طرف کرنا چاہتا ہے کہ ہم انسانوں نے اپنے ارد گرد کے ماحول کو اپنی ضرورتوں اور سہولتوں کے لیے بہت حد تک برباد کر دیا ہے اور ہمیں اس کا احساس تک نہیں۔ اس کہانی میں مصنف نے فطرت کے ساتھ مکالمہ کیا ہے جس کو پڑھ کر ہمیں پتا چلتا ہے کہ فطرت تو ہم سے نالاں ہے اور ہم سے کافی حد تک ناراض بھی دکھائی دیتی ہے مگر ہم نے کبھی بھی اس طرف توجہ نہیں

کی۔ مصنف نے ہوا پر غور کیا اور مشاہدے سے اسے پتا چلا کہ ہوا تو آہیں بھرتی ہے اور اس کی سسکیوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں تو مصنف نے اس سے پوچھ لیا کہ اے ہوا! تو آہیں کیوں بھرتی ہے تو اس نے کہا کہ شہر کے لوگ اپنے گند اور غلط طریقوں کی وجہ سے مجھے آلودہ کرتے جا رہے ہیں۔ سڑکیں دھوپ میں تپ رہی ہیں اور فضا میں جراثیم منڈلا رہے ہیں اور تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں آہیں کیوں بھرتی ہوں؟

اس کے بعد مصنف نے پھولوں سے کہا کہ تمھارے چہرے اشک آلود کیوں ہیں تو انھوں نے آگے سے جواب دیا کہ ابھی کوئی شخص آئے گا اور ہمیں توڑ کر لے جائے گا اور اس طرح ہماری زندگی انسانوں کے بے رحم رویے کے رحم و کرم پر ہے جس کا ہر لمحے ہمیں ڈر سا لگا رہتا ہے۔ ہم کھل کر مسکرانے کی بجائے ہر وقت مرجھائے ہوئے ہی رہتے ہیں اور ہمارے چہروں پر خوف اور دکھ کے آثار نظر آتے ہیں۔ کوئی ہمیں شہر کی منڈی میں بیچنے پر تلا ہوا ہے اور کوئی ہمیں توڑ کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دینا چاہتا ہے۔ پھر مصنف نے بہتی ہوئی ندی سے پوچھا کہ تُو کیوں روتی ہوئی بہتی جاتی ہے تجھے تو اپنی لہروں کے ساتھ گنگناتے ہوئے چلنا چاہیے تو اس نے بھی انسان کے غلط وجود کا شکوہ کیا اور کہا کہ انسان نے شہروں میں بے شمار فیکٹریاں بنا لینے کی وجہ سے تمام اضافی گند ہم میں ڈال کر ہمیں آلودہ کر دیا ہے اور اکثر جگہ پر تو انسان نے ہمیں گندی نالیوں اور بدرونالوں میں شامل کر دیا ہے جس سے ہماری توقیر گھٹ کر ایک گندے نالے سے زیادہ نہیں رہی۔ پھر مصنف پرندوں سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ تم گنگنانے کی بجائے روتے اور آہیں بھرتے ہوئے کیوں اڑتے ہو؟ تم خوشی میں جھومنے کی بجائے اداس اداس کیوں گھوم رہے ہو تو پرندوں نے آگے سے انسان کے غلط وجود کا شکوہ کچھ یوں کیا:

> ”ابنِ آدم ابھی مہلک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس کھیت میں آ پہنچے گا اور ہم پر اس طرح حملہ آور ہو گا جیسے ہم سچ مچ اس کے دشمن ہیں۔ اس وقت ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے ہیں کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ آج شام کو ہم میں سے کون کون صحیح و

سلامت گھر لوٹے گا اور کون کون موت کا شکار ہو چکا ہو گا۔ہم جہاں جاتے ہیں موت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔"(۱۷)

انسانی وجود واقعی میں دوسروں کے فائدے اور بھلائی کے لیے ہی بنا ہے مگر اگر یہی وجود دوسروں کے لیے نقصان کا باعث بنے تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اپنے وجود کا غلط استعما کیوں کر رہے ہیں۔مصنف موصوف نے بھی ہمیں اسی طرف متوجہ کیا ہے۔اقتباس میں تو صرف پرندوں کی سسکیاں اور آہیں ہی ذکر کی گئی ہیں مگر ہوا کا نوحہ،ندی کی پکار اور پھولوں کا درد بھی شامل کر لیا جاتا تو احساس ہوتا کہ ہمارا وجود فطرت کے لیے کس حد تک نقصان کا باعث بنا ہوا ہے۔

اس افسانے کی ایک خوبصورتی یہ بھی ہے کہ انسان اپنے فائدے اور بھلائی کے دن رات کوشاں ہے اور اس نے دھوپ سے بچنے کے لیے بڑے بڑے سائبان،بارش سے بچنے کے لیے چھتری،گھر بسانے کے لیے جنگلات کو کاٹنے سے دریغ نہیں کیا اور اسی نوعیت کے اور بھی بے شمار بلا وجہ کام ہمارے معاشرے میں ملتے ہیں مگر ہم اسے نام نہاد تہذیب کا نام دے دیتے ہیں۔مگر تھوڑی سی احتیاط برت کر ہم ان تمام کاموں سے بہ احسن طریقے سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں اور ماحول کو بھی خوش گوار رکھ سکتے ہیں اور اچھی بات یہ ہے کہ اچھے ماحول کا فائدہ بھی بہر حال ہمیں ہی ہونا ہے۔

انسانی زندی کی اہمیت اور اس کے عظیم وجود سے کبھی بھی کسی کو انکار نہیں رہا مگر حالات کی سنگینی اور مصائب کی بوچھاڑ اور زمانے کے بے اعتنا اور ظالم رویے سے اکثر انسان اپنے وجود انکاری اور اپنے ہونے سے مفر کرنے لگتا ہے اور ایسا ہم اپنے معااشرے میں دیکھتے ہی رہتے ہیں۔اس لیے ایک ادیب کا کام بنتا ہے کہ وہ زمانے کو مایوسی اور نا امیدی کی دلدل سے نکال کر خوشحالی اور رجائیت پسند زندگی کی طرف لے کر آئے۔جبران کو تو ان حالات کا سامنا اور دوسرے لوگوں سے اس لیے بھی زیادہ تھا کیوں کہ اس کے زمانے میں جنگِ عظیم اول کی ہولناکیاں بھی لوگوں نے دیکھیں اور کئی ایک مصائب کا سامنا بھی کیا اور لوگوں کا اپنے وجود کو لایعنی اور فضول کہنا یہ ایک عام سی بات تھی۔ان سارے حالات میں جبران نے نہ صرف لوگوں کو وجد

کی عظمت کا یون دلایا بل کہ انھیں زندگی کی نئی راہیں بھی سجھائیں اور انھیں اپنے حق کے لیے لڑنا بھی سکھایا اور اپنے وجود کو سمجھ کر آگے بڑھنے کا درس بھی دیا۔ ایک مہاجر ادیب اور اتنے سارے مصائب پر لکھتا رہا یہ بھی جبران کا ہی علمی اور فنی کمال ہے۔ جبران کو اگرچہ مقصدیت عزیز تھی جس کے پیشِ نظر اس نے کہیں کہیں فنی لوازم کو ترک بھی کیا مگر اس کے ہاں کمال فنی افسانے اور کہانیاں بھی ملتی ہیں۔

انھیں خیالات پر مبنی جبران کا ایک افسانہ ''مرشد کا فرمان'' اپنے موضوع اور ہئیت کے حوالے سے پڑھنے اور بحث کرنے کی چیز ہے۔ اس افسانے میں جبران نے اپنے بہت سے خیالات اور نظریات کا پرچار ایک ایسے کردار کی زبانی کروایا ہے جو افسانے کے اندر اپنے استاد جسے وہ مرشد بھی کہتا ہے، کے نظریات کا پرچارک ہے۔ یہی اس افسانے کی کمال تکنیک ہے کہ جس کے ذریعے سے افسانہ پلاٹ کے مختصر ہونے کے باوجود بھی عامیانہ پن کا شکار نہیں ہوا اور اسی تکنیک سے افسانہ کمال مہارت سے بُنا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ افسانے کے آغاز میں ہی اس شاگرد کا استاد دنیا سے پردہ کر جاتا ہے اور لوگ ایسے باکمال شخص کے سانحۂ ارتحال پر آنسو بہانہ شروع کر دیتے ہیں تو یہ شاگرد ہی انھیں بتاتا ہے کہ میرے مرشد ہی مہا کرتے تھے کہ آنسو اس شخص کی وفات پر بہانے چاہییں جو دنیا سے ایسے رخصت ہوا کہ اس نے کوئی بھلائی کا کام نہ کیا ہو اور وہ تمام عمر صرف اپنے مقصد کے لیے جیتا رہا ہو۔ مگر میرے استاد ایسے نہیں تھے وہ عمر بھر لوگوں کے لیے کام کرتے رہے لہٰذا تم لوگ آنسو نہ بہاؤ۔ اسی سے بات چل نکلتی ہے اور وہ جگہ جگہ لوگوں کو اپنے استاد اور مرشد کے فر،ودات سے روشناس کرواتا رہتا ہے کہ اس کی شہرت ایک شہر سے دوسرے اور دوسرے سے پھر تیسرے شہر تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح لوگ اس کے پاس اس کے مرشد کی باتیں سننے کے لیے جوق در جوق آتے رہتے ہیں اور آخر کار ایک دن وہ اپنے استاد کے نظریات پر عمیق اور ادق نظر ڈالنے کے لیے دنیا سے کٹ کر ایک آموزش گاہ میں چلا جاتا ہے اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اپنے استاد کے علوم کو مزید سمجھنے کے نعد دنیا کے سامنے دوبارہ جلوہ گر ہوتا ہے تو لوگ اس کی پہلے سے بھی زیادہ عزت کرتے ہیں اور سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے استاد سے بھی زیادہ مشہور اور معروف بن جاتا ہے۔ یہی شاگرد ایک جگہ پر

لوگوں کو زندگی کی عظمت اور وجود پر تلقین کرتا اس ہے اور اپنے وجود کو بعد از مرگ بھی عام اور بے کار نہیں کہتا اور زندگی کے علاوہ قبر اور حشر میں بھی اس کی عظمت کا لوگوں کا یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے:

”زندگی بجائے خود زندگی کی حقیقت ہے۔ زندگی کی ابتدا ماں کے رحم سے ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی قبر اس کی آخری منزل ہے۔ جن ماہ و سال کا ہم یہاں شمار کرتے ہیں وہ ابدیت کی نظر میں زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور یہ مادیت اور اس کی ساری کائنات اس بیداری کے مقابلے میں جس کو عرفِ عام میں ہم موت کہتے ہیں، محض ایک خواب ہے۔“(۱۸)

مندرجہ بالا پیراگراف سے ابھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جبران نے اس میں کتنے شاندار طریقے سے زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ زندگی ہی زندگی کی حقیقت ہے اور یہ ایک اٹل سچائی ہے ہماری زندگی ماں کے پیٹ سے ہی شروع نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم مرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں بل کہ جبران تو اس سے بھی آگے یہ بتاتا ہے کہ موت ایک خواب، ماندگی اور دم لینے کا وقفہ ہے جس کے بعد زندگی پھر سے رواں دواں چلنا اور دوڑنا شروع کر دے گی۔ جبران اپنے اس افسانے میں نہ صرف زندگی کی اہمیت بیان کر کے وجود کی عظمت کا پرچار کیا ہے بل کہ سب لوگوں کو سمجھایا ہے کہ اپنے وجود کی اہمیت کو سمجھو اور اپنے وجود کو کبھی بھی کم تر سمجھتے ہوئے مایوسی، تاریکی اور قنوطیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے اپنے وجود کی بڑائی کو سمجھیں اور افضل المخلوقات ہونے کا ادراک حاصل کریں اور جو لوگ یہ ادراک حاصل کر لیتے ہیں ان کے بارے میں بھی اس افسانے میں خدا کی طرف سے نوید سنائی گئی ہے اور انھیں کامیاب زندگی اور روح پرور وجود کے لقب سے نوازا گیا ہے کیوں کہ یہی تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو لوگوں کو حسنِ زندگی کا مفہوم سمجھاتے اور زندگی کے اصل اور حسین معنوں سے آشنا کرواتے ہیں۔ انھیں لوگوں کا وجود دوسروں کے لیے شیریں اور روح افزا ہوتا ہے اور یہی لوگ دوسروں کے خوابوں کی تعبیر اور جینے کا مقصد ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے وجود کے بارے میں جبران یوں لکھتا ہے:

" اگر تم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جن کی روحوں کے ہاتھ میں اس ذاتِ بے ہمتا نے سرمدی نغموں کا ساز دے رکھا ہے تاکہ وہ لوگوں کو زندگی اور حسنِ زندگی کے قریب لاتے رہیں تو تمہارا وجود ہمارے دلوں کی ایک شیریں آرزو ہے۔ تمہاری روح ہمارے خوابوں کی حسن تعبیر ہے۔"(۱۹)

جبران کے ہاں انسانی وجود کی عظمت اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور وہ لوگوں کو بھی انسانی وجود کو سمجھ کر اس سے پیار کرنے اور پھر اس سے کوئی بڑا کام لینے کے خواہش مند ہیں بجائے اس کے کہ کوئی شخص زندگی سے مایوس ہو اور خود کو مایوسی کے تاریک اندھیروں میں جھونک دے جس کا آخر کار نتیجہ موت اور خود کشی پر منتج ہو۔ انسانی وجود کو سمجھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انسان کو خود کو سمجھنا ضروری ہے۔

ii. انسانی زندگی کا مقصد

انسان کے جینے کا مقصد اگر نہ ہو تا اس کا دنیا میں رہنا ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی جانور دنیا میں آیا کھایا پیا ،زندگی گزاری اور مر گیا۔ بغیر مقصدِ حیات کے کسی شخص کا جینا کوئی جینا نہیں۔ اگر انسان اپنے معاشرے میں کسی دوسرے کا خیال کرے اور دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرے۔ تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے اور ہر انسان معاشرے میں سر اٹھا کے جی سکے۔ اگر ایسا ہی ہو تو انسان واقعی اپنی زندگی کا مقصد پا لیتا ہے۔ پروفیسر ہارون الرشید اس بارے میں کہتے ہیں:

"جہاں ظلم و ستم، حق تلفی اور بے انصافی کے بجائے عدل اور انصاف کا دوردورہ ہو۔ جہاں انسانوں کے درمیان نفرت اور عداوت کے بجائے محبت اور اخوت قائم ہو۔ جہاں کوئی انسان بھوکا، ننگا اور بے گھر نہ ہو، جہاں انسان اپنے ہمسائے کی خبر گیری کیے بغیر منہ میں لقمہ نہ ڈال سکتا ہو۔ جہاں کوئی انسان دوسرے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کر سکے۔"(۲۰)

خلیل جبران کے ہاں زندگی کے اسی اصول اور مقصد کے حصول اور درس پر افسانے ملتے ہیں۔ اپنے افسانے " پروانہ سے " وہ اسی مقصدِ زندگی کو سمجھاتے ہیں اور ایک پروانے کی زندگی سے تمثیل بناتے ہوئے انسانوں کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کرتے ہیں کہ اگر ایک مختصر حیات والا کیڑا اپنی زندگی کے مقصد کو نہیں بھولا، اور ہمیشہ سے اپنے فرائض اور عشق کی منازل طے کرتا ہے اور آکر کار اپنی منزل کے قدموں پر قربان ہو جاتا ہے تو اس کا نام رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔ رات کی تاریکی، موت کا خوف اور چند دن کی مختصر زندگی یہ سب باتین بھی اسے اپنے مقصدِ زندگی سے پیچھے نہیں ہٹا سکیں اگر ایسی ہی تڑپ کسی انسان میں آجاتی ہے تو نہ صرف وہ معاشرے کے لیے اکیم مچاِل ہوتا ہے بل کہ دنیا کے لیے ایک عملی نمونہ بن جاتا ہے۔ افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> "شب کی تاریکی میں لپٹی ہوئے ہر شے غرقِ خواب نوشیں ہے لیکن تیرے لیے شاید نیند کا نام عنقا ہو گیا۔ تیرے شاندار قافلے کے ہم سفر لحہ بہ لحہ کم ہو رہے ہیں لیکن تجھ پر کوئی اثر نہیں۔ اس قدر غرقِ یم خیال کہ اپنے آپ تک کا ہوش نہیں۔
>
> جانباز پروانے! شعلہ بار آتشیں لَو پر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر لپکنا اور بیک ثانیہ بے جان ہو کر محبوب کے قدموں پر گر پڑنا۔ کیا تیری اصطلاح میں انجامِ حیات اسے ہی کہتے ہیں کہ شمع کے اندر اندر گھلنے کا دلسوز منظر برداشت سے باہر ہے۔"(۲۱)

جبران اپنے اس افسانے میں انسانی زندگے کے مقصد کو بیان کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور کمال ہنر مندی سے ایک کیڑے کی زندگی کو ہمارے لیے، انسانوں کے لیے مثال بنایا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو نہیں چھوڑتا اور نہ ہی بھولتا ہے اور اسی کے دوران وہ اپنی جان تک نثار کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہی معاملہ انسان اپنی زندگی میں بھی کرے تو ہی کامیابیاں اس کا مقدر بنتی ہیں اور انسان کسی بھی معاشرے کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔ وگرنہ ایک انسان اور جانور میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اور وہ جملہ کہ " شمع کے اندر اندر گھلنے کا دلسوز منظر برداشت سے باہر ہے " کمال جملہ ہے۔

جبران کا افسانہ "جل پریاں" اپنی نوعیت کا منفرد، دلچسپ اور دل دہلا دینے والا افسانہ ہے۔ جس میں وطن سے محبت کے جذبات، فرض کی ادائیگی کی لگن اور ملک و وطن میں جاری امن کی خاطر جنگوں کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک محبوبہ کا اپنے محبوب کے نام محبت بھرے خط کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے افسانہ نہایت درد بھرے اسلوب کا حامل ہو گیا ہے۔

افسانے کا انداز تو تمثیلی ہے۔ جس میں ایک سمندر میں موجود جزیروں پر ایک نوجوان کی لاش جل پریوں کو ملتی ہے جو اس نوجوان کے مرنے کی وجہ پر تبصرہ کرتی ہیں اور انسانی زندگی کے بے جا مقاصد پر تنقید کرتی ہیں۔ جل پریاں کیا کہتی ہیں۔ ذرا سنیے:

"ایک بولی:

"یہ آدمی کل اس وقت پانی میں اترا تھا، جب سمندر بپھرا ہوا تھا۔"

دوسری نے کہا:

"سمندر تو بپھرا ہوا نہیں تھا، ہاں! انسان۔۔۔۔۔جو اپنے تئیں دیوتاؤں کا جوہر سمجھتا ہے۔ ایک خوف ناک جنگ میں مبتلا ہے، جس میں اب تک اتنی خوں ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی اسی جنگ کے مقتولوں میں سے ہے۔"""(۲۲)

ان دو جل پریوں کے بعد تیسری جل پری نے ذرا تفصیل سے تبصرہ کیا اور بتایا کہ انسان خود غرض ہے اور خشکی پر قبضے جما لینے کے بعد اب وہ سمندر پر بھی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جس کی اطلاع پانی کے دیوتا نبتون کو ہوئی تو وہ انسانوں پر برہم ہوا اور انسانوں کو حکم دیا کہ اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو میرے حضور اپنے انسانوں کی قربانیاں پیش کرو، جس کی یہ آخری قربانی ہے۔

اگرچہ پہلی دو جل پریوں کی باتیں بھی دلدوز ہیں مگر تیسری جل پری کی بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں آکر اپنا مقصد بھول گیا ہے اور اب دنیا کے جھمیلوں میں پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے ساری دنیا

انتشار کا شکار ہے اور کوئی کسی کے بھلے کا نہیں سوچتا۔ انسان دنیا میں اچھائی کے لیے آیا اور اپنے بنانے والے کی پہچان کو دنیا میں تشریف لایا مگر یہ اسی اپنے خالق کے خلاف ہو گیا اور اسی کی زمین پر قبضے جمانے لگا۔

اس کے بعد جل پریوں نے نوجوان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو اس کے پاس آ کر اس کی جیبیں ٹٹولیں تو دل کے پاس والی جیب میں سے ایک خط نکلا، جو کہ محبت بھرا خط تھا۔ جو اس نوجوان کو اس کی بیوی نے یا پھر محبوبہ نے لکھا تھا۔ نہایت محبت میں ڈوبا ایک ایک لفظ جو اس نوجوان کو جنگ پر آنے سے پہلے ہونے والی ملاقات بھی یاد کرواتا ہے اور فرض کی ادائیگی اور وطنیت پر طنز بھی کرتا ہے جس میں وطنیت ایک محبوب سے محبوب کو جدا کر لیتی ہے۔ انسانی زندگی کے مقاصد کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ایک محبوبہ کی فریاد سنیے:

> "جب محبت نے ہمارے دلوں کو ایک کیا تھا، تو ہمیں امید تھی، ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح گردش کرے گی۔
>
> اچانک جنگ نے تمھیں پکارا تم "فرض" اور "وطنیت" کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔
>
> یہ کون سا "فرض" ہے، جو دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دے، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دے؟
>
> یہ کون سی "وطنیت" ہے، جو معمولی معمولی باتوں پر شہروں کو تباہ و غارت کرنے کے لیے جنگ برپا کر دے؟"[۲۳]

اس سے بڑھ کر اور انسانی مقصد سے غافل ہو کر دور ہونے کی کیا مثال ہو گی۔ ہم عجیب طرح کی مخلوق ہیں جو امن کی خاطر لڑائیاں کرتے رہتے ہیں اور انسانیت کی جان، لاکھوں نوجوانوں کو اس جنگ کے ایندھن میں جھونک دیتے ہیں۔ جن کا کوئی ازالہ بھی نہیں۔ اس لیے جبران نے اپنی اس تمثیلی کہانی سے دو طرح سے انسانوں کو اپنے مقصد سے لاپرواہی برتنے پر تنبیہ کی ہے۔

انسانی زندگی کے مقصد کو نہایت خوبصورت انداز میں جبران نے کئی افسانوں اور کہانیوں میں بیان کیا ہے۔ جن میں جبران کی فکرِ آزادی اور غلامی سے نفرت کے بے مثال فکری اور جذبوں پر مبنی مثالیں اور تمثیلیں تو ملتی ہی ہیں مگر ایک قاری ان سے محظوظ ہوئے بنا بھی نہیں رہ سکتا۔ اور ایک مفکر ان سے اپنے افکار کو جلا بخشتا ہے اور ایک انقلابی ان سے اپنے انقلاب کی راہیں ہموار کرتا ہے اور صاحبِ ہوش انسان ان سے اپنی زندگی کے مقاصد طے کرتا اور حصول کی راہیں سنوارتا ہے۔

جبران کا افسانہ "غلامی" جبران کی اسی فکر کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ جس میں جبران نے انسان کو غلام کہا ہے اور زندگی کا بھی غلام ثابت کیا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی آزادی کو گروی رکھ کر کسی بھی قسم کے بھلے اور اچھے کام سے بہ امرِ مجبوری دور رہتا ہے۔ غلامی نے انسان کو اندھا، گونگا، بہرہ اور اپاہج کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے مقاصد سے بھی کوسوں دور کر دیا ہے۔

اس افسانے کی خوبصورتی اس کہانی کے علاوہ اس کے اندر جذبات اور فکر کی روانی بھی ہے۔ اس افسانے میں جبران نے غلامی کی مختلف اقسام گنوائی ہیں اور ان کی شرح بھی کی ہے۔ جس کی تعریف و تشریح سے ان غلامیوں کے نقصانات اورانسان کی بے بسی کے عمدہ ترین مرقعے پیش کیے ہیں۔ اس افسانے کی بنت میں جبران نے دنیا بھر کے اسفار کا ذکر کیا ہے اور کہا کہ میں نے مشرق و مغرب دیکھا ہے اور لوگوں کو چند مصائب اور سوچوں میں مبتلا پایا ہے ۔یعنی وہ کہنا چاہتا ہے کہ میں نے دنیا بھر کے علوم پڑھے اور قوموں کا مشاہدہ و تجزیہ کیا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لوگ بنیادی طور پر غلام سوچ کے مالک ہیں۔

جبران نے جن جن غلامیوں کا ذکر کیا ہے ان میں زندگی کی غلامی، اندھی غلامی، گونگی غلامی، بہری غلامی، لنگڑی غلامی، ادھیڑ غلامی، رنگ برنگی غلامی، حمیدہ غلامی، کبڑی غلامی، متعدی غلامی، سیاہ غلامی اور اس کے بعد غلامی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی " قوتِ استمرار کی غلامی " بھی پیدا ہوئی۔ مگر اس افسانے میں جبران نے انسانی زندگی کا مقصد ان تمام غلامیوں سے چھٹکارا اور آزادی کو قرار دیا ہے۔ افسانے کا آخری حصہ دیکھیے:

"جب میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا جہاں گزرے ہوئے زمانہ کے سائے روپوش اور آنے والے زمانے کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔وہاں میں نے دیکھا ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تُو کون ہے؟ اور تیرا نام کیا ہے؟"

جواب دیا۔

"آزادی!"

میں نے پھر سوال کیا۔

"اور تیرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔بیٹے کہاں ہیں؟"

"ایک سولی پر چڑھا دیا گیا اور دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

یہ کہا اور کہہ کر پیچھے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔"[۲۴]

جبران کے اسلوب کی یہی تو خوبی ہے کہ کس پیارے انداز میں اس نے زندگی کا مقصد بھی بیان کیا اور انسان کو مبتلائے مرضِ غلامی بھی دکھا دیا۔

جبران کی پیدائش ایک عیسائی مذہبی گھرانے میں ہوئی اور میرونی کلیسا میں بپتسمہ دیا گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کے نظریات میں جبران ایک عالم کی فکر دل میں رکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو ہر مذہب اور فرقے کو بالائے طاق رکھ چکا تھا۔ اس کو حضرت عیسیٰؑ سے بہت عقیدت اور محبت تھی اور انھیں دل و جان سے چاہتا تھا، مگر اس طرح ان کی تعلیمات اور محبت کو نہیں اپناتا تھا جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ حضرت عیسیٰؑ سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔

جبران نے حضرت عیسیٰؑ کے جنم دن کی مناسبت سے بھی ایک کہانی لکھی ہے۔ جس میں اس نے کہانی کو دو تین پہلوؤں سے بیان کیا ہے اور ہمیں معاشرے میں اپنا کردار اور زندگی کا مقصد سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے کا نام "بڑا دن" ہے۔ کیوں کہ ہم اردو میں ۲۵ دسمبر کو بڑا دن بھی کہتے ہیں اس لیے مترجم نے اس کہانی کا نام بڑا دن رکھا۔ اس کہانی میں مصنف نے جہاں دوسرے مسائل پر اور لوگوں کی بے حسی کے علاوہ حضرت مسیحؑ کی عظمت کو نہ سمجھنے پر دکھ کا اظہار کیا ہے وہیں ہمیں ہماری زندگی کا مقصد حضرت مسیحؑ کی زندگی سے اخذ کر کے بھی دیا ہے۔ مصنف کے نزدیک حضرت مسیحؑ ایک انقلابی فکر کے عملی ترجمان تھے اور وہ اپنی فکر اور عمل سے لوگوں کے اندر جینے کی تمنا اجاگر کرنے آئے تھے اور وہ اسی عملی استقامت کا استعارہ بن گئے اور وہ بھی جیتا جاگتا استعارہ۔

جبران حضرت مسیحؑ کی زندگی کے مقصد کو ہم پر یوں آشکارا کرتا ہیں:

"۱۹۰۰ برس سے انسان مسیحؑ کی شکل میں کمزوری کو پوج رہا ہے۔ حالانکہ مسیحؑ قوی تھا لیکن حقیقی قوت کے مفہوم سے دنیا ناواقف ہے۔

مسیحؑ نے خوف و مسکینی کی زندگی بسر کی نہ درد و شکایت کے عالم میں بلکہ انقلابیوں کی طرح زندگی گزاری، باغیوں کی طرح سولی چڑھا اور اہلِ ہمت کی طرح موت کو لبیک کہا۔

مسیحؑ شکستہ پر طائر نہیں، پر جوش آندھی تھا۔ جس نے اپنے تند و تیز جھونکوں سے تمام خمیدہ بازوؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

مسیحؑ فضائے نیلگوں سے غم کو زندگی کی رمز بنانے کے لیے نہیں، زندگی کو حق و آزادی کی رمز بنانے آیا تھا۔

مسیحؑ نہ تو اپنے دشمنوں اور ظالموں سے خائف تھا اور نہ اپنے قاتلوں سے دردناک، بلکہ وہ ایک کھلا ہوا حریت پسند تھا جس نے ظلم و استبداد کا جرات سے مقابلہ کیا۔ جہاں کہیں

مکروہ پھوڑا دیکھا نشتر لگایا، جہاں کہیں شر کو بولتے سنا، گونگا کر دیا اور جہاں کہیں ریاکاری کو پایا فنا کے گھاٹ اتار دیا۔"(۲۵)

مندرجہ بالا جملوں سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کا مقصد صرف کسی بڑے عالم و فاضل یا پیغمبر کی تعلیم کو پاجنا ہی نہیں بلکہ اس کی تعلیمات سے اپنی زندگی کا اصل بھی تلاش کرنا ہے۔ جس طرح جبران کے مطابق لوگ صرف مسیحؑ پر ہونے والے ظلم پر آنسو بہاتے ہیں مگر ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مسیحؑ مصلوب کیوں ہوا، اس وقت کے معاشرے کو حضرت مسیحؑ سے کیا مسائل یا کیا خوف لاحق تھے جو اس شدت کی مخالفت تک اتر آئے اور انھوں نے حضرت مسیحؑ کو سولی پر چڑھا دیا۔

ایک پیغمبر اپنے زمانے کا سب سے پہلا اور بڑا باغی ہوتا ہے۔ جس کا اظہار جبران نے اپنے افسانے کے مکالموں میں بھی کیا ہے۔ واقعی حضرت مسیحؑ نے اپنی قربانی دے کر ہمیں حق و آزادی کے اصل معانی سے روشناس کروایا ہے۔

انسانی زندگی میں مقصد کی بڑی اہمیت ہے جو لوگ بغیر مقصد کے جیتے ہیں وہ جیتے نہیں اور جو لوگ کسی مقصد کے تحت مرتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ مقصد ہی انسانی زندگی کے راستے کا تعین کرتا ہے اور ایک مقصد ہی انسان کو جینے کے طریقے فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ بنا مقصد ہی زندگی گزارتے ہیں ان کے پاس زندگی کو نبھانے اور سیدھے سادھے راستے پر چلنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہوتا۔ حاملِ مقصد شخص اپنے مقصد کے حصول اور تعاقب میں چلتا چلا تا اپنی منزل کو پالیتا ہے۔

اسی ہی موضوع کو جبران نے اپنے افسانے "تیراک" میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ جس میں دو تیراک ہیں دونوں کو دریا عبور کرنے کا مسئلہ در پیش ہے مگر ایک دریا میں تیرنا جانتا ہے اور دوسرا نہیں مگر جس کو پانی میں تیرنا آتا ہے وہ ہی پانی میں ڈوبنے لگتا ہے اور دوسرا دریا کے دوسرے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ مگر پھر وہ دریا کے پار اترنے والا ہی ڈوبنے والے تیراک کو بچاتا ہے تو تیراک اس سے پوچھتا ہے: دوست تم تو بتاتے تھے کہ مجھے تیرنا نہیں آتا مگر تم نے تو سیدھے سیدھے آرام سے دریا عبور کر لیا مگر کیسے؟ تو اس دوست

نے بتایا کہ مجھے اپنے پاس موجود اشرفیوں کی فکر تھی اور اپنے بیوی بچوں سے ملنے کی تمنا اور ان کا خیال تھا۔ اس لیے میں جلدی جلدی میں دریا کے اس پار آ گیا اور تم بھٹک گئے۔

تیراک، جو پانی میں ڈوب رہا تھا، کے بارے میں افسانہ نگار یوں لکھتا ہے:

"ان دونوں میں سے ایک کا جو دریا اور دریا کے راستوں خوب آشنا تھا۔ آدھے ہی راستے میں دم پھول گیا اور تیز بہتے ہوئے پانی کے ساتھ ساتھ وہ کنارے سے دور ہی دور ہٹتا چلا گیا۔"(۲۶)

اس کے بعد مصنف اس تیراک کا حال یوں لکھتا ہے جسے تیرنا نہیں آتا مگر مقصد کے واضح ہونے کی وجہ سے وہ منزل پہ آرام سے پہنچ گیا بلکہ اس نے اپنے دوست کو بھی بچا لیا:

"اور دوسرا، جس نے اس سے پہلے کبھی دریا کا منھ تک نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی تیرنا جانتا تھا۔ بالکل سیدھا تیر کر دریا کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔۔۔ مگر اب جو اس نے اپنے ساتھی کو پانی میں غوطے کھاتے دیکھا، تو اسے پانی میں پھر کودنا پڑا!

وہ اسے بھی بچا کر کنارے پر لے آیا!"(۲۷)

ان دونوں اقتباسات سے اندازہ لگائیں کہ جن لوگوں کے مقاصد نہیں ہوتے وہ ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے اپنی منزل اور راستوں سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے مقاصد بالکل واضح ہوں وہ چاہے کم پڑھے لکھے یا پھر کم ماہر ہوں مگر وہ سعیِ مسلسل سے ضرور منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس افسانے کے آخر میں دریا عبور کرنے والے نے دریا کو عبور کرنے کی وجہ بتائی ہے اور وہ بھی بالکل مقصدیت کا واضح ہونا ہے:

"۔۔۔۔۔۔کنارے پر پہنچ کر اپنے ساتھی سے بولا۔

”دوست تم تو بتا رہے تھے کہ تم نے کبھی پانی کا منہ تک نہیں دیکھا۔ مگر دریا تو اس بے تکلفی سے پار کیا ہے کہ میں بھی حیران ہوں۔“

دوسرے نے کہا۔

”بھائی تم شاید میرے اس کمر بند کو نہیں دیکھ رہے۔ اس میں اشرفیاں بھی بھری ہوئی ہیں اور انھیں میں نے اپنے بیوی بچوں کے لیے ایک ایک کر کے جمع کیا ہے۔

میری سال بھر کی کمائی!

اور یہ اسی طلائی کمر بند کا بوجھ تھا۔ جو مجھے دریا کے پار لے آیا، دریا کے اس کنارے سے اس کنارے پر، میری بیوی اور بچوں کے پاس۔۔۔! جب میں دریا میں تیر رہا تھا۔ تو میری بیوی اور میرے بچے میرے کندھوں پر تھے۔“““(۲۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس تیراکی کا علم نہ رکھنے والے نے دریا کو عبور کرنے کی وجہ صرف اور صرف اپنے مقصد کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ میرے سامنے ایک منزل تھی۔ جسے میں نے حاصل کرنا تھا۔ اسی لیے کوئی بھی مسئلہ مجھے مسئلہ نہیں محسوس ہوا اور میں ادھر ادھر بھی نہیں ہوا۔

انسانی زندگی اونچ نیچ، نشیب و فراز اور عروج وزوال کا مجموعہ ہے اور ہم ہر روز نئ نئ مشکلوں میں گھرتے رہتے ہیں اور پرانی مصیبتوں سے بھی چھٹکارا پاتے رہتے ہیں۔ مگر جب تک زندہ ہیں ایسا تو چلتے ہی رہنا ہے۔ آخری سانس تک ہم نے ایسے ہی جینا ہے اور جیتے رہنا ہے۔ مگر بعض انسان ان تمام مصائب سے مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے اور وہ مایوس ہو جاتے ہیں یا پھر زندگی سے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ جس سے وہ زندگی اور زندگی کے مقاصد سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور تباہی وزوال ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

ان تمام مصائب میں سب سے بڑی مصیبت اور مشکل انسانی زندگی میں غربت ہے اور دنیا کے ہر بڑے سے بڑے فلسفی اور دانشور نے بھی غربت سے پناہ مانگی ہے اور اس سے بچنے کی تدبیر کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے اس سے نجات کے لیے دعائیں بھی کی ہیں۔ جبران نے اسی خیال پر ایک افسانہ "جرمِ غربت" لکھا ہے۔ جو اپنے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ غربت کی تباہ کاری اور اس کا انسانی زندگی میں کیا کیا مضر عمل دخل ہے، پر لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جبران نے اس افسانے میں غربت کی کئی تباہ کاریاں اور مسائل گنوائے ہیں اور کہا ہے کہ دنیا عیش و عشرت میں پڑی ہوتی ہے اور یہ غریب شخص تمام آسائش وآرام سے دور کہیں چلچلاتی دھوپ میں بیٹھا کھڑا کام میں مشغول ہوتا ہے اور فکرِ روزکار میں پریشان۔ اس کی تمام تمنائیں اور خواہشیں، حسرتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور کبھی کوئی خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ شام ہوتے ہی تمام ذی روح گوشۂ عافیت میں چلا جاتا ہے اور سکون کی نیند سوتا ہے مگر اس سے تو نیند بھی کوسوں دور ہی رہتی ہے اور اس کا تعلق تو آہ و درد سے ہے اور نالہ و بکا سے ہے۔

لیکن جبران نے ان تمام غربت کے پیدا کردہ مسائل میں جو سب سے برا اور تکلیف دہ مسئلہ گنوایا ہے ، جو ان تمام مسائل سے کہیں گھمبیر اور خطرناک ہے، وہ یہ کہ غریب آدمی غربت اور روزی کی کشمکش میں ہی اپنا مقصدِ حیات بھول جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ تمام عمر تارِ حیات کو ہی قائم رکھنے میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ باقی کچھ حاصل ہی نہیں کر پاتا۔ جبران لکھتا ہے:

> "فقر وفاقہ نے اسے جذبات سے یکسر عاری کر دیا تھا اور ہر قسم کے احساس سے بالکل بے بہرہ۔
>
> وہ نہیں جانتا تھا کہ مقصدِ حیات، رشتۂ حیات قائم رکھنے کی حد سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ جرمِ غربت نے اس کی روح کو پابہ زنجیر کر دیا تھا اور محبوس طوق وسلاسل۔"(۲۹)

بے شک انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اپنے مقصدِ حیات کو بھول جانا ہے اور غربت کا سب سے برا نقصان ہی اپنے مقصدِ حیات سے دوری اور لاحاصلی ہے۔

دنیا کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کے ہاں انسانی زندگی کو سمجھنے اور اسے کام میں لانے کی ترغیب کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتی ہے۔ ایسے ہی نظریات تو کسی بھی ادیب یا شاعر کو بڑا بناتے ہیں اور سوسائٹی میں اس کا کردار ہمٰن سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں میں ہمیں ہمارے ادیب اور شاعر اپنی نگارشات میں جستہ جستہ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

جبران نے زندگی کا مقصد دوسرے کئی ادیبوں اور شاعروں کی طرح اپنے افسانے "شمع سے" میں شمع کی زندگی سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اور اس شمع کی مثال اور استعارے میں جبران نے سورج کو بھی شامل کیا ہے کہ یہ دونوں خود جلتے رہتے ہیں اور ڈٹ کر تاریکیوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور آخر کار ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی دن رات محنت اور مستقل مزاجی کا درس بھی دیتے ہیں۔ اس میں چاند اور اس کی تاریکی خلاف مزاحمت اور ہمت کی بھی مثال دی ہے۔ انھیں کی طرح خود کو سوختہ سامان کر کے دوسروں کے لیے بہترئی کی راہیں روشن کرنی چاہییں۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

> "تفسیر سوز شمع! تو اس قدر مضطرب ہے شاید خود جل جل کر اوروں کو جلانے کے احساس سے۔ لیکن! لیکن! سر حیات بھی تو اسے ہی کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آفتاب اپنے سینے سے آتشیں شعاعیں نکالتا ہے۔ بوڑھی زمین کی تھکی ہوئی ہڈیوں کو گرمی پہنچانے کے لیے، ماہِ شب رات بھر اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں دیتا ہے۔ کائنات کی تاریکیوں کا سینہ چیرنے کے لیے۔"(۳۰)

زندگی کا مقصد ہی اوروں کے کام آنا ہے اور اوروں کے کام آنے کے لیے خود کو جلانا اور تپانا پڑتا ہے۔ بل کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دوسروں کے غم میں تڑپنا بھی پڑتا ہے اور ان کے لیے دعائیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ اس تناظر میں سب سے زیادہ شمع، سورج اور چاند کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

اس افسانے کے آخر میں جبران نے زندگی کے محدود اور فانی ہونے کی وجہ سے زندگی کے چند لمحات اور اس کی تلخیوں پر تڑپنے کی بجائے کسی اور کے کام میں لا کر اسے سرخرو کر لینا چاہیے۔ کہتے ہیں:

"رات دھیرے دھیرے صباح میں تبدیل ہونے کو ہے اور بادِ صبا کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ وقت نایاب ہے اور پھر نہ آنے والا۔

اسے تو جان فروش پروانوں کی سرفروشی کی داد میں گزار دے۔"(۳۱)

زندگی اور وقت دونوں ہی نایاب اور کم ہیں۔ اس لیے اسے نفرت، غم، غصے اور فضول سرگرمیوں میں گزارنے اور ضائع کرنے کی بجائے کی ہمدرد اور صاحبِ دل اور صاحب درد پر نثار کر دینا چاہیے۔ اور یہی زندگی اور حیاتِ فانی کا اصل اور صحیح مقصد ہو سکتا ہے۔

انسان دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ بن کر آیا تھا مگر دنیا کے حرص و طمع نے اسے دنیا کا ہی پجاری اور منگتا بنا دیا ہے۔ جہاں صبر و عاجزی اور تحمل کا دامن تھامنا تھا وہیں انسان نے قتل و غارت اور نفرت و دشمنی کو اپنا لیا ہے۔ علم پر جہالت کو ترجیح دے رکھی ہے اور امن و آشتی کی جگہ اس نے جنگی اور عسکری طرزِ عمل نبانا شروع کر رکھا ہے۔ آزادی کے تحفے کے بجائے غلامی کی لعنت کو سینے میں سجا کے بیٹھا ہے اور اسے افسوس بھی نہیں، بس یہی افسوس ہے۔

جبران کے ہاں اسی مقصدِ حیات سے دوری اور دنیاوی کاموں میں مشغولیت پر خوبصورت افسانہ "انسان" ملتا ہے۔ جس میں جبران نے انسان کے ساتھ ایک بھرپور مکالمہ کیا ہے اور اسے اس کے اصل مقام کی طرف جانے کا اشارہ بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ تیرا مقام کیا تھا اور تو اب کس مقام پہ کھڑا ہے۔ افسانے کی ابتدا سے اقتباس دیکھیے:

"انسان! جسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اور مالکِ دو جہاں نے زمین کا حکمران بنایا۔

جس نے سینکڑوں پیچیدہ مسائل اپنی کمزور انگلیوں سے سلجھا کر رکھ دیے، سمندر کو اپنا تابع فرمان بنایا اور ہوا کو فرماں بردار۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور معصومیت سے ملائک کا مقابلہ کرتا تھا۔"(۳۲)

اسی افسانے میں جبران نے انسان کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہے جو اس نے اپنے مقام اور معیار سے گر کر اپنا لیا ہے۔ جس سے اپنا مقصدِ حیات بھول گیا ہے، دیکھیے:

"پر آہ! وہی انسان آج اپنی وجہ ہستی اور مقصدِ نمود بھول چکا ہے۔ جہل، عناد اور کبر ونخوت نے اس پر غلبہ کر لیا۔ آشتی وآزادی کے تحفے کو اس نے جنگ اور غلامی میں بدل دیا۔

اس سے روحِ انسانیت چھن گئی۔ اس کی جگہ ایک پیکرِ فریب وحسد ہے اور مجسمہ ظلم وستم، بردباری وپاکیزگی پر آج تشدد وبربریت حاوی ہے۔۔۔۔ ہلاکو کا استبداد اور چنگیز کا جوروظلم دہرایا جا رہا ہے اور زمانہ جاہلیت کی بھولی بسری دہشت انگیزیوں کی طرف رجوع ہے۔"(۳۳)

واقعی انسان دنیا میں آ کے اپنا مقصدِ حیات اور زندگی میں کرنے والے کام بھول گیا۔ جو اس کے پیدا کرنے والے نے اس کے ذمے لگائے تھے اور جس وجہ سے اسے مسجودِ ملائک ٹھہرایا تھا۔ پھر انسان اپنے مرتبے سے بھی گرتا چلا گیا۔ اب انسان کو چاہیے کہ اپنے اصل مقصدِ حیات کی طرف رجوع کرے اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرے۔

انسان عام طور پر اپنی زندگی میں اتنا مصروف ہے کہ اسے اپنے ارد گرد اور پاس رہنے والوں کی مطلقاً پرواہ نہیں ہوتی۔ اور بعض اوقات تو اتنا غافل ہو جاتا ہے کہ سامنے رہنے والے رشتے بھی اس کے لیے بیگانے

ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنے گھر کی دیواروں میں ایسا محصور ہوتا ہے کہ اسے چاردیواری سے باہر کچھ نظر نہیں آتا۔

یہ معاملہ اس وقت اور بھی گھمبیر اور خطرناک ہو جاتا ہے جب یہ تغافل کسی ایسے طبقے سے ہو جو واقعی میں ہماری ہمدردی اور توجہ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔یعنی غریب،نادار اور مفلس لوگ۔ جن کو دن رات امیروں اور مالدار لوگوں کی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ جبران نے انھیں لوگوں سے ہمدردی اور حق جتلانے کے لیے افسانہ ''پوشیدگی'' لکھا ہے۔ جس میں اس نے معشرے کے پسے اور کمزور لوگوں سے غفلت برتنے سے اجتناب برتنے کا درس دیا ہے اور نہ صرف ان سے ہمدردی کا کہا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی کا مقصد اور راز پانا چاہتا ہے تو غریب لوگوں سے ہمدردی اور رحم کا معاملہ رکھے۔انھیں غریب ونادار لوگوں کے قرب سے انسان کو زندگی کا اصل مقصد اور راز ہاتھ آتا ہے۔ جبران لکھتا ہے:

> ''صرف سرمایہ داری کے کچلے ہوئے انسان ہیں جو ابھرنے کی ناکام کوشش میں ہر بار لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں یا بربطِ ہستی کے شکستہ تار ہیں جنہیں حسرتوں نے نکما کر دیا۔
>
> اس کے سوا نہ لکشمی دیوی کی کرم فرمائی ہے اور نہ مایا دیوی کا سایہ عاطفت۔
>
> تم ان سے کتنی ہی نفرت کرو۔ کتنا ہی کترا کر دور بھاگو لیکن اگر تمھیں حیات کی تہہ تک پہنچنے کی آرزو ہے تو دیکھو اور غور کرو کہ تمہارے دھتکارے ہوئے انھیں غریبوں کی آہوں میں رازِ حیات پوشیدہ ہے۔ ان کی اشک آلودہ آنکھوں میں تھرتھرا رہا ہے اور دلِ پژمردہ کی دھڑکن میں نہاں۔
>
> رازِ حیات! جس کے لیے تم اس قدر سرگرداں ہو اسے غریب کی جھونپڑی میں ڈھونڈو۔ اس کے نالوں میں تلاش کرو اور اس کے افسردگی میں تیرتے ہوئے دل میں جھانک کر دیکھو۔''[۳۴]

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو اصل مقصدِ حیات اور رازِ حیات غریب کی کٹیا میں ہی ملتا ہے۔ ایک قدر درد بھرا دل اور اس دل میں انسانوں کے لیے ہمدردی اور صحیح معنوں میں کسی دوسرے سے پیار کی دولت کسی کمزور اور غربت کے مارے انسان کی آہوں اور سسکیوں میں ہی نظر آتی ہے۔ جب ہم کسی غریب کی مدد کرتے ہیں، اس کا اچھا بھلا سوچتے ہیں تو ہمیں ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوتی ہے جو ہمیں لاکھوں نیکیاں کر کے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اس افسانے کی مدد سے جبران نے جو مقصدِ حیات کی ترجمانی کی ہے وہ یہی ہے کہ جہاں ہم اپنی دولت اور مال سے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں ہمیں اپنے ہی جیسے انسانوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے جو انسان ہو کر بھی انسانوں جیسی زندگی گزارنے سے قاصر ہیں۔ زندگی وہی ہے جو دوسروں کے دکھ درد اور ان کے احساس میں گزرے، وگرنہ انسان اور جانور میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔

کوئی بھی چیز جب وجود میں آتی ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اسی طرح انسانی زندگی کا بھی مقصد ہے اور یہ مقصد دنیاداری کے تمام مقاصد سے بڑھ کر ہے اور یہ خیال جبران نے اپنے کئی ایک افسانوں میں بھرپور بیان کیا ہے۔ جبران نے عموماً تو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھے ہیں مگر بعض افسانے اپنے موضوع کی وسعت کے لحاظ سے تھوڑے طویل افسانے ہیں۔ ایسے ہی افسانوں میں ایک افسانہ "مرشد کا فرمان" بھی ہے۔ اس افسانے میں جبران نے زندگی، وجود اور ہر شعبہ ہائے زندگی سے متعلقہ لوگوں اور ان کے کاموں کے لحاظ سے تبصرہ کیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جبران اپنے تمام خیالات کو اپنے اسی ایک ہی افسانے میں بیان کر دینا چاہتا ہے۔ اس افسانے میں ایک شاگرد اپنے استاد کی تعلیمات اور فرمودات کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہے اور انھیں بتانا چاہتا ہے کہ اس کا استاد، استادِ زمانہ تھا اور وہ خود میں ایک جامع العلوم شخصیت تھے۔ اس افسانے میں اسی تکنیک اور فن سے تمام لوازماتِ زندگی پر بحث کی گئی ہے۔ مرشد کا شاگرد ہر ہر شہر میں اپنے استاد کے نظریات کی تبلیغ کرتا پھرتا ہے جس کی وجہ سے جبران نے اپنے نظریات کو کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔ انسانی زندگی کے مقصد کے بارے میں بھی بیان کرتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد فقط

دوسروں کے کام ہی آنا ہے اور انسان وہی ہے جو اچھے برے حالات میں دوسروں کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔اس سارے نظریے کو بیان کرنے کے لیے جبران نے معاشرے کے مختلف کرداروں اور صاحبِ حیثیت لوگوں کی مثالیں بھی دی ہیں وہ کہتا ہے کہ اگر تم سیاست دان ہو تو لوگوں کا سوچو نہ کہ اپنے من کا سوچو اور لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔دیرپا اور مستقل بنیادوں پہ رہنے والے اقدامات اٹھاؤ۔اگر تم تاجر ہو تو کم منافع کماؤ یہ نہ ہو کہ تم لوگوں کا خون چوسنے لگو اور بے ایمانی سے اپنا کاروبار بڑھانے کی سوچو اور اگر تم مذہبی پیشوا ہو تو تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہیں بل کہ اپنے زورِ بازو سے زندہ رہو۔لوگوں کی سادہ لوحی اور اخلاص سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔اب چاہے تمھارے سر پر بزرگی کی دستار رہے یا نہ رہے یا پھر تمھارے بدن پر پارسائی کا جبہ اور عمامہ رہے یا نہ رہے۔اگر صحافی ہو تو صحافت کی پاکیزگی کو منڈی میں لے جا کر نہ بیچو اور صحافت کو صحیفوں کی طرح پاک اور سچا مانو اور ہمیشہ سچائی کا ہی ساتھ دو۔اگر تم معلم ہو تو لوگوں کو تاریخ سے آگاہ کرنے اور انھیں آگے بڑھنے کا درس دو اور ساتھ ہی ساتھ ذرا خود بھی عمل کرو نہیں تو تمھارا علم ہی تمھاری بربادی کا سبب ہے۔اگر تم حاکم ہو تو اپنے ماتحتوں کو کبھی برا نہ سمجھو اور ان سے ہمیشہ برابری کا سلوک کرو اور ان کی جیبوں پر ڈاکا نہ ڈالو اور ان کا خیال کرو جیسا کہ ایک حاکم کو کرنا چاہیے۔اگر خاوند ہو تو بیوی کا خیال رکھو اور اس کا لبادہ بن کے رہو دونوں ایک دوسرے کی عزت بن کے رہو۔اگر منصف ہو تو عوام کا خیال اپنے جیسا ہی کرنے کی کوشش کرو نہ کہ خود بلند رہنے کی کوشش میں سارے عوام کا جینا محال کر دو۔اگر مفکر ہو تو اپنے اندرونی جذبات کا محاسبہ کیا کرو اور خود کا تصفیہ ہر لمحے کرنا تم پر فرض ہے۔اگر شاعر ہو تو شور و غل کرنے کی بجائے اصل جذبات کی شاعری کی طرف آؤ جو لوگوں کو ان کے جذبات اور احساسات سے ملا دے نہ کہ لوگوں کو آرام اور سکون کی نیند سلا دے۔ایسے ہی کرداروں پہ بات کر کے زندگی کا مقصد ہر پہلو سے سمجھانے کے بعد آخر پہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ”اے میرے دوستو!اس طرح ساری دنیا دو حصوں میں منقسم ہے۔یہ دو حصے دو ستونوں کی طرح ہیں۔ایکستون بوسیدہ اور جھکا ہوا ہے جو لوگ اس ستون کا سہارا لے کر سفر زندگی شروع کرتے ہیں وہ زندگی کی راہوں میں قدم قدم پر تکان اور پژمردگی کی

وجہ سے ہنستے ہیں اور اسی طرح محسوس کرتے ہیں جیسے وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پہ چڑھ رہے ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ اکثر ذلت کی گہرائیوں کی طرف جارہے ہوتے ہیں۔

دوسرا استون محکم ہے اس میں جوانی ہے وہ اپنے پاؤں پر چلتا نہیں بلکہ اڑتا ہے۔ اس کے ہونٹ زندگی کے نغموں سے معمور ہیں اور وہ کامرانی کی چوٹیوں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے جیسے کوئی طلسمی قوت اسے چوٹیوں کی طرف کھینچے چلی جارہی ہو۔"(۳۵)

اوپر بیان کیے گئے کرداروں اور معاشرتی لوگوں کے رویوں کی اصل عکاسی تو اسی پیراگراف میں بیان کی گئی ہے کہ زندگی کا مقصد تو لوگوں کے کام آنا اور انصاف سے زندگی گزارنے کے ساتھ ایسے ایسے پہلوؤں کو ساتھ لے کر چلنا ہے کہ انسان کی زندگی کو کوئی غیبی طاقت اور طلسمی قوت ساتھ لے کر آگے بڑھتی چلی جائے اور اگر ہم زندگی کو صحیح سے نہ نبھاہ سکیں تو لازم ہے کہ ہم نے اس دنیا کے پہلے ستون کو تھام لیا ہے جو نہ اپنی مدد کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے لیے کچھ کر سکتا ہے اگر ہم زندگی کے دوسرے ستون کو تھام لیں تو ہماری زندگی توانا اور صحت مند اقدامات کے ساتھ رواں دواں چلتی ہوئی دکھائی دے اس طرح ہم اپنی زندگی کے مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی سود مند ہو سکتے ہیں۔ مگر دوسرے ستون کو تھامنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دن رات محنت اور ریاضت سے کام لیں نہ کہ ہم دوسروں پہ انحصار کیے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا بیٹھے رہیں۔ جبران کے نزدیک مقصدِ زندگی کا حصول انھیں ہی حاصل ہوتا ہے جو جہدِ مسلسل اور ریاضتِ کاملہ سے زندگی گزارنے کے عادی ہوتے ہیں۔

جبران نے جس ماحول اور معاشرے میں آنکھ کھولی وہ معاشرہ بالکل اخلاقی اقدار کی گراوٹ کا شکار تھا اور ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ لوگ دوسروں کی مدد کیا کرتے اپنی آپ مدد کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو ان کے حالات کا خراب ہونا اور دوسری وجہ ان لوگوں کے ذہنوں اور ضمیروں کا گھن لگ چکا تھا اور وہ ایک دوسرے کی نہیں بل کہ اپنی اپنی آپ سوچتے تھے جس وجہ سے وہ زوال کا شکار ہو

گئے تھے۔ ایسے ہی معاشرے میں جب کوئی شعور کی دہلیز پہ قدم رکھتا ہے تو یقیناً اس کے سامنے کئی ایک کٹھن راہیں ہوتی ہیں جن کو پاٹتے پاٹتے اس کی عمر گزر جاتی ہے اور پھر کہیں جا کے وہ اس تصور کے لیے راہیں ہموار کر پاتا ہے جس کا اس نے خواب دیکھا ہوتا ہے۔

جبران نے نہ صرف لوگوں میں شعور کی جوت جگائی تھی بل کہ اس نے لوگوں میں آگے بڑھنے کی تڑپ اور نئے منصوبوں کی شمع بھی روشن کرنی تھی۔ جس کے لیے اس نے انقلابی افکار اور باغیانہ طرزِ فکر کو اپنایا اور یوں اپنا راستہ زمانے کے راستے سے الگ بنایا۔ ایسے ہی انقلابی افکار کی جبران کے ہاں بھرمار ہے مگر ایک افسانہ جس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے وہ ہے ”میرے بھائیو“۔ اس افسانے میں جبران نے اپنے انقلابی افکار کو زندگی اک مقصد بنا کر پیش کیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جبران جو جو کہنا چاہتے تھے وہ اپنے اس افسانے میں کہہ گئے ہیں۔ اس افسانے میں ایک ہی کردار ہے جو اپنے معاشرے کے لوگوں سے مخاطب ہو ہو کر بات کرتا ہے اور ان سے بار بار کہتا ہے کہ میں نے تمھیں زندگی کے مقاصد سمجھائے تمھیں بھائیوں کی طرف بلایا اور تمھاری خیر کی ہی بات کی مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ اب تم اذیتوں اور تکلیفوں میں ہی زندگی گزاروگے اور اب میں تم سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں جتنی کہ کبھی محبت کیا کرتا تھا۔ اس نفرت سے بھی تمھیں ہی فائدہ ہوگا کیوں کہ شفقت لاگوں کو بگاڑ دیتی ہے اور نفرت، سختی لوگوں کو نئی راہیں بھی سجھاتی ہے۔ اس سارے افسانے کو کمال مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ جبران اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کے ساتھ کتنے مخلص ہیں۔ ایک پیراگراف دیکھیے:

> ”میں نے تمھیں پکارا مگر تم نے اپنے تکیوں سے سر بھی نہ اٹھائے بلکہ خوابوں کی افواج سے مغلوب ہو کر رہ گئے۔
>
> میں نے تم سے کہا کہ آؤ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائیں تا کہ تمھیں دنیا کے ملک دکھاؤں۔ تو تم نے جواب دیا کہ تمہارے باپ دادا نے اسی وادی کے نشیب و فراز میں زندگیاں بسر کیں اور اسی دامن کے سائے میں مر گئے اور یہیں غاروں میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا

پھر ہم کس طرح اس وادی کی گہرائیوں کو چھوڑ کر وہاں جائیں جہاں ہمارے باپ دادا نہ گئے۔

میں نے تم سے کہا کہ آؤ میدانوں کی طرف چلیں تا کہ میں تمہیں سونے کی دکانیں اور زمین کے خزانے دکھادوں۔ تو مت نے جواب دیا کہ میدانوں میں چوروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ درپیش ہے۔"(۳۶)

مندرجہ بالا تین باتوں کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جبران کا اس افسانے میں اسلوب اور موضوع کیسا اور کیا ہو گا۔ اور وہ ہمیں زندگی کے جس مقصد کی طرف بلانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے۔ واقعی میں ہم اگر زندگی میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے بزرگوں کے گھسے پٹے نظریات اور روایات کو چھوڑنا ہو گا۔ ایک دوسرے کی بات کو تب قدر کی نگاہ سے دیکھنا ہو گا جب ہمیں کوئی پستی سے نکال کر بلندی کی طرف بلانے کا قصد کرے۔ ہم واقعی میں راشنی سے گھبرانے والے اور اندھیروں میں رہنے کے عادی ہیں۔ جبران نے اس اقتباس میں ہمیں یہ بھی پیغام دیا ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہمیشہ مشکلات کی جنگ لڑنی پڑتی ہے اور ہمیں ہر صورت میں ثابت قدم رہنا چاہیے اور ایسی ہی کئی ایک باتیں وہ اپنے اس افسانے میں کہتا ہے اور جب لوگ اس کی باتوں پہ عمل نہیں کرتے اور اسے خاطر میں نہیں لاتے تو وہ لوگوں سے تب تک نفرت کا اعلان کر دیتا ہے جب تک لوگ بھلائی اور محنت کے راستے پر نہیں آجاتے۔ اپنے ہم عصر لوگوں کو جب بھی مخاطب کرتا ہے تو انھیں بھائی کہہ کر پکارتا ہے اور شاید اسی لیے اس افسانے کا نام بھی میرے بھائیو رکھا گیا ہے۔ وہ لوگوں اپنی نفرت کا اظہار بھی کر دیتا ہے اور وہ اس لیے نفرت نہیں کرتا کہ وہ اپنی ذات کی تسکین چاہتا ہے۔ نہیں، بل کہ وہ اپنی نفرت کی وجہ افسانے کے آخر پہ کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ اے میری ماں کے بیٹو!

کیونکہ تم بزرگی اور عظمت سے نفرت کرتے ہو۔

میں تمہیں حقیر سمجھتا ہوں۔

کیونکہ تم اپنی خودی کو حقیر سمجھتے ہو۔

میں تمہارا دشمن ہوں۔

کیونکہ تم اللہ کے دشمن ہو۔

لیکن۔۔۔۔۔تم نہیں جانتے۔"[۴۷]

اس اقتباس سے مصنف ہمیں جو زندگی کا مقصد سمجھانا چاہتا ہے وہ بخوبی عیاں ہے۔

iii. انسان کا معاشرتی کردار

انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور زندہ رہنے کے لیے اسے ایک معاشرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جتنا ہی معاشرہ ایک فرد کی خوشیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے اتنا ہی اجتماعی زندگی کے لیے بھی معاشرہ اہم اور خاص ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان معاشرے میں اپنا کردار ادا نہیں کرتا تو وہ صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتا بل کہ وہ پورے معاشرے پہ بوجھ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قومیں ترقی نہیں کرتیں جن کے ہاں غیر ذمے دار، نالائق اور نکمے لاگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ جو معاشرے پہ ہمیشہ اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے بوجھ بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ معاشرہ جہاں ضعیف لوگوں کی بھی تعداد زیادہ ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا کیوں کہ ایک بوڑھا شخص ایک گھر پہ ہی نہیں بل کہ پورے معاشرے پہ بوجھ ہوتا ہے۔ ایک فرد کا ترقی کرنا، ایک ممعاشرے کا ترقی کرنا ہے اور ایک معاشرے کا ترقی کرنا، پوری قوم کی ترقی کا سبب ہے اور جب کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو دنیا میں وہ سر اٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنے سے کمزور لوگوں کی مدد بھی کر سکتی ہے۔ علی عباس جلال پوری نے اس بارے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ذاتی نجات کے حصول کے لیے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ دنیا سے کنارہ کشی کر کے تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے اور اس دنیا میں عوامی بہبود کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں غلطاں رہے ہیں۔ جس سے معاشرے کی ترقی پرور قوتوں کو ناقابلِ بیان صدمات پہنچتے رہے ہیں۔ قدما کے خیال میں فرد معاشرے کے لیے ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کے لیے نہیں ہوتا۔"(۳۸)

قدماء، اہلِ نظر اور معاشرے کی بنیادی عظمت کو سمجھنے والے دانش وروں کا کہنا ہے کہ ذاتی مفاد کے حصول کی جدوجہد سے معاشروں کا نظام خراب ہوتا ہے۔ چاہے پھر کوئی مذہبی رنگ میں تجرد، رہبانیت اور زاویہ نشینی اختیار کرے معاشرے کو یہ قبول نہیں۔ معاشرے کے لیے بہتر یہی ہے کہ اس کی بہتری کے لیے اپنا کردار ادا کیا جائے۔ خلیل جبران کے ہاں معاشرتی زوال کی وجہ خود انسان ہے جس کی بہتری اور عمل پر اکسانے کے لیے اس نے کئی ایک کہانیاں لکھی ہیں۔ ایسی ہی اک کہانی جبران نے "بازیافت" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں مصنف نے انسان کو ماضی کے مشکل حالات سے مایوس ہونے کے بجائے حال کے اچھے حالات سے لطف اندوز ہو کر مسرت سے جینے کا مشورہ دیا ہے اور بار بار اسے کہا ہے کہ گزرے ہوئے ایام، گزری ہوئے ناکامیاں اور گزشتہ شورشوں کو بھول جاؤ۔ یہ رنج و الم کی داستانیں تباہ کر دیتی ہیں انھیں بھول جاؤ۔ لکھتے ہیں:

" بھول جاؤ گزری ہوئی ناکامیوں اور رفتہ و گزشتہ شورشوں کو! کم از کم کچھ دیر کے لیے تو بھول جاؤ۔ رنج و الم کی داستانوں اور مصائب کے لرزہ خیز افسانوں کو فراموش کر دو اور صفحہ ء دل سے اک قلیل عرصے کے لیے محو۔ لحاتِ حیات مختصر ہی تو ہیں انھیں یادِ ایام میں سرنگوں رہ کر کیوں گنوایا جائے۔ ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔"(۳۹)

یہ بات بالکل بجا ہے کہ جب آدمی مایوس ہو جائے تو اس کا کردار معاشرے میں نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے اور وہ ماضی کی بھول بھلیوں، دھوکوں، سازشوں اور مصائب میں کھویا رہتا ہے، شکوے، شکایات اور اچھے دنوں کے قصے اس کی زبان پر رہتے ہیں، پر مصنف ایک انسان کو ایسے ہی درد انگیز لمحات سے نکال کر حال کے خوش گوار لمحات کی بازیافت کا مشورہ دیتا ہے اور اسے اپنی زندگی دوبارہ سے شروع کرنے کا مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ابھی بھی بہت کچھ باقی ہے اگر تو ہمت کرے اور نئی دنیاؤں کو تلاش کرے تو ابھی بہت کچھ ہے جو صرف تیرا ہی انتظار کر رہا ہے اور اسے ماضی سے نکال کر حال اور مستقبل کی اچھی گھڑیوں کا عندیہ بھی دیتا ہے جو تیرے ہی لیے ہیں۔ اسی کہانی میں آگے کہتے ہیں:

> "تم کھوئے ہوئے لمحات کے متلاشی ہو حالانکہ آنے والی گھڑیاں ان سے بھی کہیں قیمتی ہیں۔ اس کی تو کچھ قدر کرو کہ بہار مسلط بر سر دہر ہے اس کی تابشیں ہر ذرہ مدہوشی میں سرسراتی ہیں۔۔۔۔ کیا تمھیں اس امر کا اندازہ نہیں کہ بہار کو سامانِ عیش لاتے دیکھ کر عندلیبِ دل نگار بھی تلخیِ ایام بھول گئی۔۔۔۔۔ دریا کا چلتا ہوا پانی بھی بہار کے مسرت خیز تاثرات سے خالی نہیں۔ وہ اک اندازِ والہانہ سے بہہ رہا ہے۔۔۔۔ مگر حیرت ہے کہ تم ابھی تک زمزمہ سرائیوں پر کمر بستہ نہیں۔۔۔۔ اُف! اٹھو! بہپار کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوؤ اور اس کی دلفریبیوں سے محظوظ۔ زندگی کے دن دو چار ہی تو ہیں اور عالم ناپائیدار محض۔"(۴۰)

افسانے میں بیانیہ انداز اختیار کیا گیا ہے اور اس میں جبران نہایت خوبصورتی سے مایوس لوگوں کو مایوسی اور ماضی پرستی سے نکال کر نئے مزمانے میں آنے کی دعوت دی ہے اور کہا ہے کہ ماضی کی دردناک اور تکلیف دہ زندگی سے نکلو اور دیکھو بلبل بھی اپنا درد بھول کر بہار سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور دریا بھی اپنی روانی میں مست ہے تو پھر اے انسان تو کیوں پریشانِ محض ہے۔ زندگی چار دن کی ہے اسے بھرپور انداز میں خوشیوں سے جی۔ وگرنہ یہ عالم تو سارا ہی فنا ہو جانے والا ہے۔ اپنی ناکامیوں کو بھول کر آنے والے اچھے دنوں کی خاطر اٹھ اور لوگوں کے لیے اپنا کردار ادا کر کے دکھا۔

جبران اپنے ایک افسانے "پروانہ سے" سے مکالماتی اور تمثیلی انداز میں انسان کو اس کا معاشرتی کردار سمجھاتے ہیں اور اسے بتاتے ہیں کہ اگر ایک چھوٹا سا کیڑا اور مختصر سا حشرات الارض اپنا مقصد اور معاشرے میں اپنا کردار نہیں بھولا تو تُو تو افضل المخلوقات ہے تو اپنا فرض کیسے بھول جاتا ہے۔ حالانکہ پروانہ تو اپنا کردار ادا کرتے ہوئے جان سے بھی ہاتھ دھولیتا ہے اور تو ایسی کسی کردار سے نبرد آزما بھی نہیں۔ ہاں کبھی ایسا موقع بھی آئے تو پیچھے نہ ہٹنا اور جان کی بازی لگا دینا۔ یاد رکھ! یہ ننھا مجاہد، جانباز اور سرفروش! اپنی قربانی اپنے کردار کی عظمت کے لیے دے رہا ہے۔ کئی شب بیداریاں بھی اس پر نیند کا غلبہ طاری نہیں کر سکتیں۔ لکھتے ہیں:

"رات کی تاریکی رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ کائنات مردہ صد سالہ کی طرح خاموش ہے اور ہر ذرہ نشہ خوب میں لڑکھڑاتا ہوا۔ پرندے آشیانوں میں ساکت ہیں اور درندے جنگلوں میں خوابیدہ۔

لیکن تیری یہ شب بیداری کیسی ہے؟ تو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں جو شمع کی حیاتِ جاودانی اور اپنی قبولیتِ قربانی کے لیے دست بدعا ہے۔

تصویرِ درد! آسمان پر چاند بھی طلوع ہو گیا اس کا عکس جھیل کے پانی پر ناچ رہا ہے اور سمندری موجوں کے نغموں نے سال خوردہ دنیا کے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر دی۔

لیکن تُو! آہ! کہ تیری کائنات مشتمل بر یک شمع ہے اور اس کی آتشیں لَو میں ماحصل حیات پوشیدہ۔

لیکن آفریں تجھے! کہ لپکتے ہوئے شعلے کو بوسہ دینے کی تمنا اشتیاقِ فنا کو دوبالا کر دیتی ہے۔"[۴۱]

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنا معاشرتی کردار کرتے ہوئے ہر قسم کے خوف سے بالاتر ہونا چاہیے۔ کسی کے آرام وسکون اور آرام دہ زندگی کو دیکھنے کے بجائے اپنا کردار ادا کرنا

چاہیے۔ کوئی معاشرے میں کیا کر رہا ہے اور اپنا کردار ادا کر رہا ہے کہ نہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چا ہیے۔ پروانے کی طرح اپنی منزل پہ نظر رکھو اور اسی میں فنا ہو جاؤ۔ افسانے میں اس وقت جبران نے ایک عجب دل فریب ماحول بنالیا جب وہ اپنا کرادار ادا کرنے والوں کو انسانی عظمت سے اٹھا کر دیوتا کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے اور کہتا ہے " تو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں" یہی انسانی معاشرے میں اپنے کردار کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور زمانے پھر اسے ایسے ہی ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

جبران نے انسان کے معاشرتی کردار پر لاتعداد اور بہت اچھے اچھے اسلوب پر مبنی افسانے لکھے ہیں۔ جن میں ایک افسانہ "مجرم" بھی ہے۔ اس افسانے میں ایک نوجوان، تنومند لڑکے کے کردار کو دکھا کر معاشرے کی بے حسی دکھائی گئی ہے۔ ایک لڑکا جو غربت کی وجہ سے نہ اسکول پڑھ سکا، نہ کسی سیٹھ کے ہاں اسے کام ملا اور دو وقت کے کھانے پر بھی اسے کسی نے ملازمت نہ دی۔ مجبور ہو کر بھیک مانگی مگر کسی نے اسے بھیک بھی نہ دی چونکہ سب اسے موٹا مشٹنڈا کہہ کر ددھکار دیتے تھے۔ آخر کار اس نے لوگوں سے بدلا لینے کا سوچا اور یہ کہہ کر لوگوں پر ٹوٹ پڑا:

> "میں نے ماتھے کے پسینے کے عوض زندگی طلب کی، لیکن اسے نہ پایا۔ اب مین اسے اپنے بازوؤں کی قوت سے حاصل کروں گا! میں نے محبت کے نام پر روٹی مانگی، لیکن انسان نے کوئی توجہ نہ کی۔ اب میں ظلم و سرکشی کے نام پر روٹی ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ اس سے لوں گا اور وہ دینے پر مجبور ہو گا!"[۴۲]

ایک زمانہ گزر گیا اور وہی نوجوان اپنی لالچ اور ہوس کی وجہ سے ظلم پہ ظلم کرتا گیا اور لوگوں پہ ستم ڈھاتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی دولت بے اندازہ اور شجاعت عام ہو گئی۔ ملک کے ڈاکو اسے اپنا محبوب بنانے لگے اور ارکانِ حکومت نے اس سے ڈر کر اسے شہر کا چارج دے دیا اور نائب بنا دیا۔ اس سے سارے افسانے پر افسانہ نگار نے خود ہی تجزیہ پیش کیا اور ہمارے پورے معاشرے کے رویے پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"اس طرح انسان اپنی کنجوسی سے مسکین کو بدمعاش اور اپنی سنگ دلی سے امن پسند کو قاتل بناتا ہے!"(۴۳)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرتی رویہ بالکل بھی ٹھیک نہیں اور ہم اپنی سوسائٹی کے اکثر امن پسند لوگوں کو قاتل، مجرم اور نہ جانے کیا کیا بنا دیتے ہیں اور کمزوروں سے تھوڑا تعاون نہیں کرتے اور زورآور، طاقت ور کو بندوق کے زور پر سب کچھ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

جبران نے اپنے ایک اور افسانے "جل پریاں" کے ذریعے انسان کے معاشرتی کردار پر کھل کر طنز کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان جو اپنے معاشرے میں بڑا اچھا اور مثبت کردار ادا کر سکتا ہے وہ چند خود غرضیوں میں آکر اور لالچ میں پڑ کر بالکل بھی معاشرے کا خیر خواہ نہیں رہا۔ اس افسانے میں ایک امثالی اسلوب اپنا کر کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے کہ ایک سمندر میں موجود جزیروں کے کنارے ایک نوجوان کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے جل پریوں نے دیکھا تو آپس میں گفتگو کرنے لگیں کہ یہ کس انسان کی لاش ہے۔ یہ تین جل پریاں مختلف قیاس آرائیاں کرتی ہیں جو ہمارے معاشرے کی مجموعی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایک کہتی ہے کہ اس نے خود ہی بپھرے ہوئے سمندر میں چلانگ لگائی۔ دوسری کے بقول: یہ کسی جنگ میں آئے ہوئے نوجوان کی لاش ہے اور تیسری نے تو انسان کے معاشرتی کردار پر نہایت دلدوز طنز کیا ہے اور کہا ہے کہ انسان نے خشکیوں پر قبضہ کر لیا ہے اب سمندروں کی طرف بڑھا تو پانیوں کے دیوتا نے انھیں اس کی سزا دی ہے اور ازالے کے طور پر انسانوں کو کہا ہے کہ اپنے انسانوں کی "بلی" دو تا کہ اس قربانی سے تم انسانوں پر رحم کیا جا سکے۔ کہتی ہے:

"جنگ ونگ کو تو میں نہیں جانتی، کیا بلا ہے، ہاں! یہ جانتی ہوں کہ انسان نے خشکی پر قبضہ پا لینے کے بعد حرص کی کہ سمندر پر بھی حکومت کرے۔۔۔۔۔۔ جب اس کی اطلاع نبتون پانی کے دیوتا کو ہوئی تو وہ اس دراز دستی پر بہت برہم ہوا، اور انسان کے لیے سوائے قربانی کے کوئی چارہ نہ رہا۔"(۴۴)

مگر کہانی میں موڑ اس وقت آتا ہے جب یہ جل پریاں اپنی اپنی قیاس آرائیوں کے بعد حقیقت کا پتا چلانے کے لیے لاش کی جیبیں ٹٹولتی ہیں اور ان میں سے ایک خط بر آمد ہوتا ہے۔ جس کو پڑھ کر ایک خاص قسم کی ہمدردی اور رحم دلی کا احساس پیدا ہوتا ہے جو اس کی محبوبہ یا پھر بیوی کا ہے۔ جس میں اس کے جنگ پر جانے سے قبل ہونے والی ملاقات کے جذبات بھی رقم ہیں اور دونوں کی محبت کا قصہ بھی۔

اس خط میں محبت، وطنیت، فرض اور جنگ پر بحث کی گئی ہے اور تینوں کی وجہ سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا دکھ سے اظہار کیا گیا ہے۔ اس خط میں یہ بھی بتایا گیا ہے جو ہمارے معاشروں کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ غریب کے بچوں کو جنگ میں دھکیل دیا جاتا ہے مگر امیروں اور طاقت وروں کو وطن پہ قربان ہونے کے لیے جنگ میں نہیں بھیجا جاتا۔ ذرا اس محبوبہ کے الفاظ سنیے:

"یہ کیسا" اہم فرض" ہے جو غریب دیہاتیوں کے لیے تو ناگزیر ہے! مگر طاقت ور اور موروثی شریف زادے اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے؟

اگر "فرض" قوموں کی سلامتی کو تباہ اور "وطنیت" حیاتِ انسانی کے سکون کو تباہ کر دے تو ایسے فرض اور ایسی وطنیت کو دور ہی سے سلام۔"[۴۵]

اس خط کے آخر میں جل پریاں سارا خط پڑھنے کے بعد ان میں سے ایک خوبصورت تبصرہ کرتی ہے جو ہمارے معاشرے کی ساری قلعیاں کھولتا ہے اور ہمیں ہمارے معاشرتی کردار سے آگاہ کرتا ہے:

"جل پریوں نے وہ خط نوجوان کی جیب میں اسی طرح رکھ دیا اور غم ناک خاموشی کے ساتھ واپس ہو گئیں۔ تھوڑی دور جا کر، ان میں سے ایک نے کہا:

"انسان کے دل تو بتوں کے دل سے بھی زیادہ سخت ہیں!"""[۴۶]

اس کمال افسانے میں بنیادی طور پر کسی معاشرے میں رہنے والے لوگوں کو اپنی مرضی اور آزادی سے سوچنے اور امن سے رہنے کی خواہش کو ظاہر کیا گیا ہے۔

جبران کے ہاں معاشرتی کردار اور رویے پر مبنی بہت سی کہانیاں ملتی ہیں۔ جن میں ہر طرح سے معاشرتی کردار کو اجاگر کرنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اپنا منفی اور غیر منصفانہ کردار ادا کرنے والوں پر سرزنش اور ان سے بچنے کی تلقین بھی ملتی ہے۔ یہی ایک اچھے کہانی کار کا اسلوب ہوتا ہے کہ جہاں وہ برے لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے وہاں وہ ان لوگوں کو بھی سیدھے اور مثبت راستے پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی "اے ملامت کار" میں جبران ایک ملامت کار سے مخاطب ہے اور اس کی طرف سے ہر بات پر ہونے والی بے جا تنقید اور طنز پر خوبصورت کہانی لکھی ہے۔ جس میں وہ ملامت کار کو اپنی راہ لینے اور واسطہ چھوڑ دینے کا کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر میں غلط ہوا تو مجھے سزا میرے ضمیر کی عدالت دے گی اور اگر میں درست ہوا تو اس کی جزا بھی مجھے میرے ضمیر کی عدالت ہی دے گی۔ ایسے ہی معاشرتی کردار کے بارے جبران کہتے ہیں:

> "اے ملامت کار! مجھے چھوڑ دے اور نصیحت نہ کر اس لیے کہ مصائب نے میری چشمِ بصیرت کو وا کر دیا ہے۔ آنسوؤں نے میری بصارت کو چمکا دیا ہے اور غم نے مجھے دلوں کی زبان سکھا دی ہے۔"(۴۷)

اس کے ساتھ ملامت کار شخص ہمیشہ دولت کے لالچ دے دے کر آپ کو آپ کے مقصد سے بھی ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، سیاست اور عہدوں کے ساتھ ساتھ اقتدار کے بھی لالچ دیتا ہے مگر مصنف کہتا ہے کہ ایسے شخص سے بچو اور اپنی راہ میں لالچ کو نہ آنے دو اور قناعت پر قائم رہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرے میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو خود تو اپنا کوئی کردار معاشرے میں ادا نہیں کرتے اور دوسروں کو کام کرنے پر ملامت کرتے رہتے ہیں اور طعنے دے دے کر کوئی بھی کام کرنے نہیں دیتے یا کام کرنے سے پہلے ہی اس سے دل اچاٹ کر دیتے ہیں۔ جبران ایسے لوگوں سے کہتا ہے:

> "دولت کی کہانی اور عظمت کے قصے مجھے نہ سنا! کہ میرا نفس اپنی قناعت کی بنا پر بے نیاز اور دیوتاؤں کی عظمت و بزرگی کی پرستش میں محو ہے!

سیاست کی باتوں اور اقتدار کی خبروں سے مجھے معاف رکھ! کہ ساری زمین میرا وطن اور تمام انسان میرے ہم وطن ہیں۔"(۴۸)

ایسے ہی عقائد رکھنے والا شخص ایک معاشرے اور ملک کے لیے بہتر ہوتا ہے۔

جبران کا افسانہ "ملاقات" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں جبران کی معاشرتی کرداروں کے حوالے سے سوچ کھل کر سامنے آئی ہے۔ یہ افسانہ بھی تمثیلی اور امثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں دو محبت کرنے والوں کی ملاقات دکھائی گئی ہے جن کی محبت پر دل و جان سے آسمانی روحیں انھیں بار بار سلام پیش کرتی ہیں۔ یہ ملاقات پیار کے اقرار سے شادی کے بندھن اور پھر بوس و کنار کے استعاروں پر منتج ہوتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو تحفوں کے بدلے جو اس نے محبت میں دیے ہوتے ہیں ان کی تعریف میں چند کلمات ادا کرتی ہے جو جبران کی کسی معاشرے کے لیے سوچ ہے۔ وہ بیوی، وہ محبوبہ کہتی ہے:

"آہ تُو کتنا محترم دوست اور کتنا وفادار شوہر ہے۔ تیرے تحفے کتنے حسین اور تیری بخششیں کتنی نفیس ہیں! تُو نے میرے پاس ان نوجوانوں کو بھیجا، جو گہری نیند کے بعد بیداری تھے۔ تُو نے مجھے تحفہ میں وہ شہسوار عطا کیا، جو میری قوم کی کمزوری پر غالب آ گیا۔ تُو نے ہدیہ کے طور پر مجھے وہ ادیب دیا جس نے میری قوم کو بیدار کیا اور وہ نجیب مرحمت فرمایا، جس نے اس کی غیرتِ قومی کو بھڑکایا۔"(۴۹)

کیوں کہ جبران کا عہد انھیں تمام مسائل کا شکار تھا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد نے اشارہ بھی کیا ہے اور جبران کے عہد کے بارے فرماتے ہیں:

"اربابِ علم و دانش عزتِ نفس کو بالائے طاق رکھ کر ظالم حکمرانوں کے غلام بنے ہوئے تھے اور چند سکوں کے عوض اپنا علم بیچ رہے تھے۔ اصحابِ شعر و ادب محض حصولِ زر کی خاطر اپنے فن کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔۔۔۔۔ ہر شخص اپنے تھوڑے فائدے کے لیے بھی دوسرے کے بڑے بڑے نقصان کی کوئی پرواہ نہ کرتا اور پھر اس پر طرہ یہ کہ ان

سے کوئی باز پرس تک نہ کرتا۔ اور باز پرس کرتا بھی کون؟ جب کہ حکام بل کہ سلاطین کی روش تک بدلی ہوئی تھی۔"(۵۰)

اس اقتباس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جبران کے عہد میں مثبت معاشرتی کرداروں کی کتنی کمی اور فقدان تھا۔

ازل سے ہی انسانی معاشروں کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ معاشرے اپنے اہلِ علم، دانش ور اور صاحبِ فن لوگوں کی قدر نہیں کرتا، یا پھر اتنا مان سمان نہیں دیتا جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے معاشروں میں صاحبِ فن لوگوں کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں عزت و تکریم سے بھی نوازنا چاہیے۔ ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم زندگی میں تو ان فنکار لوگوں کی قدر نہیں کرتے مگر مرنے کے بعد جب ہمیں اس شخص کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے تو ہم اس کی یاد میں عرس مناتے ہیں، میلے لگاتے ہیں، اس کے نام کے سکے جاری کرتے ہیں، اس کے نام سے انعامات کی تقسیم کرتے ہیں اور اس کی یاد میں اس کے بت بھی نصب کروا دیتے ہیں مگر تغافل اس قدر ہے کہ زندگی میں اسے عزت نہیں دیتے اور سسکتا بلکتا مر جاتا ہے اور ایسا ہم زیادہ تر ادیب اور شاعر حضرات کے ساتھ کرتے ہیں اور انھیں ہم زندگی بھر عزت نہیں دیتے۔ جبران کو بھی اپنے عہد میں یہی مسائل درپیش تھے۔

جبران اپنی کہانی "شاعر کی زندگی" میں لکھتا ہے کہ شاعر ساری عمر اپنے خیالات جمع کر کر اور قوم کا درد سمیٹ سمیٹ کر جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی ذات کو کشید کر کے لفظوں میں بیان کرتا ہے اور زمانہ ایسے با کمال ادیب اور شاعر سے غافل رہتا ہے مگر جب وہ فوت ہو جائے اور دوسری دنیا میں چلا جائے تو اس کی یاد میں کانفرنسیں کرواتے پھرتے ہیں اور کئی ایک بت بھی نصب کروا دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد فقط عام لوگوں کی طرح اس کی قبر پہ مٹی ڈال دیتے ہیں اور دوسرے عام لوگوں کی طرح ہی اسے دفناتے ہیں اور اضافی کوئی عزت و تکریم نہیں کرتے۔ جبران لکھتا ہے:

"اب اس گھر میں، مٹی کے ایک ڈھیر اور ان اوراق کے سوا، جو اندھیرے میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، اور کچھ نہ تھا۔

صدیاں بیت گئیں اور اس شہر کے رہنے والے، بے حسی، لاپروائی اور سکھ چین کی نیند سوتے رہے۔ بالآخر جب وہ بیدار ہوئے اور ان کی آنکھیں صبحِ معرفت کے نور سے روشن ہوئیں تو انھوں نے "میدانِ عام" میں اس شاعر کا بت نصب کیا اور ہر سال اس کی برسی منانے لگے۔

آہ! انسان کی نادانی!"(۵۱)

یہ کہانی کے اختتام سے اقتباس لیا گیا ہے۔ اس میں جبران نے اور بھی زیادہ دکھی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ صدیوں کے بعد بھی اگر انسان کو خدا نورِ معرفت کی روشنی عطا کرے اور یہ شعور کی دولت عطا کر دے تو ہی وہ کسی شاعر اور ادیب کی عزت کرتا ہے نہیں تو زمانے کی گرد اس کی قبر تک کا نشان مٹا دیتی ہے۔ یہ رویہ نہ جانے کب اور کیسے ہمارے معاشروں سے ختم ہو گا۔ حالانکہ ایک ادیب اور شاعر تمام عمر عوام کے جذبات کا ہی ترجمان رہتا ہے نہ کبھی بکتا ہے اور نہ کبھی جھکتا ہے اور بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکرا جاتا ہے۔

اس افسانے میں شاعر ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں کوئی بھی صاحبِ فن مراد لیا جا سکتا ہے جو اپنی سوچوں میں جل جل کر زمانے اور معاشرے کو نئے سے نئے شاہ کار عطا کرتا ہے اور ان کے جذبات کی ترجمانی احسن انداز میں کرتا ہے۔

جبران مختلف طریقوں سے معاشرے کو سنوارنے اور لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے کی بارہا تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں انسانی محبت اور دوسروں سے محبت کا برتاؤ انسان کے لیے سب سے عمدہ اور بڑا اقدام ہے۔ ہر جنگ، قتل وغارت، نفرت اور ظلم کے خلاف جو معاشرے میں بہتری لا سکتا ہے وہ ایک محبت کا جذبہ ہے اور جبران کے نزدیک محبت ہی فاتح عالم ہے جو دنیاؤں کو بغیر کسی مشکل اور رکاوٹ کے حاصل کر سکتی ہے۔

جبران نے اپنے اسی نظریے کو بیان کرنے کے لیے کہ جنگ وجدل اور قتل غارت سے نہیں بلکہ انسانی تاریخ محبت اور پیار سے انسان کو یاد رکھتی ہے اور دنیا کی باگیں اسی کے ہاتھ میں تھماتی ہے جو شخص محبت کا پجاری اور محبت کو پیغام بر ہو، افسانہ "جب طوفان گزر گیا" لکھا ہے۔ اس افسانے میں جبران نے بڑی ہی خوبصورتی سے جنگ اور محبت کا تقابل کیا ہے اور محبت کو ہی فاتح عالم ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اس افسانے میں ایک محبوبہ اپنے محبوب کے جنگ سے واپس آنے کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوتی ہے کہ خدا اسے بخیر واپس لے آئے اور خدا کے فضل سے واپس آجاتا ہے اور واپس آکر محبت ار جنگ کے بارے میں باتیں کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ہم محبت سے ہی دنیا کو فتح کریں گے اور جنگوں سے دنیا کو فتح نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ بات اب پوری دنیا کو سمجھاؤں گا۔ اس طرح دونوں محبت کرنے والے محبت کے بیج بونے لگے اور اندھیروں میں سے سورج کی پیداوار اگنے لگی۔ اس کہانی کا اقتباس دیکھیے:

"انسانیت نے ہمیں وہ چیز واپس دلا دی ہے جسے دوسروں کی خود غرضی اور لالچ نے ہم سے چھیننا چاہا تھا۔ اس لیے رنج نہ کرو بلکہ مسکراؤ۔ میری پیاری اب خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے محبت ایسی طاقت ہے جو موت کو شکست دے دیتی ہے۔ ایسا جادو ہے جو دشمن کو مغلوب کر لیتا ہے۔

گھبراؤ نہیں۔ ادھر دیکھو میں ایسی سیج ہوں جو تلواروں اور توپوں کے بھیانک ماحول سے نکل کر آیا ہوں۔ میں لوگوں کو جنگ پر محبت کے غلبہ کی داستان سناؤں گا۔

اطمینان کا ایک گہرا سانس لینے کے بعد سپاہی نے مشرق کی طرف دیکھا اور اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوا۔

"پیاری ادھر دیکھو تاریکی نئے سورج کو جنم دے رہی ہے۔""" (۵۲)

افسانے کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جبران کس قدر محبت اور محبت کرنے والوں کے جذبات سے آگاہ ہے اور مصنف محبت سے ہی موت اور دشمنی کو مغلوب کرنا چاہتا ہے۔اس افسانے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جبران محبت کا پیامبر اور نفرت، دشمنی اور جنگ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

جبران نے اپنی زندگی میں نفرت، ہجرت اور وطن سے دوسری کے دکھ دیکھے ہیں۔ اپنوں کے علاوہ غیروں سے بھی ایک ایک محبت بھرے لمحے کے لیے بھی مانگی ہے اور نفرت بھری نظروں کا شکار ہوا ہے۔ مگر جبران نے ب اپنے اسی محبت والے فارمولے اور فلسفے سے ہی نہ صرف اپنوں کے دلوں میں گھر کیا ہے بلکہ غیروں کو بھی اپنا بنایا ہے۔ لبنان کی قادسیہ وادی سے لے کر نیویارک کی فلک پیما عمارتوں کے درمیان اپنی محبت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جبران نے دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہے اور آج تک کرتا آرہا ہے۔اسی لیے کہ محبت انسان کے ساتھ ہی نہیں مرتی بلکہ صدیوں تک انسانوں کو زندہ رکھتی ہے۔

جبران کے نزدیک ہر شخص کو معاشرے میں اپنا تعمیری کردار ادا کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص معاشرے میں اپنا تعمیری کردار ادا نہیں کرت تو جبران کے نزدیک اس کی مثال جسم کے اس عضو کی ہے جو جسم پر بوجھ تو ہے مگر وہ جسم کے کام کا نہیں۔یعنی یا شل ہے یا پھر مفلوج۔اس معاملے میں جبران کسی مذہبی، تعلیمی، عقائد کے پیشوا، رہبر اور کسی بھی سماجی کارکن کی تفریق نہیں کرتا اور سب کو برابر ایک ہی نظر سے کم تر، گھٹیا اور معاشرے کے لیے موت قرار دیتا ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "غلامی" ایسے اصولوں اور ایسے ہی خیالات کا مجموعہ ہے جس میں خلیل جبران نے بڑے خوبصورت انداز میں معاشرے کے تمام افراد کے اندر غلامی کی روش کو دیکھا اور بیان کیا ہے۔ پورے معاشرے کو اس سے بچنے اور ایسے گھٹیا کردار سے باز رہنے کی تنبیہ کی ہے۔اس افسانے میں خلیل جبران نے غلامی کی مختلف اقسام بھی بتائی ہیں جن میں عقیدت کی غلامی، حمیدہ غلامی، زندگی کی غلامی، گونگی ، بہری اور اندھی غلامی زیادہ خطرناک قرار دی ہیں۔

اس افسانے میں جبران دنیا بھر کے علوم اور مشاہدے کے بعد غلامی کی اصلیت اور نقصانات کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے دنیا بھر کے لوگوں اور قوموں کو قریب سے دیکھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر شخص کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کا ضرور غلام ہے جو اسے معاشرے میں اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ ان تمام مسائل اور غلامی کے طریقوں پر جبران اس طرح روشنی ڈالتا ہے:

> "میں قوموں کے ساتھ ساتھ گنج کے کناروں سے فرات کے ساحل، نیل کے دہانہ، سینا کے پہاڑ، ایتھنز کے میدانوں، روم کے کلیساؤں، قسطنطنیہ کی گلیوں، پیرس کی سیر گاہوں اور لندن کی عالی شان عمارتوں تک گیا اور دیکھا۔ ہر جگہ غلامی عظمت و جلال کے جلوس کے ساتھ ہے۔ لوگ اس قربان گاہوں پر، نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اسے " دیوتا " کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے قدموں میں عطر و شراب بہاتے ہیں اور اسے "بادشاہ" کا لقب دیتے ہیں۔ اس کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے ہیں اور اسے پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں اس کے سامنے گرتے ہیں اور اسے "قانون" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لیے لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور اس کا نام "وطنیت" رکھتے ہیں۔ خود کو اس کی مرضی کے سپرد کر دیتے ہیں اور اسے زمین پر "خدا کا سایہ" سمجھتے ہیں۔ اس کی ارادت و عقیدت کے جوش میں اپنے مکانوں کو آگ لگاتے اور عمارتوں کو ڈھاتے ہیں اور اسے "بھائی بندی" اور "مساوات" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی راہ میں جان توڑ کر کوشش کرتے ہیں اور اسے مال و تجارت کہتے ہیں۔"[۵۳]

افسانے کے اس طویل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلامی کس طرح معاشرتی کردار کو زنگ لگا کر مختلف ناموں اور طریقوں سے ہمیں اپنے آگے جھکائے رکھتی ہے اور ہم کتنی خوشی سے سارے کام انجام دے رہے ہوتے ہیں اور ہمیں مطلق خبر نہیں ہوتی کہ ہم غلام بن چکے ہیں اور کولھو کے بیل کی طرح اپنے شب و روز گزارتے چلے جا رہے ہیں۔

جبران نے ہمیں جہاں مختلف افسانوں اور کہانیوں کے ذریعے اور کرداروں کے دلچسپ اور دکھی مکالموں سے ہمیں ہمارے معاشرتی کردار کا اصل روپ اور چہرہ دکھایا ہے اور ہمیں اصل کردار کی طرف گامزن کیا ہے۔اسی طرح خلیل جبران ہمیں تنبیہ کرنے کے لیے ہمارے معاشرتی رویوں سے ایسی مچالیں بھی دیتا ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں کی تعلیمات اور ان سے منسوب مقدس دنوں سے بھی اصل واقفیت نہیں رکھتے اور اپنے روز مرہ مشغولات اور گندے مندے دلوں سے ان کے مقدس دنوں کا احترام کرنے کے بجائے ان دنوں کی عظمت کو پامال کرتے رہتے ہیں۔

جبران نے ان مسائل کو اجاگر کرنے اور ہمیں ہمارا معاشرتی رویہ سمجھانے کے لیے ایک افسانہ "بڑا دن" لکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بڑے دن سے مراد حضرت مسیحؑ کی پیدائش کا دن ہے۔ جس کو پوری دنیا میں ادب و احترام سے منایا جاتا ہے۔ مگر مصنف کہتا ہے کہ ان لوگوں کے ادب و احترام میں دکھاوا زیادہ اور عقیدت کم ہے اور عقیدت ہے بھی تو اندھی ہے۔ وہ حضرت مسیحؑ کے اصل پیغام کو سمجھ نہیں سکے اور دن بھر افسوس کرتے ہیں اس واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھتے اور جب شام ہوتی ہے تو یہ لوگ بھول بھلا کر دنیا میں یوں مشغول ہو جاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ مصنف لکھتا ہے:

> "آج۔۔۔۔۔ اور ہر سال آج کے دن، انسانیت اپنی گہری نیند سے بیدار ہو کر قوموں کی پرچھائیوں کے سامنے کھڑی ہوتی ہے اور مسیح ناصری کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں۔۔۔۔۔ اشک آلود آنکھوں۔۔۔۔۔ کا مرکز، کوہ جلجلہ کو بنا لیتی ہے اور جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو واپس ہوتی ہے اور ان بتوں کے سامنے سجدہ میں گر پڑتی ہے جو پہاڑ کے دامن یا چوٹیوں پر نصب ہیں۔"(۵۴)

جبران عام انسانیت کے بعد اہلِ علم، دانشوروں، فلسفیوں اور مفکروں سے مخاطب ہوتا ہے:

”ہر سال آج کے دن فلسفی اپنے تنگ و تاریک غاروں، مفکر اپنے بے کیف حجروں اور شاعر اپنی خیالی وادیوں کو چھوڑ کر ایک بلند پہاڑ پر خاموش و مرعوب جا کھڑے ہوتے ہیں اور اس مرد بزرگ کی آواز پر کان لگا دیتے ہیں جو اپنے قاتلوں کے متعلق کہتا ہے۔

”اے مقدس باپ!!انھیں معاف کر دے یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟“

لیکن خاموشی، روشنی کی آوازوں کو لپیٹنے بھی نہیں پاتی کہ وہ سب کے سب اپنی روحوں کو پرانی کتابوں کے اوراق میں کفنا دیتے ہیں۔“(۵۵)

یہ رویہ کسی بھی معاشرے میں روا نہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ معاشرہ جس کی بنیاد بھی ایک مذہب پر رکھی گئی ہو تو ہمارا اس طرح سے اپنے مذہبی پیشواؤں سے سلوک ہمارے کردار کے لیے شرمناک ہے اور تباہی کی علامت بھی۔

یہ بات بالکل سچ ہے کہ انسان جس طرح کے اعمال کرتا ہے زمانہ اسے انھیں الفاظ میں اسی کردار اور رویے کے ساتھ یاد رکھتا ہے۔ اس لیے کسی بھی انسان کا معاشرتی کردار اس کی پہچان ہوتی ہے، تو ضروری ہے کہ انسان کا اپنے معاشرے میں ایک تعمیری کردار ہو اور وہ لوگوں کے ذہنوں میں بعد از وفات بھی زندہ رہے ۔ جبران نے اسی موضوع پر ایک افسانہ ”ہم اور تم“ لکھا ہے۔ جس میں اس نے ”ہم“ سے مراد نیک لوگ اور دنیا کے لیے بھلائی کے کام کرنے والے لوگ مراد لیے ہیں، جنھوں نے اپنے لیے غم کی راہوں کو اپنایا ہے مگر خود شمع کی طرح جلتے ہیں کہ لوگ روشنی میں زندہ رہ سکیں۔ اور ”تم“ سے مراد آسانی اور خوشی کی زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔ جنھوں نے مسرت کو غم پر ترجیح دی ہے انھیں لوگوں کی بالکل بھی پرواہ نہیں اور اپنی خوشی میں سرمست ہیں۔ یہ ایک طویل اور دلچسپ مکالمہ ہے۔ جبران لکھتا ہے:

”ہم ابنائے غم ہیں اور تم ابنائے مسرت!

تو آؤ! ہم اپنے غم کے کارنامے دنیا کے سامنے رکھیں اور تم اپنی مسرت کے اعمال!

تم نے غلاموں کی کھوپڑیوں سے اہرام تعمیر کیے اور اہرام،اور ریگ زار میں بیٹھے، قوموں کو تمھاری فنا اور ہماری بقا کی داستانیں سنا رہے ہیں، لیکن ہم نے آزاد بازوؤں کی قوت سے باستیل کو پاش پاش کیا اور باستیل وہ لفظ ہے جسے قومیں بار بار دہرا کر ہمیں مبارک باد دیتی ہیں اور تم پر لعنت بھیجتی ہیں۔

تم نے کمزوروں کے جسموں پر بابل کے باغ بنائے اور غم زدوں کی قبروں پر نینوا کے محلوں کی بنیاد رکھی۔ دیکھو! بابل و نینوا مٹ مٹا کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے ریگِ صحرا پر اونٹ کے پاؤں کے نشانات۔

تم لہو و لعب کے پیچھے پڑ گئے جس کے خونخوار پنجوں نے روم اور انطاکیہ کے میدانوں میں سینکڑوں شہیدوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اور ہم نے خاموشی سے ناتا جوڑ لیا۔ جس نے انجیل کے مختلف حصے مرتب کیے۔"(۵۶)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ جو شخص بھی دنیا والوں سے ہم دردی اور انسیت اپنے کردار اور مزاج کا حصہ بنائے گا،اسے زندگی بھر دکھ، تکلیف اور دلی اضطراب کا سامنا رہے گا۔ وہ خود چاہے تکلیف اور پریشانی میں رہے مگر لوگوں کو خوش دیکھ کر اسے خوشی اور اطمینان کی دولت نصیب ہو گی اور یہی اصل معاشرتی تعمیری کردار ہے۔

انسان اپنے معاشرے میں اپنے کردار سے ہی پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ لوگ اس کو اسی نسبت سے جانتے ہیں جو ایک دفعہ اس کی نسبت بن جائے۔ اسی حوالے سے جبران کے ہاں ایک اور افسانہ "لباس" بھی پایا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ریاکاری، ملمع کاری اور دوہرے معیار کو ایک مختصر کہانی کے ذریعے واضح کیا ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں اور دونوں ہی دیویاں ہیں۔ جن میں ایک دیوی خوبصورتی کی اور دوسری بد صورتی کی دیوی تھی۔ دونوں سمندر میں اکٹھی نہاتی ہیں تو بد صورتی کی دیوی جلدی جلدی خوبصورتی کی دیوی کے کپڑے پہن کر چلی جاتی ہے اور خوبصورتی کی دیوی کو بہ امرِ مجبوری اسی بد صورت دیوی کے کپڑے پہننے

پڑتے ہیں۔ تو اس سے مصنف نے ایک بات گھڑی ہے، بلکہ استعارہ بنایا ہے کہ آج تک سبھی مرد اور عورتیں اس بات سے دھوکا کھاجاتے ہیں اور ریاکاری و ملمع کو سمجھ نہیں پاتے۔ مصنف کہتا ہے:

> ”آج تک سبھی مرد اور عورتیں ایک پر دوسرے کا دھوکا کھاتے ہیں: لیکن چند ایسے بھی ضرور موجود ہیں جو خوبصورتی کی دیوی کو دیکھ چکے ہیں اس کے لباس کے باوجود اسے پہچان لیتے ہیں اور یقیناً چند ایسے بھی ضرور ہوں گے، جنھوں نے بدصورتی کی دیوی کو دیکھا ہو۔۔۔۔اور اس کا لباس اسے ان کی نگاہوں سے چھپا نہ سکتا ہو!“(۵۷)

اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو شخص کسی دوسرے کی اصل پہچان اور اصل شناخت سے واقفیت رکھتے ہیں وہ کبھی لباس، ملمع کاری اور ریاکاری سے دھوکا نہیں کھاتے اور ہر لباس اور حالت میں اس شخص کو اس کی اصل شناخت سے پہچان لیتے ہیں۔ یہ ہے تو ایک سادہ سا افسانہ مگر اس میں انسان کے معاشرتی کردار کی حیثیت اور وقعت دکھائی گئی ہے کہ انسان کی اصل حیثیت اس کا کردار اور مزاج ہے نہ کہ لباس اور ظاہری پن۔

انسان کا اپنے معاشرے کے لیے کردار بالکل بھی ویسا نہیں رہا جیسا کہ اس کا اپنے معاشرے اور ماحول کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ انسان اتنا بے رحم اور سفاک ہے کہ جس معاشرے میں رہتا ہے اسی کو آلودہ کرتا رہتا ہے اور معاشرہ اس سے پناہ مانگتا رہتا ہے۔ معاشرہ خراب ہوتے ہوتے ساری زمین اور دنیا ہی اس کی ناجائز آلودگی کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور دنیا بالکل ایک میدانِ آلودہ سامان بن جاتی ہے۔

جبران کے ہاں اس سے بھی آگے کی باتیں انسان کی تباہ کاری اور برتاؤ میں تبدیلی کی بدولت ملتی ہیں۔ جبران نے اپنے افسانے ”میدانِ حرب“ میں انسان کے اپنے ماحول اور دنیا کے بارے میں غلط رواج، رسوم اور عادات کے بارے میں بتایا ہے۔ انسان نے دنیا میں دنیا کے ہم جنس باسیوں کو اس قدر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے کہ دنیا ایک جنگ کا سا ماحول لیے ہوئے ہے اور ساری دنیا ایک میدانِ حرب کا نقشہ پیش

کر رہی ہے۔ اس لیے جبران انسان کو جاہل، ظالم اور بے رحم کہہ کر پکارتا ہے۔ اس افسانے میں انسان کے کردار کی گراوٹ کے لیے اقتباس دیکھیے اور جبران کا لہجہ:

”آلودگی کارزار تمام دہر پر مسلط ہوگئی پر سکون زمین کا چپہ چپہ خونِ معصومیت سے گل رنگ ہے اور ذرہ ذرہ انسان کی سفاکی کا شاکی۔ ہر طرف اندھیری رات کی سی خاموشی ہے اور موت کا بڑھتا ہوا سکوت، پر خوف ولرزہ خیز سکوت!

کائنات افسردہ و ساکت ہے اور فرشتہ موت کے گہرے گہرے سانسوں سے کہر آلود!۔۔۔ جیسے جنگ کے دیوتا نے اپنی خونخوار انگلیوں سے اس کی نبض تھام رکھی ہو۔

میدانِ جنگ کی وسعت بڑھتی جارہی ہے ہر لمحہ ترقی پذیر ہے ستاروں نے خونچکاں داستانیں سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ چاند کو یہ درد انگیز افسانے زرد سے زرد تر کر رہے ہیں اور ہوا پُر خوف کہانیاں سن کر دیوانوں کی طرح سر ٹکرا رہی ہے۔

کائنات وحشت وبربریتِ انسان کا شکار ہے اور دق کے مریض کی طرح نیم جان۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن انسان! ظالم وبے رحم انسان آج جاہلیت کی روایات دہرا رہا ہے۔ زندگی کی عبارات اس کے لیے بے معنی ہیں اور چشمِ خشمگیں میں بجلیوں کے سے پیچ و تاب!“(۵۸)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان نے اپنی سفاکی، بے رحم رویے اور ظالمانہ روش سے زمانے کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اگر اب بھی انسان اپنے رویے سے باز نہ آیا تو یہ جنگ کا عمل کبھی نہ رکے گا۔ اور انسان اسی طرح پست سے پست تر ہوتا جائے گا۔ کسی بھی حوالے سے انسان کا معاشرتی کردار ہمیشہ ہی مثبت اور تعمیری ہونا چاہیے اور اگر انسان ایجابی اصولوں کے مطابق زندگی نہ گزارے رو اس کی زندگی گویا زندگی ہی نہ تھی بل کہ وہ تو ایک بے گار ہوئی۔ جس نے جانوروں کی طرح کھایا پیا، بچے پیدا کیے اور آخر کار موت کے گھاٹ اتر گیا اور اب اس کا نام لینے والا کوئی نہیں۔ ایسے عمدہ اور عظیم خیالات کا اظہار جبران

کے کئی افسانوں میں نظر آتا ہے اور مگر ایک افسانے "مرشد کا فرمان" میں ان خیالات کا اظہار ذرا تفصیل کے ساتھ آیا ہے جس میں ایک شاگرد اپنے استاد کی وفات کے بعد اس کے خیالات کا پرچار شروع کرتا ہے اور ساری دنیا کو بتانا چاہتا ہے کہ میرا استاد کتنا عظیم اور بڑا آدمی تھا جس نے ہمیشہ ہی لوگوں کا سوچا اور اپنا معاشرت کردار خوب نبھایا جیسا کہ نبھانا چاہیے تھا۔ اپنے استاد اور مرشد کی بابت اس کا شاگرد و مرید کیا کہتا ہے وہی زندگی کا مقصد اور کسی بھی معاشرے کی فلاح کے لیے انسان کا کردار ہونا چاہیے۔ کہتا ہے:

"اس نے اپنی زندگی میں عظیم کام انجام دیے اور عمر بھر سوچتا رہا اور غور و فکر میں مصروف رہا۔ اسے محنت و مشقت میں آرام ملتا تھا۔ اسے محبت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اس کے نزدیک کام اور محنت مہر و محبت کی نشانی اور عشق کی مشہور شکل تھی۔

اس کی روح ہمیشہ پیاسی رہی۔ اسے صرف کام اور بیداری میں ہی استراحت ملتی تھی۔ اس کا دل محبت کرنے والا دل تھا جو ہمیشہ مہربانی اور احسان سے معمور رہا۔

یہ تھا اس کی زندگی کا نمونہ جو اس نے دنیا میں گزاری۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ علم و فضل کا سرچشمہ تھا جو ابدیت جے سینے سے پھوٹا تھا۔ وہ عقل و خرد کی ایک صاف شفاف ندی تھی جو تازیست انسانی ذہنوں کو سیراب کرکے انہیں سرسبز کرتی رہی۔"(۵۹)

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا معاشرتی کردار کیسا ہونا چاہیے اور انسانی زندگی کے مقصد کے حصول کی کوشش کیسے کرنی چاہیے۔ بلاشبہ ایک شاگرد کے الفاظ اپنے استاد کے حق میں ہیں کہ اس کے استاد نے کس طرح محنت و ریاضت سے معاشرے کی فلاح اور بہتری کے لیے اپنا کردار نبھایا ہے۔ یہی تو اس افسانے کی فنی تکنیک اور خوبی ہے کہ افسانہ قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور شروع سے آخر تک ایک شاگرد و مرید اپنے استاد و مرشد کے نظریات کا پرچار کر کر کے لوگوں میں اپنے استاد کے علم کی دھاک

بڑھاتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کے استاد کا معاشرتی کردار کتنا ایجابی اور مثبت تھا۔ گویا استاد کی وفات کے ساتھ ہی سارا علم بھی دنیا سے اٹھ گیا یوں کہیے کہ ایک عالِم کی موت سے عالَم کی موت واقع ہو گئی۔

ب۔ انتظار حسین کے افسانوں میں تصورِ حیات کا مطالعہ:۔

کوئی بھی انسان اپنی زندگی میں کسی حد تک قید اور کسی حد تک آزاد ہوتا ہے۔ آزادی کے معاملے میں بھی وہ صرف قوتِ فیصلہ اور انتخابِ ضروریات میں آزاد ہوتا ہے مگر دیکھا جائے تو معاشرے میں رہتے ہوئے انسان کو کسی نہ کسی نظریے، عقیدے اور مذہبی وابستگی کا اظہار ضرور کرنا پڑتا ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور اسے معاشرے میں رہنے کے لیے معاشرتی اقدار اور پھر معاشرتی اصولوں کو اپنانا ہی پڑتا ہے اور ان کا کسی نہ کسی صورت میں اظہار بھی کرنا ہوتا ہے۔ اب یہ بات الگ ہے کہ وہ اظہار دلی وابستگی کا نتیجہ ہو یا پھر معاشرتی ضرورت کے تحت فقط ایک دکھاوا اور ریاکاری کا عملی مظاہرہ۔

انسانی عقل اور معاشرتی تقاضوں کو سامنے رکھیں تو ایک انسان معاشرتی، سماجی، عمرانی، معاشی اور مذہبی ہر طرح کی قدر سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور یقیناً اس قدر اور رجحان سے زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے جس کا اثر گھریلو ہو، بچپن سے ہو یا پھر کسی خاص شخص کی صحبت کی وجہ سے آجائے۔ اگر ان اصولوں کو مد نظر رکھا جائے تو بلاشبہ انتظار حسین کے ہاں مذہبی افکار کی جھلک آنا اور مذہبی خیالات کا بار بار در آنا ایک فطرتی بات ہے کیوں کہ انھیں بچپن سے ہی مذہبی ماحول ملا۔ والدِ محترم ایک عالم تھے اور انھیں بھی عالم ہی بنانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ بچپن میں جب بچوں کے کھیلنے کی عمر ہوتی ہے یہ اس وقت مذہب کے بارے میں بڑی بڑی

کتابیں پڑھ چکے تھے۔(جس کے بارے میں ہم پہلے باب میں تفصیلی بات مع حوالہ جات کر چکے ہیں)جن کا اثر ان کی آخری سانس تک رہا اور ان کی کہانیوں اور افسانوں میں کسی نہ کسی حوالے سے آتا رہا۔انتظار حسین کو اگرچہ ہجرت کا غم بھی رہا جس کے تناظر میں ان کے افسانوں ،ناولوں اور دوسری کئی ایک تحریروں میں خیالات کا اظہار پایا جاتا ہے۔اساطیر،حکایت اور مذہبی حوالوں کا ذکر ان کے افسانوں میں بارہا نظر آتا ہے اور مزے کی بات ہے کہ اساطیر میں بھی مذہبی اساطیر کو کہانی میں برتنے کا فن کم از کم اردو میں ان سے بہتر تو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہو سکا۔قرآنی اساطیر،بائبل،عہد نامہ قدیم اور ہندو صنمیات کو انھوں نے شاندار طریقے،اسلوب اور بُنت سے اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے تو اس کی وجہ بھی کہانی کہنے کا فن اور پھر ان کہانیوں میں مذہبی حوالوں اور دیومالا کو استعمال کرنے پر قدرت بھی کار فرما نظر آتی ہے۔جن کو پڑھ کر صاف پتا چلتا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں مذہب اور مذہبی اقدار کا علم بدرجہ اتم موجود ہے۔

مذہبی اقدار میں تصورِ حیات اور تصورِ حیات میں انسان کا وجود،انسانی زندگی کا مقصد اور انسان کا معاشرتی کردار زیادہ اہم ہیں۔انسان کے وجود کا مسئلہ تو انتظار حیسن کو اس وقت سے درپیش ہے جب انھوں نے اپنا پہلا افسانہ "قیوما کی دکان" لکھا۔کیوں کہ اس وقت ہی ہجرت اور ہجرت کے مسائل انھیں پیش آئے اور انسانی وجود کی جس طرح بے حرمتیاں انھوں نے دونوں اطراف دیکھیں اور لوگوں کو اپنے وجود کی عظمت سمجھنے میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑا وہ سب کچھ ان کی نظروں کے سامنے ہوا اور یہ ان تمام باتوں اور واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں۔اس لیے انسانی وجود کی لایعنیت اور بے معنویت کے سبب ان کے افسانوں میں اس درد کی کسک کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

i. انسان کا وجود

انتظار حسین کا اولین افسانوی مجموعہ "گلی کوچے" قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہوا۔جس میں ہجرت کا کرب،حزن و ملال کی کیفیت اور ایک بے نام سی کسک بجا طور دیکھنے میں آئی۔جس کی بڑی وجہ ہی ہجرت کے فسادات اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل تھے۔اس کتاب میں گیارہ افسانے اور اور دو غیر افسانوی

تحریریں بھی تھیں۔ سب سے پہلے انجیل کے عہد نامۂ عتیق میں "یرمیاہ نبی کا نوحہ" سے ایک اقتباس شامل کیا ہے جس میں زمین کی بے بسی اور بستی کے اجاڑ پن کی وجہ سے ہونے والے انتشار کا ذکر ہے، جس کا مقدر ہی پھوٹ گیا تھا اور جس کی کنواریوں کی آبرو خاک میں مل چکی تھی۔ اس کے بعد "استفسار" کے عنوان سے ایک پیش لفظ لکھا ہے جس میں مصنف اپنے اور افسانے کے مابین تعلق کو واضح کرتے ہیں اور صاف بتاتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ افسانے کی تعریف کو سمجھے بغیر کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے اور افسانے کی مروجہ تعریفوں سے رو گردانی کی ہے۔ اس کے ساتھ افسانوں کی تفصیل کچھ یوں ہے: قیوما کی دکان، خرید و حلوہ بیسن کا، چوک، فجا کی آپ بیتی، اجودھیا، رہ گیا شوقِ منزلِ مقصود، پھر آئے گی، عقیلہ خالہ، روپ نگر کی سواریاں، ایک بن لکھی رزمیہ اور استاد۔ ان سب کے علاوہ ایک سفر کی روداد جو انھوں نے ہندوستاں سے ہجرت کے بعد پاکستان میں اپنے سفر کے بارے میں لکھی تھی، بھی شامل ہے۔ جس کا عنوان "سانجھ بھئی چوندیس (رپورتاژ)" ہے۔

افسانوں کے نام گنوانے سے مراد یہ ہے کہ افسانوں اور کتاب کے نام سے ایک طرح کی ہجرت کے دکھ کی بُو آتی ہے اور آدمی کا زوال ہجرت اور جنگ میں ہی سمجھ آتا ہے۔ اکثر اوقات یہ دونوں لازم و ملزوم ہو جاتی ہیں۔ جہاں ہجرت کے ملال کا ذکر ہو گا وہاں انسان کے وجود کی بھی عدمیت کا ذکر آئے گا اور اس تحریر سے بخوبی پڑھا جا سکے گا کہ اس میں ہجرتانہ مصائب کا عکس ہے۔ مندرجہ بالا گیارہ افسانوں میں سے آٹھ افسانے ہجرت کے مسائل اور کرب کو واضح کرتے ہیں جن سب میں جو نمائندہ افسانہ ہے وہ "قیوما کی دکان" ہے۔ قیوما اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو ایک دودھ، دہی اور مٹھائی کی دکان کا مالک ہے۔ یہ دکان ایک شخص، فرد، گروہ یا معاشرے کی علامت نہیں بل کہ ہندوستان میں موجود مشترکہ ہند اسلامی اور سکھ مت کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب و ثقافت کی ملی جلی تہذیب کی علامت ہے۔ جس دکان پر تمام مذاہب اور سوچوں کے لوگ اپنی اپنی رائے اور پسند کے ساتھ آ اکٹھے ہوتے ہیں اور اپنی اپنی زندگی کے قصے بیان کرتے ہیں۔ سب مل جل کر رہتے ہیں اور کسی کو کسی سے کوئی بیر یا جلاپا نہیں۔ سب سے مزے کی اور دلچسپ بات اس

افسانے کی یہ ہے کہ یہ دکان کبھی بھی دن رات، دھوپ چھاؤں یا بارش اندھیری میں بند نہیں ہوتی اور دوسری دکانیں شام و شام یا پھر دیر سویر سے بند ہو جایا کرتی ہیں۔

تمام قوموں اور مذاہب کے لوگ یہاں اکٹھے ہوتے ہیں جو کوئی پڑھے لکھے افراد نہیں بل کہ عام دیہاتی لوگ ہیں جو اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں لے کر جی رہے ہیں اور اپنی اس گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے ہیں۔ مگر تقسیمِ ہند کے بعد یہاں پر ایک زوال آدمیت اور اجاڑ پن کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ فسادات اور لڑائی کی بدولت یہاں سناٹا اور بے بسی ہر طرف نظر آتی ہے اور قیومے کی دکان جو مشترکہ تہذیب کی علامت تھی وہ بند ہو جاتی ہے۔

> ”وقت بدلتے ہوئے بھی کیا دیر لگتی ہے، میں نے اپنی انہیں آنکھوں سے قیوما کی دکان کو بند پڑے دیکھا ہے۔ اب یقین تو کاہے کو آئے گا۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ قیوما کی دکان میں واقعی تالا پڑ گیا۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ نہ تو قیوما کا دیوالہ نکلا تھا نہ اس کے گھر میں کوئی موت ہوئی تھی اور نہ وہ بیمار پڑا تھا اور نہ قید ہوا تھا۔ پھر بھی کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ اس کی دکان بند پڑی تھی۔“[۶۰]

قیومے کی دکان کا بند ہونا گویا گنگا جمنی تہذیب کا ختم ہو جانا تھا اور ایسا ہی ہوا کہ دکان ختم ہوئی اور بہت سے لوگوں کی طرح قیومے کی دکان جو بعد میں کھلی بھی مگر اس پہ رونق نہ جم سکی اور چوک، بازار، گلیاں، چھت اور آسمان سبھی کے سبھی ویران ہو گئے بل کہ مصنف کی زبانی ” ننگے “ ہو گئے کیوں کہ ہم سب جو ننگے ہو گئے تھے۔ مصنف اس تہذیبی اجاڑ پن پہ اس طرح دکھ کا اظہار کرتے ہیں:

> ”چوک آج ننگا سا دکھائی پڑتا تھا۔ چوک بھی ننگا تھا اور مسجد کے پیچھے والی گلی بھی ننگی تھی اور چھتیں بھی ننگی تھیں اور آسمان بھی ننگا تھا اور قیوما کی دکان کا پٹرا بھی ننگا تھا۔ ہم خود ہی جو ننگے ہو گئے تھے۔“[۶۱]

اور لوگوں کی طرح قیوما بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گیا اور یہاں اس نے رام نگر میں ویسی ہی ایک دکان بنالی تھی مگر وہ تقسیم سے پہلے والی رونق اور چہل پہل نہیں تھی۔ بل کہ قیوما اپنی ہی دکان کے تھڑے پر اکیلا غمگین اور اداس بیٹھا اپنی گمشدہ تہذیب کو یاد کی دنیا میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس افسانے میں ہمیں یہی انسان کے وجود کی تذلیل اور ہراسانی ہی تو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہجرت زدہ آدمی اپنے وجود کو وہیں اپنی زمین کے ساتھ چھوڑ کے آجاتا ہے اور نئی زمین کے ساتھ جڑنے کے باوجود بھی پرانی اور اصل زمین سے کس قدر جڑا ہوا ہوتا ہے۔ جو تمام عمر اس کو جینے نہیں دیتی اور مرنے بھی نہیں دیتی۔ انسان اپنا تشخص کھو دیتا ہے اور عدم وجود کا شکار ہو جاتا ہے اور نئی زمین والے اسے ساری عمر مہاجر اور قابض خیال کرتے رہتے ہیں۔

قیوما کی دکان باقی تمام دکانوں سے بالکل الگ دکان تھی جہاں صبح و شام ہر موسم میں رونق ہی نظر آتی تھی۔ اس افسانے کے سارے کردار مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں جو مصنف نے بڑی خوبصورتی سے ناموں سے واضح کیا ہے مثلاً بدھن، رمضانی قصائی، حسین گدی، الطاف پہلوان، کمر جی (کنور جی) اور قیوما (قیوم)۔ اب فسادات اور تقسیمِ ہند کے جھمیلوں کی وجہ سے یہاں رونق باقی نہیں رہتی اور یہ دکان امن کے دوران کھلتی بھی ہے مگر کہاں وہ پہلے سی رونق۔ ہراسانی، پریشانی، خوف اور ڈر لوگوں کے چہروں پہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے جہاں کبھی مسکراہٹ اور مذاق کو راہ تھی۔ ہجرت، فساد کے دکھ درد نے انسان کے زوال کو بالکل عیاں کر دیا تھا جس وجہ سے اس افسانے کے سبھی کرداروں کے چہروں پہ اب حزن و ملال، دکھ، افسوس، سوگ اور خوف کا راج ہے۔

اسی مجموعے کے دوسرے افسانے "خرید و حلوہ بیسن کا" میں انتظار حسین نے اپنے ناسٹلجیا میں گزرے رومان کو یاد کیا ہے بل کہ انھوں نے اپنے تقسیمِ ہند سے پہلے گزرے وقت کو یاد کیا ہے جس میں انھیں چھوٹی چھوٹی باتیں اور واقعات رہ رہ کر یاد آتے ہیں بل کہ یوں گمان گزرتا ہے کہ وہ ان سب باتوں کو یاد کرنے

کی جان بوجھ کر کوشش کر رہے ہیں۔ جو فسادات کی نذر ہو گئے اور ہجرت کے واقعات نے ان پر جلتی کا کام کیا اور ان کے زخموں پر نمک چھڑکا۔

اس افسانے میں بھی انسان کے ہنستے کھیلتے وجود کو دکھایا گیا ہے جس میں ایک سماج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک کسی نے پھولوں سے بھری شاخ کے سب پھول بڑی بے دردی سے نوچ ڈالے ہوں اور انسان کا وجود اپنے ہونے کی گواہی ڈھونڈ رہا ہو اور اس کے ہاتھ سوائے یاس اور نا امیدی کے اور کچھ نہ آئے۔ ۱۹۴۷ء کے اس ہجرت کے واقعے نے ان کے ہنستے بستے علاقے میرٹھ اور اس کے قرب وجوار کو بالکل ہی اجاڑ کے رکھ دیا تھا اور ساری چہل پہل اور رونق چھین لی تھی۔ اسی تناظر میں انتظار حسین کا یہ افسانہ اپنی پرتیں کھولتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک آدمی روزانہ بیسن کا حلوہ بیچنے آتا ہے اور سارے محلے کے بچے بھاگ بھاگ کر اس سے حلوہ خریدتے ہیں جس میں محلے کے ہر مذہب کے اور ہر چھوٹی موٹی قوم کے بچے شامل ہوتے تھے جو اکٹھے ہی کھیلتے تھے اور اکٹھے ہی غمی خوشی مناتے تھے۔

اس افسانے میں اس وقت کی جو خاص منظر نگاری میں بچوں کا اپنے والدین سے پیسے لینے کا انداز دکھایا گیا ہے اور پھر بھاگ بھاگ کر حلوے والے سے حلوہ لینے کی جو منظر کشی کی ہے اس سے اس دور کی اجتماعیت، محبت اور کشش کا اندازہ ہوتا ہے۔ بندا، پنی، مسعود، بجی اور چنوں یہ افسانے کے وہ کردار ہیں جو ابھی بچے ہیں اور والدین سے حلوے کے لیے طرح طرح کے بہانوں اور حیلوں سے پیسے مانگتے ہیں جو بالآخر یہ حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ جس سے افسانے کے اندر ۴۷ء سے پہلے کی محبت اور بچوں کی معصوم اور چاہتوں سے بھری دلکشی دکھائی گئی ہے اور دوسری طرف ان کی مصروفیات اور بلا کسی امتیاز کے سب بچوں کے اکٹھے ہونے کا پتا چلتا ہے۔ مگر ہجرت کے بعد مادیت پسندی، صنعت اور ٹیکنالوجی کی بڑھتی مانگ نے ساری کی ساری تہذیب کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے ہیں اور وہ تہذیب انسان کے وجودی زوال کے ساتھ اپنی موت آپ ہی مرتی جا رہی ہے۔ لکھتے ہیں:

”پپن تو بہت دور اندیشی سے کام لیتا تھا۔ ادھر اس کے کان میں اس کی آواز کی بھنک پڑی اور ادھر اس نے ٹھنکنا شروع کیا۔ چنانچہ اس کی اسی دور اندیشی کا نتیجہ ہوتا تھا کہ اکثر سب سے پہلے حلوہ خریدنے والا وہی ہوتا تھا۔ بندا کو ہوش تنت وقت پر آتا تھا۔ جب گلی کے اندر آکر وہ پورے جوش کے ساتھ شعر پڑھتا تھا تب کہیں جا کر اسے خبر ہوتی تھی کہ عمل کی گھڑی آپہنچی ہے۔ پھر اس بیچارے کے ساتھ یہ دقت تھی کہ اس کی امس ذرا ضدی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ پہلے تو خوب تشدد برتتی تھی تب کہیں جا کر راہ پر آتی تھی۔ چنانچہ بندا اور بندا کی اماں مل کر اتنا وقت ضائع کر دیتے تھے کہ بندا جب پیسے لے کر نکلتا تھا تو وہ گلی کی نکڑ پر پہنچ چکا ہوتا تھا اور بیچارا بندا آوازیں دیتا اور بھاگتا دوڑتا اس کے پاس پہنچتا اور حلوہ خریدتا۔ مسعود کا یہ تھا کہ دو تین آوازوں کو تو وہ خود ہی پی جاتا تھا۔ اس کے ساتھ تو کئی علتیں لگی ہوئی تھیں۔ اول تو اس کی ذہنیت بھی بورژوائی قسم کی تھی۔ لیکن یہ کافر دل کہاں مانتا ہے۔ ایک دو آوازوں میں اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا اور اب وہ سوچنا شروع کرتا کہ امی سے پیسہ کیسے جھاڑا جائے۔ اس کی یہ احتیاط پسندی اور سوچ بچار اور رکھ رکھاؤ کافی وقت لے لیتا۔ پھر اس کی امی بھی ایسی نیک نہ تھیں کہ چپ چپاتے پیسہ دے دیتیں۔ ان کا کفر ٹوٹتے ٹوٹتے ہی ٹوٹتا تھا پھر بھی مسعود منزل کو جا ہی لیتا تھا، اگرچہ پھسڈی رہتا تھا۔“[۶۲]

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم سے پہلے کس طرح بچے بڑوں سے محبت اور دل آویزی سے اپنی خواہشیں پوری کروا لیتے تھے اور سارے کے سارے بچے خوشی سے ایک ساتھ ایک محلے میں رہتے کھاتے پیتے، اکٹھے کھیلتے، اکٹھے موج مستی کرتے، گلی ڈنڈا کھیلتے، گولیاں کھیلتے، کوئی پتنگ اڑا رہا تو سارے بچے اسی کے ساتھ کھڑے مزے کر رہے ہیں۔ کوئی گولے والے سے برف کا گولا کھانے کے لیے بے تاب ہے اور کوئی حلوہ کھانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ کوئی لڈو کھانے کا ملتجی ہے۔ کہیں کوئی مداری دکھانے والا آگیا ہے تو کہیں بندر کا ناچ ہو رہا ہے اور سارے محلے کے بچے ایک ساتھ بیٹھے سارے

تماشے اکٹھے ہی دیکھ رہے ہیں اور کسی بھی باپ یاماں کو کوئی اندیشہ نہیں کیوں کہ کوئی تفرقہ اور مسلکی تقسیم یا پھر مذہب کی کوئی تفریق موجود نہیں سارے بچے ایک ساتھ گھوم پھِر رہے ہیں۔ مسلموں کے تہوار ہیں یا پھر ہندوؤں کے، کوئی بھی تقسیم نہیں کر تا بل کہ اکٹھے ہی سارے تہوار منائے جاتے ہیں۔ مگر فسادات اور تقسیمِ ہند سے ہمارے اندر سے وہ اجتماعی تہذیب اوور معاشرت کا بیج نکال لیا گیا ہے اور ہمارے بچے سہمے ہوئے اپنی تہذیب، ثقافت اور روایت سے دور جیسے کیسے کٹے پڑے زندگی گزار رہے ہیں۔ گلی محلے، مساجد امام بار گاہیں اور مندر وغیرہ سبھی ویران پرے ہیں اور ان کے اندر عبادات کرنے والے بھی ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے ہیں۔ سڑکیں اور گھر بالکل ویران ہیں کہ ان کے اوپر کووں اور چیلوں نے اپنے ٹھکانے بنالیے ہیں۔ شہر کا شہر ہُو کے عالم میں ڈوبا ہوا ہے اور اندھیر نگری کے ساتھ ساتھ سناٹا پوری آواز سے گونج رہا ہے۔ انسان اپنے وجود کی تلاش میں سر گرداں ہے اور کہیں اسے سر چھپانے اور اپنے وجود کی تسکین اور تسلی کے لیے کوئی جاہ نہیں ملتی۔ انسان اس قدر اپنے وجود سے عدم کا شکار ہوا کہ ہر طرف قتل وغارت دیکھ کر وہ شہر کے مٹنے اور انسانی وجود کے خاتمے کا ذکر کر بیٹھتے ہیں:

"پھر ایک روز چچا شیر و نے سینوں کی دکان کے تختے پہ بیٹھے ہوئے دھماکہ چھوڑا کہ "لو بھئی دلی تو ختم ہوئی۔"

"چچا کیا ہوا۔" مد کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

"ابے اور کیا ہو تا۔ سب کچھ تو ہو گیا۔ سبزی منڈی، پہاڑ گنج، قرول باغ، کوچہ طاہر خاں سب ختم ہو گئے۔ بڑا اقتلام ہوا ہے۔ کیا پوچھو ہو۔"

مد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

جعفر کی آنکھوں مین خون اتر آیا۔"[۶۳]

انسانی وجود کے زوال اور عدمیت کی بہترین مثال اس افسانے میں ملتی ہے کہ کہاں سارے کے سارے محلے والے ایک ساتھ جیتے تھے اور کسی کو بھی کسی دوسرے کوئی خطرہ نہیں تھا مگر حالات، واقعات اور فسادات نے سب کو ایک دوسرے کی جان کا پیاسا کر دیا کہ وہی لوگ ایک دوسرے سے اپنے وجود اور زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ انسانی وجود بے یقینی اور لایعنیت کا شکار ہو گیا تھا کہ انھیں خطرہ گزرا کہ ہم اور ہمارا شہر سب کے سب ختم ہونے والے ہیں۔

انسانی وجود کے زوال نے ہر طرف لایعنی معنویت سی پیدا کر دی تھی اور زندگی اپنے ہی قدموں پہ کھڑی بے سہارا ہوئی جاتی تھی۔ سورج اپنی روشنی کا متلاشی اور چاند چاندنی کو ترس گیا تھا، ایسی بے یقینی اور انتشار کا زمانہ اور دور تھا کہ خود انسان اپنے سائے سے بھی گھبراتا اور جی چراتا تھا۔ بے وجہ اور بے نام سی اداسی اور نڈھال پن نے اسے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، ہجرت میں انسان نے زوال کا جہاں آغاز ہوتا ہے وہاں وہ اپنی جروں سے بھی دوری کا دکھ سہتا ہے اور یہ دکھ ایسا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے یہ زخم مزید ہرا ہوتا جاتا ہے اور گھاؤ اور بھی گہرا، جس کا مرہم کہیں نہیں۔ انتظار حسین کے افسانوں میں ہجرت کیوں بار بار در آتی ہے اور اس کا دکھ ہر کہانی میں کسی نہ کسی طرح آوارد ہوتا ہے اس کی وجہ ہی یہی ہے کہ موصوف کے ہاں ہجرت اپنی زمین سے ہی کٹنے کا نام نہیں بل کہ اپنے آباؤ اجداد کی نشانیوں، رسم ورواج، روایت اور یادگاروں سے بھی بچھڑنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ”اگرچہ ثقافتی رس اور مہک کے ساتھ مٹی بھی انتظار حسین کا عشق ہے تاہم ہجرت انتظار حسین کے لیے محض گلی کوچوں اور بستیوں کی خاک سے بچھڑنے کا مسئلہ نہیں، آباؤاجداد کی یادگاروں، روایتوں اور رسموں سے بچھڑنے، تاریخ اور تہذیب کی شہادتوں سے منقطع ہونے اور اپنے تخلیقی وجود کی شکست وریخت کا معاملہ ہے۔“(۶۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت انتظار حسین کے لیے فقط ہجرت ہی نہیں بل کہ اپنے آباؤ اجداد اور اپنی زندگی سے بڑھ کر کوئی شے ہے جو اس کو ہر وقت ماضی میں اپنے انہیں

چوکوں، محلوں، دکانوں، گلیوں، بازاروں، یادگاروں، کھانے کے ٹھیلوں، تہواروں کے میلوں اور روایتوں کی طرف کھنچتی ہے اور یہ بلا تامل ادھر ہی کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہجرت سے قبل ہوئے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو وہ برا عجوبہ بنا کر پیش کرتے ہیں جس میں وہ ہر دفعہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ بیانیہ اسلوب کہانی سنانے کی چاشنی پیدا کر دیتا ہے اور زبان بھی روز مرہ کی استعمال کرتے ہیں جیسے اپنے ہی ماضی سے باتیں کر رہے ہوں کوئی تحریر نہ لکھ رہے ہوں۔

اسی مجموعے کی تیسری کہانی "چوک" میں بھی وہ اپنے ماضی اور تقسیمِ ہند اور پاکستان کے وجود سے آنے سے قبل کی خوش حال اور رونقوں سے بھرپور زندگی کا ذکر کرتے ہیں جب ہر طرف خوش حالی اور لوگوں کی چہل پہل تھی۔ اب وہاں خاک اڑتی ہے اور لوگ وہاں نام کو بھی نظر نہیں آتے اور پہلے لوگ ایک دوسرے کی محبت اور ایسے ہی وقت گزاری کے لیے بھی یہیں کھنچے چلے آتے تھے۔ کئی قسم کے کھیل کود اور تماشے اسی ایک چوک میں ہوا کرتے تھے جہاں اب ویرانی اور کھنڈر صورتِ حال نے اپنا ٹھکانا بنالیا ہے۔ جس طرف جانے کو ڈر اور خوف مانع آتے ہیں اور چوک میں بھی ہُو کا عالم ہے۔ کہانی کے شروع کے چند جملے دیکھیے جن کو پڑھ کر فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف آگے کہانی میں کیا کہنے والا ہے:

> "چوک کی وہ پہلی سی بات کہاں۔ اب تو وہاں خاک اڑتی ہے۔ اس کی زمین پر اتنی جھریاں پڑ گئی ہیں کہ صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔ جدھر دیکھو کنکر پتھر پڑے دکھائی دیتے ہیں اور پھر جوتوں کے کانے کھدرے تلے، آم کی کالی کالی گٹھلیاں، مرغیوں کے باسی پَر، نیلے پیلے بھدمیلے شیشے، بھینس کے گوشت کی روکھی سوکھی ہڈیاں۔ غرض دنیا بھر کا میل کچیل کھنچ کر چوک میں آ گیا ہے۔ بس وہ مضمون ہو رہا ہے ترازو کی اینٹ چوراہے کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"(۶۵)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگے مصنف کہانی کے اندر اس چوک کی ویرانی سے قبل حالات کا ذکر کرنے والا ہے جہاں بڑی رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اٹھکیلیاں کیا

کرتے تھے اور طرح طرح کے ناچ گانے اور کھیل ہوا کرتے تھے۔ یہ کہانی اپنے پہلے پیراگراف کے بعد ہی بیک فلیش کی تکنیک سے ماضی کے جھروکوں سے پیچھے کی طرف جھانکنا شروع کر دیتی ہے اور خوبصورت انداز میں ماضی پرستی، ناسٹلجیا، ہجرت اور ان سب کے باعث درد و کرب اور بے چینی کو بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ مصنف جب خود ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے تو یہاں آکر انھیں اپنی زمین اور اپنے آباؤ اجداد کی یادگاروں اور نشانیوں کی رہ رہ کر یاد آنے لگی۔ اسی وجہ سے موصوف نے اپنے افسانوں میں ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بیان کیا ہے۔ ان کو ڈبائی، میرٹھ، ہندوستان اور پھر یہاں کے فسادات پھر ہجرت کا کرب اور اسی کرب میں لٹنے پٹنے کے درد انگیز واقعات اور قتل و غارت کے دل سوز سانحات نے انھیں بالک ہی کھوکھلا کر دیا تھا۔ جو رہ رہ کر ایک ایک کر کے مصنف کی روح کو ٹیسیں پہنچا رہے تھے اور وہ ہر ٹیس کو لفظوں کا جامہ پہنا کر کہانیوں میں متشکل کرتے جا رہے تھے اور یہ افسانہ چوک بھی اسی کا تسلسل ہے۔ جو تقسیم سے قبل آباد تھا اور جب کسی کا دل گھبراتا تو وہ بھاگ کر یہاں چوک میں آجاتا اور رونق سے لطف اندوز ہوتا۔ طرح طرح کے کھیل تماشے، گلی ڈنڈا، پتنگ بازی، قصہ کہانی سنانے کا دور بھی یہاں ہوا کرتا تھا جو پوری پوری رات چلا کرتا تھا اور حمید ماہرِ داستان مانا جاتا تھا جسے سونے کا پانی، بولتی چڑیا، گل بکاؤلی، سبز پری، شاہ بہرام، چراغ الہ دین، اور سلطانہ ڈاکو کے قصے ازبر تھے جو وہ بڑے مزے لے لے کر سب کو سنایا کرتا تھا۔ کچھ بچے دن رات چوک میں ہی پائے جاتے تھے جو کھیلوں میں مشہور اور دن رات شور شرابہ کیے رکھتے تھے، بہر حال چوک کی رونق تھے۔ یعنی ہر طرح سے چوک خوش حال تھا اور ہر طرف انسانی وجود ہنستا مہکتا اور لہکتا مستی کرتا نظر آتا تھا۔ ہر چہرے پہ مسکان تھی اور ہر شخص زندگی سے بھرپور۔ مگر تقسیم کے بعد تو مردنی چھاگئی اور لوگ اپنے وجود تک کو بھول گئے اور انسانی جان کی قدر و قیمت پانی سے بھی سستی ہوگئی اور کئی قتلام لوگوں نے اپنی نگاہوں سے دیکھ لیے تھے اس لیے بھائی اب بھائی پہ اعتبار کرنے کو راضی نہیں تھا۔

اس پورے افسانے کا مرکز تو چوک ہی ہے جس میں طرح طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں ۴۷ء کے بعد بالکل ویرانی اور اداسی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ ایک دم ساری بساط الٹ گئی ہے اور جہاں زندگی

تھی اب وہاں اداسی اور موت کا خوف ہے۔لوگوں کی زندگیوں کا رخ بالکل بدل گیا ہے جہاں رونق تھی اب وہاں خاک اڑتی ہے۔ یہاں کے لوگ ناامید اور بے بس ہو گئے ہیں جہاں بہار تھی وہاں اب خزاں کا دور دورہ ہے۔

> ”اور ایک وہ زمانہ تھا کہ چوک میں ہر وقت ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ جہاں کاسی لڑکے کا گھر میں جی گھبرایا اور وہ بے سوچے سمجھے منہ اٹھائے چوک کی طرف چل دیا۔ لرکے گھروں میں رہتے ہی کب تھے۔ آخر چوک کس لیے تھا۔“[۶۶]

وہاں اب خاموشی، بے چینی، اضطراب، نامعلوم سی اداسی رہ گئی تھی۔ انسان بالکل اپنے وجود کی ت؛اش میں پریشان پھر رہا تھالوگوں کے پاس وجود کی کوئی علامت اور نشانی باقی نہ رہ گئی تھی اور جینے کی کوئی وجہ بھی نہ بچی تھی۔ اب انسانوں کی جگہ ویرانوں میں رہنے والے پرندوں نے لے لی تھی۔ جو عموماً مردار کھانے کے منتظر ہوتے ہیں۔ حویلیوں کی دیواروں پر کاہی جم چکی تھی۔ بندروں جوڑے بھی دیکھنے کو مل جاتے تھے جو بغیر کسی منظر کے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی جوئیں نکالا کرتے تھے اور پھر یونہی چلے جایا کرتے تھے۔ اور کوئی انسان اگر گزرتا ہے تو نظر اٹھا کر نہیں بل کہ نظر جھکا کر جلدی جلدی گزر جانا چاہتا ہے۔ اک ٹکڑا دیکھیے:

> ”سامنے والی حویلی کی کاہی آلود منڈیر پر بالعموم کوئی مغموم صورت سفید چیل بیٹھی اونگھا کرتی ہے اور پھر بغیر کسی ظاہری وجہ کے آپ ہی آپ کچھ تھکے ہوئے انداز میں اڑ کر کسی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو جاتی ہے۔ اکثر یہاں کوئی افسردہ خاطر بندروں کا جوڑا بھی بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کے روکھے چھدرے بالوں میں جوئیں بین بین ٹونگتے رہتے ہیں اور پھر ایکا ایکی اکتا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔“[۶۷]

جہاں جانور اور مردار خور پرندے آبسیرا کر لیں وہاں انسانی وجود کا ہونا اایک معجزے سے کم نہیں ۔یعنی مصنف نے ہر ممکن اداسی، بے چینی، رونق، چہل پہل، خوشی اور ویرانی کا تقابل کرنے کی کوشش کی

ہے۔ جس میں وہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں کہ ایک طرف زندگی ہی زندگی اور دوسری طرف انسانی وجود کی عدمیت کا مظاہرہ۔ اس افسانے میں آزادی کے بعد لوگ کس طرح اپنے وجود کو کھو بیٹھے اور زندگی کو اجیرن کر بیٹھے اور مختلف النوع مسائل کا شکار ہوئے اس بارے میں ڈاکٹر حامد رضا صدیقی لکھتے ہیں:

> "انتظار حسین نے اس (افسانے) میں آزادی کے بعد کی صورتِ حال کیا تھی لوگ کتنے مایوس ہو گئے تھے ان تمام مسائل کو بڑی ہی ہنر مندی سے بیان کیا ہے اور کرداروں کی زبان وبیان اور عوامی بول چال، علاقائی زبان اور محاورے کے استعمال سے افسانے (چوک) کے اندر ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کیا ہے۔"(۶۸)

اس اقتباس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد واقعی میں دونوں اطراف لوگوں کو بے شمار مسائل کا سامنا تھا اور ان تمام مسائل کو ہر وہ شخص صحیح طریقے سے سمجھ سکتا ہے جو اس کرب اور تکلیف سے گزرا ہے اور یقیناً لوگ بالکل مایوس ہو گئے تھے اور ان کے پاس جینے کی وجہیں کم پڑ گئی تھیں۔ مگر جینا تھا وہ جیتے رہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "اجودھیا" بھی اسی نوعیت کا ایک افسانہ ہے جس میں ہجرت کے بعد کے مسائل کا سامنا ہے اور انسان کے اپنی زمین سے کٹ کر جینے کے عذاب کا ذکر ہے۔ مگر اس افسانے کو دوسرے افسانوں سے اس لیے بھی الگ کیا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ بیانیہ ٹکنیک پر ہونے کے باوجود نیا پن لیے ہوئے ہے کہ اس میں ایک راوی ہے جو خود مصنف کی ذات ہے جو پاکستان آ گیا ہے مگر اسے رہ رہ کر ہندوستان اور وہاں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں یاد آ رہی ہیں۔ کہانی ایک ریوڑی اور ریوڑی فروش سے چلتی ہے اور راوی کو میرٹھ کے رمچنڈی ریوڑی فروش کی ریوڑیاں یاد آتی ہیں اور وہ پاکستان میں ہر جگہ ویسی ریوڑیاں تلاش کرتا ہے مگر اسے کہیں نہیں ملتی تو وہ اپنے بچھڑے دوست رمیش سے خط و کتابت کے ذریعے ریوڑیاں بھی مانگ لیا کرتا تھا مگر اب وہ شرمندگی کے باعث نہیں منگواتا اور آہستہ آہستہ اس کی خط و کتابت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اسی دوران اسے ہندوستان سے آتے وقت کا منظر یاد آتا ہے جب لوگ دھڑا دھڑ اسٹیشن پر آ جا رہے تھے اور بھیڑ کی

بدولت انسان اپنی انسانیت بھول چکا تھا اور بالکل انسانی وجود ذلالت اور معدومیت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جن کے بغیر ان کے گلی کوچے آباد ہی نہیں سمجھے جاتے تھے وہ بھی اپنا نام نہاد وجود اٹھائے اس اسٹیشن پر پاکستان آنے کے لیے منتظر کھڑے تھے اور بے یارومددگار۔ اور اس اسٹیشن پر تو کبھی بھیڑ تو کجا ایک آدمی بھی مسافر مشکل سے نظر آتا تھا مگر ہجرت کی جلدی اور انسانی وقار کی بے حرمتی نے انھیں اپنی جڑوں سے اکھاڑ کر یہاں پھینک دیا تھا اور اب یہ سارے اپنے اپنے گلی محلے کے بڑے بزرگ یہاں بے نام ونشاں پڑے منتظر تھے اور ایک دوسرے کی نظروں میں گرے ہوئے۔ اقتباس دیکھیے:

> "اسٹیشن۔۔۔۔اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپنے میں مذہبی کتابوں میں عرصہ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا۔ جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ اسٹیشن کا کون رخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑی لیکن اس روز آدمی پٹا پڑا تھا۔ ایسے ایسے وضع دار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکایک ایک دن اپنی ڈاڑھی منڈادے۔ ہر طرف سامان کے اڑنگ کے اڑنگ لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پہ کیفیت یہ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔"(۶۹)

ایسی حالت کہ جب کوئی شرعی آدمی تمام عمر کی ریاضت اور عبادت کے بعد اپنی ڈاڑھی ایک دم سے کٹوادے اور اس اسٹیشن کا حال اور محشر کا حال اگر مصنف کی نظر میں ایک ہی جیسا تھا تو آدمی کے وجود اور انسانیت کی کیا قدر باقی رہ گئی ہوگی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آدمی پہ آدمی گر رہا تھا اور تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کوتوال تک لوگوں کے اس جمگھٹے سے پریشان ہو گئے تھے بھلا زمین کو چھوڑنا اور اس دکھ کو سہنا

کوئی آسان کام ہے اور پھر یہ دکھ اور بھی بڑا ہو جاتا ہے کہ اگر ہجرت کے بعد بھی ٹھکانا نہ نصیب ہو جو کہ اس اجودھیا کے راوی کے ساتھ ہوا۔ جو دو دو ریوڑیوں کا ترس گیا تھا۔

"ایک بن لکھی رزمیہ" انتظار حسین کے پہلے افسانوی مجموعے کا بہترین اور مشہور افسانہ مانا جاتا ہے۔ جس میں پچھوا نامی ایک رزمیہ کردار پایا جاتا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے کامیابی سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آزادی سے پہلے لوگ کس طرح ہندوستان مین اپنے وطن کے لیے لڑنے، مرنے اور جان تک دینے اور لینے کے لیے تیار تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ہمیں اپنا ملک ملے گا مگر وہ انجام سے ناواقف تھے اور انھیں ان کا ملک نہیں ملا بل کہ سب کو قادر پور چھوڑ کر پاکستان جانا پڑا۔ ان سب کرداروں کو یہ تو اندازہ تھا کہ ہم ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں گے مگر انھیں اس بات کی خبر نہ تھی کہ پاکستان میں ان کا علاقہ قادر پور نہیں آئے گا۔ جس کے لیے یہ سارے انقلابی ہوئے پھرتے تھے اور پاکستان کے حق میں نعرے لگاتے پھرتے تھے "بٹ کے رہے گا ہندوستان، بن کے رہے گا پاکستان"۔ پچھوا اور اس کے ساتھی سارے کے سارے لوگ اس بات کی ضمانت ہیں کی تقسیمِ ہندوستان سے قبل لوگ کس طرح پاکستان سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور انقلابی ہوئے پھرتے تھے۔ جب یہ لوگ تقسیم سے پہلے بٹوارے کے نعرے لگاتے تو تن تن کے آگے بڑھ بڑھ کے سینا پھلا پھلا کے نعرہ فگن تھے مگر تقسیم کے بعد تو یہ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے ہو کر گزارہ کرنے لگے۔

اس افسانے میں یہ حقیقت بھی دکھائی گئی ہے کہ کس طرح سیاسی لوگوں نے اپنے مفاد کے لیے سادہ لوح لوگوں کو استعمال کیا اور تقسیم کے بعد خود تو چوری چھپے اور بہانے بہانے سے پاکستان بھاگ گئے اور وہاں جا کر خود سیٹل ہو گئے اور اپنے رشتے داروں کو بھی اچھی اچھی نوکریاں دلوا لیں مگر لرنے مرنے والوں اور جاں نثار کرنے والوں کو پوچھا تک نہیں۔ جاٹوں کے خونریز حملے سے تو پچھوا اور اس کے ساتھیوں نے پورے قصبے قادر پور کو بچا لیا مگر نعیم (جو کہ سیاسی آدمی ہے) بچ بچا کر پاکستان بھاگ گیا اور وہاں جا کر سیٹل ہو گیا تو اس نے خط لکھا کہ پاکستان ہی آجاؤ وہاں قادر پور اور کوئی بھی مسلمان محفوظ نہیں ہے۔ اس خط سے قادر پور میں بڑی بد

نظمی پھیل گئی اور زندگی بے معنی سی ہو کے رہ گئی۔ وجودیت خطرے میں پڑ گئی اور انسان جائے پناہ ڈھونڈنے کے لیے پاکستان کو جانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے۔ جس تناظر میں انھوں نے جیسے کیسے اپنی زمینیں ،جائیداد اور بسترے برتن کباڑیوں کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچے اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "نعیم میاں کے خط سے قادر پور میں ہلچل مچ گئی۔ تیسرے دن منشی ثناء اللہ کا بستر بوریا بندھ گیا۔ اس ہفتے جب پینٹھ لگی تو کباڑیوں کی دکان پر لوگوں کے گھریلو سامان کے اڑنگ لگے ہوئے دیکھے۔ اس اڑنگ میں سید حامد حسن کی نیتی تال کی چھڑیاں قربان علی کے یاں کی شیشم کی چارپائیاں اور منشی ثناء اللہ کے چینی کے برتن خاص طور پر نمایاں نظر آ رہے تھے۔"(۷۰)

تقسیم کے بعد لوگوں میں جو ایک خوف اور عدم وجود کی ہوا پھیل گئی تھی اس پر جلتی کا کام نعیم کے پاکستان سے آئے ہوئے خط نے کیا۔ سب لوگ دھڑا دھڑ سامان باندھ ،بیچ یا پھر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ زندگی بے معنی معلوم ہونے لگی اور چاروں اور موت کے خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ اس ضمن ڈاکٹر عبادت بریلوی یوں رقم طراز ہیں:

> "اس (ایک بن لکھی رزمیہ) میں جمی جمائی محفلوں کے درہم برہم ہونے، اپنی تہذیبی بساط کے الٹنے، ایک قوم کی نفسیات کے بدلنے اور اس کے معیارِ اقدار میں ایک متزلزل کیفیت کے پیدا ہو جانے کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور اس میں انتظار حسین کا سیاسی، سماجی، تہذیبی اور انسانی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ افسانہ ان کے انفرادی ردِ عمل ہی کو ظاہر نہیں کرتا ہے اس میں تو پوری قوم کی نفسیات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے جو واقعات بیان کیے ہیں اور مختلف کرداروں کی جن حرکات و سکنات کو پیش کیا ہے، اس میں پوری قوم کے تجربات کا پرتو نظر آتا ہے۔"(۷۱)

اس میں شک نہیں کہ افسانے کے مطالعے سے اس وقت کی متزلزل کیفیت ،دگر گوں حالات اور بے یقینی کی فضا کا یقین سا ہونے لگتا ہے اور یہ افسانہ پڑھتے ہوئے ایک جذباتی تاثر قاری پر طاری ہو جاتا ہے اور اسے پچھوا کے ساتھ جہاں ہمدردی ہو جاتی ہے وہیں اپنے سیاسی بھائیوں سے نفرت بھی ہونے لگتی ہے۔ بلا شبہ پچھوا ان مسلمانوں کا نمائندہ ہے جو عام ہونے کی وجہ سے سیاسی پیچ و خم کو نہیں جانتے اور ان سیاست دانوں کے ہاتھوں استعمال ہو جاتے ہیں۔ پچھوا ان لوگوں کا بھی نمائندہ ہے جو تحریکِ پاکستان میں تو پیش پیش تھے مگر ہجرت کے بعد ان کو منھ نہیں لگایا گیا۔ جیسے پچھوا کو فکرِ معاش تھی اور اسی سلسے میں وہ نعیم کے پاس گیا اور اس نے دھکے دے دے کر نکلوا دیا۔ یعنی جو پچھوا تقسیم سے پہلے ہیرو تھا، وہی تقسیم کے بعد مجسم التجا بن گیا اور زیرو ہو گیا۔

افسانہ نگار جب پاکستان پہنچتا ہے تو وہ وہاں مہاجرین کے حالات دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے اور اسی وجہ سے اس کا کردار پچھوا جو قادرپور میں ایک قادر شخص تھا، اب پاکستان میں مجبور و بے بس اور لاچار ہے۔ اس کے بعد افسانہ نگار نے خطوط اور دائری لکھنے کے انداز میں افسانے کو آگے بڑھایا ہے۔ جہاں اس نے اس وقت کے پاکستان کے حالات بیان کیے ہیں اور معاشرے میں ناقدریِ انسان کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد کہانی کار پچھوا کی وفات کا ذکر کرتا ہے اور اس کی وفات کے ساتھ ہی افسانے کو بھی ختم کر دیتا ہے کہ جہاں پچھوا کی توقیر نہیں اور وہ مزدوری کرنے لگتا ہے تو وہاں ایک ادیب کو بھی اپنے قلم کو خاموش کر کے ایک طرف بیٹھ کر ادب اور انسانیت کا جنازہ پڑھ لینا چاہیے۔

انتظار حسین کا افسانہ " استاد " بھی ان کا ہجرت اور اس کے مسائل کے لحاظ سے بڑا اہم افسانہ ہے اگرچہ یہ افسانہ انھوں نے ہجرت سے قبل لکھا تھا مگر بعد میں ۱۹۵۱ء کو اسے دوبارہ لکھا[۴۲] تو اس میں بھی ویسی ہی کسک آ گئی۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک استاد ہے جس کو افسانے کے اندر دو مختلف پہلوؤں اور ادوار میں دکھایا گیا ہے ایک ہندوستان کی تقسیم سے قبل اور دوسرا تقسیم کے بعد۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے استاد کا بڑا رکھ رکھاؤ اور دور دورہ تھا۔ ہر کوئی استاد کی عزت کرتا تھا اور اسے اپنا مائی باپ مانتا تھا۔ ہمیشہ انھوں نے اپنے کارناموں سے لوگوں کے دل جیتے اور ان کے ٹھاٹ باٹھ سب سے نرالے تھے۔ لوگ ان کو پلکوں پہ بٹھاتے تھے اور ان کی عزت میں ان کے سامنے بچھے جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کی محبت اور توجہ کے مرکز رہے تھے۔ اسی توجہ اور مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ بڑے بڑے رئیس اور امرا بھی انھیں ان کی حویلی میں سلام کرنے آتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر علاقے میں کوئی نیا پولیس والا یا کوئی داروغہ آتا تو پہلے ان کو سلام کرنے آتا پھر اپنے تھانے جایا کرتا تھا۔ استاد کی ایک بڑی سی حویلی تھی اور جس میں بڑے بڑے فیصلے ہوا کرتے تھے اور ہر وقت یہاں مردوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ استاد پتنگ بازی اور پہلوانی کے بھی استاد اور چیمپین تھے کیا مجال کہ کوئی ان کے سامنے ٹِک جائے۔

> ”استاد کا زمانہ بس دیکھنے کے لائق تھا۔ سارے شہر میں ان دھاک تھی۔ بڑے بڑے تیس مار خانوں کا ان کے نام سے دم خشک ہوتا تھا اور رئیسوں کی تو کبھی انہوں نے ہستی ہی نہیں سمجھی۔ جس کسی نے ذرا اکڑ تکڑ کی اس کو بیچ بازار میں جوتے لگوا دیے۔ رئیسوں ہی پہ کیا ہے افسروں سے بھی وہ دب کے تھوڑا ہی رہتے تھے۔“(۷۳)

ایک وہ وقت تھا کہ استاد کی یہ عزت اور توقیر تھی مگر تقسیمِ ہند کے بعد ساری کی ساری فضا ہی بدل گئی۔ انتظار حسین نے استاد کے ساتھ اس تمام فضا کا بھی بڑی باریکی سے جائزہ پیش کیا ہے جب بالکل زندگی، موت کے نرغے میں آچکی تھی اور جینا موت سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ زمین سے بچھڑنے کا غم تو اس میں واضح ہی ہے مگر ساتھ میں دنیا کی بے ثباتی اور اس کے حباب پن کا نوحہ بھی ملتا ہے کہ واقعی میں زندگی ایک پل میں حباب کی مانند ہو جاتی ہے کہ کسی بھی وقت ختم ہو جائے گی۔ استاد کو موضوع اور علامت بنا کر سارے معاشرے کو بیان کیا ہے کہ کس طرح محفلیں سجا کرتی تھی اور لوگ کیسے کیسے تماشوں میں مشغول تھے کہ اس تقسیم نے انھیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ وجودیت کا یہ کال ہے کہ کوئی بھی ڈرا سہا آپس میں بات کرنے کو تیار نہیں۔ معاشی، سیاسی اور تہذیبی ساری اقدار کھو کھاتے میں چلی گئی ہیں۔ وقت کے جبر اور قہر نے انھیں بالکل

تنہا اور خاموش کر دیا ہے کہ اب یہ زبان رکھتے ہوئے بھی گونگے ہو گئے ہیں۔بات کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے سماعت تو ہے مگر سننے سے قاصر ہیں۔ایک دوسرے کی خاطر جان دینے والے لوگ ایک دوسرے کی جان لینے لگے۔قیامتوں کا سامنظر اور ہر طرف آگ ہی آگ۔مگر پھر بھی استاد کی حویلی کی طرف کوئی نہ آیا مگر اب خاموشی، سناٹا اور خوف ہر طرف پھیل گیا۔زندگی اور اس کا وجود دونوں معدوم ہو کے رہ گئے۔اس منظر کو اپنی نظروں سے دیکھیے:

> ''چاروں طرف خون خرابہ ہوتا رہا، آگیں لگتی رہیں مگر بڑی حویلی کی طرف کسی نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ یہ فساد تو ختم ہو گیا۔لیکن قیامتیں تو اس کے بعد بھی آئیں اور ایسی قیامتیں آئیں کہ بڑی حویلی کی بنیادیں ہل گئیں۔ہاں نہ ہلے تو استاد اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ایک بڑی حویلی پہ کیا موقوف ہے دنیا ادھر سے ادھر ہو گئی۔زمانہ دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ محلے خالی ہونے لگے۔ بھری بستیاں اجڑنے لگیں لوگ ایمان بچانے کے بہانے جانیں بچا بچا کر لے گئے۔استاد نے اسی چبوترے پہ بیٹھ کے کربلائیں بھی ہوتے دیکھیں اور میلے بھی ڈھلتے دیکھے۔''(۷۴)

ایک بڑا چھتنار درخت بھی ایسے ماحول میں ہل گیا بل کہ اس کی جڑیں تک نکل گئیں اور استاد اب بالکل ہی خاموش ہو گئے اور اس قدر خاموش ہوئے کہ بس دنیا سے ہی چپ چاپ رخصت ہو گئے۔کیوں کہ خاموش ہونے والے خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر جیسی بھی خاموشی اور سناٹا ہو کچھ نہ کچھ تو کسی کی وفات پہ رونا دھونا ہوتا ہے مگر استاد کی وفات پہ ایسا بھی کچھ نہ ہوا اور ایسا جی دار شخص اور پہلوان جو خود میں ایک تہذیب تھا اور ایک ثقافت کا علمبردار اسے بھی ہجرت کا دکھ اور اپنے لوگوں کی خاموشی ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئی۔

استاد بھی زندگی کا بوجھ نہ سہار سکے اور دوسروں کے کندھے پہ سوار ہو اپنی زمین کے اندر سما گئے۔ان کے بعد حویلی کا جو نقشہ انتظار حسین نے کھینچا ہے وہ اس شہر کے لوگوں کی اجتماعی حالت کا عکاس ہے۔لکھتے ہیں:

"استاد چلے گئے۔ بڑی حویلی کا جو تھوڑا بہت بھرم تھا وہ بھی ختم ہوا۔ اب یہاں کیا رکھا ہے، خاک اڑتی ہے۔ استاد سارے ہنگامے اپنے ساتھ لے گئے۔ اب تو بڑی حویلی ڈھنڈار سی نظر آتی ہے۔ باقی پٹھے پہلے ہی رخصت ہو گئے تھے ای سگارہ گیا تھا۔ سو وہ بھی پاکستان چلا گیا۔ مشن بھائی خود چوبیسوں گھنٹے پاکستان جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ بڑی حویلی کے دام اٹھ جائیں۔ اجی بڑی حویلی بکے گی تو کیا، اس میں بس تالا ہی پڑے گا۔ دیکھ لینا کسی روز یہ ہی ہو گا۔"(۷۵)

انتظار حسین نے اس افسانے میں فقط استاد کی ذات اور شخصیت کو ہی پیش نہیں کیا بل کہ تقسیم کے حوالے پیدا ہونے والے زندگی اور وجود کے فقدان کو پیش کیا ہے جس میں ہر شخص پِس رہا ہے۔ لوگوں کے حالات، منظرِ تباہی اور سوچ کو بیان کیا ہے۔ یہ دنیا حباب کی سی ہے اور ساری کی ساری نمائش دھوکا ہے اور اس کا ادراک فسادات کی بھینٹ چڑھنے والوں کو سب سے زیادہ ہوا ہے۔ بٹوارے کے بعد لوگوں میں ایک خاص یاسیت اور قنوطیت کا احساس پیدا ہوا جو اپنے وجود کو ہی ٹٹول ٹٹول کر ڈھونڈتے رہے اور آخر کار اسی تلاش میں مر گئے۔ وجودیت کا یہ فقدان انتظار حسین کے ہاں کثرت سے پایا جاتا ہے مگر کیوں اس کے بارے میں اقبال آفاقی کہتے ہیں:

"آدمی جب دربدر ہوتا ہے تو نہ صرف اس کا دنیا پر اعتبار اٹھ جاتا ہے بل کہ اس کے اندر کی کہانی بھی بے اعتبار ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کا vocation یہ ہے کہ وہ اس دربدر شخص کو یاد کرے اور نوحہ کرے۔ جو ہجرت کے دنوں میں کہیں کھو گیا یا کہیں گم نا ہوا یا اس کہانی کا نوحہ لکھے جو اس کے ساتھ ہی کہیں روپوش ہو گئی۔۔۔۔۔ اسی طرح وہ آئرش وجودی مصنف سیموئیل بیکٹ کے قریب تر ہوتا نظر آتا ہے۔ وجودیت پسندوں کی طرح انتظار کا جھکاؤ بھی التباسی وقائع نگاری کی طرف بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار کی کہانیوں کی فضا Hauntedness سے بھرپور ہے۔"(۷۶)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت نے مصنف کے اندر ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔ جس کو پُر کرنے کے لیے تمام عمر مصنف دنیا بھر کے ادب، مذہب اور اساطیر میں غوطہ زن رہا مگر اسے اپنی مٹی سے کٹے رہنے کا غم غلط ہوتا دکھائی نہ دیا۔ اس لیے پہلے دن سے لے کر آخر دن تک اس کے اندر یہ خلا بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ اپنے دکھ کو کہانیوں میں مترشح کرتا رہا۔

انتظار حسین کی دوسری کتاب ۱۹۵۵ء میں مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہوئی جس میں چودہ افسانے اور ایک افسانے کی طرز کا مضمون شامل ہے جس میں انھوں نے اپنے فن اور افسانے کے فن پہ بات کرنے کے ساتھ ساتھ نئے افسانہ نگاروں کے لیے بھی کافی سود مند باتیں کی ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں بھی مصنف اپنے پہلے افسانوی مجموعے سے باہر نہیں آئے یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مجموعہ ''گلی کوچے'' کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ اس میں بھی ویسے ہی ہجرت کے مسائل، فسادات اور درد و کرب کی کیفیات اور ہندوستان سے پاکستان جانے کے بعد کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

ایسا ہی ایک افسانہ ''اصلاح'' ہے جس میں انتظار حسین نے بچوں کی نفسیات سے آزادی سے پہلے اور بعد کے مسائل کا بھرپور احاطہ کیا ہے کہ کس طرح لوبٹوارے سے پہلے خوش حال اور مل جل کر رہتے تھے اور اب ہجرت کے بعد کیسے ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے رہتے ہیں کہ بالکل انسانی وجود خطرے میں معلوم ہوتا ہے۔ بندا اس کا مرکزی کردار ہے اور ضمنی کرداروں میں کلو، نہال اور حبیب شامل ہیں۔ انھیں کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہے آزادی سے پہلے کی خوش حالی اور بعد کی اداسی، پژمردگی کے ساتھ ساتھ معاشرے پہ چھایا اضمحلال واضح ہوتا ہے۔ اپنے پہلے مجموعے کے افسانوں کی طرح اس میں بھی تسیم سے پہلے کی رونق کا ذکر ہے کہ کس طرح بچے اچھل کود کرتے اور شرارتیں کرتے تھے۔ گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنا، کوڑیاں، گولیاں، غلیل، پتنگ بازی کرتے تھے۔ کلو کو دار لوٹنے اور مانجھا سوتنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ یہ کبھی بھی پتنگ نہیں خریدتا تھا بل کہ اپنی چھت سے ہی لوٹ لیا کرتا تھا۔ دوسرے بچوں کے بھی عجیب عجیب ٹشن ہوتے تھے۔ ذرا سب کو ایک ساتھ دیکھیے:

”یہ کام حبیب اور بندا کو خوب آتا تھا۔ حبیب نے پتنگ شاید ہی کبھی اڑائی ہو، وہ تو ہچکا تھام کر ہی اپنی تسکین کر لیتا تھا۔ چوک میں وہ ہمیشہ اس تاک میں کھڑا پایا گیا کہ کب مجید پتنگ اڑانے آئے اور کب وہ اس کا ہچکا تھامے۔ کلو چوک میں اپنا وقت کیوں گنواتا۔ چوک میں تو ہمیشہ نکھرے لونڈوں کا جمگھٹا رہتا۔ جن کی چھتوں کے زاویے درست ہیں وہ کیوں چوک میں اپنا وقت ضائع کرنے لگے۔ ہچکا نہیں ملا نہ سہی۔ آخر چھوٹے مکانوں میں بھی لوگ رہتے ہی ہیں۔ کلو نے خالی گھٹک پر ہی قناعت کر لی۔“(۷۷)

اس اقتباس کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم سے قبل کس قدر لوگ خوش تھے اور خصوصاً بچے کیسے ایک دوسرے سے بغیر کسی امتیاز کے گھل مل کر کھیلا کرتے تھے۔ ہر قسم کا مذہبی و ثقافتی تہوار سب مل کر مناتے تھے کوئی مذہبی یا قومی تفریق موجود نہ تھی اور نہ ہی کسی قسم کا ڈر موجود تھا ہر طرف زندگی اور زندگی کی ریل پیل تھی۔ ان بچوں کے کھیلنے اور تماشے کرنے سے ہر وقت چوک بھرا رہتا تھا اور ہر طرف رونق نظر آتی ہے مگر تقسیم کے بعد یہ چوک خالی خالی نظر آتا ہے بل کہ اس جگہ صرف چیل اور کوے ہی دکھائی پرتے ہیں۔ وہ رنگینیاں جو بچوں کے کھیلنے سے پیدا ہوتی تھیں وہ ساری کی ساری بچوں کے اترے ہوئے ڈر اور خوف میں مبتلا چہروں میں کہیں گم ہو کر رہ گئیں۔ رنگ برنگی پتنگوں سے سجی سجائی دیواریں اب بالکل ہی خالی خولی ہو گئی تھیں کہیں کوئی ہچکا بھی نظر نہیں پڑتا تھا۔ اب گھروں سے بھی لڑنے، رونے اور کھل کھلانے کی آوازیں نہیں آتی تھی بال کہ خاموشی اور بے نام سی اداسی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ پورے شہر میں ایک ماتم کی سی فضا تھی اور محلے، چوک اور گلیاں جہاں رونق ہوا کرتی تھی اب وہاں کنکر پتھر اور کوڑے کے ڈھیر ہی دکھائی پرتے ہیں۔ بعد از تقسیم کا منظر ملاحظہ ہو:

”چاروں طرف سے بھورے بھورے ذروں کا ایک اتھاہ سمندر بڑی سست روی سے بہتا نظر آتا۔ دور آسمان کی بلندیوں پر چند سیاہ سائے تیرتے دکھائی دیتے۔ کبھی کبھی ان میں جنبش دکھائی دیتی۔ پھر کبھی کبھی ایک فاختہ اڑتی ہوئی نہال کے کوٹھے پر جو ایک چھوٹی سی برجی اس پر آ بیٹھتی۔ اور اپنی چونچ کچھ اس انداز سے گھماتی کہ کبھی بھی اس بیرنگ

دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گی۔ اکثر اوقات یہاں ایک مردار چیل بھی بیٹھے نظر آتی ہے جو کلو کی دھمکیوں اور اینٹوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائی۔ خود ہی بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی تو بغیر بازوؤں کو ہلائے اور بغیر چونچ کو جنبش دیے آہستگی سے فضا کی لہروں میں اتر جاتی۔ اس تھکا دینے والے منظر سے بیزار ہو کر وہ چھت سے نیچے اترتا اور گلی میں بے معنی طور پر اچھلتا کودتا ہوا چوک میں پہنچتا۔ چوک میں بھی اب کون سی دلکشی باقی رہ گئی تھی۔ دنیا جہان کا کوڑا وہاں جمع تھا۔"(۷۸)

اس اقتباس سے میرٹھ اور اس جیسے کئی اور شہروں کا فسادات کے وقت اور بعد میں کیا حال ہوا ہو گا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہجرت اور اس کے فسادات نے بالکل ہی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور سب سے زیادہ نقصان انھوں نے اٹھایا جو ہجرت کر کے نئے ملک اور نئی زمین پہ جا آباد ہوئے کیوں کہ انھیں اپنی شناخت کا بھی مسئلہ درپیش تھا اور معاش کا بھی، گھر بار بھی ان لوگوں کے پاس نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر اپنوں کے بچھڑنے کا غم۔ جہاں کبھی بچوں کے دوڑنے، کھیلنے اور تماشے کرنے کا شور تھا وہاں اب الو، گدھ، چیل اور دوسرے کئی پرندے اڑتے دکھائی دیتے ہیں جو ویران جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہجرت نے کس قدر انسانیت کے وجود کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ لوگوں کے اندر غم، حزن اور ملال اس قدر جمع ہو گیا تھا کہ وہ ہنسنا ہی بھول گئے تھے اور دن میں بھی گھر قبرستانوں کے جیسے خاموش ہو گئے تھے۔ کئی بچے یتیم ہو گئے اور کئی عورتیں اپنا سہاگ اس ہجرت کی نذر کر چکی تھیں اسی لیے بند اب یتیم خانے میں پل رہا تھا اور اس کی ماں بیوہ ہو گئی تھی۔ ایسی بے چارگی اور بے بسی تھی کہ وقت بالکل تھم سا گیا تھا بل کہ وقت کا احساس ہی جاتا رہا اور یہ زیاں بہت بڑا نقصان تھا۔ وقت کی بے وقعتی کے بارے میں انتظار حسین نے اس افسانے میں نہایت ہنر مندی سے جملے لکھے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کس قدر اپنی اہمیت کھو چکا تھا کیوں کہ وقت کا احساس اس معاشرے میں رکھا جاتا ہے جہاں کسی کو کچھ کرنا ہو اور آگے بڑھنے اور حرکت عمل کے معاملات ابھی باقی ہوں مگر جہاں زندگی اپنے وجود کو ترسے اور رونے پیٹنے اور ماتم کے لیے ہی وقت ہو تو آدمی رو رو کر بھی ایک دن چپ کر جاتا ہے۔ وقت کی بے توقیری کے لیے یہ جملے دیکھیے:

"دن گزرتے گئے، دن لمبے ہوتے گئے، دنوں کی شگفتگی اور شادابی زائل ہونے لگی، دن جو پہلے دوڑتے تھے گھٹنے لگے، پھر دنوں کا تنوع ختم ہوا۔ ہر نیا دن پرانا ہوتا تھا، اور ہر دوسرا دن پہلے دن کا ہم شکل بن گیا۔ پھر نئے پرانے اور پہلے دوسرے کا امتیاز بھی ختم ہونے لگا۔ وقت ایک بے کیف تکرار بن کے رہ گیا۔ وہی ایک ادھ مرا دن تھا جو نڈھال ہو کر مغرب میں ڈوب جاتا تھا اور دوسری صبح کو پھر مرتا گرتا آن وارد ہوتا تھا۔ پھر دن مضمحل ہوتا گیا، معدوم ہوتا گیا۔ پھر دن کے وجود کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔"(۷۹)

اس سے بڑھ کر وقت کی بے توقیری اور حالات کی پژمردگی اور ژولیدگی کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ یوں لگتا ہے کہ انتظار حسین نے وقت کی روح کو بھینچ کر رکھ دیا ہے یا وقت کے بدن سے سارا خون ایک لخت نچوڑ لیا ہے۔ ہر جگہ انسان کے وجود کی دھجیاں بکھر گئی ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ "پسماندگان" میں انسان کے وجود کے بے معنی ہونے پر ایک اور دلچسپ افسانہ ہے۔ اس میں پسماندگان کے ساتھ مکالمے کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے کہ جب کسی کا کوئی عزیز فوت ہو جاتا ہے تو دوسرے لوگ عزیز و اقارب اور اہلِ محلہ کس طرح تعزیت کرتے ہیں اور انسانی وجود کی لایعنیت پہ اپنے سے انداز میں بحث کرتے ہیں وہ ہمارے روز مرہ کے مشاہدہ کا حصہ ہے۔ ہر مرگ اور ماتم پہ ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے اور ہم میں سے انتظار حسین کی دور بیں نگاہ نے اسے ایک کہانی کا روپ دے دیا۔

محلے کی خانصاحبنی کا جوان سال بیٹا ہاشم جس کی عمر ابھی صرف اٹھائیس سال تھی ایک دم بیمار ہوا اور اگلے دن فوت ہو گیا۔ جس کی وجہ سے اہلِ محلہ اور رشتے داروں میں کہرام بپا ہو گیا۔ آئے جانے والے لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انسانی زندگی فضول سانسوں کا تار ہے اور ہم اسی پہ اتراتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہتے ہیں۔ پسماندگان سے ہر کوئی اپنی سی تعزیت کر رہا ہے:

"باقر بھائی دھیمے سے لہجے میں بولے۔ "سب کہنے کی باتیں ہیں موت کا بہانہ ہوتا ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔"

چھنوں میاں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ”کیا خدا کی قدرت ہے؟“

باقر بھائی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اکڑوں بیٹھے تھے ان کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے بولے۔ ”آدمی میں کیا رکھا ہے، ہوا کا جھونکا ہے، آیا اور گیا۔“

علی ریاض کی آنکھوں میں ایک تحیر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ”باقر بھائی! کیا ہوتا ہے یہ، آدمی اچھا خاصا بیٹھا ہے، ہچکی آئی، پٹ سے دم نکل گیا۔ جارہا ہے جارہا ہے، ٹھوکر لگی آدمی ختم، کچھ عجب کرشمہ ہے۔“

باقر بھائی سوچتے ہوئے بولے۔ ”بس بھائی سانس کا تار ہے۔ جب تک چلتا ہے، چلتا ہے، ذرا ٹھیس لگی، تار ٹوٹا، آدمی ختم۔“

تجمل اور چھنوں دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ “(۸۰)

یقیناً زندگی اور اس کا وجود بالکل بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور نہ ہی ہمیں اس کا کسی لمحے بھروسہ کرنا چاہیے۔ دنیا ایک گھاٹے کا سودا ہے اور ہمیں ہمیشہ اللہ کے بتائے ہوئے اعمال کے مطابق ہی زندگی گزارنی چاہیے تاکہ مرتے ہوئے بھی ہمیں خدا کا قرب نصیب ہو اور آخرت میں بھی۔ اس اقتباس سے بھی یہی پتا چل رہا ہے کہ انسان کی حیثیت اور اوقات ایک پانی کے بلبلے کی مانند ہے پتا نہیں کس لمحے یہ بلبلا پھٹ جائے اور انسان ختم ہو جائے۔

انتظار حسین کا تیسرا افسانوی مجموعہ ”آخری آدمی“ ایسا افسانوی مجموعہ ہے کہ جس نے اردو ادب اور بالخصوص اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ اس کے سارے کے سارے افسانے ہی انسانی وجود کی معدومیت پر متشکل اور مصور ہوئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ نمائندہ تین افسانے ہیں۔ آخری آدمی، زرد کتا اور کایا کلپ۔ ان تینوں افسانوں میں انسان کی معدومیت اور پھر اپنے وجود کی تبدیلی کا ایک خاص منظر نظر آتا ہے۔

آخری آدمی اپنی بستی کا ایک ایسا شخص ہے جس کی ساری کی ساری بستی گناہ کرنے اور خدا سے مکر و فریب کی وجہ سے بندر بن چکی ہے اور یہ آخری بچ جانے والا اپنی بستی کا سب سے ذہین شخص ہے۔ جس نے حتی المقدور کوشش کی کہ میں آدمی پیدا ہوا ہوں تو لہٰذا آدمی ہی کی جون میں مروں، مگر ایسا نہیں ہوتا اور اس کا وجود بھی معدوم و متبدل ہو کر انسان سے بندر بنا جاتا ہے۔ وجود کی عدمیت کے ساتھ ساتھ یہ انسانی زوال اور انحطاط کی بہترین کہانی ہے جس میں انسان کی گراوٹ اور تنسیخ کا عمل نظر آتا ہے۔ وجود کی نفی ہوتی نظر آتی ہے اور زندگی و موت کی کشمکش کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی شکست بھی دکھائی پڑتی ہے۔

الیاسف اس بستی کا آخری آدمی ہے اور یہی اس کہانی کا مرکزی کردار بھی ہے۔ باوجود یہ کہ اس نے مقدور بھر کوشش کی کہ میں بندر نہ بنوں اور آدمی ہی کی جون میں دنیا سے رخصت ہوں مگر اس کا وجود اس کے لیے ہی عبرت کا نشان بن گیا اور اس کی ذات بدل گئی۔ اقتباس دیکھیے:

> ”الیاسف نے اپنے بد ہئیت اعضا کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا میں، میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے اس کا دل ڈھینے لگا۔“(۸۱)

الیاسف کا وجود بدلنے سے وہ بندر بن گیا اور اس طرح انسان کی تنسیخ کا عمل جاری رہا اور وہ بالکل اپنی ذات سے نکل کر جانوروں میں شمار ہونے لگا۔ اس افسانے میں انسان کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ساتھ اخلاقی شکستگی اور معشرت زوال کا اجتماعی سطح پر مظاہرہ ملتا ہے۔ اسی لیے یہ مسائل ہر دور کے انسان کے مسائل رہے ہیں تو یہ کہانی آفاقی درجے پر پہنچ جاتی ہے جہاں انسان خلوص و بردباری جیسے جذبات سے نکل کر لالچ اور بدنیتی کی دلدل میں دھنس جاتا ہے۔

اسی مجموعے کی ایک اور شاہ کار کہانی ”زرد کتا“ ہے۔ یہ دونوں افسانے معنوی لحاظ سے ایک دوسرے کا تسلسل اور کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ آخری آدمی کی کہانی انجیلِ مقدس اور قرآن سے مشتق ہے مگر یہ زرد کتا

بزرگانِ دین کے ملفوظات اور حکایات سے ماخوذ ہے۔ اور اس طرح اس میں حکائی اسلوب اپنایا گیا ہے کہ زرا برابر شک نہیں پڑتا کہ انتظار حسین نے ملفوظات اور واقعات خود گھڑے ہیں یا کہ واقعی بزرگوں نے ایسی باتیں کہی ہیں کیوں کہ وہ اس قدر فِٹ اس افسانے میں بیٹھی ہیں کہ نشست و برخواست میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

زرد کتا کہانی بھی روحانی اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ساتھ انسان کی معدومیت اور تنسیخ کی کہانی ہے جس میں ایک راوی کے سوال وجواب اور اس کے مرشد کے جواب سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں انسان اپنا اصل وجود کھو کر دنیا میں لالچ اور ہوس کا بھوکا کتا بن گیا ہے اور ایسا شکار بنا پھرتا ہے جسے کہیں سکون میسر نہیں اور طمع دنیا نے اسے کھوکھلا کر دیا۔ معاشرتی اقدار سے گر کر جانوروں سے بھی بدتر اور اسفل ہو چکا ہے۔ انسانی وجود پر زرد کتا یعنی نفسِ امارہ کس طرح غلبہ پالیتا ہے اور انسانی وجود دنیاوی طمع میں کس طرح کھپ جاتا ہے یہ افسانہ اس کی بہترین تفسیر ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے، مگر پھر ایسا ہوا کہ کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آگئی اور پیروں پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پہ نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ میں نے اسے پیروں سے لاندکر کچل دینا چاہا اور وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے قدموں سے کھوندا اور وہ موٹا ہوتا گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندتا ہوا آگے نکل گیا۔۔۔۔۔۔ میں تھک گیا اور میں تھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ میں نے بارگاہِ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا۔"[۸۲]

اس افسانے میں اس کے علاوہ بھی بہترین جملے موجود ہیں اور مکالمے بھی کہ جن سے انسان کی تنسیخ اور اس کے وجود کی معدومیت کا پتا چلتا ہے۔ اس اقتباس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طمعِ دنیا کی وجہ سے اس کا نفسِ امارہ جس کو افسانہ نگار نے زرد کتے سے معنی مستعار لے کر استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی تو اس کہانی کو انسانی نفس کی رزالت گردانتے ہیں۔ جس میں معاشرتی رویوں کے زوال کا ذکر آیا ہے اور ہر ذہن مختل ہے اور کھچاؤ کا شکار ہے۔ لکھتے ہیں:

"زرد کتا انسانی نفس کی رزالت کا تمثیلی استعارہ ہے۔ اس میں معاشرتی کرداروں کو ہم خارج کے ناقابلِ برداشت زوال اور شعور کی تکلیف دہ حالتِ زوال میں گھرا پاتے ہیں۔ زندگی Erose اور موت Thanatos کی جبلی کارکردگی کا فساد بھی اس میں در آتا ہے۔ زرد کتا سے شہرِ افسوس تک آتے آتے بہت سی تصویروں کے رنگ اور ذائقے رجعتِ قہقری کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے ان تصویروں میں نفسیاتی کھچاؤ اعصابی کشیدگی میں ڈھل گیا ہے۔ مصنف ہر مثبت قدر کا انکار کر رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے یہاں انسانیت بھی باطل قرار پا چکی ہے۔" (۸۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی میں اس افسانے کی کہانی میں افسانہ نگار کے ہاں انسانی زندگی، اس کا وجود اور اس کی ذات بالکل ہی باطل قرار پا چکی ہے۔ ہر معاملہ کشیدگی کا شکار ہے اور زندگی ٹھہراؤ کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ منجمد ہو چکی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ کایا کلپ اپنے موضوع کے لحاظ سے تو نیا نہیں اور اسلوب بھی وہی داستانوی ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے وہی انسان کے وجود کی عدمیت اور تنسیخ کا رونا رویا ہے کہ آدمی کس طرح اپنے معیار سے گر کر اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھ نکر اپنا انسان ہونا بھی بھول جاتا ہے۔

اس افسانے میں مرکزی کردار ایک شہزادے آزاد بخت کا ہے جو اپنی دلربا شہزادی کو ایک دیو کی قید سے چھڑانے ایک قلعے میں آیا ہوا ہے۔ اس قلعے میں شہزادی دیو کی قید میں ہے جو شام کو واپس اپنے قلعے میں

واپس آتا ہے تو شہزادی ایم منتر پڑھ کر شہزادے پر پھونک مارتی ہے جس سے شہزادہ ایک مکھی بن کر کسی دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہے تاکہ دیو کی نظروں سے بچا رہے اور دیو انسان کی بو سونگھ کر مانس گند مانس گند یعنی انسان کی بو انسان کی بو کہتا رہتا ہے تو شہزادی اسے کہتی ہے کہ میں ہی یہاں انسان ہوں تو مجھے ہی کھالے۔ اس طرح دیو اسے کچھ نہیں کہتا اور دن گزرتے رہتے ہیں اور روزانہ شہزادی اسے مکھی کی جون میں بدل دیتی ہے اور دن ہوتے ہی دوبارہ منتر پڑھ کر اسے آدمی کی جون میں لے آتی ہے۔

مگر شہزادہ ان دو متضاد کیفیات میں رہتے رہتے اکتا جاتا ہے اور اپنا آدمی ہونا بھول کر مکھی ہونا جانتا ہے کیوں کہ راتیں لمبی آگئیں تھیں اور دن چھوٹے تو اسے دن بھر یونہی لگتا کہ میں ابھی تک مکھی کی ہی جون میں ہوں اور آدمی نہیں بن پایا۔ ایسے ہی اسے آدمی بننا مشکل اور مکھی کی جون میں رہنا آسان لگتا تھا۔ اور اس طرح وہ اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ جس پر اقبال آفاقی نے کہا کہ "انتظار کا افسانہ "کایا کلپ" متھ کی زبان میں آدمی کی تنسیخ کا نوحہ نہیں تو اور کیا ہے؟"(۸۴) افسانے سے آدمی کی تنسیخ کا ایک اقتباس دیکھیے:

> "اس نے اپنے آپ کو بار بار دیکھا اور کہا میں آدمی نہیں ہوں۔ تو پھر میں مکھی ہوں؟ مگر اس وقت وہ مکھی بھی نہیں تھا۔ تو میں آدمی بھی نہیں ہوں، میں مکھی بھی نہیں ہوں۔ پھر میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں، اس خیال سے اسے پسینہ آنے لگا اور اس نے سوچا کہ نہ ہونے سے مکھی ہونا اچھا ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا کہ آج اس کے خیال کی رو ڈوبتی نبض کی مانند رک رک کر چل رہی تھی۔"(۸۵)

شہزادے کی اس مکھی میں رہنے اور کشمکش و پنج میں مبتلا ہونے کی کیفیت جب شہزادی کو معلوم پڑی تو اس نے کہا کہ اب میں رات کو اسے دیو کے ڈر سے مکھی نہیں بناؤں گی اور اسے ایسے ہی آدمی کی ہی جون میں تہہ خانے میں بند کر دوں گی اور ایسا ہی ہوا کہ شہزادے کو شہزادی نے تہہ خانے میں بند کر دیا تو وہاں وہ اپنے احساس اور وجود کی عدم احساسیت کی وجہ سے خود ہی مکھی بن گیا اور دیو نے اس رات آکر مانس گند مانس گند بھی نہیں کہا جس پر شہزادی کو حیرانی ہوئی کہ دیو کی انسان کو سونگھنے والی حس کو نہ جانے کیا ہوا مگر ہوا یہ کہ شہزادہ

اپنی آدمی کی جون سے بالکل اصل مکھی کی جون میں تبدیل ہو چکا تھا۔ شہزادی نے صبح دیکھا تو وہ ایک بڑی سی مکھی میں بدل چکا تھا جس پر بارہا منتر پھونکنے سے بھی وہ انسان نہ بن سکا۔ اس افسانے کا بنیادی موضوع ہی انسان کے وجود کی معدومیت اور اس کا نوحہ ہے۔

ii. انسانی زندگی کا مقصد

اس کائنات کی ہر چیز کسی نہ کسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہے اور وہ اپنا مقصد بخوبی نبھا بھی رہی ہے۔ یہ چاند ستارے سورج اور طرح طرح کی پھیلتی ہوئی کہکشائیں اپنا اپنا مقصد لیے ہوئے ہیں اور دن رات اپنے اپنے وقتِ مقررہ پر آتے اور جاتے ہیں۔ دن کا ایک وقت ہے اور رات کا اپنا ایک نظام ہے۔ دریا سمندر اور یہ بڑی بڑی آبشاریں کبھی ان کو دیکھ کر خوف آیا کرتا تھا اور انسان ان کو اپنی ترقی کے راستوں میں رکاوٹ خیال کیا کرتا تھا مگر جیسے جیسے انسان نے خدا کی قدرت کو سمجھا ہے تو اس نے جانا ہے کہ یہ بھی ہمارے ہی فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں اور اس طرح انسان نے اس جہاں کی ہر چیز کا مقصد ڈھونڈا اور پھر اس سے استفادہ کرنا شروع کیا۔

انسان بھی اس دنیا میں اپنے ایک مقصد کے لیے تشریف لایا ہے اور آسمانی کتابوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب سے بہترین اللہ کی تخلیق ہے جسے ایک احسن شکل وصورت دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اور اس بات کا ثبوت کہ کائنات کی افضل مخلوق ہے اس کے آج نت نئے کاموں اور ایجادات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی لیت تو خدا نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ کہا ہے اور نائب مقرر کیا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کو اس وقت میسر آتا ہے جب وہ اپنا دنیا میں آنے کا مقصد یاد رکھتا ہے اور اسی کے، طابق زندگی گزارتا ہے مگر جب انسان اپنے مقصد سے روگردانی کرتا ہے اور وہ کام کرنے شروع کر دیتا ہے جو اس کی شایانِ شان نہیں یا جس سے اسے منع کیا گیا یا روکا گیا ہے تو خدا پھر نہ اسے زمانے میں رسوا کرتا ہے بل کہ اسے اسفل اور سافلین میں شمار کر دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بھی بنا دیتا ہے۔ اس لیے انسان کو کبھی بھی اپنا مقصد نہیں بھولنا چاہیے اور ہمیشہ اپنے فرائض کی ادائیگی کرنی چاہیے۔

انتظار حسین کے ہاں ایسے افسانے بھی مل جاتے ہیں جن میں انسان اپنے خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے حکم سے روگردانی کرتا ہے جس کے تحت اسے سافلین میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے اور مقصد سے دوری بالکل بھی قابلِ قبول نہیں۔ انتظار حسین کا تیسرا افسانوی مجموعہ "آخری آدمی" میں ایسے افسانے موجود ہیں جن میں انسان اپنے مقصد سے روگردانی کر کے خدا کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔

آخری آدمی افسانہ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے جو اپنی نوعیت کا منفرد اور بے مثال افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اپنے اسلوب، معانی اور موضوع کے لحاظ سے مختلف تعبیرات کا حامل ہے۔ اس کہانی کے کرداروں میں الیاسف مرکزی کردار ہے اور اس کے ساتھ الیعذر، الیاب، ابنِ زبلون اور الیعذر کی لونڈی گجر دم شامل ہیں۔ اس افسانے کا پلاٹ قرآن کی چار آیات (سورۃ اعراف کی ۱۶۳ سے لے کر ۱۶۶ تک) سے لیا گیا ہے جس میں ایک قبیلہ جو رب تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی وجہ بندر بن گیا تھا۔ یعنی وہ لوگ اپنے مقصد کو بھول کر حرص وہوس میں پڑ گئے تھے تو اللہ نے ان سے یہ سلوک کیا یعنی ان سب کو بندر بنا دیا۔ مگر ایک آدمی الیاسف بچ رہا جس کو مصنف نے آخری آدمی کہا ہے۔ اس نے مکمل کوشش کی کہ میں اب انسان کی جون میں ہی مروں گا مگر وہ بھی ایسا نہ کر سکا اور آخر کار بندر بن گیا۔

اپنے مقصد کو بھول کر حرص وہوس اور لالچ نے باہمی لڑائی جھگڑے اور انسانی بے توقیری نے ان سب کو غیر جنس بنا دیا اور خدا کے منع کرنے کے باوجود سبت کے دن مچھلیاں پکڑتے تھے کہ اس دن مچھلیاں سطحِ آب پر زیادہ آتی تھیں۔ مگر خدا کے حکم کی عدولی کرنے پر اور آپسی نفرت، رنجش اور لڑائی پر انھیں سزا ملی اور ساری کی ساری بستی اپنی صورت مسخ کروا کے بندر بیٹھی۔ وہ بستہ کہ جو اونچے میناروں، برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی تھی۔ جس میں دن رات ریل پیل تھی اور کاروبار زوروں پر تھا مگر خدا کی نافرمانی انھیں لے ڈوبی۔ اقتباس دیکھیے:

"الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔الیاسف محبت اور نفرت سے،غصہ اور ہمدردی سے،رونے اور ہنسنے سے،ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ان کا درختوں پر اچکنا،دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا،کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا۔یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا،کبھی ہنساتا تھا،کبھی غصہ دلاتا تھا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا۔پھر یوں ہوا کہ انہیں لڑتا دیکھ کر اس غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔"[۸۶]

اس اقتباس سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انسان اپنے ہی بھائیوں پہ ظلم ڈھانے اور اپنے سماج میں بگاڑ پیدا کرنے کا مرتکب بن کر خدا کے عذاب کو دعوت دیتا ہے۔انسان کا دنیا میں مقصد بھلائی نیکی احسان اور محبت و رواداری ہے اور جب اس کے برعکس کام کرنا شروع کر دے تو سوائے عبرت اور دکھ کے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔جیسے خدا نے پوری کی پوری بستی کو بندر بنا کر عبرت کا نشان بنا دیا اور بعد میں آنے والوں کے لیے نشانیوں کے طور پر انھیں کسی نہ کسی حالت میں باقی رکھا۔آسمانی صحیفوں میں لکھا ہے کہ احسان کرو تا کہ تمھارے ساتھ میں احسان کا رویہ رکھا جائے اور تمھارے ساتھ بھلائی کا سا سلوک کیا جائے۔

انتظار حسین کا مشہورِ زمانہ افسانہ "زرد کتا" ایک اہم ترین افسانہ ہے جو "آخری آدمی" کا تسلسل معلوم ہوتا ہے۔جس میں آخری آدمی کی طرح ہی زمانے کے مصائب اور مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کہانی میں زرد کتا انسانی نفسِ امارہ کو بتایا گیا ہے جو ایک لومڑی کے بچے سے بڑھ کر بڑا ہو کر زرد کتا بن جاتا تھا۔اس افسانے میں صوفیا کے ملفوظات اور قرآنی آیات سے سہارا لے کر کہانی گھڑی گئی ہے۔اور ہر انسان اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے اور دناوی حرص و طمع میں پڑ کر خدا اور اس کے بتائے ہوئے احکامات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے تو ہر انسان پر اس کا نفسِ امارہ غالب آجاتا ہے اور وہ زرد کتا بن جاتا ہے۔اس طرح وہ روحانی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔یہی اس افسانے کا مرکزی نکتہ ہے کہ نفسِ امارہ انسان کو مختلف طریقوں سے بہکا کر اسے اس کے مقصدِ زندگی سے دور کر دیتا ہے۔

یہ کہانی ابو قاسم راوی کے ذریعے آگے بڑھتی ہے جو اپنے شیخ و مرشد سے سوالات کرتا ہے اور وہ جواب دے دے کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور راوی و مرید ہر جواب کی شرح مانگتا ہے جس کے سلسلے میں مرشد ایک حکایت اسے سناتے اور سمجھاتے ہیں۔ اس میں کئی پہلو انسانیت کی گراوٹ کے بھی آتے ہیں جو جہاں دلکش و حسین معلوم ہوتے ہیں اور بار بار پڑھنے کو جی کرتا ہے وہیں وہ ٹکڑے معنی خیزی سے بھی بھرپور ہوتے ہیں۔

راوی ابو قاسم خضری نے بتایا کہ ان کے مرشد شیخ عثمان کبوتر کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اور ہمیشہ ایک ہی ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ کو اپنا دشمن کہا کرتے تھے، جو کہ رفیق و مددگار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز بیان اور وعظ کے بعد ان سے پوچھ ہی لیا کہ یہ ہاتھ کیوں کٹ گیا تھا۔ جس سے آپ پناہ مانگتے ہیں۔ تو میرے جواب میں انھوں نے شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا جو یہاں من و عن نقل کرتا ہوں:

> "شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کے گھر تیسرا فاقہ تھا، ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی۔ تب شیخ ابو سعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر لوٹ رہے تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ ترشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور تو نے سوال کیا، سو تو نے اپنا انجام دیکھ لیا۔"(۸۷)

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے تو اسے ہمیشہ افضل و اعلیٰ کام ہی کرنے چاہییں جو کہ اسے زیب دیتے ہیں۔ مگر جب انسان اپنے معیار سے گرتا ہے تو وہ بھی گرا دیتا ہے اور ایسے انسانوں کو اسفل السافلین میں ڈال دیتا ہے۔ انسان کا مقصد دنیا میں آسانیاں پیدا کرنا اور نیک اعمال کرنا ہے نہ کہ دنیاوی طمع و حرص پر دوسروں کے سامنے ہاتھ دراز کرنا۔ جب انسان اپنے مقصد پہ نظر رکھتا ہے تو اسے دنیاوی حرص و طمع اور لالچ کبھی بھی گھیر نہیں سکتے اور وہ ہر وقت خدا کے دیے پر شکر گزار رہتا

ہے۔ مگر جب انسان اپنے مقصد سے گر کر اعلیٰ سے ادنیٰ ہو جائے گا تو اس کے ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا۔ جیسا شیخ ابو سعید کے ساتھ کیا گیا۔

راوی نے طمع دنیا کا سنا اور اسے دل میں بٹھا لیا اور اپنے شیخ سے اجازت طلب کی جس پر مرشد خاموش ہو گئے اور تھڑے سے توقف کے بعد گویا ہوئے اور کہا لفظ کلمہ ہے اسی لیے لکھنا عبادت ہے اور جب لکھو وضو کر کے بیٹھو اور جیسے سنا ویسے لکھو۔ اس کے بعد قرآن کی یہ آیت پڑھی:

"پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔"(۸۸)

اس آیت کے یہاں لکھنے کے کئی معنی اور تعبیریں لی جا سکتی ہیں مگر فی الحال اس مقاپہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ افسانہ نگار نے ان نام نہاد علما پر تنقید کی ہے جو ایک ایک آیت بیچتے ہیں اور پھر پیسے بناتے ہیں اس سے عالم اور علم دونوں کی توہین ہوتی ہے جس سے علم اور علما دونوں کی عزت جاتی رہتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علما کرام دنیا پرست ہو گئے ہیں اور جو ان کا مقصد تھا وہ اس سے پھر گئے ہیں تو ان سے ایسا سلوک ہونا ہی تھا کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کرنی تھی۔ اس سلسلے میں کہ جب ہر کوئی بازاری علم والا بن جاتا ہے اور علم کی قدر جاتی رہتی ہے جس سے اصل علم والے بالکل کنارہ کر لیتے ہیں۔ اس موضوع پر شیخ عثمان کبوتر نے احمد حجری کا ایک قصہ سنایا۔ جس میں علم، شاعر اور اہلِ علم والوں کی قدر نہ کرنے اور گدھوں کے شعر کہنے کا ذکر تھا۔

شیخ عثمان کے مکتب میں ابو قاسم خضری کے علاوہ بھی کچھ لوگ سلوک کی منزلیں طے کرنے کو تشریف لاتے اور شیخ سے سیکھتے۔ ان میں سید رضی، ابو مسلم بغدادی، شیخ حمزہ اور ابو جعفر شیرازی شامل تھے۔ شیخ کی وفات کے بعد یہ چاروں اپنے اپنے عقیدے سے پھرے اور مرشد کی تعلیمات کو بیچنے لگے۔ انھوں نے دنیا میں جی لگایا اور حرص وہوا میں پڑ گئے۔ جب کہ مرشد کا فرمان انھیں یاد تھا کہ دنیا دن ہے اور ہم اس میں روزہ دار ہیں۔ جس کا انھوں نے ذرا بھی پاس نہ رکھا۔ دنیاوی حرص اور لالچ میں پڑ کر یہ بھی اپنے نفس بل

کہ نفسِ امارہ کے غلام ہو گئے اور دنیا داروں کے ہاتھوں بک گئے اور ان کا روزہ ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے ان پر بھی زرد کتا غالب آ گیا جو بازار جاتے ہوئے ابو قاسم خضری کو نظر آیا۔ جس کو افسانہ نگار اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ''میں وہاں سے اٹھ کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پھاٹک میں ایک بڑا سا زرد کتا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حویلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو جعفر شیرازی کی مسند پر محوِ خواب پایا اور ابو مسلم بغدادی کی محل سرا میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا۔''(۸۹)

اپنی زندگی کے مقصد اور تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دینے کا نقصان تو ہوتا ہے اور اس کہانی میں جو زرد کتے کو نفس امارہ کی علامت بنایا ہے کہ یہ انسان پر غالب آتا ہے تو دیکھنے والے کو نظر آتا ہے کہ وہ زرد کتے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اسی طرح راوی کے چاروں ہم مکتب بھی دنیا کی لالچ میں پڑ گئے تو وہ بھی زرد کتے میں تبدیل ہو گئے۔ اور افسانہ نگار نے چاروں ہم مکتبوں کے لیے جو لفظ استعمال کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد سے کس قدر دور اور دنیا سے کس قدر قریب تھے۔ مثلاً؛ سید رضی کا قصر، شیخ حمزہ کی حویلی، ابو جعفر شیرازی کی مسند اور ابو مسلم بغدادی کی محل سرا۔ ان چاروں کے ٹھکانوں سے امارت کی نہ صرف بو آتی ہے بل کہ خوش بو بھی آتی ہے۔ جب کہ تصوف کی راہ میں چلنے والے تو ٹاٹ، صوف اور کملی جیسے لباس میں خوش رہتے ہیں اور حجروں میں قیام کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی آستینوں میں یدِ بیضا ہوتا ہے اور ان کی جبینوں پر دانائی اور حلم کا نور ہوتا ہے۔ جب کہ ایسے دنیا دار لوگوں کے پاس محلات تو ہوتے ہیں پر چہرے پر پھٹکار واضح نظر آتی ہے۔

راوی سارے شہر کے کتے پن سے خائف ہو کر سب سے جدا الگ تھلگ رہتا ہے کہ میں ان لوگوں جیسا دنیا پرست آدمی نہ بن جاؤں اور وہ آخر کار خدا سے التجا کرتا ہے کہ خدایا کرم کر اور مجھے ایسی آفت سے محفوظ رکھ۔ انسان بالکل آہستہ آہستہ اور بالکل خاموشی سے دنیا داروں کی فہرست میں شمار ہونے لگتا ہے اور اس کا روحانی و اخلاقی زوال بھی شروع ہو جاتا ہے اور اس کو پتا بھی نہیں چلتا۔ انسان جب اپنے مقصدِ زندگی کو

تیاگ دیتا ہے تو چاہے وہ بڑے سے بڑا صوفی بھی اپنے آپ کو سمجھتا رہے مگر وہ اپنے فقر کی دولت لٹا کر سگِ دنیا بن چکا ہوتا ہے مگر اسے معلوم نہیں ہوتا۔ پر دیکھنے والی آنکھ دیکھ لیتی ہے کہ کون زر دکتا ہے اور کون نہیں۔

اپنا مقصد بھول کر اور اپنا ضمیر بیچ کر اخلاقی گراوٹ کو مول لینا اور اس کہانی کے اسلوب اور تاثیر کے بارے میں ڈاکٹر آصف فرخی کہتے ہیں:

> "ملفوظات کے انداز میں چلنے والی اور واقعیت نگاری کی تمام رسومات کی خلاف ورزی کرنے والی یہ کہانی حکایت کوtransform کر کے ایک زر پرست اور علم دشمن معاشرے کے خلافmoral indictment قائم کرتی ہے۔حکایت کا انداز اس indictment کی راہ میں حائل نہیں ہوتا بلکہ اس میں تہہ داری، بصیرت اور معنویت کے کئی ابعاد کو اجاگر کرتا ہے۔ اخلاقی کرپشن کا منظر یہاں اس قدر تاریک ہے کہ انتظار حسین کی کسی اور تحریر میں اتنی وضاحت اور اس قدر دوٹوک انداز میں نہیں ملتا۔"[۹۰]

بلا شبہ انتظار حسین نے اس افسانے کی بنت میں صوفیا کرام کے ملفوظات کا سہارا لیا ہے مگر یہ کہانی بنانے میں بالکل کامیاب ہوئے ہیں کہ ان کے ملفوظات کے لگائے ہوئے ٹکڑے اس قدر ترتیب اور موقع مناسبت کے مطابق ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ صوفیا کے ملفوظات ہیں بل کہ گمان ہوتا ہے کہ سارے ملفوظات اور اقوال انتظار حسین کو اس کہانی میں ہی اترے ہیں۔ ایسی اخلاقی گراوٹ کی اور کوئی مثال افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتی۔

انسان کی زندگی کا مقصد تو پہلے ہی دن سے طے ہے اور یہ بھی طے ہے کہ اگر وہ اپنے مقصد پہ عمل کرے گا تو خدا اسے حقیقت میں اس کے مقام اشرفیت پہ فائز رکھے گا اور اگر یہ اپنے مقصد سے روگردانی کرے گا تو یہ اشرفیت سے گر کر اسفلیت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اب اپنے مقصد کو پورا کرنے کا سب سے پہلا جو قدم ہے وہ ہے دینِ اسلام پر ایمان اور اس کے ارکان و شعار پر عمل درآمد کرنا۔ مگر معدودے چند ہی لوگ

ہوتے ہیں جو اس منصب پہ فائز رہتے ہیں اور اپنے مقصد کو پورا کر پاتے ہیں۔ اکثریت میں لوگ دنیا داری میں کھو کر، لالچ، حرص ہوس اور شیطانیت میں پھنس کر اپنے آپ کو اور اپنے مقصد کو بھول جاتے ہیں۔

دین پہ عمل کرنے کے لیے دینی شعار کو اپنانا پڑتا ہے جو کہ مقصدیت کے حصول کا پہلا زینہ ہے مگر بہت سے لوگ اس زینے سے کوسوں دور رہتے ہیں اور اس مقدس اور پاکیزہ کام کو نبھانے کی بجائے اس میں ڈنڈیاں مارنے لگتے ہیں۔ جس سے اس کی فوائد زائل ہوتے ہیں اور انسان گراوٹ کی اندھی کھائی میں گر جاتا ہے۔ اپنے مسلک اور دین میں بھی ناانصافیاں کرنے لگتا ہے۔ جس میں سب سے بڑی خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان ایک متولی بن کر یا پھر خزانچی بن کر روپے پیسے میں ہیر پھیر کرے۔ انتظار حسین کے افسانے "مردہ راکھ" میں اس کی مثال ملتی ہے جس میں تراب علی متولی دلدل کی خوراک، لنگر اور دوسرے کئی شیعہ مسلک کے دینی شعار کا روپیہ کھا جاتا ہے جس سے اس سال امام کی سواری نہیں نکلتی اور نہ ہی اصل دلدل گھوڑا نکل پاتا ہے۔ لنگر تقسیم نہیں ہوتا اور تندور گرم تک نہیں ہوتے۔

"مولوی فرزند علی نے روکھے لہجے میں کہا: "وہ گھوڑا مر گیا؟"

"وہ گھوڑا مر گیا؟"

"دلدل مر گیا؟"

"دلدل؟ دلدل مر گیا؟ کون کہتا ہے؟"

پہلے کسی کو یقین نہ آیا۔ مولوی فرزند علی نے کسی کو یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ خود ہی یقین آ گیا۔

انھیں ایک دم سے اگلی پچھلی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ انھیں وہ دن یاد آ گیا، جب پہلی بار کسی نے بتایا تھا کہ دلدل کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تراب علی متولی نے متولی بنتے ہی وہ کچھ کیا تھا کہ اب کسی کے دل میں ان کا ذرہ بھر احترام نہیں تھا۔"(۹۱)

ایک آدمی کی بے پروائی اور تغافل سے ایک دینی فریضے کی انتہائی اہم ذمے داری سے ہاتھ دھونا پڑے اور سب کے سب لوگ اس کے سرانجام نہ دینے پہ کتنا ملول ہیں اور دکھ سے سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ اور بے چارہ جانور اپنی زندگی سسک سسک کے ختک کر بیٹھا اور انسان اپنا مقصد بھول کر صرف پیسے بٹورنے میں لگا رہا۔ جب آدمی ایک معاشرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی فرائض پورے نہیں کرتا تو وہ دوسرے کئی ایک غلط کاموں میں ملوث ہو جاتا ہے جس سے معاشرے میں شر، ناانصافی، لاقانونیت، مذہبی انحطاط، اخلاقی زوال اور بے مروتی جیسی بری اور گھناؤنی صفات پھیل جاتی ہیں۔ ہر ممکن انسان کو اپنے مقصد کو پورا کرنا چاہیے اور کسی طور بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

انسان دنیا میں آیا ہے ساتھ میں اپنے مقاصد کی ایک فہرست بھی لے کر آیا ہے اور ان مقاصد کو کس طرح حاصل کرنا ہے اس کے بارے معلومات اور رہنمائی کے لیے نیک لوگ اور بڑے بڑے دانشور آتے رہے ہیں جنھیں مسلمان اپنی زبان اور عقیدے کے مطابق نبی کہتے ہیں جو خدا سے رہنمائی لے کر دنیا کو ہدایت کی راہیں دکھاتے ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارا جینا اور مرنا دنیا سے ذرا مختلف ہے اور ہماری زندگی کے مقاصد بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں جو مسلمان نہین ہیں۔ اس بات کا ادراک ہمیں اس لیے بھی ہونا چاہیے کہ ہم اس بات پہ یقین رکھتے ہیں ساری کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور ہمارے ہر کام کا جاننے اور سننے والا بھی خدا ہی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات اور ارشادات کے علاوہ ایک مسلمان کچھ بھی نہیں کرے گا اور اگر کچھ کرے گا تو وہ اپنے مقصد سے دور ہوتا چلا جائے گا اور اس کو اس دنیا میں رسوا اور ذلیل کر دیا جائے گا۔

خدا کی تعلیمات اور ارشادات کو جاننے کے لیے ہمارے پاس خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں اور اس کے بھیجے ہوئے انبیاء کی باتیں ہیں اس لیے ہمارے اوپر نبی کی بات کو ماننا بھی ایسے ہی ضروری ہے جیسا کہ خدا کی بات کو ماننا ضروری ہے اور نبی کے ارشاد کے مطابق مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھے کسی بھی رنگ ونسل کے مسلمان سے ہمارا رشتہ کلمہ پڑھتے ہی بھائیوں کا سا ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو عرب خطے سے تعلق رکھتے ہیں اور عربی بولتے ہیں ان کے ساتھ تو ہمارا اور بھی عقیدت کا رشتہ ہے اور

وہ یہ ہے کہ وہ وہ زبان بولتے ہیں جو ہمارے نبیؐ بولتے تھے اور ہمارے مذہب کی بنیادی زبان بھی عربی ہی ہے اس لیے ہمیں ان عربیوں سے قدر تاً محبت اور عقیدت ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "شرم الحرم" مسلمانوں کے زوال پہ لکھا ہوا افسانہ ہے جو خصوصاً ۱۹۶۷ء کی عرب اسرئیل جنگ کا احاطہ کرتا ہے کہ کس طرح ہمارے ہاتھوں سے یروشلم نکل گیا اور ہم سقوطِ یروشلم پہ شکست خوردہ ہیں۔ یہ افسانہ مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور جہاد جیسی خصوصیت سے عاری ہونے جیسی وجوہات کو سامنے لاتا ہے کہ اسی کی وجہ سے ہم آج شکست پہ شکست کھاتے جارہے ہیں اور ہمارا پرسانِ حال کوئی نہیں۔

اس افسانے کے تین کردار ہیں اور تینوں ریڈیو اسٹیشن پہ کام کرتے ہیں اور افسانہ ان تینوں کی گفتگو اور ریڈیو پہ آنے والی خبروں کے ذریعے آگے بڑھتا ہے اور دوسری طرف ریڈیو پر جنگ کی خبریں بھی گردش کررہی ہیں۔ اس کے ساتھ ایک کردار سفید ریش والے بزرگ کا بھی ہے جو علامتی طور پر کہانی کو جذباتی بنانے اور اپنے اسلاف کی ہمت اور بہادری کا ہمیں بتاتا ہے۔ عربوں کی طاقت ان کی بہادری، انا اور موت سے بے خوفی تھی جو کہ اب ختم ہو چکی ہے کہ کوئی بھی مردِ میدان اور مردِ تلوار ان میں باقی نہیں رہا سب کی تلواریں کند ہو گئی ہیں اقر سب کے سب اپنے اپنے ضمیر کی عدالت مین ننگے ہو گئے ہیں اسی لیے اپنے گھر کی عزت وناموس جانے کی وجہ سے افسانہ نگار نے اس افسانے کا نام "شرم الحرم" رکھا ہے۔

مصر کے فوجی سپہ سالار عبد الناصر جو ان کا وزیرِ اعظم بھی تھا، کو افسانہ نگار نے مردِ تلوار اور مردِ میدان بنا کر پیش کیا ہے کہ جو آخری دم تک کفار سے لڑتا رہا ہے اور بہادری کے جوہر دکھاتا رہا ہے۔ اسی کے تناظر میں راوی پکارتا ہے کہ کوئی ہے ماں کا جایا بہادر نوجوان، ہے کوئی مرد میدان تو سامنے آئے۔ عبد الناصر جتنا کوئی بھی مردِ مجاہد اب نہیں رہا۔ اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھیے:

> "بپھرے ہوئے مجمعے میں سے ایک شخص چلایا: "عبد الناصر کی ماں عبد الناصر کے سوگ میں بیٹھے! کیا وہ ہم سے تلواریں نیام میں ڈالنے کو کہے گا۔"

تب صاحبِ ریش اعرابی نے زاری کی اور کہا کہ "ہم سب عربوں کی مائیں ہمارے سب کے سوگ میں بیٹھیں کہ تلواریں ہماری کند ہو گئیں اور ہم نے انھیں نیاموں میں ڈال لیا۔"

"عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟" چلانے والے نے چلا کر پوچھا۔

عرب کا بہادر بیٹا؟ سب ٹھٹک گئے۔ متعجب ہوئے۔ ہاں! عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟ پھر ایک آواز ہو کر چلائے: "عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟ عرب کے بہادر بیٹے کو باہر لاؤ!"(۹۲)

ایسے ہی بہادر بیٹے جنگ کے میدانوں میں ابدی نیند سو چکے تھے جو اسلام کو بچانے اور مسلمانوں کی عزتوں کے تحفظ میں قربان ہو چکے تھے۔ اس لیے تو جو مارے گئے وہ اچھے رہے اور جو بچ رہے اور زندہ رہے وہ ذلیل ہوئے۔ یہ سب کچھ اپنے مقصد سے دور ہونے کی سزا ہے کہ ایک ایک کر کے ہمارے بہادر مار دیے گئے اور اب ہمارے علاقوں پر قبضہ کیا جا رہا ہے اور سارا عرب خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا ہے۔ جس کا درد ہے اسی کو محسوس ہو رہا ہے وہ جانے اور اس کا کام۔ حالانکہ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ ہم سب تو بھائی بھائی ہیں اور ہم نے ہی ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے اور ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔ ایک ایک کر کے ہمارے ہاتھ سے عمان ،بغداد،، بیت المقدس، دمشق، قاہرہ اور الجزیرہ چھین لیے گئے اور ہمیں شرم نہ آئی ہمیں اپنے مقصد کو بھولنا نہیں چاہیے اور مسلمان بھائیوں کے استحصال سے قبل ان کے دشمنوں کو روکنا چاہیے۔ اسی لیے افسانہ نگار نے اس واردات اور واقعے کو صرف عربوں کے لیے ہی شرم کا مقام قرار نہیں دیا بل کہ کہا ہے کہ عربیوں اور عجمیوں دونوں کو ڈوب مرنا چاہیے کہ مسلمان تو ہم سب ہیں کہ ہم نے تلواریں بیچ کر مصلے خرید لیے ہیں اور اب ہمار یہ ماؤں بہنوں کی عزتیں لٹتی رہیں ہماری زمینوں پہ کافر دندناتا پھرتا رہے ہمیں کیا ہم تو سجدے پہ سجدہ کیے جائیں گے۔ اقتباس دیکھیے:

"سفید ریش اعرابی نے پوچھا کہ "اے شخص! کیا تو ہم میں سے ہے؟"

میں نے کہا: ”بے شک میں تمھی میں سے ہوں۔“

”پھر بیان کر کے بیت المقدس پر کیا گزری؟“

میں نے زاری کی اور کہا کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ بیت المقدس کی بیٹی بے حرمت ہو گئی، شرم العرب۔ شرم العجم، شرم الحرم۔“(۹۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات اب صرف عربوں کی شرم اور غیرت کی نہیں رہ گئی بل کہ افسانہ نگار پوری دنیا کے مسلمانوں کے ضمیر کو جنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیت المقدس کی بیٹی کی عزت و حرمت لٹ گئی اور اب بیت المقدس سے تو تمام مسلمانوں کا ایک سا رشتہ ہے۔ اس لیے تڑپ بھی ایک سی پیدا ہونی چاہیے۔ یروشلم کا ہم سے چھن جانا صرف عربوں ہی کی شکست نہیں بل کہ پورے عالمِ اسلام کے لیے شکست کی بات ہے اور اس طرح اتحادِ اسلام کی ساری کڑیاں کھل گئیں اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس تناظر میں ڈاکٹر حامد صدیقی کہتے ہیں:

”سقوطِ یروشلم پوری امتِ مسلمہ کی شکست ہے اور یہ ایک عظیم المیہ بھی ہے۔ عرب ممالک اور عالمِ اسلام کے لیے کہ اس کی عسکری قوت، بہادری اور شجاعت کا جو بھرم پوری دنیا میں تھا وہ ٹوٹ گیا اس لیے شکست صرف عرب ممالک کی شکست نہ بن کر پورے عالمِ اسلام کی اجتماعی قوت کا بھرم پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔“(۹۴)

اس اقتباس سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ سقوطِ یروشلم تمام عالمِ اسلام کے لیے کتنے دکھ اور کرب کی بات تھی اور ابھی تک ہے مگر ہم میں سے کوئی بھی مردِ مجاہد نکل کر سامنے نہ آیا اور اس نے کبھی بھی یروشلم کو آزاد کروانے کی کوشش نہ کی۔ دمشق، بغداد، عمان اور الجزیرہ سبھی کچھ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا کیوں کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے اپنا اسلامی مقصد پسِ پشت ڈال دیا ہے اور یہ فکر ایک انسان تو کیا کسی بھی اسلامی ملک کی عوام تک میں نہیں اور سب کے سب اپنی اپنی ترقیوں میں مگن ہیں۔

"کانا دجال" بھی مسلمانوں کے زوال اور اسرئیل اور امریکا کی مل کر دجال کو دنیا میں تیار کر کے بھیجنے کہ کہانی ہے۔اس افسانے میں تین کردار ہیں جن میں بیٹا محسن جو ہندوستان اپنے ماں باپ کو ملنے آیا ہے اور دوسر دو کردار یہی ماں باپ ہیں جو ہجرت کے وقت پاکستان آ گئے تھے۔بیٹے سے وہ ہندوستان کی بابت پوچھتے ہیں کچھ لوگوں کا پوچھتے ہیں اور کچھ بچھڑی ہوئی قبروں کا بھی پوچھتے ہیں۔بیٹے اور والدین کے درمیان گفتگو جارہ ہے اور یونہی کہانی چلتی رہتی ہے ساتھ میں کوئی جنگ بھی چل رہی ہے جس کا واضح اشارہ مصنف کی طرف سے نہیں ملتا مگر اس جنگ کی بابت بار بار اخبار دفتر میں محسن فون کر کر کے حالات دریافت کرتا رہتا ہے۔

باپ واقعہ معراج کا ذکر کرتا ہے حضورؐ کی شان بیان کرتا ہے ماں بھی دلچسپی سے سنتی ہے دجال کے ذکر پر تو خوف اور دہشت سے رونے لگتی ہے ماں اپنا خواب بھی سناتی ہے جو ایک علامتی خواب ہے۔اور حضورؐ کے روضے کا ذکر آتا ہے۔مسلمانوں کے مقصد سے دوری کی وجہ سے مسلمان زوال کا شکار ہو گئے ہیں انھوں نے حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنا تھا مگر یہ ان کے اسوہ سے دور ہوئے اور ذلیل ہو گئے۔اتنے میں باپ بیٹے محسن کو کہتا ہے کہ ذرا دوبارہ جنگ کے حالات کا اخبار کے دفتر میں فون کر کے پتا کرو تو وہ فون کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں تو باپ افسوس سے سر جھکا کر مقصد سے دور ہو جانے کی وجہ سے ان کی شکست کو تسلیم کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ حضورؐ تو اس مقام پہ بلند ہوئے تھے اور ہم زوال کا شکار ہو گئے۔افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"اماں جی نے پیچھے سے آواز دی:

"بیٹا! ذرا پھر اخبار کے دفتر میں تیلی فون کرو!"

اس نے ٹیلی فون پہ جا کر ڈائل گھمایا:"ہیلو، دھائی تین منٹ بات کی۔پھر واپس خاموش کرسی پہ آبیٹھا۔ابا جان نے اس کی صورت غور سے دیکھی، پوچھا:

"کوئی خبر ملی؟"

”جی! سیز فائر ہو گیا۔“

”مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے؟“

”بس یہی سمجھیے۔“

ابا جان کا سر جھک گیا۔ وہ ان کا جھکا ہوا سر دیکھتا رہا، پھر انھوں نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے:”جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔“ پھر چپ ہو گئے۔“(۹۵)

اس اقتباس سے ہی دیکھ لیں کہ ہمارا مسلمان ہونے کے ناطے زندگی کا مقصد حضورؐ سے وفا اور ان کے نقشِ قدم پہ چلنا ہے مگر ہم اپنے مقصد سے پھر گئے تو جس طرح محسن کے ابا کو یقین تھا کہ مسلمان ہی ہتھیار ڈالیں گے اسی طرح محسن کو بھی یقین ہے اور اس نے باپ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ حالانکہ اسے دکھ تھا اور اسنے باپ کو اس طرح بات نہیں بتائی جیسے سنی تھی مگر والد ایک تجربہ کار آدمی ہے اور زندگی مے مقاصد سے آگاہ اسی لیے افسانہ نگار نے ساتھ ساتھ حضورؐ کی محبت کا بھی ذکر کیا ہے اور دونوں بزرگ تو خواب بھی روضۂ مبارک کے دیکھتے ہیں۔ جب ابا جان کا سر جھک گیا اس کا مطلب ہے پورے عالمِ اسلام کا سر شرم سے جھک گیا اور ہم کانے دجال کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ”دوسرا گناہ“ ایک معیشت اور اس کی تقسیم پہ لکھا ہوا اچھا افسانہ ہے۔ جس میں روپے پیسے کی مساوی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے فوائد کو زیرِ بحث لا کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر تقسیم مساوی نہ ہو تو کس طرح نقصانات معاشرے میں سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک گناہ تو آدمؑ نے جنت میں گندم کھا کر کیا تھا اور اب دوسرا گناہ انسان گندم کی غیر منصفانہ تقسیم کر کے کر رہا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار توزمران ہے جو حشام کا بیٹا ہے جو نیک صفت، ایمان دار اور ساری عمر لوگوں میں برابری کا قائل تھا۔ جس نے تمام عمر ٹاٹ کا لباس پہنا اور لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک دسترخوان

پہ کھانا کھایا۔ لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے اور دل سے اک احترام بھی کرتے تھے پھر ایک دن ۱۷۵ اسا ل کی عمر میں وہ فوت ہو گیا اور اتنی عمر کے باوجود اس کی کمر ابھی تک سیدھی ہی تھی۔ جب یہ نئی بستی میں آئے تھے تو حشام نے ہی سب کو برابری دے کر سب کو ایک جیسا بنا کر اس زمین کو نرم کر کے یہاں ایک شہر بسایا تھا۔ افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پہلے ایک گھرانا آیا اور یہاں پہنچ کر کھلے آسمان میں سخت زمین پر پڑ رہا، پھر دوسرا گھرانا آیا اور زمین کی سختی سے لڑنے لگا، پھر گھرانے آتے چلے گئے اور اونچے درختوں کو سرنگوں کرنے اور سخت زمین کو نرم بنانے پر جت گئے۔

جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے حشام سے کہا کہ اے حشام! تو ہم میں بڑا ہے۔ پس تو ہمارے بیچ بیٹھ اور منصفی کر! حشام ان کے بیچ بیٹھا اور خوب منصفی کی۔ اس نے تا عمر ٹاٹ پہنا اور سب کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر موٹی روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا۔ اس نے ایک سو پچھتر برس کی عمر پائی اور جب وہ مرا تو اس کی کمر سیدھی تھی۔"(۹۶)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کا مقصد نیک ہو اور وہ دوسروں کی بھلائی کا سوچے تو خدا اس میں نہ صرف برکت ڈالتا ہے بل کہ دوسروں کے دلوں میں اس کی عزت بھی بنا دیتا ہے۔ زمران کے باپ حشام نے ہمیشہ اپنے نیک مقصدِ زندگی کو ہی اہمیت دی جس کی وجہ سے وہ دنیا میں سرخرو ہوا اور یقیناً وہ مرنے کے بعد بھی سرخرو ہو گا۔ لوگ اس کے مرنے پہ پہروں روئے اور اس کی ہی وجہ سے لوگوں نے اس کی دوسری جورو کے بیٹے زمران کو اپنا بڑا بنایا اور اس کو باپ کی سیٹ دے کر کہا کہ تو اب ہم میں منصفی کیا کر۔

زمران شروع میں تو باپ ہی کی طرح لوگوں میں رہا اور اس کا مقصد بھی باپ والا ہی تھا برابری کرتا تھا اور لوگوں کے درمیان بیٹھ کر وہی موٹے آٹے والی روٹی کھاتا تھا۔ ٹاٹ کا لباس پہنتا تھا اور ایک دستر خوان

ہی استعمال کرتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس نے اپنے مقصد کو چھوڑا اور لوگوں سے خود کو علیٰحدہ کرنے لگا پہلے اس نے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائی جس کا رنگ دوسری روٹیوں سے مختلف تھا تو اس کو الیملک نے کہا کہ زمران تو اب اپنے باپ سے مختلف ہوتا جاتا ہے اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے لگا ہے تو اس نے اسے جھڑک دیا اور کہا کہ تو اپنا دستر خوان ہم سے الگ کر لیے اس طرح الیملک کھائے بغیر اٹھ گیا اور اس کا چرچہ پوری بستی میں ہوا اور اس طرح گیہوں اپنے چھلکے سے الگ ہونا شروع ہو گیا۔ مقصدِ زندگی کو پسِ پشت ڈال دینے کی وجہ سے تمام شہر میں کئی ایک دستر خوان بچھ گئے اور لوگ جدا جدا ہو گئے یہ اس مقصد سے دوری کا نتیجہ یہ ہوا۔ اقتباس دیکھیے:

> ”زمران نے لوگوں کو دیکھا اور غصہ کیا اور جس جس نے حیرانی ظاہر کی اور خوف کا اعلان کیا، اس کا دستر خوان اپنے دستر خوان سے الگ کر دیا۔ سو، جہاں ایک دستر خوان تھا، وہاں بہت سے دستر خوان ہو گئے، پر زمران کا دستر خوان مختصر ہو جانے پر بھی پھیلا رہا۔ اس کے آڑی اور حواری دونوں وقت اس کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھتے اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھاتے۔“[۹۷]

بے مقصدیت کی وجہ سے ساری بستی انتشار، بے سکونی، خوف، حیرت کے ساتھ ساتھ اضطراب کا بھی شکار ہو گئی۔ زندگی کے مقصد کو سمجھنے سے عاری حکمران نے ساری لی ساری بستی تباہی کے دہانے تک پہنچا دی اور اپنے نام نہاد حواریوں کے جمگھٹے میں بیٹھ کر عیاشی کی محفلیں سجانے لگا۔ اپنوں سے دور ہو گیا اور منافقین کے چنگل میں پھنستا چلا گیا۔ معاشرہ اس سے نفرت کرنے لگا اور یہ سمجھتا تھا کہ میں اکیلا حکمران ہوں اور اپنی مرضی سے آسائش والی زندگی گزار رہا ہوں مگر دراصل وہ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا تھا کیوں کہ بغیر کسی مقصد کے زندگی یوں ہی تباہ ہو جاتی ہے۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے مذہبی شعار کو معاشی اور معاشرتی سطح پر سمجھنے اور پھر اس پر عمل کرنے کی ایک سعیِ کامل کی ہے جس میں مصنف کامیاب ہوئے ہیں اور اس افسانے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ لازم نہیں کہ اگر باپ

کامیاب اور رعایا پرور شخص ہے تو اس کا بیٹا بھی ویسا ہی نیک صفت انسان ہو گا۔ ممکن ہے کہ وہ باپ کی ساکھ کو بھی کمزور یا پھر ختم کر دے۔ زمران کہانی کے آخر میں اپنی ہی لوگوں کو بستی بدر کر دیتا ہے جس سے بستی میں ایک اور انتشار اور بے سکونی سر اٹھاتی ہے معاشرہ طبقات میں بٹ جاتا ہے اور لوگ ایک دوسرے پہ اعتماد کرنے کے بجائے اب شک کرنے لگتے ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے'' سیاسی لحاظ سے پُر اثر اور جان دار تمثیلی اور علامتی افسانہ ہے کہ اس کو پڑھ کر مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی اور ہم سب بھائیوں کی آپس کی لڑائی پہ حیرانی ہوتی ہے کہ ہم کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ یاجوج ماجوج ایک باپ یافث کے بیٹے ہیں کہ جن کو سدِ سکندری کے پیچھے قید کر دیا گیا تھا اور اس کا حوالہ مصنف نے قرآن سے لیا ہے کہ وہ دونوں سدِ سکندری کو ساری ساری رات چاٹتے ہیں اور جب وہ دیوار انڈے کے چھلکے جتنی پتلی رہ جاتی ہے کہ وہ دونوں بھائی سوچتے ہیں کہ اتنی انڈے کے چھلکے جتنی مختصر دیوار تو ہم صبح اٹھ کر ایک ہی زبان کے وار سے چاٹ لیں گے اور ہو سو جاتے ہیں کہ صبح اٹھ کر دیکھتے ہیں کہ دیوار پہلے کی طرح پہاڑ کی مانند ان کے سروں پہ کھڑی ہے اور روز ہی یوں ہوتا ہے اور انھوں نے سوچا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ہمارا دیوار کو چاٹنا اور نہ چاٹنا تو ایک برابر ہے۔ اس پر پہاڑ کی کھوہ سے ایک بزرگ نکلا جو اپنی عمر کے ہزارویں سال میں تھا اس نے کہا کہ یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر چاٹنا ہے تو لہٰذا ان کو چاہیے کہ دیوار کو جلد چاٹ کھائیں کیوں کہ شہر طبرستان کے ٹھنڈے چشمے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

ان ٹھنڈے چشموں کا سن آلِ موجوج نے آلِ یاجوج پہ حملہ کر دیا کہ کہیں ہمارے عزیز اور بھائی ہم سے پہلے نہ ان ٹھنڈے چشموں تک پہنچ جائیں اور یوں ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگ گئے اور جو ان کا مقصدِ زندگی تھا دیوار کو چاٹنا وہ اس کو بھول گئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ دونوں کی آل ایک دوسرے کو رات بھر چاٹتے تھے مگر صبح دم دونوں ہی آل تازہ دم ہوتی تھیں اور پھر ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ اقتباس دیکھیے:

"اب بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہونے پر یاجوج ماجوج نے اپنی اپنی زبانیں نکالیں اور سدِ سکندری کو چاٹنے کے بجائے عالمِ غیظ میں ایک دوسرے کو چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یاجوج ماجوج کے چاٹنے سے اور ماجوج یاجوج کے چاٹنے سے انڈے کی مثال رہ گیا۔"(۹۸)

دونوں کی زندگی کا مقصد تو دیوار کو چاٹنا تھا تاکہ دیوار کو چاٹ کر خود بھی آزاد ہو سکیں اور اپنی قوم اور آل کو بھی آزاد کروا سکیں مگر باہمی رنجش اور ذاتی لالچ نے دونوں کو زندگی کے مقصد سے دور کر دیا اور موت کے دہانے کے قریب کر دیا۔ یہ دونوں آپس میں بھی لڑتے رہے اور ان کی آل اولاد بھی آپس میں لڑ لڑ مرنے لگی۔ ایک دوسرے کے گھر لوٹے، نوجوانوں کا قتل کیا اور عورتوں کو بے عزت بھی کیا۔

یاجوج ماجوج کے حالات اور ان کی آل اولاد کے احوال دیکھ کر وہ بوڑھا پھر پہاڑ کی کھوہ سے نکل ظاہر ہوا اور اس نے دونوں کو ان کی زندگی کا مقصد سمجھایا اور کہا کہ تم اپنے مقصد یعنی دیوار کو چاٹنا نہ چھوڑو اگر تم ایسا کرو گے اور اپنے مقصد سے دور جاؤ گے تو آپس میں لڑو گے اور زندگی بھی گنواؤ۔ افسانے سے ایک ٹکڑا اور دیکھیے:

"بوڑھے نے افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ وہ سدِ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔"

اور یاجوج ماجوج اپنی لال زبانوں کے ساتھ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔"(۹۹)

اس افسانے میں کئی ایک تعبیری اور تفہیمی پہلو مضمر ہیں جو اس کے متن سے کشید کیے جا سکتے ہیں مگر یہاں جو مذہبی حوالے سے معنوی رنگ میں ڈھالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی شخص یا پھر قوم اپنے مقصد کو بھول جاتی ہے اس کا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں بل کہ وہ قومیں خود آپس میں گتھم گتھا رہتی ہیں اور یونہی وہ فنا پذیر ہو جاتی ہیں۔ غیر اس پہ حکومت کرتے ہیں اور اپنا احتساب کرنے کے بجائے آپسی جھگڑوں میں پڑے رہتے ہیں۔ مقصد زندگی کا تعین اور اس کی رخ بندی کرتا ہے۔

انسان حقیقت میں ہی اپنے مقصد سے بہت دور نکل آیا ہے اور اپنے مقصد کو سمجھنے کے لیے دنیا میں بے شمار ایسے کام ہیں کہ جن کو بڑی توجہ اور ترتیب سے کرنا پڑتا ہے اور ان میں ایک ایسا عمل بھی ہے کہ اپنے اسلاف اور اپنے بڑوں کی باتوں کو بھی دل میں جگہ دینی چاہیے اور ان کو اس لیے بھی یاد رکھنا چاہیے اور ان کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ہم اپنی جڑوں سے جڑے رہیں چاہے سنگِ مرمر پہ چلیں مگر ہمیں اپنی مٹی پہ چلنے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیے۔

انتظار حسین کلیلہ اور دمنہ اور ان کی کہانیوں سے بہت متاثر تھے اور ان کی کہانیوں میں ان سے اخذ کیا گیا کافی مواد بھی ملتا ہے تو اپنی آخری افسانوی کتاب ''شہر زاد کے نام'' میں انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ کہانیوں بعنوان: کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا، دمنہ کیوں ہنسا، کلیلہ کیوں رویا، کلیلہ دمنہ ہٹ لسٹ پر اور کلیلہ چپ ہو گیا، لکھی ہیں۔ ان کہانیوں میں دراصل وہ کلیلہ دمنہ کے اندر چھپی کہانیوں کی بازیافت کرتے ہیں اور اپنے لحاظ سے دورِ حاضر پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں موجود آخری کہانی ''کلیلہ چپ ہو گیا'' اپنے مقصد کے لحاظ سے اہم کہانی ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ جہاں ہم بہت سے مقصدِ زندگی بھلا چکے ہیں وہاں ہم اپنے ادب سے بھی منھ موڑ چکے ہیں اور اب کہانی کہنا، سننا اور لکھنا ایک عیب سا ہو گیا ہے اور بالکل ناجائز کام۔ کسی کو کہانیوں سے سروکار ہی نہیں رہ گیا۔ مادیت پر مبنی دنیا میں ہر کوئی اپنی ہی الگ دنیا میں مست ہے کہ کسی کے پاس ان کہانیوں کے لیے وقت ہی نہیں اس لیے کہانی کہنے والا کلیلہ اب چپ ہو اچاہتا ہے اور وہ چپ ہو گیا۔ آخری پیرا گراف دیکھیے:

> ''کلیلہ اداسی سے ہنسا اور بولا'' اے امنہ وہ زمانہ اور تھا جب ہم بولتے تھے اور ہماری باتیں اور کہانیاں عرب و عجم تک سنی جاتی تھیں۔ اہلِ دانش کو ان میں حکمت کی رمزیں نظر آتی تھیں۔ مگر وہ اہلِ دانش افسانہ بن گئے۔ اب شہر آدم زاد کے نعروں کی زد میں ہیں اور جنگلوں میں زاغ و زغن کا شور ہے۔ اس طوفانِ بد تمیزی میں کس کے پاس کان رہ

گئے ہیں کہ وہ کلیلہ اور دمنہ سے کہانیاں سنے۔ سوااے دمنہ میں نے تجھے تیرے حال پہ چھوڑ دیا۔ تو جانے تیرا نیا زمانہ جانے۔ میں نے کہانیوں کا باب بند کر دیا اور میں چپ ہو گیا۔ اب میں اپنی خاموشی میں گم خود ایک کہانی ہوں۔ جو سنتا ہے اس کا بھی بھلا۔ جو نہیں سنتا اس کا بھی بھلا۔"

پھر کلیلہ چپ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور گم سم ہو گیا۔"(۱۰۰)

اس اقتباس سے تو یہی لگتا ہے کہ کلیلہ اس لیے کہانی سنانے سے درگزر کر رہا ہے کہ اب اہلِ دانش کا فقدان ہے اور کہیں کوئی دانش مند باقی نہیں رہا کہ وہ ہم سے کہانی سننے آئے اور ہم اسے اپنی کہانی سنائیں اور ساتھ میں جدید زمانے کا رونا بھی رویا ہے کہ اس زمانے میں کسی کو بھی کہانی کی عظمت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ اک طوفانِ بد تمیزی ہر طرف دیکھنے کو ملتا ہے اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے مقصد سے عاری ہیں نہیں تو مقصد کے حصول کے لیے آپ کو اہلِ دانش کی دانش کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ہماری کہانیوں میں علم وحکمت کی رمزیں ہوا کرتی تھیں اب ان رمزوں کو سمجھنے والے لوگ بھی نہیں رہے۔ اس لیے کلیلہ اب چپ کر گیا ہے اور کہانی کا باب بند ہو گیا۔

iii. انسان کا معاشرتی کردار

ہر معاشرے میں اچھے برے کردار اور لوگ ہر وقت پائے جاتے ہیں جس کے لیے ایک مشہور مثل بھی بولی جاتی ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ یعنی اگر اچھے لوگ معاشرے میں بستے ہیں تو یقیناً ان میں برے لوگ بھی ہوتے ہوں گے۔ جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹوں نے بھی اپنی راہ کسی نہ کسی طریقے بنائی ہی ہوتی ہے۔ بس ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ ہم ہمیشہ نیک لوگوں کی راہ کو اپنائیں اور انھیں اپنا رہنما بنائیں اور برے لوگوں سے بچیں کہ جو گمراہ ہوئے اور جو بھٹک گئے۔

انسان کے سامنے ہر وقت دو راستے کھلے رہتے ہیں کہ وہ جس کو چاہے اپنی مرضی سے اپنا لے اور اپنی زندگی کو اپنی خواہش کے مطابق چلا سکے۔ ہمیں جہاں نیک لوگوں کی خبر ہونی چاہیے وہاں ہمیں معاشرے کے برے افراد کا بھی علم ہونا چاہیے تاکہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے عزیزوں کو اس شخص کی بری صحبت سے بچا سکیں۔انتظار حسین کے ہاں ایسے مذہبی لطیف نکتے بھی ملتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے اندر بڑی باریکی سے سرایت کر چکے ہیں۔ جن میں ایسے ایسے صوفیانہ کردار بھی ہیں کہ جن کو پڑھ کر ان کے سے اعمال کرنے کو بے اختیار جی کرتا ہے اور ایسے بھی ناچاکی پھیلانے والے کردار بھی ہیں کہ جن کو پڑھ کر کانوں کو ہاتھ لگانا پڑتا ہے کہ وہ معاشرے میں کیسی کیسی لگائی بجھائی کرتی ہیں۔ جن میں انتظار حسین کا افسانہ "عقیلا خالا" سرِ فہرست ہے ۔اس افسانے کا مرکزی کردار ہی عقیلا خالا ہیں جو اپنے شوہر کی رنڈی بازی کی عادتوں سے تنگ آکر اپنے شوہر اچھن میاں کو چھوڑ کر میکے آبسی ہیں۔ میاں کو بھی قابو کرنے میں انھوں نے بڑے بڑے کشٹ اڑھائے، چلے کاٹے، درگاہیں ناپیں اور منتیں مانگیں مگر ان کی مراد پوری نہ ہوئی اور یہ ناچار اپنے ماں باپ کے گھر آ گئیں مگر یہاں آکر انھوں نے پورے محلے میں جو اودھم مچایا اور لگائی بجھائی کا سلسلہ شروع کیا وہ ہمارے معاشرے کے اندر پائے جانے والے چند ایک بنیادی کرداروں میں سے ہے جو اکثر دوسروں کی بیٹیوں کے رشتے نہیں ہونے دیتیں اور بری سیدھی ساری باتیں کر کے منگنیاں تک تڑوا دیتی ہیں۔ عقیلا خالا بھی ایسی ہی ہیں۔ زبان کی نہایت تیز اور چالاک ہیں اور کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔ جب یہ اپنا گھر چھوڑ رہی تھیں تو ان کی بوجی نے ان کو بہت سمجھایا کہ تمھارا خاوند جیسا بھی ہے ہے تو تمھارا ہی۔ تو یہ اپنی ماں کو بھی پڑ گئیں اور ایک نہ مانی ان کی اور ادھر میکے ہی میں ٹِک گئیں۔

جب تک ماں زندہ تھی تو تھوڑی بہت ان کا دید لحاظ کرتی تھی مگر جیسے ہی انھوں نے دنیا کو خیر باد کہا یہ تو جیسے بالکل ہی آزاد ہو گئیں۔ پوچھتا پہلے بھی کوئی نہیں تھا مگر اب تو میدان میں اکیلی ہی کھلاڑی تھی اور باقی سب کھلاڑی تو پہلے ہی میدان سے مارے ڈر کے باہر ہو لیے تھے۔ ان کی بری عادتوں کے متعلق جن سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے انتظار حسین یوں لکھتے ہیں:

"خود کیا چھپ کے بیٹھیں دوسروں کی منگنیاں تڑوانے اور بیاہ شادیوں میں کھنڈت ڈالنے کا انھوں نے وطیرہ اختیار کر لیا۔اس کی بات اس سے لگائی۔فلاں کے بیٹے کو بدنام کیا۔فلاں کے بیٹے میں فی نکالی۔یوں وہ بیبیوں میں آپس میں جوتا چلواتی رہتی تھیں۔اس معاملہ میں ان کی قیافہ شناسی کو داد دینی پڑے گی۔ویسے انہوں نے کنسوئیاں لینے کو اپنے اوپر حرام نہیں کیا تھا۔"(۱۰۱)

ہر معاشرے میں ایسے کردار ضرور ہوتے ہیں جو معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے کئی لڑکیاں کنواری بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں اور کئی لڑکے اپنے گھر بسانے کی امید لیے دنیا سے ہی چلے جاتے ہیں۔اسیا معاشرتی کردار انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور ایسے کردار سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔انتظار حسین نے یہ افسانہ خوب عورتوں کی ہی زبان،روزمرہ اور محاورے میں لکھا ہے۔تاکہ اصل معنوں میں ایسے کرداروں کی تہہ تک پہنچا جاسکے۔اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف موصوف کی مشاہداتی قوت کس قدر وقیع ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "آخری آدمی" اگرچہ اس افسانے میں عہد نامہ عتیق، قرآن اور دوسرے بھی کئی مذہبی و اساطیری حوالوں ملا جلا اسلوب نظر آتا ہے اور احادیث و حکایات کا رنگ بھی غالب ہے مگر اس افسانے میں انسان کے معاشرتی کردار اور پھر اس سے روگردانی کی سزا کا ذکر بھی ملتا ہے۔اس افسانے میں الیاسف بنیادی کردار ہے کہ جو اپنی بستی کا آخری انسان کی جون میں زندہ آدمی تھا باقی سب کے سب خدا کے حکم کی عدولی کرنے پر بندر بن گئے تھے جس کا ذکر قرآن کی سورۃ اعراف میں ذکر بھی ملتا ہے۔الیاسف کو اپنے معاشرے میں بننے والے بندروں سے جو بھی چیز اور وجہ پتا چلتی ہے کہ وہ اس طرح کر رہا تھا اور وہ بندر بننے لگ گیا تو وہ اس چیز سے کنارہ کر لیتا ہے۔

اس افسانوی مجموعے "آخری آدمی" کا دیباچہ سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے جس میں انھوں نے الیاسف کے کوشش کے باوجود انسان نہ رہنے اور بندر بن جانے کے پیچھے دو وجوہات لکھی ہیں۔"الیاسف کے بندر بن

جانے کے دو اسباب ہیں۔ ایک ذاتی اور ایک معاشرتی۔"(۱۰۲) اور جو معاشرتی سبب اس افسانے میں انسان کے تہذیبی سطح سے بندروں کی سطح تک ذلیل ہونے کا ہے وہ یہ ہے:

"الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے اور اس کی ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنی ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو ہوگئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا۔"(۱۰۳)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں لفظ اپنا وقار اور معانی کھو دیں وہاں لفظ مر جاتے ہیں اور اگر لفظ ہی مر جائیں تو انسانی رشتے کیسے قائم رہ سکتے ہیں اور جہاں رشتے ہی قائم نہیں رہیں گے وہاں معاشرے کیسے اپنا وجود قائم رکھ سکیں گے۔ اس لیے یہ کہانی انسان کے مکر و فریب لالچ، داخلی خرابی اور ظاہری بے بصیرتی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے اور لفظوں کی موت خارجی اور داخلی دونوں سطح پر معاشرے کے زوال اور انحطاط کی علامت ہے۔ جس سے معاشرتی رشتے اپنی شکست کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

الیاسف نے ایک اور معاشرتی اقدار سے روگردانی کی اور اسے اس کی سزا بھی ملی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ ساری بستی کے لوگ بندر بن گئے ہیں تو اس نے خود کو سب سے الگ تھلگ کر لیا اور خود کو دوسروں سے مختلف جانا۔ سب سے بتعلق ہونے کی بنا پر اس کے اندر سے ایک مرض نے منھ نکالا کہ اسے وہم پڑ گیا کہ میں، میں نہیں رہا اور میرے اندر پتھری پڑ گئی ہے جو آہستہ آہستہ بڑی ہوتی جاتی ہے جس نے پتھر بن کر اسے برباد کر دینا ہے۔ گہرے پانیوں میں خود کو ایک آدمیت کا جزیرہ جان کر پڑ رہا۔ اور خوف، پریشانی اور ندامت نے پھر اس جزیرے کو پاٹا اور خدا سے معافی منگوائی اور اس طرح یہ جزیرہ اپنے پشتوں سے ٹوٹا اور اس میں پانی بھر آیا۔ اقتباس دیکھیے:

”اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لے لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں میں خشکی کا ننھا سا نشان۔ اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا، گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنالیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں، کہ جذبہ کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے۔ اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کھانے لگا۔ اور جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔“(۱۰۴)

معاشرے ہمدردی، سلوک پیار اور محبت جیسی اقدار کے فروغ سے آگے بڑھتے ہیں اور اگر معاشرے میں لوگوں کا کردار ایسا گھاؤنا ہو جائے کہ اپنی ذات سے باہر انھیں کچھ اور دکھائی نہ دے تو ایسے معاشروں کے افراد خود تو تباہ ہوتے ہی ہیں مگر ساتھ میں معاشرے کو بھی ڈبو کے رکھ دیتے ہیں۔ الیاسف نے بھی ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ بھی بندر بنا دینے جیسا سلوک ہوا اور آخر کار یہ بندر بن گیا۔ بھاگ کر جنگلوں میں بھی جا چھپا اپنی بست بھی چھوڑ گیا مگر اس کو کہیں بھی سکون نہ ملا اور بالآخر یہ چیخنے لگا اور اس کی چیخیں اسی پر بار بنیں بے تحاشا بھاگتا پھر مگر رسوائی اور ذلالت اس کا مقدر بن چکی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کے تلوے بھی دکھنے لگے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی مڑ چکی تھی جس سے اس کا کمر درد بھی بڑھ گیا۔ جھک کر اپنی ہتھیلیوں کو زمین پہ ٹکا کر چاروں پاؤں سے چلنے لگا اور تیر کی طرح سیدھا ہو گیا یعنی یہ بھی انسانی جون سے بندل کر بندروں کی جون میں منتقل ہو چکا تھا اور اس کا اس کو بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ اپنے معاشرے کو بے یار و مددگار چھوڑنا اور خود کو دوسروں سے افضل جاننا یہ انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ جو کہ الیاسف کے ساتھ بھی ہوا۔ آخری آدمی کی کہانی اپنے معاشرتی اقدار کو چھوڑ کر اور مذہبی شعار چھوڑ کر رسوا اور ذلیل ہونے کی کہانی ہے جس میں معاشرے کی روحانی اقدار کا جنازہ اور معاشرتی رویوں کا زوال و انحطاط دیکھا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین کا تیسرا افسانوی مجموعہ "آخری آدمی" کا افسانہ "زرد کتا" اپنی نوعیت کا منفرد اور اہم ترین افسانہ ہے اس افسانے میں انتظار حسین نے اساطیر اور مذہبی صحیفوں سے رجوع کرنے کے بجائے صوفیا کرام کے ملفوظات اور اقوال سے رجوع کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ نہایت اچھی کہانی تخلیق کر پائے ہیں۔ صوفیا کا تو کام ہی معاشرے میں امن پیار اور محبت کی فضا قائم کرنا ہے۔ چھوٹے بڑے اچھے برے اور اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر سب سے ایک جیسا سلوک کرنا اور معاشرتی اقدار کو زندہ رکھنا یہ صوفیا کرام کا مسلک رہا ہے اور آج بھی ایسے ہی قائم دائم ہے۔

صوفیا نے ہر دور میں معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے اور اس کی بین مثالیں موجود ہیں جس سے ہمارے معاشرے امن اور پیار کے اصولوں پہ آگے بڑھے ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ کسی شخص کے معاشرتی کردار کو بہتر بنانے کے لیے صوفیا نے بہت کام کیا ہے تو بے جا نہ ہو گا اور ان کے ملفوظات، اقوال اور دینی محافل و مجالس کی نشستوں سے آج بھی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ان ملفوظات اور اقوال کو ایک آورد یہ کہانی میں کھپانا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر انتظار حسین اس میں بالکل کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور کہانی میں لگائے گئے لفوظات اور اقوا کے ٹکڑے کہانی کے ہی معلوم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار نے کہانی کے لیے خود ہی گھڑے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر آصف فرخی لکھتے ہیں:

> "اس قسم (ملفوظات اور اقوال) کے قابلِ اقتباس ٹکڑے، افسانے کے بیان میں اوپر سے چھڑکے ہوئے یا توڑ توڑ کر اور کاٹ کاٹ کر چپکائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ کہانی کی اس مکمل معنویت کا حصہ ہیں جو اپنا نقش اسی طور قائم کرتی ہے۔"(۱۰۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے اس اسلوب میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک انسان کا معاشرتی کردار ہر صورت معاشرے میں ہونا چاہیے اور وہ بھی مثبت اور ایجابی۔ جس سے معاشرے کی تعمیر ہو اور اس کی ساکھ بڑھے۔ اگر معاشرے میں منفی اور تخریبی قوتیں آگے بڑھنا شروع کر دیں تو معاشرہ زوال اور انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں جتنی بھی اخلاقیات کو پروان چڑھانے اور امن و خلوص کی بات کر لو وہ بے معنی

ہی رہتی ہے۔اور داخلی و خارجی ہر سطح پر معاشرتی افراد کا شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس طرح کسی بھی فرد کا ایسے معاشرے میں رہنا کسی دوزخ سے کم نہیں ہوتا۔ایسے ہی کسی معاشرے کے رویوں کی نشان دہی انتظار حسین کے اس افسانے میں ملتی ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم کہتی ہیں:

"زوال پذیر معاشروں میں فرد کی روحانی اور اخلاقی جدو جہد ثمر بار نہیں ہوتی بلکہ شعوری اور لاشعوری سطح پر ان کوششو کے نتیجے میں خود اپنی زات کا شیرازہ بکھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس دوران فرد احساسات و کیفیات کے جس جہنم سے گزرتا ہے اس کا خوبصورت اظہار انتظار حسین نے اپنے مخصوص اسلوب اور تکنیک میں کیا ہے۔"زرد کتا" اور" آخری آدمی" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔"آخری آدمی" کا الیاسف جب قلب ماہیت کرنے سے قبل (جو اس بستی کا آخری آدمی ہے) جدوجہد کرتا ہے تو یہی اس افسانے کا مرکزی نقطہ اور موضوع ہے۔اصلاً یہ ایک کردار ہے مگر اس میں پوری سماجی زندگی سمٹ آئی ہے۔"(۱۰٦)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کہانی زرد کتا پورے معاشرے کی المیاتی صورت کا نوحہ ہے اور اس کہانی میں بھی راوی ابو قاسم خضری جو ابھی تک زرد کتے کے عذاب سے بچا ہوا ہے خود کو مزید بچانے کی کوشش کرتا ہے اور آخر تک اسی جدوجہد میں لگا رہتا ہے جب کہ باقی سارے لوگ اور مرشد عثمان کبوتر کے مرید بھی زرد کتے کی زد میں آچکے ہیں۔معاشرہ انتشار اور زوال کا شکار نظر آتا ہے۔جہاں طمع دنیا آئی وہاں علم، حلم اور برکت جیسی نعمتیں چھن گئیں اور آدمی اپنے معاشرے میں رذیل ورسوا ہو گیا۔لالچ اور حرص انسان کے روحانی اور اخلاقی اقدار کو کھا جاتی اور اسے ختم ہی کر دیتی ہے۔معاشرت زوال اور انحطاط کے لحاظ سے اس افسانے کا مرکزی خیال اس اقتباس میں دیکھیے:

"میں یہ سن کر عرض پرداز ہوا۔

یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟ فرمایا:

زرد کتا تیرا نفس ہے۔ میں نے پوچھا: یا شیخ نفس کیا ہے؟ فرمایا:

نفس طمع دنیا ہے۔ میں نے سوال کیا: یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟ فرمایا:

طمع دنیا پستی ہے۔ میں استفسار کیا: یا شیخ پستی کیا ہے؟ فرمایا:

پستی علم کا فقدان ہے۔ میں ملتجی ہوا: یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟ فرمایا:

دانشمندوں کی بہتات۔"[۱۰۷]

زرد کتا یعنی نفسِ امارہ انسان کی پوری روحانی زندگی کے لیے ایک مسئلہ ہے اور اس کو انحطاط کا شکار کر دیتا ہے، بدی ایک وبا کی صورت ہوتی ہے جو معاشرے میں بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ آخری آدمی کی طرح زرد کتا میں ایک انسان کو زندگی اور زوالِ زندگی کے درمیان کشمکش کرتے دکھا کر پوری سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آخری آدمی میں چوں کہ وہ الیاسف خدا سے مکر کرتا ہے اس لیے وہ اپنی بدی کے سبب بندر کی جون میں منتقل ہو جاتا ہے مگر اس کہانی زرد کتا میں راوی ابو قاسم خدا سے پناہ مانگنے کی وجہ سے انسان کی ہی جون میں باقی رہتا ہے اور وہ زرد کتا نہیں بنتا۔

زرد کتا ایک روحانی زندگی کے لیے چیلنج کی کہانی ہے جس میں معاشرتی اقدار کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کہانی میں لوگ قوتِ سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں یہ بھی کسی معاشرے کے مردہ ہونے کی علامت ہے اسی لیے سید علی جزائری قبرستان میں جا کر خطاب کرتا ہے اور مردوں کو قابلِ سماعت پاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"وہ قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا، اس کا عجب اثر ہوا قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی جزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا: اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو تیرے جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ فرما کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر

ہو گئی۔اس کے بعد انھوں نے بستی سے کنارہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے۔جہاں وہ

مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔"(۱۰۸)

ظاہری بات ہے کہ جس شہر میں جیتے جی سماعت سے محروم ہو جائیں اور مردوں کو قوتِ سماعت مل جائے وہاں لفظ بالکل ہی کھوکھلا اور معدوم ہو جاتا ہے۔اس طرح لفظ مر جاتے ہیں اور جہاں لفظ مر جاتے ہیں وہاں زندگی اپنی معنویت کھو کر لایعنیت کا شکار ہو جاتی ہے اور ایسے معاشرے اور شہر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔جس معاشرے کے افراد اپنے اسلاف،اپنے استاد،اپنے مرشد اور اپنے بڑوں کے فرمودات پر عمل نہیں کرتے وہ روحانی اور اخلاقی زوال کا شکار ضرور ہوتے ہیں جیسا کہ اس افسانے میں بتایا گیا ہے۔

انسان کا جب معاشرتی کردار کمزار ہو جاتا ہے یا پھر وہ دنیاداری میں اس طرح مگن ہو جائے کہ اسے اچھے برے کی تمیز نہ رہے تو وہ بڑے سے بڑا گناہ سے بھی نہیں چوکتا اور ایسے ایسے گرے ہوئے کام بھی کر جاتا ہے کہ جس کی توقع انسان سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔اپنی عقیدت،محبت اور دین کو بھی داؤ لگانے لگتا ہے اور اس دھوکے سے وہ فقط دنیاوی فائدے حاصک کرتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ "مردہ راکھ" اس کی ایک بہترین مثال ہے جس میں مذہبی اور معاشرتی مسلکی مسائل اور ان عقیدتوں میں رخنے پیدا کرنے والوں کا ذکر ہے کہ جو اپنی ذاتی خوشیوں اور لالچوں کے تحت نیکی اور دین کے کاموں کے جمع شدہ پیسے اور وقف کردہ مال بھی کھا جاتے ہیں۔ان کا معاشرے میں اس قدر گھٹیا اور کم ترین کردار ہوتا ہے کہ معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور دوسروں پر بھی چوری چکاری کے الزامات کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔یہ افسانہ انتظار حسین نے اپنے مسلکی اقدار اور شعییت کے مطابق لکھی ہیں مگر اس افسانے کو پڑھ کر ہر مسلک اور دین میں چھپے ایسے بے ایمان لوگوں کا پتا چلتا ہے۔

اس افسانے میں شعیہ مسلک کے ساتھ جڑے تاریخی اور عقیدت پر مبنی حوالوں کا ذکر ملتا ہے جن میں دلدل،غیاب،امام بارگاہ،ذوالجناح،عَلم اور امام کی سواری وغیرہ۔اس افسانے کے چار بنیادی کردار اہیں کہ جن کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہوئی اپنے منطقی انجام تک پہنچ جاتی ہے۔جو فرزند علی،محمد عوض

کربلائی، تفضل، اختر، تراب علی متولی اور افضال حسین ہیں۔ کہانی کے شروع میں ہی پتا چلتا ہے کہ اس سال امام کی سواری نہیں نکلی اور جو دلدل نکالا ہے وہ بھی اصل دلدل نہیں کہ وہ سب کو تنگ کر رہا ہے اور گھبر ایا ہوا اور ڈرا ہوا کوئی اور گھوڑا ہے۔ جس کی وجہ سے پتا چلتا ہے کہ اصل دلدل تو تراب علی نے رکھوالی نہ کرنے اور صحیح دانہ دنکانہ کھلانے کی وجہ سے مار دیا ہے تو بڑا شور اٹھتا ہے اور لوگ مارے ڈر کے کچھ کہتے بھی نہیں۔ اور لوگوں کو محرم میں کھانے کے لیے لنگر اور تبرک بھی پہلے کی طرح نصیب نہیں ہوا تو یقیناً کوئی گڑبڑ ہے۔ اس بحث پر اقتباس دیکھیے:

> ”تراب علی نے متولی بنتے ہی وہ کچھ کیا تھا کہ اب کسی کے دل میں ان کا ذرہ بھر احترام نہیں تھا۔ وقف کی مجلسوں میں تبرک کی رسم اٹھ گئی اور بڑے امام باڑے کے صحن میں بنی ہوئی وہ بھٹیاں اور تندور، جو یکم سے گرم ہو جایا کرتے تھے، اب ٹھنڈے پڑے رہتے اور صرف آٹھ کی شب اور عاشورہ کی سہ پہر کو گرم دکھائی دیتے۔ تراب علی متولی کہتے کہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ میدہ تو کسی بھاؤ نہیں ملتا۔“[۱۰۹]

ایسے بہانے کرنے والے، کام چور، نکمے اور مال میں سرقہ کرنے والوں کی آج بھی کمی نہیں اور بالکل کردار میں ذلالت اور گمراہی بھرنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ اس میں انسان کے اجتماعی شعوری معاشرے کی مثال پیش کی گئی ہے کہ جس معاشرے میں لوگو اپنی عقیدت، مسلک اور مذہب کا پیسا کھا جاتے ہوں وہ دوسرے کاموں کا کیا حال کرتے ہوں گے۔ سو میں سے دس روپے بھی نہیں لگاتے ہوں گے۔

ایسے لوگوں کا برتاؤ اسلام اور اس کے شعار کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ ہی ان سارے مذہبی رسومات کے مالک اور ٹھیکیدار ہیں۔ لوگ ہر چیز کو ٹھیکیداری میں نیلام کر دیتے ہیں لنگر تک پکانے اور کھلوانے کے ٹھیکے ہوتے ہیں اور ایسا تب بھی تھا اور ایسا آج بھی ہے۔ ایسے نام نہاد عقیدت مندوں کا جھمگٹا کبھی کم نہیں ہوا۔ ایسے لوگوں کے کردار اور برتاؤ نے ایسے کئی دوسروں کا رویہ اور امیج بھی خراب کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر حامد رضا صدیقی کہتے ہیں:

”جب دنیا مذہب کی ٹھیکیدار ہو، مذہبی محفلوں، مجلسوں اور پروگراموں کا ٹھیکا ہونے لگے، لوگ دولت کے بھوکے ہو جائیں، دین سے بیزار ہو جائیں، غلط اخلاقیات کو اپنا شعار بنالیں، مذہبی عقائد سے بچنے لگیں تو دین سمٹ جاتا ہے۔“(۱۱۰)

بالکل سارا معاشرہی مذہبی اقدار سے خالی خولی ایک بندوں کا گروہ بن کے رہ جاتا ہے۔ جن کا کردار معاشرے میں سوائے گمراہی اور دھوکے کے کچھ اور نہیں رہتا۔ اور ایسے لوگ جو اوپر سے مذہبی اور اندر سے لالچ اور ہوا س کے مارے ہوں ان سے منافقت جنم لیتی ہے جو کسی بھی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بن سکتی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ”دوسرا گناہ“ میں معاشرے کے اندر رہ کر کس طرح سماج کی اقدار کو زندہ رکھنا ہے اور کس طرح گزارا کرنا ہے اس کو بڑے علامتی اور تمثیلی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس افسانے میں کسی بھی بستی یا معاشرے کے لیے معاشی نظام کو چلانے اور اس کو بہتر بنانے کی ترغیب ملتی ہے اور اس کے ساتھ معاشرتی کرداروں پہ بحث ہے کہ ایک اچھا انسان کس طرح معاشرے کو زندہ رکھتا ہے اور ایک برا انسان کسطرح معاشرے کو تباہ کرتا ہے اور ان کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیتا ہے۔

اس افسانے کی کہانی تو معاشی نظام اور برابری کے نظام پہ گھومتی ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین یہ کہانی مشہور ماہرِ معاشیات اور فلسفی کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں کہانی میں جگہ جگہ قرآنی حوالے اور احادیث کا اسلوب اور الفاظ بھی ملتے ہیں۔ کہانی میں ایک اچھا کردار حشام دکھایا گیا ہے جس کے برتاؤ کی وجہ سے بستی کے تمام لوگ اسے اپنا بڑا اور منصفی مان لیتے ہیں اور ایک سو پچھتر سال کی عمر میں وفات ہونے کی وجہ سے اس کی کرسی پر اس کے بیٹے زمران کو براجمان کر دیا جاتا ہے جو شروع شروع میں تو اچھے اور انصاف پر مبنی کام کرتا ہے مگر بعد میں وہ اپنے اور لوگوں کے درمیاں اونچ نیچ کی دیوار کھڑی کر لیتا ہے جس کی وجہ سے سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور تما لوگ ایک دوسرے سے الگ الگ رہنا شروع کر دیتے ہیں جو کہ پہلے ایک ہی دستر خوان پر اکٹھے کانا کھایا کرتے تھے۔

جب زمران نے خود کو دوسروں سے افضل سمجھا اور خود کو اعلیٰ جانتے ہوئے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی پکوائی تو اس کی رنگت اور ذائقہ مختلف تھا تو لوگوں کو دستر خوان پر پتا چلا کہ یہ تو انصاف نہیں اور نہ ہی برابری ہے۔اس لیے شور پڑ گیا اور ابی ملک نے اس کو سمجھایا کہ بیٹا دیکھو جب برابری اور انصاف نہیں رہتا اور جب گیہوں کے چھلکے گیہوں کی مینگ سے الگ ہونے لگیں تو اناج معاشرے مین تھوڑا رہ جاتا ہے اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے۔اس بیان سے لگتا ہے کہ بستی والوں کو اس کا یقین اوت ایقان تھا کہ برا معاشرتی کردار معاشرے میں بگاڑ لے کر ہی آتا ہے۔افسانے سے اقتباس دیکھیے:

> "اس باپ کے بیٹے نے بھی بڑی منصفی کی، پھر ایک دن یوں ہوا کہ ابی ملک نے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اجلے پن کو دیکھ کر حیران ہوا، پھر اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اتنی اجلی نہ تھیں، پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر بولا کہ اے حشام کے بیٹے! کیا تُو اب چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ جب گیہوں کی مینگ گیہوں کے چھلکے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہو جاتا ہے، گیہوں تھوڑا اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمیں ہمارا پالنے والا اس دن سے پناہ میں رکھے کہ ہمارے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ہماری بھوک بڑھ جائے۔"(111)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کردار ک غلط حرکت سے معاشرے کے بڑے بوڑھوں کو اس بات سے در آنے لگا تھا کہ اگر اسی طرح وہ دوسروں لوگوں سے اپنی روٹی الگ بنوائے گا اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا تو وہ وقت دور نہیں جب سارے لوگ ہی ایک دوسرے سے مختلف کھانے کی فرمائش کریں گے اور ساری بستی کا شیرازہ بکھر جائے گا۔جب گوشت ناخن سے جدا ہو گا، مطلب لوگ جدا جدا جینے لگیں گے تو اتفاق میں برکت تھی وہ جاتی رہے گی اور سارے لوگ اپنا اپنا الگ پکا لیں گے تو نفاق سے کی وجہ سے کھانا کم پڑنے لگے گا کیوں کہ ہر کوئی اپنے لیے سمیٹے گا اور دوسروں کا خیال نہیں کرے گا۔بھوک بڑھ

جائے گی اور کھانا کم پڑ جائے گا۔ زمران کا باپ اور دادا بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا اور اُسی برابری کا خیال کیا کرتا تھا جس سے آج تک بات بنی ہوئی تھی اور ساری بستی ان کے خاندان کی عزت کرتی تھی اسی وجہ سے تو زمران کو باپ کی جگہ پر بٹھایا گیا تھا۔

الیملک نے کھانے کا ایک نوالہ بھی نہ لیا اور وہ زمران کی اس حرکت سے اس قدر نالاں تھا کہ دسترخوان سے اٹھ کر چلا گیا اور ساری بستی میں زمران کے اس برتاؤ کی باتیں مشہور ہوئیں اور یہ بھی مشہور ہوا کہ الیملک بغیر کچھ کھائے چلا گیا تھا۔ لوگ چوں کہ الیملک کے ساتھ تھے اس لیے انھوں نے غصہ کیا اور حیرانی کا بھی اظہار کیا۔ جس جس نے غصے اور حیرانی کا اظہار کیا زمران نے ان سب کو بھی علیٰحدہ کر دیا۔ اس طرح اس بستی میں اتفاق کا شیرازہ بکھر گیا اور لوگ ایک آدمی کے غلط معاشرتی رویے سے دور دور ہو گئے۔ لوگوں نۓ ایک دوسرے سے بچنے کے لیے اپنے گھروں کی دیوارایں اونچی کرالیں اور چوری کے خدشے ڈیوڑھیاں بھی اونچی اونچی بنوالیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت سے رہتے تھے اور ان کا پیار اس قدر بھلا اور اچھا تھا کہ اگر سونے کی ڈلّی بازار میں پھینک دو تو کوئی اٹھاتا نہ تھا کہ جس کی ہو گی خود ہی لے جائے گا۔ یہ ساری باہمی کدورت، رنجش اور نفاق ایک آدمی کے غلط معاشرتی رویوں سے پیدا ہوا۔ زمران نے باہمی نفاق پیدا کیا تھا اور خود ہی چیزوں کو الگ اور قیمتی بنا کر پہننے اور پیش کرنے لگا تھا تو ایک دن اس کے گھر سے چوری ہو گئی۔ تو جب بڑے آدمی اور سربراہ کے گھر محفوظ نہ تھے تو لوگوں نے بھی احتیاط برتنی شروع کی اور چیزوں کو سنبھال سنبھال اور چھپا چھپا رکھنے لگے جب کہ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا اور لوگ پیار محبت سے اکٹھے ہی رہا کرتے تھے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”اور یوں ہوا کہ جب زمران کے گھر کا دروازہ بن گیا اور اس میں کنڈی لگ گئی تو کچھ دیکھنے والوں نے اسے دیکھ کر رعب کھایا اور کچھ دیکھنے والوں نے اس کے پیچھے کی چیزوں کے بارے میں تجسس کیا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ زمران کی بھاری پوشاک چوری ہو گئی اور یہ پہلی چوری تھی کہ اس بستی میں ہوئی۔ پہلے یوں تھا کہ سونے کی ڈلی بازار میں

پھینک جاؤ اور دوسرے دن آکر اٹھا لو مگر اب لوگوں نے اپنی اپنی چیزیں سنگھوا کر رکھنی شروع کیں، اور ایک آڑی نے زمران کی پوشاک چوری ہو جانے کے بعد زمران سے کہا کہ میرا گھر محفوظ ہے کیا میں دفروازہ بنالوں ؟ زمران نے کہا: بنوا لے ! اور اس نے دروازہ بنا لیا پھر دوسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ بنا لیا، پھر تیسرے آڑی نے اجازت لی اور دروازہ بنالیا اور پھر بستی میں دروازے بنتے چلے گئے۔"(۱۱۲)

جس طرح دروازے ایک ایک کر کے بنتے چلے گئے اس طرح دیواریں بھی ایک ایک کر اونچی ہوتی چلی گئیں۔ اس طرح نگہبانوں اور پاسبانوں کی بھی ضرورت آن پہنچی اور دربان بھی رکھے جانے لگے۔ اور یوں زمران نے اپنے لیے سواری کا بھی بندوبست کر لیا اور اس طرح اس نے سفید دودھیا گھوڑوں کی سواری حاصل کی اور گیہوں پر اسرار طور پر تھوڑا پڑنے لگا کہ اب زمران کے گھوڑے اور گھوڑیاں بھی بھوسا کھانے لگیں اور لوگوں کو بھوسا ملا اناج اور گیہوں کم ملنا شروع ہو گیا۔ الیملک نے پھر اپنے عزیز زمران کو سمجھایا اور کہا کہ اناج اور گیہوں اب تمھاری گھوڑیوں کو تو میسر ہے مگر ہم انسانوں کی نہیں مل رہا تو اس نے اسے جھڑکا اور بستی سے نکال دیا اور اس طرح وہ اپنی بیوی کو لے کر جنگل میں آ آباد ہوا۔ وقت کے ساتھ لوگ اس بستی میں کھانے کی قلت محسوس کرنے لگے اور ہجرت کر کے اسی جنگل میں آ الیملک کے پاس رہنے لگے۔ الیملک نے ساری بستی کے لوگوں کا پوچھا اپنے بیٹے کا بھی پوچھا اور اس طرح جنگل میں منگل ہو گیا اور لوگ اس بستی سے ہجرت کر کے یہاں آنے لگے کہ وہاں رزق اور مال کا قحط پڑ گیا تھا اقتباس دیکھیے:

"پھر یوں ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد زمران کی بستی سے ایک اور قافلہ چلا اور بھوکا یہاں پہنچا۔ زمران کی بستی میں قحط پڑ گیا تھا اور وہاں سے پہلے ایک قافلہ چلا اور یہاں آکر پناہ گیر ہوا، پھر دوسرا قافلہ آیا اور پناہ گیر ہوا، پھر قافلے آتے چلے گئے اور یہاں ڈیرے ڈالتے چلے گئے۔"(۱۱۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ایک شخص کے برے معاشرتی کردار کی بدولت کس طرح پورے کا پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے اور اس وقت معاشرے میں زیادہ بگاڑ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاشرے کے سربراہان یا بڑے لوگ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔

افسانہ "دوسرا راستہ" میں افسانہ نگار نے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں آنے والے مہاجرین کے مسائل گنوائے ہیں اور لوگوں کی ان کے ساتھ بے مروتیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس افسانے میں ایک ڈبل ڈیکر بس ہے جس کے اوپر اور نیچے دونوں ڈیکوں پہ سواریاں بیٹھی ہیں اور اس قدر بیٹھی ہیں کہ رش کی وجہ سے کچھ سواریاں زینے کے قریب ڈنڈے کو پکڑ کر بھی کھڑی ہیں۔ ڈبل ڈیکر بس کے دونوں ڈیک بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں کے لیے علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں کہ بڑے لوگ اوپری ڈیک پہ اور چھوٹے لوگ نچلے ڈیک پہ سوار ہیں اور ڈرائیور انجان اور نیا نیا ہے کہ جو گاڑی کو نامعلوم سمت کی طرف لے جا رہا ہے جس کا سے خود بھی اندازہ نہیں ہو رہا حالانکہ بس نے اسٹیشن پر ضرور جانا ہے اب کسی کو نہیں معلوم کہ کس روٹ سے گاڑی نے اسٹیشن جانا ہے۔

اس افسانے میں کچھ لوگ انصاف کے لیے تو کچھ لوگ اپنی اپنی روزی روٹی پر بحث کر رہے ہیں کسی کا کاروبار بند ہو گیا ہے تو کسی کو برے خواب کی تعبیر چاہیے تو کسی کو ماضی ستا رہا ہے اور وہ بس میں سب کو اپنی کہانیاں سنا رہا ہے۔ اس افسانے میں ایک جگہ معاشرتی رویوں اور معاشرتی کردار پہ بات ہوتی ہے کہ لوگ اب رمضان میں مسجد میں افطاری بھیج دیتے ہیں جب کہ ساتھ والا ہمسایہ جو بھوکا اور روزے دار بھی ہوتا ہے اس کی خبر کوئی نہیں لیتا۔ اقتباس دیکھیے:

> "قلعے سے رمضان کے رمضان افطاری کے خوان جمعہ مسجد جایا کرتے تھے۔ اس برس بھی گئے مگر ایک شام کو کیا ہوا کہ خوان قلعے سے باہر نکلے ہی تھے کہ جانے کس طرف سے چیلیں منڈلاتی آئیں۔ ایسا جھپٹا مارا کہ خوان اوندھے ہو گئے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ اس شام جمعہ مسجد میں افطاری تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی رمضان میں عید سے پہلے

پہلے دلی میں قیامت برپا ہو گئی پھر کال پڑا۔ ایسا کال۔۔۔۔بس یہ سمجھ لو کہ زبردست کال
پڑا تھا۔"(۱۱۴)

اس بات سے افسانہ نگار یہ ہی سمجھا رہے ہیں کہ بنیادی طور پر ہمیں اپنے ہمسائیوں اور اردگرد میں دیکھ کر پہلے اس کی خدمت کرنی چاہیے اور اپنا معاشرتی کردار نبھانا چاہیے اور اگر پھر بھی آپ کے پاس اتنا کچھ ہے کہ آپ مسجد بھی کھانے کو بھیج سکتے ہیں تو ضرور بھیجیں۔ مگر آج کل مسجد صرف دکھاوے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور سارے اہلِ محلہ ہی مسجد میں افطاری بھیجتے ہیں جس سے کیا ہوتا ہے کہ مسجد میں رزق کی بے حرمتی بھی دیکھنے میں آتی ہے اور افطاری اپنے حقدار تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔

ڈاکٹر حامد صدیقی نے چیل کے جھپٹنے کو غریب عوام کا جھپٹنا کہا ہے کہ جب انھیں حقوق نہیں ملتے اور اپنے حصے کا رزق نہیں مل پاتا تو پھر یہ معاشرے میں چوری ڈاکا اور قتل و غارت جیسے کام شروع کر دیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> "رمضان میں جب افطاری قلعے سے باہر لائی جاتی کہ مسجد میں لے جائیں گے مگر راستہ میں چیل جھپٹا مار کے چھین لے جاتی ہے یہ غریب طبقے کی طرف اشارہ ہے جو معاش کے لیے قتل وغارت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور افطاری اسلام کے نقطہ نظر سے پہلے غریب پڑوسی کو دینا چاہیے جبکہ یہاں اس کے برعکس ہوتا ہے۔"(۱۱۵)

اس اقتباس سے ہمیں اس افسانے میں موجود انسان کے معاشرتی کردار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ انتظار حسین نے کس طرح علامتی انداز میں گریب عوام کے دکھ درد اور ہمارے سماج کے اجتماعی رویے کو بے نقاب کیا ہے۔

انسان کا معاسرتی رویہ اور کردار ہی اسے معاشرے میں ایک نیک صفت شخص یا پھر ایک بدکار آدمی بناتا ہے۔ یعنی آدمی اپنے اخلاق اور لوگوں کے ساتھ اچھے برتاؤ ہی سے معاشرے میں اپنا نام کما سکتا ہے ورنہ بہت سے لوگ آئے اور چلے گئے کسی کو کیا خبر کسی کی۔ افسانہ "بیرم کاربونیٹ" میں انتظار حسین نے انسان

کے کردار کو ایک نفسا نفسی کے عالم میں ایک دوسرے کی جان کا دشمن اور ذاتی فائدے کو اجتماعی فائدے پر کس طرح لوگ فوقیت دیتے ہیں اس کو موضوع بنایا ہے۔لوگوں کو جب اپنا مطلب ہوتا ہے تو وہ کسی دوسرے کی پرواہ کیے بغیر پہلے اپنی جان کی پرواہ کریں گے اور اپنا کام پہلے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور اگر کسی کے ہاتھ لمبے ہیں تو وہ اپنی پہنچ اور سفارش سے سارے کام گھر بیٹھے کروالے گا اور دوسرے امیر لوگ بھی غریبوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے لیے سارے کام گھر بیٹھے ہی کروالیں گے۔

اس افسانے مین ایک کالونی پر چوہوں کی یلغار دکھائی گئی ہے کہ کالونی میں ہر طرح اور ہر طرف سے چوہے ہی چوہے بھر گئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کالونی کے ہر گھر میں ایک بل بن گئی۔گھر تو گھر بل کہ درختوں کی جڑیں تک محفوظ نہ رہیں اور لوگوں خوف کے ساتھ مختلف بیماریوں میں بھی مبتلا ہونے لگے اور اس پریشانی کا حل کسی سے نہ نکل سکا۔آخر کار اس کا حل نکالنے کے لیے امریکا سے بیرم کاربونیٹ کی گولیاں برآمد کروائی گئیں جس سے چوہے مرنا شروع ہوئے اور لوگوں کے سانس میں سانس آیا۔

اب جب بیرم کاربونیٹ کی گولیاں زمریکا سے آتیں تو وہ امیر لوگوں اور سیاستدانوں تک تو پہنچ جاتیں مگر غریبوں کو نہ مل سکتیں اور دکانوں اور میڈیکل اسٹوروں پر اس قدر رش ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے کی پرواہ کیے بغیر ایک دوسرے کے اوپر گرتے اور ہر کوئی یہی کہتا کہ مجھے کسی بھی قیمت وہ دوا مل جائے اور باقی سارے مرتے ہیں تو مر جائیں۔افسانے سے اقتباس دیکھیے:

> ”خیالات کے اس رینگتے دائرے کو بیرم کاربونیٹ نے توڑا۔ بیرم کاربونیٹ سچ مچ آ گئی۔جب یہ خبر ملی ہے کہ بیرم کاربونیٹ کی بلٹی آگئی ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ کیا حال ہوا ہے۔ایسا لگتا تھا کہ کیلی پر ٹھہری ہوئی زمین پھر یکایک گھومنے لگی ہے۔جس کوارٹر والے کو دیکھو منور میڈیکل سٹور کی طرف جارہا ہے۔جب ہم وہاں پہنچے ہیں تو ایک مجمع جمع تھا اور ڈاکٹر منور کہہ رہے تھے ”بیرم کاربونیٹ ختم ہو گئی۔“
>
> ہم نے اشرف چاچا سے کہا ”اشرف چاچا بیرم کاربونیٹ بھی بلیک میں چلی گئی۔“

اشرف چاچا غصے میں بھرے مجمع کو چیرتے ہوئے سٹور میں داخل ہوئے۔ تڑخ کر بولے کہ "ایک دن میں ختم ہو گئی۔ آج بلٹی آئی ہے، آج ہی ختم ہو گئی۔"

ڈاکٹر منور نے سکون سے جواب دیا" بات یہ ہے کہ رام گڑھ کے زمینداروں نے لمبے آرڈر بک کروا رکھے تھے۔"

"رام گڑھ کے زمینداروں نے" اشرف چاچا اسی غصے سے بولے" آپ نے میڈیکل سٹور کالونی والوں کے لیے قائم کیا ہے یا رام گڑھ کے زمینداروں کے لیے۔ مصیبت ہم پر آئی ہوئی ہے، بیرم کاربونیٹ رام گڑھ کے زمیندار لے گئے۔""(۱۱۶)

اس اقتباس سے دو چیزوں کا معاشرتی کردار میں جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی مصیبت بنتی ہے تو لوگ پہلے اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور معاشرے کی ضرورت بھول کر اپنا کردار ادا کرنا بھول جاتے ہیں اور دوسرا یہ کہ امیر لوگ اپنے وسائل کو استعمال کر کے غریب لوگوں تک پہنچنے والی تمام اشیا کو ہڑپ کر جاتے ہیں اور غریب بے چارہ چند پیسے جمع بھی کر لے تو اس کے پیسے جمع کر کے دکان تک پہنچتے تک وہ ضرورت کی چیز ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور کسی امیر کے ذخیرے میں جا جمع ہوتی ہے یا کسی امیر کے پالتو جانور کو لگا دی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کاروباری شخص ہمیشہ اپنا فائدہ سوچتے ہیں نہ کہ معاشرے میں اپنا اچھا کردار ادا کر کے لوگوں کا بھلا کرتے ہیں۔ ان چوہوں کی وجہ سے کالونی میں پھیلی طاعون کی بیماری گلٹیوں میں ظاہر ہوتی ہی رہی اور اس کی قیامت ڈھا دینے والی دہشت ختم نہ ہوئی۔ افسانے میں بھی اس بیماری کو ایسے ہی ختم کیے بغیر ختم کر دیا گیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ جب تک لوگ اپنا معاشرتی کردار ادا نہیں کرتے خدا بھی لوگوں پہ رحم نہیں کرتا اور ان کو انھیں کے حال پہ چھوڑ دیتا ہے۔

ج۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں میں تصورِ حیات: تقابلی مطالعہ

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ہم نے مذہبی افکار کا فنکارانہ اظہار دیکھا جس میں مذہبی اقدار تصورِ حیات کے متعینہ تینوں پہلوؤں کو پرکھا جانچا اور ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے افسانوں میں مذہبی عناصر اور افکار کے لحاظ سے ان کا جائزہ بھی پیش کیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں مذہبی افکار کی خوب پیش کش ملتی ہے جس سے اپنے معاصرین کے ساتھ ساتھ انھوں نے متاخرین کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ موضوع کی مناسبت سے دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں میں موجود مذہبی عناصر اور افکار کو مذہبی قدر تصورِ حیات کے آئینے میں رکھتے ہوئے انھیں تینوں پہلوؤں کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس افسانہ نگار کے ہاں مذہبی افکار کا برتاؤ اور پرچار مناسب اور بہترین ہے اور کس نے کس طرح مذہبی افکار کے ذریعے معاشرے میں تصورِ حیات کو اپنے اسلوب میں بہتر بیان کیا ہے۔

i. انسان کا وجود

انسانی وجود کی اہمیت، اس کی قدر اور اس کی معدوم ہوتی قدریں کسی بھی انسان سے ڈھکی چھپی نہیں اور پھر ایک افسانہ نگار و ادیب کو تو معاشرے کے دوسرے عوام سے تو بڑھ کر ہی اپنے ارد گرد کی فکر ہوتی ہے جو اپنی فکر کی سان پر ہر شخص کے دکھ کو یوں چڑھاتا ہے کہ جیسے یہ المیہ بھی اسی کے ساتھ پیش آیا ہو۔ کسی کے دکھ درد اور پریشانی کو نباض بن کے پیش کرنا کسی بھی ادیب کا فرضِ اولیں ہے۔ جو ہمیں دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں بدرجہ اتم ملتا ہے۔

جبران اپنی زندگی کے مشاہدے میں آنے والی چھوٹی سی چھوٹی چیز کو بھی قرطاس کی زینت بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے اور پھر اسے اپنے خاص فلسفیانہ اسلوب کی سان پہ چڑھا کر اس طرح اسے پیش کرتا ہے کہ کہانی کو مزید چار چاند لگ جاتے ہیں اور وہ اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ بیان میں آتی ہے۔

جبران کا افسانہ ”پروانہ سے“ اپنی نوعیت اور بنت کے لحاظ سے ایک منفرد افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک پروانے کے ادنیٰ سے وجود سے کہانی کو بیان کیا ہے کہ جس میں ایسا ایک کیڑا جس کی ہماری زندگی میں ایسی کوئی اہمیت بھی نہیں مگر اس سے انسانی وجود کے اہم ہونے اور پھر اسے کام میں لانے کی ترغیب دینا یہ جبران ہی کا خاصا ہے کہ ایک پروانہ رات رات بھر شمع کے گرد طواف کر سکتا ہے تو پھر انسان کیوں اپنے وجود کی عظمت کو نہیں سمجھتا اور ہمیشہ غفلت سے کام لیتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

”ننھے سرفروش! اس بے قراری سے شمع کا طواف کیوں کر رہا ہے مطلوب کے قریب پہنچ کر بھی اتنی بے چینی اس قدر آہ وزاری۔۔۔۔ لیکن تیری یہ شب بیداری کیسی؟ تُو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں۔۔۔۔۔ اللہ اللہ! یہ وارفتگی کہ دہر میں دم بھر کا قیام بھی بارِ خاطر ہے۔ دل صد پارہ میں اک عزمِ آہنی ہے اور روح کی گہرائیوں میں ملکوتی درخشانی۔ کتنی مختصر ہے تیری زندگی لیکن کس قدر شاعرانہ اور بعید از وسعتِ خیال۔“(۱۱۷)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ایک پروانہ اپنے وجود کی عظمت کو اپنے عشق اور والہانہ عقیدت سے دیوتا تک کے مرتبے تک لے گیا ہے تو انسان تو ہے ہی اللہ کا زمین پر نائب اور خلیفہ تو یہ اپنے عشق اور لگن سے فرشتوں سے بہتر تفویض مقام پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ عشق کی ایک جست سارے قصے تمام کر کے اسے منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔ مختصر، ادنیٰ اور کیڑے کی زندگی بھی عزمِ آہنی سے بڑے سے بڑے دیوتا جیسی ہو گئی ہے یہی وجود کی عظمت کا اقرار ہے جو جبران کے اس افسانے میں نظر آتا ہے۔

مگر انتظار حسین کے ہاں وجود کی اہمیت کا تو پتا چلتا ہے مگر اس کے ہاں زیادہ مسائل اس بات کے ہاں کے وجود گیا کہاں؟ کہ انسانی وجود جو کہ ایک اہم اور خاص چیز ہے جس نے دنیا میں آکر کائنات کو رونق بخشی مگر وہ انسان دنیا میں آکر طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہوا اور اپنی اہمیت کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی

شناخت اور پہچان بھی کھو گیا جس میں زیادہ تر ہاتھ ان حادچات کا ہے کہ جو قسمت کی لکیروں کی طرح انسان کے ماتھے پہ چپک گئے ہیں اور انسان چاہ کر بھی ان سے جان نہیں چھڑا پا رہا۔

افسانہ نگار کا افسانہ ”قیوما کی دکان“ قیامِ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے فوراً بعد لکھا جانے والا افسانہ ہے کہ جس میں مصنف نے ہجرت سے قبل اور بعد میں ہونے والے انسانی وجود کی بے حرمتی کو موضوع بنایا ہے جس میں وجود کہیں پس کے رہ گیا ہے مگر اس وجود کی سلامتی اور اڑان کے لیے قیوما کی دکان اور قیوما ایک خاص روایتی دکانداروں جیسا اسلوب رکھتا ہے کہ جس کی دکان ہر قسم کے حالات کے دوران کھلی رہی اور فسادات کے دنگوں میں وہ دکان اپنی تہذیب سمیت کہیں بند ہو کر رہ گئی اور کہیں دور کھو گئی۔ قیوما جو کہ وجود کی عظمت کی علامت بنے کو تیار تھا مگر نہیں بن سکا اور وہ بھی ہجرت کے بعد پاکستان چلا گیا اور اس کا وجود دوسرے کئی وجودوں کے ساتھ اپنی شناخت کا المیہ بن گیا۔ ایک ٹکڑا افسانے سے دیکھیے:

> ”چوک آج ننگا ساد کھائی پڑتا تھا۔ چوک بھی ننگا تھا اور مسجد کے پیچھے والی گلی بھی ننگی تھی اور چھتیں بھی ننگی تھیں اور آسمان بھی ننگا تھا اور قیوما کی دکان کا پٹرا بھی ننگا تھا۔ ہم خود ہی جو ننگے ہو گئے تھے۔“(۱۱۸)

ہم خود ہی جو ننگے ہو گئے تھے ایک ایسا جملہ ہے کہ جس میں وجود کی تذلیل کا اندازہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہمیں اسی وقت ذلت کا سامنا زیادہ ہوتا ہے کہ جب ہم اپنی عزت زیادہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری عزت زیادہ ہے تو ہی ہماری بے عزتی بھی زیادہ ہی ہوئی ہے۔ جبر ان انسانی وجود کو چھوٹی سے چھوٹی چیزوں میں وقار بخش کر حاصل کرنا چاہتا ہے اور ان کی اہمیت کا ادراک جتنا اس کے دماغ میں ہے اتنا ہمیں بھی کروانا چاہتا ہے۔ انتظار کے پاس اسی اشرفیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا انداز جدا اور الگ ہے کہ وہ ٹھوکر مار کر کہتا ہے کہ تم ٹھوکر سے بچ بھی سکتے تھے مگر تمھارے احمق پن، سست پن اور نالائقی نے تمھیں ٹھوکر پر مجبور کیا کہ وہ انسانی وجود کی عظمت کے تو قائل ہیں مگر اس کی رذالت اور گرے پن کی وجہ سے اسے دوبارہ وہی واقعات یاد کرواتے ہیں کہ

جب تو ایک اعلیٰ وجود کا مالک انسان تھا مگر اج اپنی ہی حرکتوں کی بدولت دنیا میں ذلیل ہو رہا ہے۔ جس سے آج ہم سب ننگے ہو گئے ہیں اور شرمندہ شرمندہ پھر رہے ہیں افسوس پھر بھی زندہ ہیں۔

جبران اپنے افسانوں میں وجود کو دوسروں کی بھلائی اور دوسروں کے کام آ کر بہتر بنانے کا بھی درس دیتا ہے بجائے اس کے کہ ہم ساری عمر دوسروں سے دور رہیں یا دوسروں کو اپنے سے کم تر سمجھیں اور خود کو عقلِ کل جانیں اور دوسروں کی قدر نہ کر سکیں یا پھر اپنے وجود کو ان کے لیے سود مند نہ بنا سکیں۔

اس موضوع پہ جبران کا افسانہ "شروبِ کہنہ" پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ جس میں ایک شخص اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتا ہے اور نہ صرف عقلِ کل سمجھتا ہے بل کہ اپنے پاس رکھی شراب جو کہ نہایت بیش بہا اور قیمتی ہے وہ شراب شہر کے معززین، امرا اور اہلِ علم کو بھی پیش نہیں کرتا کہ وہ ان سب سے بھی اعلیٰ لوگوں کو یہ شراب پیش کرنا چاہتا ہے مگر اس کی وفات کے بعد وہی شراب شہر کے اوباش اور آوارہ لوگ جام بھر بھر کر پیتے ہیں۔ افسانے کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

> "ایک امیر آدمی کو اپنے سرد خانے اور اپنی پرانی شراب پر بڑا ناز تھا۔ اس کے پاس پرانی شراب کا ایک بہت بڑا خزانہ تھا جو کسی خاص تقریب کے لیے جس کا صرف اسے ہی علم تھا۔ سرد آب میں مدتوں سے رکھا تھا۔
>
> شہر کا حاکم اس کے پاس آیا۔۔۔۔ کلیسا کا بڑا پادری اس کی ملاقات کو آیا۔۔۔۔ اس ملک کا شہزادہ اس کے یہاں کھانے پر آیا۔۔۔۔ یہاں تک کہ اپنے بھتیجے کی شادی پر جہاں بڑے بڑے رئیس و امرا مدعو تھے۔ اس نے اپنے آپ سے صرف یہی کہا۔
>
> "نہیں، ان مہمانوں کے لیے ہر گز میں اپنی پرانی شراب کا پیمانہ نہیں کھول سکتا۔""(۱۱۹)

وہ امیر آدمی اپنی شراب ان میں سے کسی کو بھی پیش نہیں کرتا بل کہ وہ ان سب مذہبی، علمی اور معززینِ شہر کو اپنی کہنہ شراب کے پینے کے قابل نہیں سمجھتا۔ مگر ایسا سمجھنے سے انسانی وجود کی تذلیل ہوتی ہے

مگر اس کا اپنا بھی ایک وجود تھا جس کسی دوسرے وجود کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا اور ذلیل ہوا۔ یعنی وہ اپنی شراب نہ کسی کو پلا سکا اور نہ ہی خود پی سکا بل کہ جب مرا تو شراب شہر کے آوارہ اور بد معاشوں نے جام بھر بھر کے پی اور رات بھر مزے لوٹے۔ ایسے وجود کی مثال ایسے ہی سانپ کے جیسے ہے جو ساری عمر خزانے کے اوپر بیٹھا رہتا ہے اور کسی کو خزانہ استعمال نہیں کرنے دیتا اور جب مر جاتا ہے تو وہی خزانہ لوگ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ نہ وہ سانپ خود خزانے کی عظمت کو سمجھتا ہے اور نہ اسے دوسرے کے لیے فائدہ مند بناتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ”ایک بن لکھی رزمیہ“ اس افسانے سے کہیں بہتر وجودی مسائل سے گھرا افسانہ ہے کہ جس میں بہت سے لوگوں کو اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے کی وجہ سے کئی وجودوں کے بے یارو مدد گار ہونے کا سبق ملتا ہے۔ اس افسانے کا کردار پچھوا جو اپنے علاقے قادر پور سے پیار کرتا ہے اور اسی لیے وہ پاکستان بن جانے کے حق میں ہے مگر اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ سیاسی لوگ اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور اس کا علاقہ قادر پور تقسیم کے بعد پاکستان میں نہیں آئے گا۔ مگر جب سب لوگ تقسیم ہو جانے کے بعد بھی قادر پور چھوڑنے کے لیے رضامند نہیں تو ایک دن اچانک ان کے بڑے سیاسی لیڈر نعیم کا پاکستان سے خط آتا ہے کہ میں تو پاکستان آگیا ہوں تم بھی پاکستان آنے کی تیاری کرو وہاں اب کچھ نہیں رہ گیا۔ پچھوا اور اس کے ہم خیال لوگوں کی اپنے علاقے قادر پور کے لیے محبت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”نعیم میاں کے خط سے قادر پور میں ہلچل مچ گئی۔ تیسرے دن منشی ثناء اللہ کا بستر بوریا بندھ گیا۔ اس ہفتے جب پینٹھ لگی تو کباڑیوں کی دکان پر لوگوں کے گھریلو سامان کے اڑنگ لگے ہوئے دیکھے۔ اس اڑنگ میں سید حامد حسن کی نیتی تال کی چھڑیاں قربان علی کے یاں کی شیشم کی چارپائیاں اور منشی ثناء اللہ کے چینی کے برتن خاص طور پر نمایاں نظر آ رہے تھے۔“(۱۲۰)

پچھوا بھی اس ماحول اور پریشانی کے ہاتھوں مجبور پاکستان چلا جاتا ہے مگر پاکستان میں اس سے پہلے آنے والے سیاسی لوگ اور تاجر اپنے ٹھکانے مضبوط کر چکے ہوتے ہیں اور وہ بے یارو مدد گار، روٹی کپڑے کو ترستا بغیر کسی کام کے پاکستان میں ذلیل ہوتا رہتا ہے۔

جبران اور انتظار دونوں کے انافسانوں کی تکنیک تو مختلف ہے مگر ٹریٹ منٹ اور کہانی ایک ہی جیسی ہے کہ کس طرح آدمی جب عقلِ کل ہو جائے تو آخر کار اس پر کیا بیتتی ہے اور لوگ اس کے وجود کو کس طرح نفی کر کے گزر جاتے ہیں۔ وجود کی نفی ہونے اور اپنے تئیں خود کو بڑی چیز سمجھنے کے دھوکے پر لکھے یہ دونوں افسانے شاہکار افسانے ہیں۔ خدا نے انسانی وجود کو بے سود نہیں بنایا اور لہٰذا اسے بے سود کاموں پہ خرچ بھی نہیں کرنا چاہیے یا پھر اسے اہم ترین کاموں پر صرف کرنا چاہیے جن کے مستقبل کا کچھ اندازہ تو انسان کو پہلے سے ہو۔ اپنی دانست میں انسان کیا کا کیا سوچتا رہتا ہے مگر انجام آخر کار کیا ہوتا ہے اس کا اسے اندازہ نہیں ہوتا۔

ہجرت کا غم اور اپنی زمین سے محبت دونوں افسانہ نگاروں کو وطنِ مالوف سے دور بیٹھے اندر ہی اندر گھن لگا کر تباہ کر گئی۔ دونوں افسانہ نگار کہیں نہ کہیں علامتوں اور کنایوں میں اور اشاروں ہی اشاروں میں اپنے غریب الدیار ہونے اور کم تر ہونے اور بکھر جانے کا تذکرہ کرتے ہیں رہتے ہیں کہ پہلے ہم کتنے حسین، جمیل اور رنگین وادیوں میں دلکشی سے جی رہے تھے کہ موسم کی ایک بے درد لہر نے ہمیں کہاں سے کہاں لا پٹکا ہے۔ ایک کو قادشیا کے حسین منظر اور وادی سے اٹھا کر نیویارک جیسے اجنبیوں کے اجنبی اور بے گانے دیس میں اور دوسرے کو ڈبائی گاؤں کے دلفریب محلوں، گلیوں اور چوکوں سے اٹھا کر ایک نئی زمین میں مہاجروں کی طرح غیروں میں رہنا پڑا۔

جبران کا افسانہ "گلِ خزاں رسیدہ" اپنے نام سے ہی دکھ کا مارا اور دکھ سے لبریز افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ جس میں جبران نے ایک موسم کے پھول پر اثرات کا بغور معائنہ اور مشاہدہ کرتے ہوئے علامتی کہانی لکھ کر اپنے دکھ اور غم کا اظہار کیا ہے۔ افسانے میں لکھتے ہیں:

"آج سے ایک روز پہلے وہ اس چمن کا حسین ترین غنچہ تھا۔ بھونرے اس کے گرد بیتابی سے طواف کرتے اور آفتابی کرنیں بار بار اپنی رفاقت کا احساس دلاتیں۔

اس کا ننھا سا قلب صد چاک تھا اور روح فضاؤں میں آوارہ۔

"میری ہستی بے کار ہے۔ غنچہ ہائے نو دمیدہ میں مجھ مردہ کا کیا کام۔" اس نے رنجیدگی سے اک جھرجھری لیتے ہوئے کہا اور ہوا کا شوریدہ جھونکا اس کی باقی پتیوں کو بھی اڑا لے گیا۔"(۱۲۱)

افسانے کے اس اقتباس سے تو یہی لگتا ہے کہ افسانہ نگار اپنا دکھ ایک پھول جس کو خزاں نے چاٹ لیا اور بے دردی سے بکھیر کر رکھ دیا کے علامتی انداز میں بیان کیا ہے کہ جب میری زندگی میں بہار تھی اور خزاں نہ تھی میں بھی ایک پھول کی ہی طرح حسین زندگی گزار رہا تھا مگر میری زندگی میں خزاں کا ایک جھونکا اس پھول کی طرح مجھے تابہ کر کے رکھ گیا اور میں اپنی زمین سے کٹ کر دور سنگلاخ اور بے جان، مصنوعی علاقوں میں آوارد ہوا جس سے میں اندر سے ٹوٹ گیا اور باہر سے بکھر گیا۔

انتظار حسین کے ہاں تو ایسے افسانوں کے حسین مرقعے موجود ہیں کہ جن میں وہ اپنی ذات کے اندر ہجرت کے دکھ کو بار بار بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہجرت سے پہلے یہاں کتنی رونق اور چہل پہل ہوا کرتی تھی اور اب یہاں خاک اڑتی ہے گلیاں بازار ویران ہو گئے ہیں اور لوگ اندر باہر ہر طرح سے توٹ پھوٹ کا نہ صرف شکار ہو گئے ہیں بل کہ ایک خزاں کے شوریدہ جھونکے سے بالکل تباہ اور برباد ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ "چوک" اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے ہجرت کے دکھ کی وجہ سے پہلے کے خوش گوار حالات کا نقشہ نہایت چابکدستی اور مہارت سے کھینچا ہے کہ لوگ بالکل خوش حال تھے اور باہمی پیار اور محبت کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک اس فسادات کے ٹنٹے نے اور ہجرت کے معاملے نے سب کے چہرے مرجھا دیے۔ جہاں لوگ دن رات موج مستی کیا کرتے تھے اور ایک ہنگامہ دن رات جہاں جس چوک میں رہتا تھا وہاں اب بالکل بھی نہ آدم ہے اور نہ ہی آدم ذات۔ بل کہ خاک اڑتی ہے اور

چیلیں کووں کے علاوہ یہاں حویلیوں کے سنسان ہو جانے کی وجہ سے بندر آنکلتے ہیں۔لوگ بے جان اور زندگی سے پریشان اور ایک دوسرے سے ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"چوک کی وہ پہلی سی بات کہاں۔اب تو وہاں خاک اڑتی ہے۔اس کی زمین پر اتنی جھریاں پڑ گئی ہیں کہ صورت بھی نہیں پہچانی جاتی۔جدھر دیکھو کنکر پتھر پڑے دکھائی دیتے ہیں اور پھر جوتوں کے کانے کھدرے تلے، آم کی کالی کالی گٹھلیاں، مرغیوں کے باسی پَر، نیلے پیلے بھدمیلے شیشے، بھینس کے گوشت کی روکھی سوکھی ہڈیاں۔غرض دنیا بھر کا میل کچیل کھنچ کر چوک میں آگیا ہے۔بس وہ مضمون ہو رہا ہے ترازو کی اینٹ چوراہے کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔"(۱۲۲)

جبران اور انتظار دونوں نے اپنی اپنی جگہ نہایت کمال علامتی انداز میں اپنے اپنے دکھوں کا اظہار کیا ہے کہ ہجرت کے بعد تو بالکل ہی ہم اندر سے ٹوٹ گئے اور جینے کی خواہش بالکل ہی ختم ہو گئی۔ایک خزاں ہے کہ ہمارے اندر اور باہر گھومتی رہتی ہے اور ہمیں توڑتی رہتی ہے جھنجھوڑتی رہتی ہے۔جبران نے ایک پھول کی زندگی، اس کا بانکپن اور خوبصورتی کو علامت بنا کر اپنے اچھے دنوں کا تذکرہ کیا ہے اور انتظار نے ایک چوک کی چہل پہل، رونق اور لوگوں کے باہمی میل جول اور پیار محبت کو علامت بنا کر اپنی خوشحالی کے دنوں کو بیان کیا ہے اور اس کے بعد پھول کا بکھر جانا اور چوک کا اجڑ جانا، دونوں کے بیان میں بھی ایک قسم کی بلا کی خوبصورتی ہے مگر جبران جو بات دو صفحوں مین کہہ گئے اس کے لیے انتظار نے چار سے پانچ صفحے لے لیے۔جبران کہانی اور پلاٹ کو طول دیے بغیر مدعا پہ فوکس کرتے ہیں مگر انتظار اپنے خاص مشرقی اسلوب میں کہانی کی جزئیات اور تفاصیل بیان کر کے ہی آگے بڑھتے ہیں۔یوں کہہ لیں تو بے جانہ ہو گا کہ انتظار کہانی کاری میں اس افسانے میں جبران سے آگے اور جبران اپنے موضوع کو بیان کرنے میں انتظار سے ذرا فرصت میں دکھائی دیتے ہیں۔مگر دونوں کہانیاں اپنے عروج پہ دکھائی دیتی ہیں۔

جبران اپنے افسانے "انسان کی تکمیل" مین اپنے دکھ اور ہجرت کی بے بسی کو چھپانے کے لیے خدا کی سب سے اعلیٰ تخلیق کے بننے کے مراحل پہ غور کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے بننے میں جہیاں خدا نے اچھے عوامل کا سہارا لیا ہے وہاں خدا نے اس پر جہالت، قہر اور غضب کی بھی رمق اس کی مٹی میں گھول دی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جبران جیسے اپنے دل کو تسلی دے رہے ہوں کہ انسان کے دنیا میں اس قدر بے باک ہو نجانے اور انسانی وجود کی بے حرمتی کرنے میں انھیں عوامل کا ساتھ ہو۔ خدا نے تمام اچھی اور بری چیزوں کو اسنان کے خمیر میں ملا دیا ہے اور جب انسان کے جسم اور روح کو اکٹھا کیا تو خدا ایک دفعہ ہنسا اور ایک دفعہ رویا بھی۔ تاکہ اندازہ وہ سکے کہ دونوں کیفیات خدا کے علم میں تھیں اور ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"پھر اس پر آسمانی علم اتارا، جو سچائی کے راستوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں ایک بصیرت پیدا کی جو غیر مرئی چیزوں کو دیکھتی ہے۔۔۔۔۔ پھر اسے تمنا کا لباس پہنایا ہے، جسے فرشتوں نے قوسِ قزح کی لہروں سے بنا تھا۔ اس کے بعد اس میں حیرت کی تاریکی پیدا کی۔

اور خداؤں کی خدا نے قہر و غضب کی بھٹی سے "آگ" جہالت کے صحراؤں سے "ہوا" اپنائیت کے ساحل سمندر سے "ریگ" اور زمانے کے قدموں تلے سے "مٹی" اور ان سب کے امتزاج سے انسان کو پیدا کیا۔

پھر اسے ایک اندھی قوت عطا کی، جو "جنون" کے وقت بھڑک اٹھتی اور خواہشوں کے سامنے بجھ جاتی۔ اس کے بعد اس میں زندگی پیدا کی۔ اور وہ موت کا سایہ ہے!" خداؤں کا خدا پہلے ہنسا۔ پھر رو دیا، اس نے محبت کا بے پایاں جذبہ محسوس کیا پھر انسان اور اس کی روح کو آپس میں ملا دیا۔"(۱۲۳)

اس اقتباس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو بنانے میں بھی خدا نے اچھے برے سبھی عوامل کو استعمال کیا ہے اور اتنا سب کچھ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ خدا نے اسے ہنسی خوشی کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی

موت کا دھچکا لگائے رکھا ہے اور اسی وجہ سے اس کی خوشیوں کو عارضی کہا گیا ہے کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انسان کی اس بناوٹ کے بعد خدا ہنسا اور رو دیا جیسے یہ سوچ رہا ہو کہ میں نے یہ کیسی مخلوق بنادی ہے کہ جس کو اتنا حسن، دولت، جاہ و حشمت، کمال، خوشی اور رونق دے کر اچانک موت کا سایہ اور اس کا ڈر بھی دے دیا ہے کہ ایک پل میں زندگی کچھ اور دوسرے ہی پل میں زندگی کچھ اور۔

جہاں رونقیں اور میلے اور جو لوگ جہاں کی زینت ہوں وہیں پہ ان کو تماشا بنا دینا خدا نے انسان کی فطرت میں لکھ رکھ ہے اور اس کے خمیر میں گوندھ دیا ہے۔ اس کے غصے اور قہر کی آگ کا بھی ذکر افسانہ نگار نے کیا ہے جس سے تباہی اور ملکوں کی تقسیم جیسے دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ہر وقت بے یارومدد گار انسانوں کی کہانیاں سمجھنے کا وسیلہ بھی بنا دیا ہے۔

انتظار حسین کی کہانی "اجودھیا" میں اجودھیا کے اجڑنے کا منظر اور پھر اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم انسان کے اسی فطرتی پہلو کی عکاسی کرتا ہے کہ انسان میں کہیں آگ اور جنون کا ایسا ملاپ بھی موجود ہے جو انسان کو انسان سے وحشی اور حیوان بنانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگنے دیتا۔ اگرچہ اس افسانے کا مرکزی کردار پاکستان ہجرت کر کے چلا گیا ہے مگر ابھی تک اس کے اندر وہ اسٹیشن کا منظر کہیں پھنسا ہوا ہے جہاں ٹرین تول کر کب کی پاکستان آگئی مگر اسٹیشن کہیں رک سا گیا ہے۔ اسٹیشن کا منظر کہ قیامت کا نقشہ! اک نظر مصنف کی نظر سے دیکھیے:

> "اسٹیشن۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپنے میں مذہبی کتابوں میں عرصہ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا۔ جہاں عام طور پر سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ اسٹیشن کا کون رخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اڑی لیکن اس روز آدمی پٹا پڑا تھا۔ ایسے ایسے وضع دار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ آج اپنی

ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکایک ایک دن اپنی ڈاڑھی منڈا دے۔ ہر طرف سامان کے اڑنگ کے اڑنگ لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پہ کیفیت یہ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔"(۱۲۴)

اس افسانے میں افسانہ نگار نے خوب مہارت سے انسانی وجود کی تذلیل اور بے حرمتی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ ہجرت کا کرب دکھانے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں جو کہ انتظار حسین کے افسانوں کا سب سے اہم جزو ہے۔ جبران نے جہاں اپنے افسانے میں انسان کے وجود میں پائے جانے والے انھیں عناصر کا ذکر کیا کہ جن سے انسان وحشی بن جاتا ہے تو انتظار حسین کے ہاں ان کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جبران کے افسانے میں سب کچھ ہونے کے باوجود انسانی وجود کو موت کا ایک کھٹکا ہر وقت رہتا ہے تو انتظار کے ہاں بھی اس اقتباس سے ہی موت کے مناظر جھلکنے لگتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انتظار اس افسانے میں جبران سے کہیں آگے نکل گئے ہیں تو بے جا نہ ہو گا کیوں کہ جبران نے صرف ان تخریبی عوامل کا اظہار کیا ہے مگر انتظار نے ان کا استعمال کر کہانی کو اور بھی نکھار بخش دیا ہے۔ اور یہی ایک کہانی کار کہ کہانی کا بہترین اسلوب ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کو بیان کر کے اس کی ترتیب بھی بیان کرے اور ویسا ہوتا اپنی کہانی میں دکھائے بھی، جو کہ انتظار کے ہاں بخوبی نظر آتا ہے۔

جبران نے زندگی کی مختلف شیڈز اور جہات پہ مختلف طریقوں سے روشنی ڈالی ہے اور اپنی کہانیوں اور خیالات سے ایسی ایسی عمدہ اور دلچسپ باتیں پیش کی ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے زندگی کو ایک بے جان اور بے معنی چیز تصور نہیں کیا بل کہ وہ تو زندگی کو ایک نہایت ہی اہم اور دوسروں کے کام آ جانے والی ایسی تخلیق قرار دیتا ہے کہ جس سے انسان تمام عمر کے لیے امر ہو جاتا ہے اور اس کا نام آتشیں حروف میں ہمیشہ کے لیے لکھ دیا جاتا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اسے دیکھ کر پڑھ کر جان سکیں کہ اس شخص نے انسانیت اور آدمیت کے لیے کچھ کیا تھا اسی وجہ سے آج یہ ہم میں زندہ ہے۔

جبران کے ہاں ایک ایسی کہانی "آتشیں حروف" اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آتی ہے کہ جس میں کسی بھی شخص کو زمانے میں جلی حروف سے لکھ کر زندہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسی انسان کو زندگی بعد از زندگی نصیب ہو گی جو دوسروں کے کام آئے گا اور نیک اور اچھے کاموں سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے گا اور اس دنیا میں ہماری زندگی صرف آکر چلے جانے ہی کا نام نہیں بل کہ دوسروں کے فائدے بھی ڈھونڈنے چاہییں۔ لکھتے ہیں:

"کیا انسان اسی طرح رہے گا؟ اس بلبلے کی مثال، جو تھوڑی دیر کے لیے سطح سمندر پر نمودار ہوتا ہے، لیکن جب ہوا کے جھونکے آتے ہیں، تو پھوٹ جاتا ہے۔ گویا کبھی تھا ہی نہیں!

نہیں! اپنی زندگی کی قسم! کبھی نہیں! زندگی کی حقیقت زندگی ہے، وہ زندگی، جس کا آغاز رحم مادر سے ہوتا ہے، نہ خاتمہ قبر میں۔"(۱۲۵)

یعنی نیک کام کرنے والا انسان اور محبتوں پر مبنی روح جبران کے نزدیک مرنے کے بعد بھی اپنی زندگی قائم اور دائم رکھتی ہے اور وک شخص مر کر بھی زندہ رہتا ہے کہ اس کی زندگی کے کارنامے جلی حروف اور آتشیں حروف میں لکھ کر باقی رکھے جاتے ہیں۔ اس کہانی میں اپنے وجود کو معاشرتی لحاظ سے زندہ رکھنے اور دوسروں کے کام آنے کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے جو کہ افسانہ نگار کی بہترین کہانیوں میں سے ہے جس میں انسان وجود کو معاشرے میں بہترین کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں تو ایسے شاہکار افسانے ملتے ہیں جن میں انسانی وجود کو بے کار نہیں بل کہ انسانوں کے لیے کار آمد بنانے کی ترغیب ملتی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود کو بہتر استعمال کرے تو اس کی تخلیق کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور وہ واقعی خدا کا خلیفہ اور نائب بن کر سامنے آتا ہے۔

انتظار کے افسانے ”زرد کتا“ میں انسان کی عظمت اور اس کے بعد اس کے نیک کاموں کی بدولت دنیا میں عزت و تکریم اور اس کے نظاروں کے مناظر ملتے ہیں۔ اس کہانی کو اگرچہ صوفیا کے ملفوظات سے مزین کر کے لکھا گیا ہے اور اس میں انسان کو اس کی عظمت سمجھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کب زرد کتا کب بنتا ہے، یعنی انسانیت سے کب گرتا ہے۔ انسان کے حیوان بننے اور اپنی جبلت پہ قائم رہنے کے لیے نیک کاموں کی طرف ترغیب پر یہ ایک شاہکار افسانہ ہے۔ اس میں شیخ عثمان کبوتر کا ایک مرشد کا کردار ہے کہ جو ہوا میں اڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے تو اس افسانے میں جب راوی اپنے مرشد سے پوچھتا ہے کہ آپ کو اڑنے کی صلاحیت کیسے نصیب ہوئی تو وہ بتاتے ہیں:

”اور ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی، املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالمِ سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے، کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔

میں نے ایک روز استفسار کیا:

یا شیخ قوتِ پرواز آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟ فرمایا:

عثمان نے طمع دنیا سے منہ موڑ لیا اور پستی سے اوپر اٹھ گیا۔

عرض کیا: یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمع دنیا تیرا نفس ہے۔“[۱۲۶]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں طمع دنیا یعنی لالچ سے بچ کر اپنے نفس کو پاکیزہ رکھنے میں ہی انسان کی بڑائی اور عظمت مضمر ہے۔ نہیں تو انسان اپنے نفس کی لالچ اور ہوس میں مبتلا ہو کر انسانیت جیسے عظیم منصب سے گر کر زرد کتا بن جاتا ہے کہ افسانہ نگار کے بقول زرد کتا انسان کا نفس ہے کہ جتنا

اس کو روندا جائے اتناہی موٹا ہو تا جاتا ہے۔اور دنیا کے سفلی مقام سے اوپر اٹھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان نیک کام کرے اور اپنے آپ کو رذیل کاموں میں مشغول نہ رکھے۔

انسان بعض اوقات اپنے انسانیت کے مرتبے سے اس طرح گر جاتا ہے کہ اپنی حیوانی خصلت کی وجہ سے اسے دنیا و آخرت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر اس امر میں دلچسپی یہ ہے کہ اپنے آپ کو انسان اور کامیاب انسان سمجھنے والا شخص بالکل اپنی انسانی حالت سے گر کر کسی جانور کے روپ میں ڈھل چکا ہوتا ہے مگر اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اس قدر پستی میں اتر چکا ہے کہ اب وہ انسان کے روپ میں بھیڑیا اور سور یا گدھا ہے مگر وہ زندہ ہے اور دیکھنے والی آنکھ اسے پستی میں گرا ایک سفلی انسان دیکھ رہی ہے مگر اس آدمی کو کوئی احساس دامن گیر نہیں۔

جبران کے ہاں انسان کے وجود کی تبدیلی اور اس کی رذالت و سفلیت پہ بڑی مزیدار کہانی ''قیدی بادشاہ'' موجود ہے جس میں ایک بادشاہ کو تخت سے اتار کر جیل میں قید کر دیا گیا ہے مگر جب وہ جیل میں پہنچتا ہے تو وہاں پر پہلے سے ایک قیدی موجود ہے جو کہ شاعر بھی ہے،اب افسانہ نگار نے شاعر جو کہ ایک زیرک، بافہم اور سمجھ دار و دانش مند انسان ہے، کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا ہے اور شاعر بادشاہ کو بتاتا ہے کہ باہر رہنے والے لوگ اپنے کردار اور ہنر میں یکتا نہیں بل کہ وہ تو انسانی منصب سے گر کر اپنے وجود کو جانوروں میں ڈھال چکے ہیں مگر انھیں احساس نہیں اور ہم پہ وہ اس لیے غالب آگئے اور ہمیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں وگرنہ ان میں ایسی بہادری بھی نہیں کہ ہم جیسے باکردار اور باوصف انسانوں کا مقابلہ بھی کر سکیں کہ جانور انسان کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔اقتباس دیکھیے:

> ''۔۔۔۔۔۔ان میں بہت سے اپنی بزدلی کی بنا پر خرگوش، بہت سے اپنی مکاریوں کی وجہ سے لومڑی اور بہت سے اپنی خباثت کے سبب سانپ ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس میں خرگوش کی صلح پسندی، لومڑی کی ذہانت اور سانپ کی دانائی ہو۔

دیکھ! اس شخص کو دیکھ! جو اپنی گندگی کی بنا پر، خنزیر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اس کا گوشت اس قابل نہیں کہ اسے کوئی اپنی غذا بنائے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو اپنی بے وقوفی کے اعتبار سے گدھا معلوم ہوتا ہے، لیکن دو ٹانگوں سے چلتا ہے۔

اب اس شخص کو دیکھ! جو نحوست کے لحاظ سے کوا ہے لیکن اپنی کائیں کائیں کو عبادت گاہوں میں فروخت کرتا ہے۔

اور اب اس شخص کو دیکھو! غرور ناز میں طاؤس سے مشابہ ہے لیکن اس کے پَر مانگے تانگے کے ہیں۔"(۱۲۷)

افسانہ نگار نے انسانی کمال چھن جانے کی وجہ سے بعضوں کو لومڑی، خرگوش اور سانپ جیسے ارذل جانور قرار دیا ہے تو بعضوں کو سور، بعضوں کو گدھا اور بعضوں کو مور نما مانگے تانگے کے پروں والا پرندہ قرار دیا ہے۔ یعنی انسان اپنے معیار سے گندگی میں گر ار و سور بن گیا، چالاکی اور ہوشیاری کی وجہ سے لومڑی کا روپ دھار گیا اور مذہب کو بیچنے کی وجہ سے اور اپنے مفاد کے طور پر معبدوں میں لفاظی کرنے کی وجہ سے کوا بن گیا کہ ہر وقت کائیں کائیں کرتا رہتا ہے یعنی کوئی اس کی سنتا نہیں اور وہ اپنے انسان ہونے کے معیار کو بھول چکا ہے۔ افسانہ نگار نے مختصر پیرائے میں بڑی بڑی باتیں کی ہیں کہ انسانیت سے گر کر انسان کسی بھی گندگی کی ڈھیر کی زینت بن کر اپنی سفلیت کو دعوت دے سکتا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی یہی اسلوب ملتا ہے کہ انسان اپنے وجود سے انصاف نہ کرے اور لالچ، ہوس اور حرص میں پڑ جائے تو کس طرح وہ انسانیت کے معیار سے گر کر ایک بندر کے روپ میں ڈھل جاتا ہے جس کے لیے بہترین مثال ان کا افسانہ "آخری آدمی" ہے کہ جس میں انسان کو اپنے معیار سے گر کر اپنے وجود کی عظمت کو ٹھکرانے پر طمع دنیا پر منھ مارنے پر اور خدا سے مکر کرنے کی وجہ سے بندر بنا دیا جاتا ہے اور صرف ایک انسان کے وجود کو نہیں بل کہ پوری کی پوری بستی کو ہی یہ حکم ہو جاتا ہے کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔

"الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بے تحاشا بھاگ چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے (جس میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا تھا)۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے۔ اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔"(۱۲۸)

انسان اپنے وجود کی عظمت سے گرنے اور طمع دنیا میں اپنے ضمیر کو فروش کرنے والا کیسے کتا بن جاتا ہے اور اپنے انسان ہونے کو کیسے ذلیل و رسوا کرتا ہے اس پر انتظار حسین کا بہترین افسانہ "زرد کتا" ہے کہ جس میں انسان، انسان کے وجود سے نکل کر کتے کے وجود میں ڈھل جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے، مگر پھر ایسا ہوا کہ کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آ گئی اور پیروں پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پہ نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ میں نے اسے پیروں سے لاند کر کچل دینا چاہا اور وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے قدموں سے کھوندا اور وہ موٹا ہوتا گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندتا ہوا آگے نکل گیا۔۔۔۔۔ میں تھک گیا اور میں تھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ میں نے بارگاہِ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا۔"(۱۲۹)

جبران کے ہاں انسان اپنے معیار سے گر کر خواہشاتِ نفسانی میں گھر کر گدھا بن کر اپنی دو ٹانگوں پہ چلتا رہتا تو انتظار حسین کے ہاں انسان اپنے معیار سے گر کر بکرا بن جاتا ہے اور وہ بھی دو ٹانگوں پہ چلتا رہتا

ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ "ٹانگیں" اسی موضوع پہ لکھا گیا بہترین افسانہ ہے کہ جب اس میں موجود کردار کو پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اپنے وجود انسانی کے خلاف جا رہا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی بکرے کی ٹانگوں پہ چل رہا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "پچھلے کمرے میں جا کر جہاں روشنی خاصی مدھم تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے شرع کیے۔ کپڑے بدلتے بدلتے اپنی برہنہ ٹانگوں پہ نظر ڈالی اور کسی قدر ٹھٹھکا۔ اس نے تھوڑے شک کے ساتھ پھر اپنی برہنہ ٹانگوں کو دیکھا مگر وہ شک بس شک ہی رہا۔ وہ یہ طے نہ کر سکا کہ یہ برہنہ ٹانگیں اس کی اپنی ٹانگیں ہیں یا بکرے کی؟"(۱۳۰)

انتظار حسین کے ہاں بھی مذہبی لوگوں پر شدت سے تنقید ملتی ہے کہ جنھوں نے اپنے مقصد کے دین کو استعمال کیا اور اپنے علم کو دنیا کی لالچ اور ہوس میں بے دریغ استعمال کیا۔ "زرد کتا" میں اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

> "پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔"(۱۳۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ جو لوگ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور اپنے علم کو پھر بیچتے ہیں انھیں اس غلط کام سے بچنا چاہیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہیں اور ان پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ ایک تو انسان اور پھر پڑھا لکھا انسان ایسا کیسے کر سکتا ہے؟

آدمی کی جون سے مکھی کی جون میں تبدیل ہونے کا نظریہ بھی انتظار حسین کے پاس موجود ہے اقتباس دیکھیے:

> "اس نے اپنے آپ کو بار بار دیکھا اور کہا میں آدمی نہیں ہوں۔ تو پھر میں مکھی ہوں؟ مگر اس وقت وہ مکھی بھی نہیں تھا۔ تو میں آدمی بھی نہیں ہوں، میں مکھی بھی نہیں ہوں۔ پھر

میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں، اس خیال سے اسے پسینہ آنے لگا اور اس نے سوچا کہ نہ ہونے سے مکھی ہونا اچھا ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا کہ آج اس کے خیال کی روڈوبتی نبض کی مانند رک رک کر چل رہی تھی۔"(۱۳۲)

یعنی جبران اور انتظار حسین دونون افسانہ نگاروں کے ہاں یہ تصور ملتا ہے کہ جب انسان اپنے معیار اور اپنے منصبِ عظیم سے گرتا ہے تو اس کا وجود انسان کا وجود نہیں رہتا بل کہ اس کی گراوٹ کے لحاظ سے وہ مختلف سطحوں تک مختلف جانوروں اور پرندوں اور حشرات میں ڈھل جاتا ہے۔ جبران کے ہاں وہ کبھی گدھا، کبھی سور، کبھی کوا، کبھی لومڑی، خرگوش، سانپ اور کبھی کبھی مور بھی بن جاتا ہے۔ اور انتظار حسین کے ہاں کبھی بندر، کبھی بکرا، کبھی کتا، کبھی مکھی اور کبھی مور اور کبھی دوسرے کسی جانور کی جون میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

خلیل جبران ہو یا انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں مذہبی اقدار کے حوالے انسانی وجود کی اہمیت، قدر، حیثیت کو جاننے اور پہچاننے کے لحاظ سے پر مغز خیالات اور جملے ملتے ہیں اور پھر اپنے معیار سے گرنے اور ناجائز کاموں میں لالچ و ہوس کی بنیاد پر انسانی وجود کی تذلیل کرنے کی بنا پر آدمیت سے گر کر دوسرے جانورانہ وجودوں میں ڈھلنے کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ جبران کا اسلوب ذرا فلسفیانہ اور منطقی ہے جس میں وہ سیدھے سیدھے انداز میں کہانی کہتے کہتے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہیں کہیں علامت اور تمثیل لے کر آتے ہیں جس پر کہانی کے پیچ کم اور سادگی زیادہ غالب نظر آتی ہے۔ مگر انتظار حسین کا اسلوب اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ کہانی کو بیان کرتا ہے اور علامت، ہجرت کا دکھ، تمثیل، ملفوظات اور قرآنی حوالے مل ملا کر دل کش کہانی تشکیل دیتے ہیں جس سے کہانی ایک عام سطح سے اٹھ کر اعلیٰ قاری کی سطح تک پہنچ جاتی ہے۔ جو کہ انتظار حسین کا خاصہ ہے۔

ii. انسانی زندگی کا مقصد

دنیا میں تخلیق ہونے والی کسی بھی چیز کا مقصد ضرور ہے اور کوئی بھی چیز اس کارخانے میں بغیر مقصد کے یا پھر نکمی خدا نے پیدا نہیں فرمائی۔اس لیے کائنات کی ہر چیز اپنے مقصص کو پورا کرنے میں دن رات کوشاں ہے اور اسی مقصد کے تناظر میں اس کی دنیا اور اس کائنات میں عزت اور اہمیت ہے۔اگر چاند سورج اپنے مقصد سے روگردانی کریں گے تو یقیناً ہمیں بہت بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ یہ کائنات پھر سورج چاند کے متبادل کوئی اور چیز تخلیق کر لے یا پھر کرنے کی کوشش کرے کیوں کہ انسان کا مزاج اور فطرت کی کارفرمائی تو یہی ہے کہ جو بھی چیز اپنا مقصد پورا نہیں کرتی اسے نکال باہر کیا جاتا ہے اور اس کا متبادل ڈھونڈ کر پہلے والے کا کام اس نئ تخلیق سے لیا جاتا ہے۔

انسان بھی اللہ تعالٰی کی تخلیق ہے اور اس تخلیق کو خدا نے کہا بھی سب سے افضل،اعلیٰ اور اشرف تخلیق ہے، جس سے ہمیں بنظرِ طائر بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انسان کی ذمے داریاں اور مقاصد بھی دوسری مخلوقات سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ مگر انسان اور دوسری مخلوقات میں ایک فرق عقلِ سیلم کا ہونا اور نہ ہونا ہے۔یعنی انسان اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے زمانے کا ولی بھی بن جاتا ہے اور زمانے سے راندہ ہوا اور بھٹکا ہوا مسافر بھی بن سکتا ہے۔اس عقلی تسلسل کی وجہ سے جب انسان اپنے آپ کا صحیح استعمال نہیں کرتا تو یہ زمانے کا باغی اور خدا کے بنائے ہوئے قوانین کا کھل کر منکر بن جاتا ہے۔جس کے تناظر میں اہل علم اور دانش ور اپنے ملفوظات،فرمودات اور اپنی بساط بھر دانش کے مطابق اسے دوبارہ خدا کی راہ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اس کا بھولا ہوا سبق بھی یاد کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔جس وجہ سے وعید کے ساتھ ساتھ وعدوں کی بھی یقین دہانی کروائی جاتی ہے۔خوشی کی امید بھی لگائی جاتی ہے اور دوزخ کے عذاب سے بھی ڈرایا جاتا ہے کہ کسی بھی طرح انسان سیدھی راہ پہ آجائے۔اسی تناظر میں خلیل جبران اور انتظار حسین جیسے نابغہ روزگار نے شاہکار افسانے لکھے ہیں کہ جن کو پڑھ کر یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کہیں دنیا کی رنگارنگی میں اپنا مقصدِ دنیا بھول گیا ہے اور دنیا کی چاندنی میں کھو گیا ہے جو کہ ہے ہی چار دن کی۔

خلیل جبران کے افسانوں میں بھی ایسے خیالات ملتے ہیں کہ جن میں وہ ایک کہانی کے ذریعے اور مختلف کرداروں کے ذریعے زندگی کے مقصد کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ "پروانہ سے" میں افسانہ نگار نے نہایت ہنر مندی اور اپنے ادبی فن کہ مہارت سے ایک ادنیٰ سے کیڑے سے زندگی کی مقصدیت کو واضح کیا ہے کہ وہ ہے تو پروانہ اور اسے یہ بھی خبر ہے کہ میں نے زیادہ دیر نہیں جینا اور جلد ہی مر جانا ہے اور میرا مقصدِ زندگی بھی ایک شمع کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر فنا ہو جانا ہے مگر وہ اپنی زندگی کی پرواہ کیے بغیر اپنے مقصد کو نبھاتا چلا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"شب کی تاریکی میں لپٹی ہوئے ہر شے غرقِ خواب نوشیں ہے لیکن تیرے لیے شاید نیند کا نام عنقا ہو گیا۔ تیرے شاندار قافلے کے ہم سفر لحہ بہ لحہ کم ہو رہے ہیں لیکن تجھ پر کوئی اثر نہیں۔ اس قدر غرقِ یم خیال کہ اپنے آپ تک کا ہوش نہیں۔

جانباز پروانے! شعلہ بار آتشیں لَو پر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر لپکنا اور بیک ثانیہ بے جان ہو کر محبوب کے قدموں پر گر پڑنا۔ کیا تیری اصطلاح میں انجامِ حیات اسے ہی کہتے ہیں کہ شمع کے اندر اندر گھلنے کا دلسوز منظر برداشت سے باہر ہے۔"(۱۳۳)

انسان تو ایک اعلیٰ وارفع مخلوق ہے کہ جس کا مقصد تو کسی بھی اور مخلوق سے زیادہ اور اچھا ہے کہ دنیا میں وہ اللہ کا نائب اور خلیفہ بن کر تشریف لایا ہے۔ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی رات کے اندھیروں میں ہر شے خوابِ خرگوش کے مزے لیتی ہے اور استراحت فرماتی ہے مگر اس پروانے کو اپنی زندگی کا مقصد اتنا عزیز ہے کہ دنیا ومافیہا سے بیگانہ ہو کر شمع کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے اور اپنے دل کو سکون بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ حالانکہ تیرے ساتھ آنے اور چلنے والے لوگ کہیں پیچھے رہ گئے ہیں اور تو اکیلا ہی آگے منزل کو رواں دواں ہے۔ اگر شمع سے محبت اور پروانے کا اس کے گرد چکر کاٹ کاٹ کر فنا ہو کر اسی کے قدموں میں گر کر فنا کی منزل کو چومنا ہی مقصدِ حیات ہے تو واقعی پروانہ علامتی سطح پر کسی بھی انسان کے لیے بہت کچھ سیکھنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی مقصدِ زندگی کو سمجھنے اور اپنی زندگی کے مقصد کو پسِ پشت ڈال دینے اور اس کے انجام کے متعلق کئی ایک افسانے اور خیالات ملتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر اور علامتوں کو سمجھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بے مقصد جینا بھی کوئی جینا ہے وہ تو جانور ہم سے بہتر جی لیتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے "شرم الحرم" میں ایسے ہی ایک مردِ مجاہد اور مردِ ہمت کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنے مقصد کے لیے جان دیتا ہے مگر پیچھے نہیں ہٹتا۔ افسانے میں دنیا کے اندر مسلمانوں کے زوال کو موضوع بنا کر بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً مصر کے وزیرِ اعظم جناب عبدالناصر کو اپنے مقصد کے حصول میں مر مٹنے والوں کے لیے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہ جس کے بعد مسلمانوں میں شاید کوئی مردِ میدان نہیں رہ گیا کہ لوگ اس کی صفت پہ چل سکیں اور دشمنوں کا للکار سکیں تو ہر طرف اس کو ہی پکار دی جا رہی ہے:

> "بچھرے ہوئے مجمعے میں سے ایک شخص چلایا: "عبدالناصر کی ماں عبدالناصر کے سوگ میں بیٹھے! کیا وہ ہم سے تلواریں نیام میں ڈالنے کو کہے گا۔"
>
> تب صاحبِ ریش اعرابی نے زاری کی اور کہا کہ "ہم سب عربوں کی مائیں ہمارے سب کے سوگ میں بیٹھیں کہ تلواریں ہماری کند ہو گئیں اور ہم نے انھیں نیاموں میں ڈال لیا۔"
>
> "عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟" چلانے والے نے چلا کر پوچھا۔
>
> عرب کا بہادر بیٹا؟ سب ٹھٹک گئے۔ متعجب ہوئے۔ ہاں! عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟ پھر ایک آواز ہو کر چلائے: "عرب کا بہادر بیٹا کہاں ہے؟ عرب کے بہادر بیٹے کو باہر لاؤ!"(۱۳۴)

مگر اب کوئی شخص ہم میں موجود نہیں جو زندگی کے مقصدِ جہاد کو سمجھ سکے اور ہمیں حکم کرے کہ تلواروں کو نیام سے نکالو اور آگے بڑھ کر دشمن پہ ٹوٹ پڑو۔ زندگی کا مقصد مسلمان ہونے کے ناطے تو خدا کے

دین کی سر فرازی ہے اور یقیناً ہم اسی لیے مسلمان ہیں اور اسی لیے نمازی ہیں۔ جہاں زندگی کے مقصد میں نیکو کار ہونا ہے تو نیکو کاری میں دوسروں کو دشمنوں سے اور اذیتوں بچانا بھی شامل ہے۔

دونوں افسانوں میں زندگی کے مقصد کے حصول کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے کی ترغیب ملتی ہے اور جان سے گزرنا بھی مقصد کے حصول میں نہایت چھوٹی مگر اہم چیز ہے۔ جبران نے اپنے افسانے میں پروانے کے ذریعے ہمیں سمجھایا ہے کہ مقصد کے حصول کے لیے جان سے بھی گزرنا کوئی بڑی بات نہیں اور انتظار نے بھی یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح عبدالناصر نے دشمنوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے بہتر سمجھا کے اپنے مقصد کی خاطر جان دے دی اور اسی لیے تو سارے لوگ ویسے ہی بہادر کو یاد کر رہے ہیں اور یاد کر کے رو رہے ہیں۔ جبران کی کہانی یک سطحی ہے مگر انتظار کی کہانی میں پورے عرب اور پھر ساری مسلمان امت کو ایک درد بھری آواز میں مدد اور بہادری کی پکار دی ہے کہ ہے کوئی مردِ مومن، کوئی مردِ مجاہد اور مردِ خدا باقی نہیں رہا جو ان کفار ظالموں سے اور دجالی قوتوں سے مسلمانوں کو چھڑوائے اور آزاد کروائے۔ اس لحاظ سے انتظار کا افسانہ جبران کے افسانے اور اسلوب سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔

جبران نے اپنے افسانوں کے ذریعے زندگی کے اعلیٰ مقصد کو کامیابی سے پورا کرنے اور اس کے حصول کے لیے جہاں دلکش افسانوی مرقعے پیش کیے ہیں وہاں افسانہ نگار نے ایسے بھی شاہکار تخلیق کیے ہیں کہ جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار زندگی کے مقاصد میں تفریق بھی کرتا ہے کہ کچھ مقاصد بڑے اور عظیم ہوتے ہیں اور کچھ مقاصد بالکل ادنیٰ اور فرضی ہوتے ہیں مگر ہم بڑے مقاصد کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے مقصدوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور انھیں میں اپنی جان کھپا دیتے ہیں۔

اسی ضمن میں جبران کا افسانہ ”جل پریاں“ تمثیلی انداز میں خوبصورت افسانہ ہے کہ جس میں ایک سمندر کے کنارے چند جل پریاں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں کہ آج ان کو ایک نوجوان کی لاش ملی ہے جس کو دیکھتے ہوئے وہ قیاس آرائیاں کر رہی ہیں۔ ان قیاس آرائیوں میں ہی مصنف نے اپنے نکتہ نظر کو پیش کر دیا ہے۔ آدمی بلاوجہ جنگوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ اگر وہ ان جنگوں کو چھوڑ دے اور امن سے رہے تو کیا مضائقہ

ہے مگر وہ امن قائم کرنے کے لیے مسلسل جنگیں کر رہا ہے اور کرتا جا رہا ہے جس میں کئی نوجوان شہید ہوتے جا رہے ہیں مگر وہ اپنی انھیں حرکتوں سے بعض نہیں آ رہا۔ اگر کہیں وطنیت کی بات ہے تو اس کے لیے امن کے راستے بھی نکالے جا سکتے ہیں اور ایک میز پہ بیٹھ کر بھی بات ہو سکتی ہے۔ یعنی اس چھوٹے سے مقصد کے لیے کئی کئی نوجوانوں کو جنگوں کا ایندھن بنا دینا اور پھر یہ بھی اندازہ نہیں کہ یہ جنگیں کب تک چلیں گی جب کہ پہلے ہی بہت خونریزی ہو چکی ہے۔ ایک جل پری کا تبصرہ دیکھیے جو لاش کو دیکھ کر اس کی شناخت کرنے کی کوشش کر رہی ہے:

"ایک بولی:

"یہ آدمی کل اس وقت پانی میں اترا تھا، جب سمندر بپھرا ہوا تھا۔"

دوسری نے کہا:

"سمندر تو بپھرا ہوا نہیں تھا، ہاں! انسان ۔۔۔۔۔ جو اپنے تئیں دیوتاؤں کا جوہر سمجھتا ہے۔ ایک خوف ناک جنگ میں مبتلا ہے، جس میں اب تک اتنی خوں ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی اسی جنگ کے مقتولوں میں سے ہے۔"""(۱۳۵)

اقتباس سے یہ بات تو سامنے آ رہی ہے کہ انسان بلا شبہ خدا کا نائب اور خلیفہ ہے اور یہ دنیا میں دیوتاؤں کا مظہر ہے مگر یہ اس مظہر کی صفات خود میں بھرنے اور ظاہر کرنے کے بجائے مختلف دنیاوی مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ جن کو کسی بھی مختصر سے حوالے اور حیلے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اسی افسانے میں انسان کو انسان کا نہ صرف قاتل کہا گیا ہے بل کہ انسان کو انسان کی محبت کا بھی قاتل کہا گیا ہے اور امن کے مقصد کو قائم کرنے کی جو علت اس افسانے میں پیدا کی ہے اس کے لیے جبران نے اس لاش کی جیب میں پڑے خط سے واضح کی ہے جو ان میں سے ایک کو لاش کی دل کے پاس والی جیب میں ملتا ہے۔ امن اور محبت کا قاتل انسان ہی ہے، خط کے متن سے ایک ٹکڑا دیکھیے:

"جب محبت نے ہمارے دلوں کو ایک کیا تھا، تو ہمیں امید تھی، ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح گردش کرے گی۔

اچانک جنگ نے تمھیں پکارا تم "فرض" اور "وطنیت" کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

یہ کون سا "فرض" ہے، جو دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دے، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دے؟

یہ کون سی "وطنیت" ہے، جو معمولی معمولی باتوں پر شہروں کو تباہ و غارت کرنے کے لیے جنگ برپا کر دے؟"(۱۳۶)

اصل میں اس خط کے درپردہ جبران اپنا نکتہ نظر پیش کرنا چاہ رہا ہے کہ جنگوں کا ماحول کسی بھی انسان کو کھا جاتا ہے اور محبت بے چاری بلکتی اور سسکتی ایک کونے میں اپنا مدفن بنا لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سپاہی کی محبوبہ یا پھر اس کی بیوی نے اسے گھر سے اسی جنگی محاذ پر خط لکھا ہو جس میں وہ اپنی ادھوری محبت کی ملاقات بھی یاد کروا رہی ہے اور یہ بھی کہہ رہی ہے کہ یہ کیسی وطنیت یا پھر فرض کی ادائیگی ہے کہ جس میں ایک محبوب اپنے محبوب سے جدا ہو کر رہ جائے۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے شہر کے شہر غارت کر دیے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کے ہاں تو ایسے افسانوں کی بھرمار ہے کیوں کہ انھوں نے عمر بھر ہجرت کو اپنا موضوعِ افسانہ بنائے رکھا اور فسادات کی وجہ سے ہونے والی تباہی کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی کہ جس میں بھائی بھائی کا پتا نہ رہا اور اکٹھے ایک جگہ پہ رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن گئے اور معاملہ یہاں بھی زمین کے حصول کا ہی تھا۔ انتظار کا المیہ بھی یہی ہے کہ لوگ اپنا اصل مقصد بھول گئے وہ پیار محبت کی سنگتیں اور اکٹھے کھیلنا کودنا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پہ لطف اندوز ہونا۔ مگر فسادات کے بعد تو جیسے سبھی ایک دوسرے سے پرائے ہو گئے۔ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہنے لگے۔

انتظار حسین کے پاس تو ایسے کئی افسانے ہیں جن میں جنگ کی ہولناکیاں بخوبی بیان ہوئی ہیں اور جن سے ان کے دل اور جگر پر جنگ کے زخموں کو دیکھا جا سکتا ہے اور ہجرت کے کرب نے انھیں کس قدر ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کا افسانہ "استاد" اس موضوع پہ بہترین مثال ہے کہ استاد کی ہستی ایک عظیم ہستی ہوتی ہے اور ایسا ہی رتبہ اور شان ان کو اپنی بستی میں حاصل تھا کہ ان کا فرمایا ہوا سند اور حرفِ آخر مانا جاتا تھا کہ بڑے سے بڑے بستی کے فیصلے انھیں کی حویلی میں طے ہوتے تھے اور ان کی ایک عظمت، شان اور رعب تھا:

"استاد کا زمانہ بس دیکھنے کے لائق تھا۔ سارے شہر میں ان دھاک تھی۔ بڑے بڑے تیس مار خانوں کا ان کے نام سے دم خشک ہو تا تھا اور رئیسوں کی تو کبھی انہوں نے ہستی ہی نہیں سمجھی۔ جس کسی نے ذرا اکڑ تکڑ کی اس کو بیچ بازار میں جوتے لگوادیے۔ رئیسوں ہی پہ کیا ہے افسروں سے بھی وہ دب کے تھوڑا ہی رہتے تھے۔"(۱۳۷)

وہ شخصِ معتبر کہ جس کا رکھ رکھاؤ تھا اور شہر بھر میں ایک دھاک تھی وہ شخص اس جنگ کے ادنیٰ سے مقصد کے پیچھے کیسے ذلیل ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر چہ یہ افسانہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے جس میں پلاٹ کے اندر کوئی علامت یا گھمبیر تا بھی نہیں مگر پھر بھی یہ افسانہ پڑھنے والے کو چھوٹے اور بڑے مقصد میں فرق بخوبی سمجھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیسے کیسے بڑے لوگ ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ فسادات کے بعد استاد کی حالت ایسی ہو جاتی ہے:

"چاروں طرف خون خرابہ ہو تا رہا، آگیں لگتی رہیں مگر بڑی حویلی کی طرف کسی نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ یہ فساد تو ختم ہو گیا۔ لیکن قیامتیں تو اس کے بعد بھی آئیں اور ایسی قیامتیں آئیں کہ بڑی حویلی کی بنیادیں ہل گئیں۔ ہاں نہ ہلے تو استاد اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ایک بڑی حویلی پہ کیا موقوف ہے دنیا ادھر سے ادھر ہو گئی۔ زمانہ دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ محلے خالی ہونے لگے۔ بھری بستیاں اجڑنے لگیں لوگ ایمان بچانے کے بہانے

جانیں بچا بچا کر لے گئے۔ استاد نے اسی چبوترے پہ بیٹھ کے کربلائیں بھی ہوتے دیکھیں اور میلے بھی ڈھلتے دیکھے۔"(۱۳۸)

استاد بے بسی اور افسردگی کی علامت بن کے رہ گیا۔ فسادات سے پہلے یہی استاد اپنے معاشرے کی عزت اور زمانے کی پہچان تھا مگر اس جنگی فسادات نے استاد اور اس کا زمانہ سبھی کچھ اجاڑ کر رکھ دیا۔ خون خرابہ بھی ہوئے اور لوگ ایک دوسرے سے دور بھی ہوتے چلے گئے۔

جبران کا افسانہ اپنی بنت اور اسلوب کے لحاظ سے تمثیلی ہے جس سے بات بخوبی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتظار حسین کا افسانہ اگرچہ ایک سیدھی سی کہانی ہے جس میں جنگ سے پہلے اور بعد کے حالات کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور استاد ان دونوں حالات کی ایک علامت بن کر سامنے آیا ہے اور نہ جانے کتنے ہی استاد ایسے ہوں گے جو اس پاک وہند کی علیٰحدہ ہوتی ریاستوں کی جنگ میں کام آئے ہوں گے اور کتنے ہی ہوں گے جو بے گھر ہو گئے ہوں گے۔ زمانے نے ایسے تمام لوگوں کی یادوں پر دھول اڑا کر ان کو گرد سے اٹا اٹ بھر دیا ہے۔ دونوں افسانہ نگار اپنے اپنے اسلوب میں ایک ہی موضوع کو بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ کبھی بھی کسی بھی ملک کے عوام جنگ نہیں چاہتے اور امن کے داعی ہوتے ہیں مگر ہمارے بڑے اور سیاسی لوگ ان قباحتوں سے باز نہیں آتے اور جنگ کا ماحول بنا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ عوام ہمیشہ محبت اور پیار سے رہنے کے حق میں ہوتے ہیں۔ کوئی محبوب کا خط جیب میں رکھے ساحلوں پہ مرا ہوا ملتا ہے تو کوئی اپنوں کے بچھڑ جانے کی وجہ سے چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے اور آخر کار داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے اور اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان محبت اور امن کا پیامبر ہے اسے جنگی مقاصد سے ہر حال میں گریز کرنا چاہیے۔

انسان دنیا میں آیا تو پاکیزہ دامن لے کر تھا اور آج بھی انسان پیدائشی طور پر ہر مذہب اور فرقے کے لحاظ سے گناہوں سے پاک ہی ہوتا ہے مگر زمانے کی آلائشیں اسے روک لیتی ہیں اور وہ ان مسائل میں الجھ کر تنگ و تاریک گناہوں اور عیبوں کی گھاٹیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ جن میں ایک سب سے بڑا عیب غلامی ہے جس میں انسان کا جسم تو کجا اس کا ذہن اور دماغ بھی اپنے نفس اور دوسری طاقتوں کے ہاتھوں قید ہو جاتا

ہے۔ جبران نے اس موضوع پر ایک کہانی لکھی ہے جس کا عنوان بھی ”غلامی“ ہی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک انسان غلام ذہنیت اور غلام بدن سے کوئی مقصد بھی پورا نہیں کر سکتا بل کہ وہ اپنے مقصد کو اور فرض کو ادا کرنے کا بھی نہیں سوچ سکتا۔

اس افسانے میں مصنف نے انسان کی حالت کے مطابق بہت سی غلامیوں کا ذکر کیا ہے جس میں کبڑی غلامی، سوچ کی غلامی، عقل کی غلامی، لنگڑی اور ذہنی غلامی کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور پاؤں کی غلامی بھی شامل ہے۔ جس میں جبران نے نہایت اعلیٰ طریقے سے آزادی کی تڑپ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک آزاد ذہن ہی آزاد مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشش کر سکتا ہے۔ سارے افسانے میں غلامیوں کی اقسام پہ دلچسپ تبصرے کرنے کے بعد آخر پہ آزادی کی حالت پہ دلسوز تبصرہ کرتا افسانہ نگاریوں طنز کرتا دکھائی ہے:

”جب میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا جہاں گزرے ہوئے زمانہ کے سائے روپوش اور آنے والے زمانے کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ وہاں میں نے دیکھا ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تُو کون ہے؟ اور تیرا نام کیا ہے؟“

جواب دیا۔

”آزادی!“

میں نے پھر سوال کیا۔

”اور تیرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بیٹے کہاں ہیں؟“

”ایک سولی پر چڑھا دیا گیا اور دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا۔“

یہ کہا اور کہہ کر پیچھے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔“(۱۳۹)

اس افسانے کے ڈرامائی اختتام پر یہ نکتہ بھی کھل کر سامنے آتا ہے کہ جو شخص اپنے مقصد کی تکمیل چاہتا ہے اسے قربانی بھی دینی پڑ سکتی ہے، اگر ہوش مند رہا اور کچھ کر نہ سکا تو ضرور پاگل ہو جائے گا اور حالات کا کبھی بھی سامنا نہیں کر سکے گا۔ یا پھر مقاصد کی تکمیل کے لیے نئی نسل میں اپنے خیالات کو اتارے گا تا کہ اس کا مقصد لے کر آگے بڑھتے چلے جائیں۔

انتظار حسین کے ہاں ذہنی اور ضمیری غلامی پر مبنی کئی ایک افسانے دیکھنے کو مل جاتے ہیں جس میں بنیادی کردار ایسے ہی اپنے اپنے نفس کے ہاتھوں بک چکے ہیں اور ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور ان پر نفسِ امارہ غالب آ چکا ہے اور کرداروں کو اپنی اپنی بقا کی جنگ بھی لڑنی پڑ رہی ہے۔ اس سلسلے میں انتظار کا افسانہ آخری آدمی بہترین افسانہ ہے کہ جس میں ایک پوری بستی اپنے نفس کی غلامی میں مبتلا ہو کر خدا کے عذاب میں بندر بن چکی ہے اور اب آخری آدمی بھاگتا پھر رہا ہے کہ مجھے خدا کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے مگر اسے کہیں بھی جگہ نہیں ملتی اور بستی سے بھاگتا ہوا دور آجاتا ہے اور وہ بھی اپنے مکر، فریب اور لالچ سے نفس کا غلام بن چکا ہے اور اپنے ضمیر کو بیچ کر ایک غلام صفت ہو گیا ہے اور آخرکار وہ بھی اپنی قوم کی طرح بندر بن جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”الیاسف نے اپنے بد ہئیت اعضا کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا میں، میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے اس کا دل ڈھینے لگا۔“(۱۴۰)

یہ افسانہ انتظار حسین کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے جس کی علامت نے اس کی کئی ایک تعبیریں اہلِ علم اور دانش پہ واضح کی ہیں۔ اس افسانے میں جہاں لالچ، بغض، حسد، ہوس، مکر اور فریب کو نشانہ بنا کر نفسِ امارہ کی نفی کی گئی ہے اسی طرح اس افسانے میں انسان کو اپنے ضمیر کا غلام بھی دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے نفس کے ہاتھوں قید بھی ہے جس سے اس کا مزاج، عادت اور چہرہ تک بدل رہے ہیں کہ زمانے پہ اس کے

گناہوں کا راز نہ فاش ہو جائے اس لیے وہ بھاگتا ہوا اپنے ضمیر کو آزاد کروانا چاہ رہا ہے مگر اسے کہیں بھی چارہ نہیں ملتا اور آخر کار وہ اسی غلامی کی زندگی میں نفس یعنی اپنی اندر بیٹھے زرد کتے کے ہاتھوں اسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ بھی غلامی کی ایک قسم ہے۔

جبران کا افسانہ سپاٹ اور پہلو داری سے عاری افسانہ ہے کہ جس میں فلسفیانہ موشگافیاں تو ہیں مگر کہانی والی گیرائی اور گہرائی موجود نہیں۔ علامت کوئی نہیں بل کہ سیدھی سادی کہانی ہی کہانی ملتی ہے مگر انتظار کا افسانہ جبران سے کہیں بلند پائے کا افسانہ ہے کہ جس میں تہہ در تہہ کئی کہانیاں کھلتی چلی جاتی ہیں اور پھر ہر تہہ کا اپنا ایک پہلو ہے کہ جس میں کہانی کو ایک نئی جہت مل جاتی ہے کہ اس افسانے سے ہم نے نفس کی غلامی جیسی اصطلاح بھی اخذ کر سکتے ہیں۔

زندگی کے مقصد کا تعین ہونا اور پھر اس پر صراطِ مستقیم کی طرح عمل کرنا مقصد کے حصول میں اہم ترین بات ہے۔ جبران کا افسانہ "تیراک" اسی موضوع پہ اہم ترین افسانہ ہے کہ جن لوگوں کو اپنے مقصد کا تعین اور پیار ہوتا ہے وہ کم عقل، کم علم اور کم وسائل کے باوجود اپنے مقصد کو حاصل کرتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں دو تیراکوں کو دکھایا گیا ہے جن میں سے ایک تیراکی جانتا ہے اور دوسرا نہیں جانتا۔ مگر جب دونوں دریا پار کرتے ہیں تو تیراکی نہ جاننے والا دریا عبور کر جاتا ہے اور جو تیراکی جانتا ہوتا ہے وہ دریا میں ڈوبنے لگتا ہے اور وہی تیراکی کا علم نہ رکھنے والا اسے بچاتا ہے۔ تو تیراک اس سے سوال کرتا ہے کہ تمھیں تو تیراکی نہیں آتی تھی تو اس پر دوسرا بتاتا ہے کہ اسے اس کا مقصد عزیز تھا اور گھر والوں کی فکر دامن گیر تھی بس انھیں کے خیال اور محبت میں ایک طرف توجہ کرتے ہوئے میں نے دریا عبور کر لیا۔ گفتگو ملاحظہ کیجیے:

"۔۔۔۔۔۔ کنارے پر پہنچ کر اپنے ساتھی سے بولا۔

"دوست تم تو بتا رہے تھے کہ تم نے کبھی پانی کا منھ تک نہیں دیکھا۔ مگر دریا تو اس بے تکلفی سے پار کیا ہے کہ میں بھی حیران ہوں۔"

دوسرے نے کہا۔

”بھائی تم شاید میرے اس کمر بند کو نہیں دیکھ رہے۔اس میں اشرفیاں بھی بھری ہوئی ہیں اور انھیں میں نے اپنے بیوی بچوں کے لیے ایک ایک کر کے جمع کیا ہے۔

میری سال بھر کی کمائی!

اور یہ اسی طلائی کمر بند کا بوجھ تھا۔جو مجھے دریا کے پار لے آیا،دریا کے اس کنارے سے اس کنارے پر،میری بیوی اور بچوں کے پاس۔۔۔!جب میں دریا میں تیر رہا تھا۔تو میری بیوی اور میرے بچے میرے کندھوں پر تھے۔“““(۱۴۱)

اندازہ کریں کہ مقصد کا تعین انسان کو بڑی سے بڑی مصیبت میں سہارا دیتا ہے نہ کہ گھبراہٹ طاری کر دیتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ مشکل میں گھبرانا مشکل کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اور مشکل میں ہمت سے کام لینا آدھی مشکل کو ختم کر دیتا ہے۔انسان کو اپنی زندگی کے مقصد کا تعین نہ ہو تو تباہی اور ذلالت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔تیراکی نہ جانتے ہوئے دریا میں کود جانا کوئی اچھی بات نہیں بل کہ ایک طرح سے حماقت ہے۔مگر اس کے علاوہ اگر کوئی اور حل موجود نہ ہو اور آپ کو اپنے مقصد کی اور جانا بھی ہو تو پھر دشت تو دشت ہیں دریاؤں کا سینہ چیر کر بھی منزل کی طرف بڑھنا پڑتا ہے اور پھر مقصد ہی آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔مقصد بوجھ نہیں ہوتا بل کہ ہمت،حوصلہ اور منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔

انتظار حسین کی کہانی ”دوسرا گناہ“ اگرچہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرنے کے ضمن میں لکھی گئی ہے مگر اس کہانی میں ہمیں ایک ایسے خاندان اور گھرانے کا بھی پتا چلتا ہے کہ جن کی زمین قحط کی نظر ہو گئی اور وہ اپنے علاقے سے ہجرت کر کے کسی اور سنگلاخ اور ویران علاقے میں آ آباد ہوئے۔مگر ان میں اتفاق تھا اور ہمت کے ساتھ ساتھ مقصد کا تعین بھی تھا کہ اگر ہم نے زندہ رہنا ہے تو ہمیں اس سنگلاخ اور پتھریلی زمین کو نرم کرنا ہو گا اور اس کے پتھر اس کے سینے سے اتار پھینکنا ہوں گے اور یونہی ہوا اور اس گھرانے کے افراد تعداد میں مٹھی بھر ہونے کے جت گئے اور کئی مہینوں کی محنت سے اس زمین کو نرم کیا اور سبزہ اگایا اور اس میں آباد

وشاد ہو گئے۔ قافلے آتے رہے اور وہیں آباد ہوتے رہے اس طرح اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے دن رات محنت کی اور اسی خاندان کے بڑے شخص کو وہاں کا بڑا مان کر ساری اہم ذمے داریاں اس بستی کی اس کے کاندھوں پہ لاد دی گئیں کہ مقصد ناممکن کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔ افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پہلے ایک گھرانا آیا اور یہاں پہنچ کر کھلے آسمان میں سخت زمین پر پڑ رہا، پھر دوسرا گھرانا آیا اور زمین کی سختی سے لڑنے لگا، پھر گھرانے آتے چلے گئے اور اونچے درختوں کو سرنگوں کرنے اور سخت زمین کو نرم بنانے پر جت گئے۔

جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے حشام سے کہا کہ اے حشام! تو ہم میں بڑا ہے۔ پس تو ہمارے بیچ بیٹھ اور منصفی کر! حشام ان کے بیچ بیٹھا اور خوب منصفی کی۔ اس نے تا عمر ٹاٹ پہنا اور سب کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر موٹی روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا۔ اس نے ایک سو بچھتر برس کی عمر پائی اور جب وہ مرا تو اس کی کمر سیدھی تھی۔"(۱۴۲)

خوش حال اور خوش طبیعت آدمی ایک سو بچھتر برس اپنی عوام میں رہا اور جب مرا تو اس کی کمر سیدھی تھی یعنی خم تک نہیں تھا تو کوئی اور بیماری کیا ہو گی۔ ایسے نیک بخت لوگ جو اپنی زندگی میں کسی مقصد کو اپنا لیتے ہیں تو اسی کو پھر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں۔ جیسے کہ اس بستی کے بڑے بوڑھے سردار حشام نے کیا۔ جب اس نے ٹھان لی کہ میں نے اپنے گھرانے کے افراد ملا کر اس پتھریلے علاقے کے سینے میں لالہ زار پیدا کرنا ہے تو اس نے کر ہی لیا اور ایک بستی بھی اس گلزار میں آباد کی۔

جبران اور انتظار دونوں کے افسانوں میں مقصد کی اہمیت واضح ہے اور یہی بات دونوں افسانوں کو اپنی جگہ اہم اور قیمتی بناتی ہے۔ جبران نے ایک حکائی انداز میں کہانی بیان کی جس سے کہانی کا بیانیہ بالکل سادہ اور سیدھا رہا اور بات سیدھی دل میں اتر گئی جس سے افسانے کا مقصد پورا ہوتا صاف دکھائی دیتا ہے۔ مگر انتظار نے

اپنے افسانے میں قرآنی حوالوں اور نیکی اور برائی کی باتوں کو شامل کر کے کہانی کو ذرا تلمیحاتی اور استعاراتی بنا دیا ہے۔ جس سے کہانی کا سلوب تو کافی اچھا ہو گیا اور اس میں کئی اور بھی پہلو نکل آئے ہیں جس سے کہانی عام آدمی کے ہاتھ تو آتی دکھائی نہیں دیتی مگر ادبی سطح پہ یہ ایک شاہکار کہانی ہے۔ دونوں افسانہ نگار اپنی جگہ کامیاب ہیں۔

جبران چوں کہ مذہبی لحاظ سے عیسائی مذہب کا پیروکار تھا جس کی بڑی وجہ اس کی ماں کا ایک عیسائی مذہبی گھرانے سے تعلق تھا اور اس کے ننھیال میں سے اکثر بڑے بڑے پادری اسے بچپن سے ہی تعلیم دینے آتے تھے اس لیے اس کے ذہن میں ساری عمر بچپن کے وہ انمٹ نقوش اثر دکھاتے رہے۔

جبران کا افسانہ "بڑا دن" عیسیٰؑ کی پیدائش کے دن کی مناسبت سے لکھا گیا افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے عیسیٰؑ کو ایک انقلابی اور مقصدِ نبوت کی تکمیل کے لیے ایک بہادر انسان دکھایا ہے۔ جس سے ہمیں یہ بات سمجھانے کی تلقین کی ہے کہ مقصد کی خاطر بڑی سے بڑی لڑائی بھی لڑ لینی چاہیے چاہے اس کا انجام سولی ہی کیوں نہ ہو۔ اقتباس دیکھیے:

> "۱۹۰۰ برس سے انسان مسیحؑ کی شکل میں کمزوری کو پوج رہا ہے۔ حالانکہ مسیحؑ قوی تھا لیکن حقیقی قوت کے مفہوم سے دنیا ناواقف ہے۔
>
> مسیحؑ نے خوف و مسکینی کی زندگی بسر کی نہ درد و شکایت کے عالم میں بلکہ انقلابیوں کی طرح زندگی گزاری، باغیوں کی طرح سولی چڑھا اور اہلِ ہمت کی طرح موت کو لبیک کہا۔
>
> مسیحؑ شکستہ پر طائر نہیں، پر جوش آندھی تھا۔ جس نے اپنے تند و تیز جھونکوں سے تمام خمیدہ بازوؤں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔

مسیحؑ فضائے نیلگوں سے غم کو زندگی کی رمز بنانے کے لیے نہیں، زندگی کو حق و آزادی کی رمز بنانے آیا تھا۔

مسیحؑ نہ تو اپنے دشمنوں اور ظالموں سے خائف تھا اور نہ اپنے قاتلوں سے دردناک، بلکہ وہ ایک کھلا ہوا حریت پسند تھا جس نے ظلم و استبداد کا جرات سے مقابلہ کیا۔ جہاں کہیں مکروہ پھوڑا دیکھا نشتر لگایا، جہاں کہیں شر کو بولتے سنا، گونگا کر دیا اور جہاں کہیں ریاکاری کو پایا فنا کے گھاٹ اتار دیا۔"(۱۴۳)

اس اقتباس سے اندازہ لگالیں کہ مسیحؑ اپنے حواریوں اور دنیاداروں کو حق و صداقت کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے مقصد کے لیے دوسروں کے سامنے حق بات کہنے کی بھی جرات موجود تھے۔ وہ صرف نیک اور پاکیزہ روح آدمی ہی نہ تھے جو راہب بن کر ایک کونے میں بیٹھے عبادت کرتے رہے بل کہ وہ لوگوں کے درمیان آئے اور لوگوں کو ان کے عیب بھی بتلائے کیوں کہ ان کی زندگی کا مقصد تو لوگوں کو گناہوں کی پاتال سے نکالنا تھا اور نیکی کی معراج تک لے جانا تھا۔ واقعی میں انھوں نے زندگی کو حق و آزادی کی رمز بنا دیا۔ اپنے مقصد کی تکمیل میں ہمیشہ سرگرداں رہے نہ دشمنوں سے ڈرے اور نہ ظالموں کا کبھی دل میں خوف رکھا اور ہر انسان کو مسیح کی تعلیم بھی یہی ہے کہ اپنے مقصد کے لیے ہر ممکن قربانی دیں اور آگے بڑھیں چاہے تجھے دشمنوں اور ظالموں سے بھی ٹکر لینی پڑے۔

انتظار حسین کے افسانوں میں بھی حضورؐ کے بہادری اور مقصد کی عظمت کے واقعات آتے ہیں اور بعض جگہوں پر تو حوالے آئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی کئی حوالے ملتے ہیں۔ انتظار کا افسانہ "کانا دجا" اپنے نام سے ہی ظاہر ہے کہ امریکا اور اسرائیل کی ملی جلی بھگت اور ان کی مذموم ارادوں پہ لکھا گیا افسانہ ہے۔ جس میں تین کردار ہیں۔ والدین اور ان کا بیٹا جو کہ ہجرت کے دوران بھارت ہی رہ گیا تھا مگر اب واپس لوٹا ہے تو اس سے بات چیت چل رہی اور مسلمانوں کے حالات پوری دنیا میں زبوں ہیں تو اس کے تناظر میں کوئی جنگ بھی چل رہی ہے جس میں مسلمان کسی کافر اور یہودی سے برسرِ پیکار ہیں۔ باپ، ماں اور

بیٹے کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے جس میں حضورؐ کی بہادری ان کے کمالات اور واقعہ معراج کو بھی بیان کیا جاتا ہے اور باپ کے بیان کرنے پر ماں کی آنکھوں میں آنسو اور ماں کے بیان کرنے پر باپ کی آنکھیں نمدیدہ۔ بیٹا بھی حضورؐ کی محبت میں سرشار ہے اور بار بار ان کو اس بات کا بھی خیال ہے کہ مسلمان کسی جنگ میں مصروف ہیں خدا ان کی خیر اور جیت ہو۔

ماں بیٹے کو ٹیلیفون دفتر فون کر کے حالات کے پوچھنے کا کہتی ہے تو آگے مصنف کی زبان سے سنیے:

"اماں جی نے پیچھے سے آواز دی:

"بیٹا! ذرا پھر اخبار کے دفتر میں ٹیلی فون کرو!"

اس نے ٹیلی فون پہ جا کر ڈائل گھمایا: "ہیلو، دھائی تین منٹ بات کی۔ پھر واپس خاموش کرسی پہ آبیٹھا۔ ابا جان نے اس کی صورت غور سے دیکھی، پوچھا:

"کوئی خبر ملی؟"

"جی! سیز فائر ہو گیا۔"

"مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے؟"

"بس یہی سمجھیے۔"

ابا جان کا سر جھک گیا۔ وہ ان کا جھکا ہوا سر دیکھتا رہا، پھر انھوں نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے: "جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔" پھر چپ ہو گئے۔"(۱۴۴)

بلا شبہ ہم مذہبی لوگ ہیں اور ہماری نجات صرف مذہب کو ماننے میں ہی ہے اگر ہم اپنے نبیؐ کے احکامات نہیں مانیں گے تو دنیا و آخرت ہر دو جگہ پر ہماری رسوائی اور ذلالت ہے اور ابھی بھی دیکھ لیں کہ پوری

دنیا میں صرف مسلمان ہی پِٹ رہا ہے اور کفار اور اس کے حواری وچیلے خوشیاں منا رہے ہیں کیوں کہ ہم خوار ہو رہے ہیں کہ دینِ مصطفیؐ چھوڑ دیا ہے اور ان کے راستے پہ چلنا ہمارے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ جہاں حضورؐ بلند تھے آج وہیں ہم پیچھے اور راندے ہوئے ہیں۔

جبران نے عیسیٰؑ کے حوالے سے ان کی تعلیمات کو مان کر آگے بڑھنے اور دنیا میں مقصدیت کے حصول کی ترغیب دی ہے بلاشبہ انتظار حسین نے بھی حضورؐ کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی زندگی اور مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھیں کے اسوہ پر عمل کی تلقین کی ہے کہ آج ہم اسی لیے ذلیل ہیں کہ ان کے اسوہ پر نہیں چل رہے۔ جبران کے افسانے میں لفاظی شاعرانہ حد تک کمال کو پہنچی ہوئی ہے جس سے افسانہ دوآتشہ اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ پرکشش ہو گیا ہے مگر انتظار کا افسانہ اگرچہ اپنے مقصد اور کہانی میں کامیاب دکھائی دیتا ہے مگر لفاظی اور بنت میں جبران کے اس افسانے کو نہیں چھوتا۔ موضوعاتی سطح پر تو دونوں افسانہ نگار ایک صفحے پہ نظر آتے ہیں مگر اسلوبی سطح پر جبران کا پلہ اس افسانے میں بھاری ہے۔

جبران کے پاس انسانی زندگی اور اس کے مقاصد کے لحاظ سے بڑے پر اثر اور دلچسپ افسانے موجود ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ایک زخمی روح اپنے ہمدردوں کو پکار رہی ہے کہ آؤ اور اپنی اپنی زندگی کی محتاجی کو ختم کرنے کے گر سیکھو، اپنے اپنے مقصدِ حیات کا تعین کرو تاکہ دنیا و آخرت میں سر اٹھا کر جی سکو اور سر فراز ٹھہرو۔ نہیں تو یہاں بھی شرمندگی اور وہاں بھی پشیمانیجبران اپنے ایک افسانے "انسان" میں انسان سے محوِ کلام ہے اور اس سے گفتگو میں اسے اس کا وہ مقام بھی یاد کرواتا ہے کہ جب انسان مسجودِ ملائک تھا اور اسے دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا گیا تھا اور اسے تمام مخلوقات میں اشرف ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اقتباس دیکھیے:

> "انسان! جسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اور مالکِ دو جہاں نے زمین کا حکمران بنایا۔

جس نے سینکڑوں پیچیدہ مسائل اپنی کمزور انگلیوں سے سلجھا کر رکھ دیے، سمندر کو اپنا تابع فرمان بنایا اور ہوا کو فرماں بردار۔

---------اور معصومیت سے ملائک کا مقابلہ کرتا تھا۔"(۱۴۵)

مگر یہی انسان دنیا میں آکر اپنا مقصدِ حیات بھول گیا اور ننگِ شرم اور ننگِ انسانیت ہو گیا۔یعنی افسانے کے دوسرے حصے میں انسان کا دوسرا رخ دکھایا گیا ہے کہ جس میں انسان اپنے وقار اور معیار سے گر گیا ہے اور اب اس کی حالت کیا ہو گئی ہے۔جو ولیوں اور پیغمبروں کا جانشین تھا آج اپنی لالچ، نخوت، کبر، جہالت، انسان دشمنی، ظلم و بربریت اور تشدد کی وجہ سے ہلاکو اور چنگیز کا ساتھی بن چکا ہے۔اقتباس دیکھیے:

"پر آہ! وہی انسان آج اپنی وجہ ہستی اور مقصدِ نمود بھول چکا ہے۔جہل، عناد اور کبر و نخوت نے اس پر غلبہ کر لیا۔آشتی و آزادی کے تحفے کو اس نے جنگ اور غلامی میں بدل دیا۔

اس سے روحِ انسانیت چھن گئی۔اس کی جگہ ایک پیکرِ فریب و حسد ہے اور مجسمہ ظلم و ستم، بردباری و پاکیزگی پر آج تشدد و بربریت حاوی ہے۔---ہلاکو کا استبداد اور چنگیز کا جور و ظلم دہرایا جا رہا ہے اور زمانہ جاہلیت کی بھولی بسری دہشت انگیزیوں کی طرف رجوع ہے۔"(۱۴۶)

اپنا مقصدِ نمو اور مقصدِ حیات بھول کر انسان واقعی میں انسانی مقام سے گر جاتا ہے اور جانورانہ مقام پہ آجاتا ہے جہاں اس کو اسفل السافلین کے درجے تک اتار دیا جاتا ہے اور وہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر اور کم تر ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں ایسے کئی ایک افسانے ملتے ہیں کہ جس میں انسان اپنے اعلیٰ وارفع مقام کو کھو کر جانورانہ اطوار اور اشکال پر اتر آتا ہے۔ پہلے انسان کا مرتبہ کیا ہوتا ہے اور آخر کار وہ کس درجے گھٹیا اور کم تر ہو جاتا ہے۔ اس موضوع کے لیے انتظار حسین کا نمائند افسانہ "زرد کتا" بہترین افسانہ ہے کہ جس میں انسان کبھی اپنے نفس پہ قابو پا کر اور طمع دنیا کو چھوڑ کر سفلی درجات سے اوپر اٹھ کر فضاؤں میں اڑنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتا ہے مگر جب اس پر مکر فریب، لالچ اور طمع دنیا کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی انسان کی جون میں باقی نہیں رہتا اور آخر کار دوسرے ریاکار، بدکردار اور لالچی انسانوں کی طرح کتا بن جاتا ہے کہ جو طمع دنیا میں مارا مارا پھرتا ہے اور اسے کہیں بھی سکون نہیں ملتا۔ اقتباس دیکھیے:

> "میں چلتے چلتے دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ میرا دم پھول گیا اور میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے، مگر پھر ایسا ہوا کہ اچانک میرے حلق سے کوئی چیز زور کر کے باہر آ گئی اور پیروں پر گر گئی۔ میں نے اپنے پیروں پہ نظر کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک لومڑی کا بچہ میرے قدموں پر لوٹتا ہے۔ میں نے اسے پیروں سے لاند کر کچل دینا چاہا اور وہ لومڑی کا بچہ پھول کر موٹا ہو گیا۔ تب میں نے اسے قدموں سے کھوندا اور وہ موٹا ہوتا گیا اور موٹا ہوتے ہوتے زرد کتا بن گیا۔ تب میں نے پوری قوت سے زرد کتے کو ٹھوکر ماری اور اسے قدموں سے خوب روندتا ہوا آگے نکل گیا۔۔۔۔۔۔ میں تھک گیا اور میں تھک کر گھٹ گیا اور وہ زرد کتا پھول کر بڑا ہو گیا۔ میں نے بارگاہِ رب العزت میں فریاد کی کہ اے پالنے والے آدمی گھٹ گیا اور زرد کتا بڑا ہو گیا۔"(۱۴۷)

لالچ جب انسان کے اندر گھر کرتی ہے تو اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی اور آدمی کو خود احساس ہونے لگتا ہے کہ میرے اندر کوئی توڑ پھوڑ شروع ہو گئی ہے اور میں عنقریب اپنی اصل جون سے کسی اور حیوانی جون میں منتقل ہو جاؤں گا بشرطیکہ اس کے ضمیر کا کوئی ایک حصہ ابھی زندہ ہو۔ اس افسانے میں بھی انتظار کا مرکزی کردار اپنے ضمیر کے کچھ کچوکوں پر ہی اٹھ بھاگتا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ کتے کی جون میں تبدیل

نہ ہو مگر وہ اس قدر اپنے مقصد سے دور نکل آیا ہوتا ہے کہ اس کا واپس پلٹنا اور رجوع کرنا ممکن نہیں رہتا اور وہ بھی انھیں لوگوں کی طرح کتا بن جاتا ہے۔

جبران کا افسانہ "انسان" اور انتظار کا افسانہ "زرد کتا" موضوع کے لحاظ سے تو دونوں افسانے ایک ہی جیسے ہیں اور کہانی بھی دونوں کی بڑی دلچسپ اور بُنی ہوئی ہے مگر جبران کا افسانہ اپنے پہلے افسانوں کی طرح سیدھا سادہ سا افسانہ ہے کہ جس میں وہ ایک سمجھانے کے اسلوب میں انسان سے ہم کلام ہیں کہ اے انسان تو کہاں مسجودِ ملائک اور کہاں تیرا اشرف المخلوقات ہونا اور آج تو انھیں فرشتوں کے لکھے پہ پکڑا جا رہا ہے اور فرشتے تجھ سے افضل ہو گئے ہیں۔ تو دن بہ دن اسفل ہوتا جا رہا ہے یہاں تک تشدد اور تباہی میں چنگیز خان اور ہلاکو کو شرماتا ہے۔ جب کہ انتظار کا افسانہ حقیقت میں افسانوی اسلوب کا نمائندہ افسانہ ہے کہ جس میں صوفیا کے ملفوظات اور فرمودات سے کہانی کو تشکیل دیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف انسان کا افضل ہونا سمجھ آتا ہے وہاں حکائی انداز و اسلوب میں اور دلچسپ پیرائے میں انسان کا اپنے مرتبے سے گرا ہونا بھی دکھایا گیا ہے۔ بلا شبہ انتظار کا یہ افسانہ جبران کے افسانے سے ہر لحاظ سے بہترین اور خوب افسانہ ہے۔ جس میں معنی و تعبیر کی کئی منزلیں نکالی اور سمجھی جا سکتی ہیں۔

iii. انسان کا معاشرتی کردار

انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور اچھے برے حالات میں کسی نہ کسی طور اور چاہتے نہ چاہتے اسے کسی نہ کسی انسانی گروہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے جہاں یہ ایک اچھے اور باوقار طریقے سے زندگی گزار لے اور اپنی ضروریات کو بھی پورا کر سکے۔ یہی گروہ ذرا مہذب ہو کر باشعور معاشرہ بن جاتا ہے کہ جہاں زندگی کی نئ تعبیریں اور قدریں سامنے آتی ہیں۔ جن میں انسان لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ دوسروں کے غم میں شریک بھی ہوتا ہے اور اپنے غم کو بانٹنے کے لیے ساتھی بھی چاہتا ہے۔

اسی معاشرے کی قدروں کو بحال رکھنے اور معاشرے کو پر رونق بنانے کے لیے انسانوں کو اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے جسے انسان کا معاشرتی کردار کہتے ہیں کہ انسان اپنے معاشرے میں جس قدر اچھا اور ایجابی کردار ادا کرے گا معاشرہ اسی طرح اور انھیں خطوط پر مثبت زاویوں کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ معاشرے کے حساس افراد ضرور بالضرور معاشرے میں مثبت اور تعمیری رویے کے خواہش مند ہوتے ہیں جو تعمیری کردار کو سراہتے ہیں اور تخریبی کردار کی سرزنش کرتے ہیں اور ایک ادیب اور شاعر کسی بھی معاشرے کا سب سے زیادہ حساس اور لطیف انسان ہوتا ہے کہ جو معاشرے کے اچھے اور برے ہر پہلو سے سب کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔

خلیل جبران کے افسانوں میں بھی ہمیں ایسے کئی افسانے اور کہانیاں ملتی ہیں کہ جن میں معاشرے کے اچھے پہلوؤں پہ روشنی ڈالی گئی ہے اور برے کردار سے روکا گیا ہے یا اس کے نقصانات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ افسانہ "پروانہ سے" ایک کمال افسانہ ہے جس میں جبران نے ایک کیڑے پروانے کے ذریعے سے زندگی کو سمجھنے اور پھر معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنے لحاظ سے مثال بنا کر پیش کیا ہے کہ وہ ایک پروانہ اور ننھی سی جان ہے مگر وہ مسلسل اپنا کردار ادا کرتا ہے اور اس سے ہمیں یہ بھی سیکھنا چاہیے کہ جب آدمی مسلسل اپنے کام میں لگا رہتا ہے تو معاشرے کو اس کا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ ایک پروانے کا جو کام ہوتا ہے کہ وہ شمع کا دیوانہ ہے تو وہ اپنے کام سے غفلت نہیں کرتا اور ساری ساری رات اس میں لگا رہتا ہے حالانکہ اسے یہ بھی اندازہ ہے کہ اس کی جان بھی اس میں چلی جائے گی۔ اسی طرح اپنی جان دے کر بھی معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اقتباس دیکھیے:

> "رات کی تاریکی رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے۔ کائنات مردہ صد سالہ کی طرح خاموش ہے اور ہر ذرہ نشہ خوب میں لڑکھڑاتا ہوا۔ پرندے آشیانوں میں ساکت ہیں اور درندے جنگلوں میں خوابیدہ۔

لیکن تیری یہ شب بیداری کیسی ہے؟ تو کوئی ننھا سا دیوتا تو نہیں جو شمع کی حیاتِ جاودانی اور اپنی قبولیتِ قربانی کے لیے دست بدعا ہے۔

تصویرِ درد! آسمان پر چاند بھی طلوع ہو گیا اس کا عکس جھیل کے پانی پر ناچ رہا ہے اور سمندری موجوں کے نغموں نے سال خوردہ دنیا کے چہرے پر مسکراہٹ طاری کر دی۔

لیکن تُو! آہ! کہ تیری کائنات مشتمل بر یک شمع ہے اور اس کی آتشیں لَو میں ماحصل حیات پوشیدہ۔

لیکن آفریں تجھے! کہ لپکتے ہوئے شعلے کو بوسہ دینے کی تمنا اشتیاقِ فنا کو دوبالا کر دیتی ہے۔"(۱۴۸)

اگرچہ پروانے کی زندگی مختصر اوراس کی کل کائنات ایک شمع پر ختم ہو جاتی ہے مگر وہ اپنی شمع کی لَو پر دیوانگی سے جان دے دیتا ہے اور اپنے کردار سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ بل کہ شمع کا لپکتا ہوا شعلہ اسے اور بھی محبت میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ شمع کے اور بھی نزدیک جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے کردار سے ہمیں یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ جب آدمی اپنے کام میں ہی مصروف رہے اور معاشرے میں اپنا رول ادا کرتا رہے تو اسے دوسروں کے کاموں پہ نظر رکھنے کی فرصت نہیں ملتی جس سے معاشرے کے لوگوں کا جینا حرام نہیں ہوتا اور وہ بھی مقدور بھر اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

انتظار حسین کے پاس بھی ایک ایسا افسانہ ہے کہ جس کے مرکزی کردار کے نام پر ہی افسانے کا نام ہے "عقیلا خالا"۔ جو کہ آفت کا پرکالا ہیں۔ خود تو اپنے خاوند کو سنبھال نہ سکیں اب اجڑ کر میکے آن بیٹھی ہیں جہاں سارا محلہ ان کی حرکتوں اور باتوں سے نالاں و پریشان ہے کہ کبھی کسی کا رشتہ تڑوا دیتی ہیں تو کبھی کسی میں لڑائی کروا دیتی ہیں یعنی اپنے کام سے کام نہیں رکھتیں تو معاشرے میں برا کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک ٹکڑا تعارف کا دیکھیے:

”خود کیا چھٹ کے بیٹھیں دوسروں کی منگنیاں تڑوانے اور بیاہ شادیوں میں کھنڈت ڈالنے کا انھوں نے وطیرہ اختیار کر لیا۔ اس کی بات اس سے لگائی۔ فلاں کے بیٹے کو بدنام کیا۔ فلاں کے بیٹے میں فی نکالی۔ یوں وہ بیبیوں میں آپس میں جوتا چلواتی رہتی تھیں۔ اس معاملہ میں ان کی قیافہ شناسی کو داد دینی پڑے گی۔ ویسے انہوں نے کنسوئیاں لینے کو اپنے اوپر حرام نہیں کیا تھا۔“(۱۴۹)

عقیلا خالا کا کردار ہے تو بڑا دلچسپ اور ایسے کردار ہمارے معاشرے میں اکثر پائے بھی جاتے ہیں جن سے ہمیں نہ صرف بچنا ہوتا ہے بل کہ ان کی عزت اچھے اچھے لوگوں سے بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے نہیں تو وہ تمھارے بارے میں کوئی ایسی بات مشہور کر دیں گی کہ جو تم میں نے کی تو دور کی بات ہے کبھی سنی بھی نہیں ہو گی۔ ایسے کردار معاشرے کی رونق ہوتے ہیں مگر انتہائی خطرناک بھی ہوتے ہیں۔

جبران نے ایک کردار کے عزم بالجزم سے کرداری حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنے کردار کو ہر صورت نبھانا چاہیے چاہے اس کا انجام موت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر انتظار ہمیں ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار سے ملواتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ ایسے برے کردار بھی ہمارے معاشرے میں ہیں کہ جن کو صرف دوسروں کے گھروں میں تاکا جھانکی کی عادت ہوتی ہے اور اپنے گھر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تو اسی وجہ سے ان کے گھر اجڑ جاتے ہیں اور ایسے لوگ اپنے ہی گھر والوں سے مات کھا جاتے ہیں مگر پورے محلے کے لوگوں کو زک کیے رکھتے ہیں۔ جبران نے ایک کیڑے کے ذریعے علامتی اسلوب میں کہانی بیان کی ہے جب کہ انتظار نے سیدھی سادی کہانی میں ایک عورت کے معاشرتی کردار کو بیان کیا ہے۔ جبران کی کہانی کی اور بھی کئی جہتیں اور تعبیریں حاصل کی جا سکتیں ہیں جس وجہ سے وہ اسلوبی سطح پر انتظار سے آگے ہیں اور بہتر کہانی پیش کر سکے ہیں مگر یک سطحی کہانی ہونے کی وجہ سے انتظار اسلوبی معاملے میں جبران کی کہانی کا مقابلہ نہیں کرتے۔ موضوعاتی لحاظ سے دونوں کی کہانیاں جان دار ہیں۔

جبران کا افسانہ ”جل پریاں“ ایک تمثیلی کہانی ہے کہ جس کے ذریعے افسانہ نگار نے معاشرے اور حکومتوں کے حالات اور واقعات پر نہ صرف روشنی ڈالی ہے بل کہ ان پر شدید طنز بھی کیا ہے کہ حکومتیں اپنے چھوٹے چھوٹے مقاصد کے حصول کے لیے نوجوانوں کو اپنی خواہش کے ایندھن میں جھونک دیتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کبھی وطنیت پرستی کے نعروں سے قائل کرتے ہیں تو کبھی فرض کی اہمیت سے دلوں میں لڑنے کی امنگ پیدا کی جاتی ہے۔ مگر آخر کار کیا حاصل ہوتا ہے دونوں طرف ”موت“۔

جل پریوں کو ساحلِ سمندر پہ ایک نوجوان کی لاش ملتی ہے جس پر بحث کرتی ہوئی اور اس کی شناخت کرتی ہوئی وہ جل پریاں اسے جنگی سپاہی سمجھ لیتی ہیں اور جنگ کی ہولناکیوں کو بیان کرتی ہیں اور یہ بھی کہتی ہیں کہ انسان نے دنیا پر قبضے کے لیے ایسی قتل وغارت شروع کر رکھی ہے۔ اگر وہ امن سے رہتا تو ایسے نہ کرتا اور یوں ہزاروں جانیں بچ جاتیں۔ اقتباس دیکھیے:

> ”جنگ ونگ کو تو میں نہیں جانتی، کیا بلا ہے، ہاں! یہ جانتی ہوں کہ انسان نے خشکی پر قبضہ پا لینے کے بعد حرص کی کہ سمندر پر بھی حکومت کرے۔۔۔۔۔۔جب اس کی اطلاع نبتون پانی کے دیوتا کو ہوئی تو وہ اس دراز دستی پر بہت برہم ہوا، اور انسان کے لیے سوائے قربانی کے کوئی چارہ نہ رہا۔“(۱۵۰)

افسانے میں دلچسپ موڑ اس وقت آتا ہے جب ایک جل پری آگے بڑھ کر اس نوجوان کی لاش کی تلاشی لیتی ہے تو اس کی دل والی طرف والی جیب سے ایک محبت بھرا خط نکلتا ہے اور یوں کہانی جذباتی اور رومانوی انداز اختیار کر جاتی ہے۔ جس میں اس کی محبوبہ اسے کہہ رہی ہے کہ محبت ہر فرض اور ہر وطنیت سے بڑی ہوتی ہے کیوں کہ یہاں تو غریب کو اس فرض اور وطنیت میں جھونک دیا جاتا ہے اور امیر اور موروثی شریف زادے اس وطنیت کے عذاب سے دور ہی رکھے جاتے ہیں۔ خط کے متن کا ایک حصہ دیکھیے:

> ”یہ کیسا“ اہم فرض“ ہے جو غریب دیہاتیوں کے لیے تو ناگزیر ہے! مگر طاقت ور اور موروثی شریف زادے اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتے؟

اگر "فرض" قوموں کی سلامتی کو تباہ اور "وطنیت" حیاتِ انسانی کے سکون کو تباہ کر دے تو ایسے فرض اور ایسی وطنیت کو دور ہی سے سلام۔"(۱۵۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں آ کر اونچ نیچ کے ساتھ ساتھ لالچ میں بھی پڑ گیا اور اس نے دنیا میں آ کر اپنا اصل معاشرتی کردار پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اب بالکل بھی اسے ہوس نے چین نہیں لینے دینا اور یہ یونہی تڑپتا اور بلکتا اندھے ضمیر اور ذہن کے ساتھ دوسرے انسانوں کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے دن رات حملے کرتا اور مرتا مارتا رہے گا۔ معاشرتی کردار میں اپنا مثبت رول ادا کرنے کے بجائے یہ دنیا کو تباہی کے دہانے پہ لے آیا ہے۔ ایٹم بم کی ایجاد نے اسے جتنا سکون فراہم کیا ہے اس سے کہیں زیادہ بے چینی بھی دی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "ایک بن لکھی رزمیہ" اپنے اسلوب اطوار اور بنت سے کمال کہانی ہے کہ جس میں وطن، زمین کے ساتھ ساتھ لوگوں کی توقعات کے ٹوٹنے کو ایسے قرینے سے بیان کیا ہے کہ زمانے کی بے حسی پر افسوس ہوتا ہے اور ہم بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ خدا ان جنگی سازوسامان بنانے والوں اور زمین کے حصے بٹوارے کرنے والوں کا ستیاناس کرے۔ اس افسانے کا کردار پچھوا مرکزی کردار ہے جس نے زمین اور اپنی بستی قادر پور کی خاطر بہت قربانیاں دیں اور چاہا کہ جب پاکستان بن جائے تو ہم اس میں آرام سے رہیں۔ اس سلسلے میں اس کی بنائی سپاہیوں کی ٹولی اور دشمنوں کے در، میان جو جھڑپیں اور لڑائیاں ہوئیں اس کا منظر دیکھیے:

"قادر پور میں وہ رن پڑا کہ سننے والوں نے کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ افراتفری تو خیر عام تھی انسانی جانیں ہر جگہ ٹکے دھڑی بکیں۔ بس تولے ماشے کا فرق رہا۔ کوئی دو قدم پیچھے ہٹ کے مرا کسی نے چار قدم بڑھ کے جان دی۔ کسی کی پیٹھ پہ گھاؤ آیا۔ کسی نے سینے پہ وار روکے۔ قادر پور کی کیا ہستی تھی۔ اس ریلے نے تو پہاڑوں کی جڑیں ہلا ڈالیں لیکن

پچھوا کے دم قدم کی خیر قادر پور میں نو نیزے پانی چڑھا۔ پھر وہ ٹھنی وہ خون خچر ہوا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔"(۱۵۲)

مگر اتنی ساری جنگیں تو زمین کے لیے ہوئیں مگر ان کی زمین اور بستی پاکستان میں شمار نہیں ہوئی اس طرح پچھوا اپنے ساتھیوں سمیت اب نہ ادھر کا رہا اور نہ ادھر کا رہا اور اس کے بنے بنائے خواب چکنا چور ہو گئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پاکستان جانا پڑا اور وہاں بالکل حالات اس کے خیال کے برعکس تھے اور اس سے برتاؤ بھی غیروں جیسا کیا گیا اس کے ساتھی جو پہلے یہاں آ کے سیٹل ہو چکے تھے وہ بھی اس سے جان چھڑواتے تھے اور پچھوا کو اپنی جان کی بقا کی فکر دامن گیر تھی مگر کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں تھا۔

"لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ غمِ عشق سے زیادہ غمِ روزگار میں مبتلا ہے۔ آج صبح پچھوا مجھے ملا تھا کہنے لگا" میاں کہیں کام وام دلوا دو۔ سالی پاؤں ٹکانے کی جگہ بھی نئیں اے۔ بابو کس کام آؤ گے اور نئیں تو کوئی گھر ہی الاٹ کرا دو۔" پچھوا کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ قادر پور میں اس کے سامنے کبھی رہنے اور کھانے کا سوال کھڑا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آ کر وہ کھانے کو روٹی مانگتا ہے اور سر چھپانے کو چھت چاہتا ہے۔ میں اسے مکان اور ملازمت کہاں سے دلاؤں۔"(۱۵۳)

پچھوا کے کردار سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زمین کے جھمیلے اور جھگڑوں سے سوائے مہیب سایوں کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو کبھی اپنی زمین اور قادر پور کے لیے لڑتا رہا اور پاکستان بنانے کے دھن جس کے سر پہ سوار تھی آج اسے پاکستان پناہ دینے سے بھی گریز کر رہا ہے۔ سوائے خون خرابے اور کشتوں کے پشتوں سے کچھ اور حاصل نہیں ہوتا۔

جبران اور انتظار دونوں کے افسانوں میں جنگی حالات کی تباہ کاریاں اور حکومتی لوگوں کے جنگی حالات پیدا کر کے قتل و خون کرنے کی داستان نظر آ رہی ہے۔ جبران کا افسانہ اپنی جگہ پر مکمل، موضوع کے اعتبار سے اپنا مفہوم سمجھاتے ہوئے رقم کیا گیا ہے۔ جب کہ انتظار کا افسانہ ایک حقیقی داستان کی عکاسی کر رہا ہے اور کردار

حقیقی ہوتے ہوئے بھی علامت کا اور لیجنڈ کا درجہ اختیار کر گیا ہے کہ ان فسادات کے دوران دونوں طرف ایسے کئی پچھوے تھے کہ جن کے ساتھ ایسا ہوا کہ جو نہ پاکستان کے رہے اور نہ ہی ہندوستان کے، بل کہ انھیں تو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا ہو گیا ہے اور میدانِ عمل میں ہمیں استعمال کیا گیا ہے اور ہم اپنے ہی انسانوں پہ ہلہ بولتے رہے اور انھیں موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ اتنی مختصر سی زندگی کو ہم نے پیار سے گزار کر معاشرے میں اپنا تعمیری رول ادا کرنے کے بجائے ہم نے کشت وخون میں ساری جوانی کھپادی اور اسی میں فنا ہوئے۔ دونوں افسانہ نگاروں نے خوب اپنے اپنے اسلوب میں ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ اسلوبی سطح پر جبران کی کہانی ذرا تمثیلی ہے مگر انتظار کا افسانہ سیدھی سادی کہانی کے انداز میں بیانیہ طرز میں لکھا گیا ہے۔

ہمیں ہماری روزمرہ زندگی میں بہت سے ملامت کار اور ناصح حضرات سے پالا پڑتا ہے کہ جو ہمیں دن رات نیکی کی تلقین، برائی سے بچنے کی ترغیب اور ملک وقوم کے حالات سے باخبر رکھ کر دنیا کو بدلنے کی باتیں کرتے رہتے ہیں مگر کچھ کرتے نہیں ہیں۔ جبران نے ایسے ہی لوگوں پر ایک افسانہ لکھا ہے جو لوگوں کو ایسے ہی مختلف حالات میں لالچ اور ہوس پہ اکساتے رہتے ہیں اور ان کے ضمیر کو جنجھوڑتے ہیں کہ کسی طرح دنیا کی پستی میں اترو اور دنیا کو حاصل کرو۔ افسانے "اے ملامت کار" میں جبران نے دکھایا ہے کہ جس انسان کو دنیا میں رہتے رہتے غم سہنے کی اور دکھ تکلیف برداشت کرنے کی عادت ہو جائے تو غم اور مصائب اسے ویسے ہی چشمِ بصیرت عطا کر دیتے ہیں اور اسے کسی ناصح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اقتباس دیکھیے:

> "اے ملامت کار! مجھے چھوڑ دے اور نصیحت نہ کر اس لیے کہ مصائب نے میری چشمِ بصیرت کو وا کر دیا ہے۔ آنسوؤں نے میری بصارت کو چمکا دیا ہے اور غم نے مجھے دلوں کی زبان سکھا دی ہے۔
>
> دولت کی کہانی اور عظمت کے قصے مجھے نہ سنا! کہ میرا نفس اپنی قناعت کی بنا پر بے نیاز اور دیوتاؤں کی عظمت وبزرگی کی پرستش میں محو ہے!

سیاست کی باتوں اور اقتدار کی خبروں سے مجھے معاف رکھ! کہ ساری زمین میرا وطن اور تمام انسان میرے ہم وطن ہیں۔"(۱۵۴)

اس افسانے میں ملامت کار کے ذریعے اپنے معاشرتی کردار کے دفاع کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کو صرف اپنے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے بل کہ اسے پورے معاشرے اور موری دنیا کے لوگوں کے لیے سوچنا چاہیے۔ ہر انسان اگر دوسرون کا بھلا چاہے گا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی کا نقصان کیسے ہو گا۔ سب ہی خوش و خرم اور خوشحال رہیں گے اور دنیا میں امن قائم ہو جائے گا جو کسی بھی معاشرے کے لیے خوشی کی نوید اور خوشحالی کی پہلی کرن ہے۔ انسان کو تعمیری رویوں مین ہمیشہ خدا کے دیے پہ شاکر رہنا چاہیے اور اپنے لوگوں سے جیسے دل لگی اور محبت ہو ویسے ہی پوری انسانیت سے محبت ہونی چاہیے تب ہی کہیں جا کر معاشرے ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے ہیں۔

انتظار حسین کا افسانہ "دوسرا گناہ" اسی معاشرت رویوں پہ لکھا دلچسپ اور خوبصورت افسانہ ہے کہ جس میں مصنف پورے طور پر اپنے مقصد اور موضوع کو بیان کرنے میں کامیاب ہوا ہے کہ وہ معاشرے جن میں دوسروں کا نہیں سوچا جاتا وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور جن معاشروں میں بڑے چھوٹے سب ایک ہی دستر خوان سے نوالے چنتے ہیں وہ معاشرے ضرور آگے بڑھتے ہیں، مراد جن معاشروں میں قانون اور ادارے سب کے لیے ایک جیسے ہوں وہاں امن اور سکون کا ہونا لازمی امر ہے۔

اس افسانے میں زمران نامی حکمران نے اپنے اور اپنی رعایا کے درمیان تفاوت ڈالنے کی کوشش کی جس کے تحت اس نے لوگوں میں تقسیم اور تفریق کا عمل شروع کر دیا اور لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہوتے چلے گئے اور ان کے بڑے نے یہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر ہم ایک دوسرے میں فرق ڈالیں گے تو رزق کم ہو جاوے گا اور بھوک بڑھ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"اس باپ کے بیٹے نے بھی بڑی منصفی کی، پھر ایک دن یوں ہوا کہ ابی ملک نے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اجلے پن کو

> دیکھ کر حیران ہوا، پھر اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اتنی اجلی نہ تھیں، پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر بولا کہ اے حشام کے بیٹے! کیاتُو اب چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ جب گیہوں کی مینگ گیہوں کے چھلکے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہو جاتا ہے، گیہوں تھوڑا اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمیں ہمارا پالنے والا اس دن سے پناہ میں رکھے کہ ہمارے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ہماری بھوک بڑھ جائے۔"(۱۵۵)

اس قدر لوگوں کو اپنے سے جدا جاننے کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے دستر خوان پہ بیٹھنے کے بجائے اپنے اپنے دستر خوان پہ بیٹھنے لگے اور ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ دور ہوتے ہوتے انھوں نے گھروں پہ دروازے لگوا لیے، دیواریں اونچی کروالیں اور ڈیوڑھیاں بھی بنوالیں۔ اس طرح وہاں چوری چکاری بھی ہونے لگی اور سارے معاشرے کا محبت بھرا نظام بدل کے رہ گیا اور لوگ ایک دوسرے پہ جان دینے والے ایک دوسرے کی جان لینے لگے۔ اور وہی ہوا کہ لوگوں کے درمیان بھوک بڑھ گئی اور کھانا کم پڑ گیا۔ اور یہی بھوک پھر قحط میں بدل گئی۔ اور لوگ یہاں سے ہجرت کر کے جانے لگے اور وہیں جا پہنچے جہاں زمران حکمران نے اسے نکال بھیجا تھا۔ اقتباس دیکھیے:

> "پھر یوں ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد زمران کی بستی سے ایک اور قافلہ چلا اور بھوکا یہاں پہنچا۔ زمران کی بستی میں قحط پڑ گیا تھا اور وہاں سے پہلے ایک قافلہ چلا اور یہاں آ کر پناہ گیر ہوا، پھر دوسرا قافلہ آیا اور پناہ گیر ہوا، پھر قافلے آتے چلے گئے اور یہاں ڈیرے ڈالتے چلے گئے۔"(۱۵۶)

زمران کے اپنے معاشرے میں برے رویے کی وجہ سے سارا معاشرہ اجڑ گیا اور لوگ برباد ہو گئے اور قحط پڑ گیا اور اس کے بھائی عزیز الیملک کا جنگل شہر میں تبدیل ہونے لگا اور لوگ اس کے اچھے معاشرتی برتاؤ

کی وجہ سے دوبارہ آ آباد ہونے لگے۔اس سے ایک تعمیری معاشرتی کردار اور تخریبی معاشرتی کردار کے درمیان فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

جبران اور انتظار دونوں افسانہ نگاروں نے نہایت کمال مہارت سے اپنے اپنے افسانوں میں انسان کے معاشرتی رویوں پہ کھل کے بات کی ہے کہ ایک اچھا معاشرتی رویہ پورے معاشرے کی بقا کا ضامن بن جاتا ہے اور ایک برا معاشرتی کردار پورے معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔

جبران نے اپنے افسانے میں گفتگو اور فلسفیانہ انداز میں سارے معاشرے اور انسانیت کے امن اور محبت کی بات کی ہے اور انتظار نے جہاں بات کی وہیں افسانے میں ایک عملی مکافات کا بھی نظارہ کروایا ہے جس سے انتظار حسین افسانوی سطح پر جبران سے کہیں آگے بڑھ جاتے ہیں اس کی ایک خاص وجہ بھی ہے کہ جبران ایک فلسفی مفکر ہونے کی وجہ سے اپنی کہانی پر فلسفے کے رنگ میں ناصح بن جاتے ہیں اور انتظار جو خالص کہانی کار تھے وہ کہیں بھی کہانی میں ایک مبلغ اور ناصح بن کر سامنے نہیں آتے بہر حال کہانی میں یہ سارے ہی رنگ موجود ہوتے ہیں۔جبران کہانی کاری میں انتظار کے مقام کو نہیں پہنچتا اور انتظار لفاظی اور منطقی اسلوب میں دو ٹوک بات کرنے میں جبران سے کہیں پیچھے دکھائی دیتا ہے۔جبران مقصدیت اور موضوع پہ براہ راست بات کرتا ہے جب کہ انتظار حسین کہانی کے لوازمات اور جزئیات میں تہہ در تہہ بات کہنے کو مناسب خیال کرتا ہے۔

جبران نے اپنے ایک افسانے "ملاقات" میں دو محبت کرنے والوں کو دکھایا ہے اور وہ بیوی محبوبہ بھی ہے کہ اپنے خاوند کو کے ادیب اور شاعر ہونے پر فخر کر رہی ہے کہ میرا محبوب ایک ایسا محبوب ہے جو قوموں کو بیداری کا درس دیتا ہے اور ہر برائی پر غالب آنے کی ترغیب دیتا ہے اس کی تحریروں سے لوگ جاگ اٹھتے ہیں اوراس کا قلم کوئی زر خرید نہیں ہے اس کے الفاظ اپنے معانی رکھتے ہیں کہ جن کو آزمایا نہیں جا سکتا اور ایسے نوکر چاکر تحفے میں پیش کیے کہ جو تیری ہی طرح بہادر، جری اور بدی پہ غالب آ جانے والے ہیں۔بیوی کے الفاظ دیکھیے:

"آہ تُو کتنا محترم دوست اور کتنا وفادار شوہر ہے۔ تیرے تحفے کتنے حسین اور تیری بخششیں کتنی نفیس ہیں! تُو نے میرے پاس ان نوجوانوں کو بھیجا، جو گہری نیند کے بعد بیداری تھے۔ تُو نے مجھے تحفہ میں وہ شہسوار عطا کیا، جو میری قوم کی کمزوری پر غالب آگیا۔ تُو نے ہدیہ کے طور پر مجھے وہ ادیب دیا جس نے میری قوم کو بیدار کیا اور وہ نجیب مرحمت فرمایا، جس نے اس کی غیرتِ قومی کو بھڑکایا۔"(۱۵۷)

جبران نے اپنے اس افسانے میں لفظوں کی عظمت اور کسی بھی معاشرے کی بہتری میں ادیبوں اور شاعروں کے لفظوں کی قدر کو بنیادی درجہ دیا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے کے زندہ ہونے کی علامت ہے کہ وہ اپنے ادیبوں اور شاعروں کی قدر کرتے ہیں۔ جبران کے ایک اور افسانے "شاعر کی زندگی" میں بھی انھیں لفظوں کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ جس میں شاعر ساری زندگی لوگوں کو اپنے فن اور اپنے لفظوں کی عظمت کے بارے بتاتا رہتا ہے مگر کوئی بھی اس کی قدر نہیں کرتا اور شاعر اسی کسمپرسی میں وفات پا جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے فن کی قدر کی جاتی ہے اور اسے عزت و تکریم سے نوازا جاتا ہے اور اس کے قبر کا مزار بنا کر چوراہوں پر اس کا بت نصب کروایا جاتا ہے۔ مگر جبران کے نزدیک یہ ایک مردہ معاشرے کی علامت ہے کہ جہاں شاعروں اور ودیبوں کی قدر نہیں کی جاتی اور ایسا معاشرہ کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ جہاں لفظوں کی قدر اور عظمت نہیں وہاں لوگ بہرے اور گونگے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"اب اس گھر میں، مٹی کے ایک ڈھیر اور ان اوراق کے سوا، جو اندھیرے میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، اور کچھ نہ تھا۔

صدیاں بیت گئیں اور اس شہر کے رہنے والے، بے حسی، لاپروائی اور سکھ چین کی نیند سوتے رہے۔ بالآخر جب وہ بیدار ہوئے اور ان کی آنکھیں صبحِ معرفت کے نور سے روشن ہوئیں تو انھوں نے "میدانِ عام" میں اس شاعر کا بت نصب کیا اور ہر سال اس کی برسی منانے لگے۔

آہ! انسان کی نادانی!"(۱۵۸)

مگر ایسا بھی تب ہوا کہ جب اس شہر کے لوگوں پہ نورِ معرفت کی تجلی نے اپنا آپ ظاہر کیا نہیں تو یہ لوگ ازلی اندھے اور بہرے تھے اور انھوں نے اسی غم اور زعم میں مر جانا تھا۔

انتظار کے ہاں بھی ایسے افسانے ملتے ہیں کہ جن میں شاعر کی قدر نہیں اور الفاظ مر چکے ہیں اور اپنا مطلب گنوا چکے ہیں۔ ایسے افسانوں میں کہانی بڑی دلچسپی سے آگے بڑھتی ہے اور اپنے منطقی انجام کو پہنچتی ہے۔ آخری آدمی اور زرد کتا ایسے ہی موضوعات پر دو مسلسل کہانیاں ہیں کہ جس بستی میں انسان نے خدا سے مکر اور فریب کیا ان کو بندر بنا کر سماعت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور دوسری کہانی میں روحانی اور معاشرتی گراوٹ کے باعث لفظ سامع سے محروم ہو جاتے ہیں اور جہاں لفظ سامع سے محروم ہو جائیں وہاں لفظ اپنی موت مر جاتے ہیں اور معاشرہ روحانی انحطاط کا شکار ہو کر زوال آشنا ہو جاتا ہے۔ اس طرح لفظوں کے مر جانے سے زندگی کی معنویت ختم ہو جاتی ہے سجاد باقر رضوی اس لایعنیت کے متعلق کہتے ہیں:

"زرد کتا نفسِ امارہ کے حوالے سے فرد کی روحانی زندگی کے انحطاط کی کہانی ہے۔ مگر یہی بات معاشرتی انحاطاط کی وجہ بھی بن جاتی ہے۔ نفس کا دوزخ بھرنے والے "آخری آدمی" میں بندر بن جاتے ہیں اور اس کہانی (زرد کتا) میں وہ سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ روحانی طور پر انحطاط پذیر معاشرے میں صاحبِ کلام منہ پر تالا ڈال لیتے ہیں اور زندہ انسان سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یوں لفظ مر جاتے ہیں اور لفظوں کی موت سے زندگی کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔"(۱۵۹)

رضوی صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ جہاں لفظ اپنی موت مر جائیں وہاں زندگی کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر انتظار حسین کے افسانے زرد کتا کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں لفظ اپنی معنویت کھو دیں اور زندگی بے معنی ہو جائے صاحبِ علم بات کرنے سے احتراز کریں وہاں مردوں کو زبان اور سماعت مل جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"وہ (سید علی جزائری) قبرستان میں گئے اور منبر پر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا، اس کا عجب اثر ہوا قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔ تب سید علی جزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا: اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو تیرے جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔ یہ فرما کر وہ اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے بستی سے کنارہ کیا اور قبرستان میں رہنے لگے ۔ جہاں وہ مردوں کو خطبہ دیا کرتے تھے۔"(۱۶۰)

اس کے علاوہ بھی انتظار حسین کے ہاں شاعروں ادیبوں اور لفظوں کی حرمت پر باتیں مل جاتی ہیں کہ جب ہر کس و ناکس شاعر اور ادیب ہو جائے اور کلام کہنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم میں کوئی بھی صاحبِ کلام اور شاعر نہیں رہ گیا کیوں کہ جب اچھے برے کی تمیز مٹ جائے تو شاعر اور شعر دونوں کا بستر ا گول ہو جاتا ہے۔ اس پر زرد کتا میں بحث ملتی ہے کہ احمد حجری اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر اور ادیب تھے کہ معاشرے میں ہر کوئی شعر کہنے لگا تو انھوں نے شعر کہنا ترک کیا اور شہر میں ایک گدھے پر سوار ہو شراب بیچا کرتے تھے لوگ انھیں طعنے دیتے کہ شہرت اور عزت چھوڑ کیا فضول کام کرتا ہے مگر وہ اپنی دھن میں لگے رہے مگر ایک دن ان کے گدھے نے بھی ان سے شعر کہہ ڈالا تو تب وہ ڈرے اور گدھے کو شہر کی طرف ہانک کر خود جنگلوں میں نکل گئے۔ اقتباس دیکھیے:

"مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آ کر اڑ گیا۔ انہوں نے اسے چابک رسید کیا تو اس گدھے نے انہیں مڑ کر دیکھا اور شعر پڑھا جس میں تجنیسِ لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دوراہے پہ کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل، احد کہتا ہے مت چل۔ احمد حجری نے یہ سن کر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا برا ہو کہ گدھے کلام کرنے لگے اور احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی سمت ہنکا دیا اور خود پہاڑوں میں نکل گئے۔"(۱۶۱)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں بھی افسانے میں لفظوں کی بے حرمتی اور لایعنیت پر انسان کے معاشرے کا زوال پذیر ہونا اور روحانی انحطاط کا ہونا واضح ہے۔ چونکہ افسانہ نگار اپنی طرز کا انوکھا اور وضع کا ندرت پسند فکشن نگار ہے۔ جس بارے ڈاکٹر شمیم حنفی یوں رقمطراز ہیں:

> "انتظار صاحب ہمارے یہاں اپنی وضع کے شاید آخری فکشن لکھنے والے تھے۔ منٹو، منشی پریم چند اور قرۃ العین حیدر کی طرح جن کی روایت، جن کی بصیرت اور جن کی وراثت ناقابلِ تقسیم ہے۔"(۱۶۲)

جبران اور انتظار دونوں کے ہاں لفظوں کی لایعنیت اور بے معنویت کا ذکر نظر آتا ہے کہ جہاں انسان اندھا، جاہل، گونگا اور بہرہ ہو گیا ہے کہ ایک شاعر، ادیب اور فنکار تک کی قدر نہیں کرتا اور لفظوں کی عظمت سے محروم ہو گیا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے خاص اساطیری اور تمثیلی اسلوب میں کہانی کو بیان کیا ہے جس میں چند حکایات بھی شامل ہو گئی ہیں اور جبران نے اپنے فلسفیانہ اسلوب کے ساتھ کہانی میں رومانیت بھر کر کہانی میں رنگ بھرے ہیں۔ دونوں کے ہاں مقصدیت موضوع میں کھل کر بیان ہوئی ہے اور وہ اپنی اپنی بات کہنے میں کامیاب دکھائی دیے ہیں۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کو اگر بنظرِ غائر دیکھیں تو ان کے ہاں مذہبی عناصر کی بازگشت ضرور نظر آتی ہے کہ ان کے بچپن سے ہی مذہبی حوالے مل جاتے ہیں کہ جن کے ماحول میں یہ دونوں پروان چڑھے۔ تصورِ حیات بالکل واضح ہے کہ انسان کو ہر صورت اپنا، اپنے معاشرے کا خیال رکھنا چاہیے جس کے لیے اپنی جان تک کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے۔ اور ایسی کوئی قربانی بھی نہیں دینی چاہیے جس سے جنگ وجدل کا ماحول گرم ہو اور امن و آشتی کہیں پیچھے رہ جائے۔ اپنے وجود کو بامعنی بنا کر معاشرے میں بہترین رول ادا کرنا چاہیے اور زندگی کسی نہ کسی مقصد میں گزارنی چاہیے ورنہ خدا کے حضور کیا کہیں گے کہ دنیا میں آئے تھے کیا کر چلے۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں مذہبی افکار میں تصورِ حیات کا تقابل کرنے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ موضوعات کا تنوع دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں بہ کثرت پایا جاتا ہے اور انسانی وجود کی عظمت کے حق میں دلائل، انسان کے معاشرتی کردار کی جھلکیاں اور انسانی زندگی کے بامقصد ہونے اور اسے کسی مقصد میں لگانے کے لحاظ سے دونوں نے بھرپور کہانیاں پیش کی ہیں۔ کہانیوں کی بنت اور اسلوب مختلف ہے جس میں جبران کا اسلوب بالکل سادہ اور بیانیہ انداز ہے کہیں کہیں کہانی میں تمثیلی، علامتی اور استعاراتی انداز آجاتا ہے وگرنہ فلسفیانہ انداز میں کہانی جملوں کی روانی سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مگر انتظار کے ہاں اس کے برعکس معاملہ پایا جاتا ہے کہ جس کے اسلوب میں کہانی ایک علامتی، استعاراتی اور تمثیلی انداز میں آگے بڑھتی ہے اور کوئی کوئی کہانی سادی اور سیدھے بیانیہ انداز میں ملتی ہے۔ کہانی کا پلاٹ تہ در تہ پرتوں میں چھپا نظر آتا ہے کہ عام قاری اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور کچھ کہانیوں کے بیان کرنے میں قرآنی اور ملفوظاتی اسلوب اپنایا ہے اور مکالموں کی فضا قائم کر کے مشکل موضوعات کو بہ آسانی قاری تک پہنچایا ہے۔

خلیل جبران کی کہانیوں میں منطقی انجام صاف نظر آنا شروع ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ کہانی کو خود اپنی مقصدیت کی طرف لے جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے کہانی کے اندر ایک لکھاری کے بجائے ایک مبلغ اور ناصح کے ہونے کا گمان گزرتا ہے کہ جو آپ کو ہر لمحے نصیحتیں اور تبلیغ کرنا چاہتا ہے اور کرتا بھی ہے جس سے کہانی قاری پر بوجھ اور لطف کم محسوس کراتی ہے۔ مگر انتظار کے ہاں ایسا نہیں وہ اپنی بات کو بات کے اندر چھپا کر کرتے ہیں کہ جو جہاں پہنچنا چاہے بہ ہمتِ علم غواصی کر لے اور اپنے حصے کے موتی چن لے۔ کہانی اپنا مفہوم ادا کرتی جاتی ہے اور کہیں بھی لکھاری اور ادیب کے مبلغ اور ناصح ہونے کا گمان نہیں گزرتا۔

جبران کے ہاں مذہبی عناصر کی بازگشت اس کے گھریلو ماحول اور ماں کی تربیت کے باعث آگئی جو کہ اپنے بیٹے کو لے کر فلک شگاف بلند عمارتوں کے شہر نیویارک میں آگئی اور یہاں اس کی تربیت اپنی مرضی سے کی اور جو بچپن میں اس کی گھٹی میں مذہبی عناصر اور تعلیمات رکھ دی تھیں اب ان کو اور بھی پختہ کیا اور اس پہ جلتی کا کام اس کی ہجرت اور وطنِ مالوف کی محبت نے کیا اور اس طرح جبران کی شاعری اور نثر دونوں میں

مذہبیت اور ہجرت کے دکھ کے ساتھ ساتھ وطن کی مٹی کی خوشبو کا بھی حوالہ آنے لگا اور وہ وطن کی محبت میں قلم چلاتا رہا اور موتی رولتا رہا۔ اس کی آخری خواہش بھی اپنے وطن میں دفن ہونا تھی جو کہ بعد از مرگ پوری ہوئی۔ اپنی کہانیوں میں مضبوط ترین مذہبی حوالے لے کر آیا اور خصوصاً بائبل عہد نامہ جدید و عتیق اور اساطیر کی دنیا میں مذہب کو استعمال کر کے دکھایا کہ انسان ہر حالت میں مذہبی حوالوں میں گھرا رہتا ہے۔

انتظار حسین اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا اور باپ اسے مذہب کی ہی دنیا میں رکھنا چاہتے تھے اور اسے ایک عالمِ دین اور نیک انسان بنانا چاہتے تھے جس وجہ سے انگریزی سے نفرت سکھائی گئی اور مذہبی کتابوں میں اسے گھیر دیا گیا اور یہ بچہ بھی اپنے بچپن سے ہی مذہبی ماحول میں آ گیا۔ سنبھلا تو ہجرت کا کرب اور دکھ اس کی کہانیوں میں آ گیا اور پھر مہاجر ہونے کا دکھ نئی سرزمین پہ اسے ستانے لگا۔ اپنی جڑوں کی تلاش اور اپنی تہذیب سے وابستگی انتظار کا مضبوط حوالہ بن گیا اور ساری عمر اس نے انھیں کی تلاش میں قلم چلایا اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کرتا رہا اور بچھڑی زمین کے ساتھ ساتھ بچھڑے لوگوں کا بھی نوحہ لکھتا رہا۔ کہانیوں میں مذہبی حوالے اور تقسیمِ ہند سے پہلے مذہبی آزادی اور بعد میں مذہبی رسومات کی ادائیگی میں رکاوٹ اس کے افسانوں کا موضوع بنی اور اس نے آنسوؤں سے کئی ایک کہانیاں لکھیں اور آنکھوں دیکھے واقعات پر بھی قلم چلایا اور اپنے دکھ میں سب کو شریک کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی۔ اپنی کہانیوں میں مذہبی حوالے، قرآنی آیات اور واقعات کو جگہ دی عہد نامہ عتیق و جدید اور جاتک کہانیوں کے ساتھ ساتھ مہابھارت اور وید تک کے مذہبی حوالے اس کی کہانیوں میں مل جاتے ہیں۔

انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ انسان جس ماحول اور تربیت میں رہتا ہے ویسا ہی بن جاتا ہے یا پھر ویسا ہی سوچنا شروع کر دیتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ویسی ہی عادتیں اور خصائل آدمی میں پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ انسان کی فکر بھی اسی طرح پروان چڑھتی ہے۔ کسی پر تربیت کا اثر، کسی پر صحبت کا اور کسی پر کتابوں کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ تمام عمر انسان ویسا ہی ہو کر جیتا رہتا ہے۔ فکر کے پروان چڑھنے اور اس کے ارتقا میں انسانی معاشرے، لوگوں، کتابوں اور علم کا بہت عمل

دخل ہے۔ یا تو آدمی ایک ماحول میں رہ رہ کر ویسا ہو جاتا ہے یا پھر اس ماحول کے خلاف ہو جاتا ہے اور اس کی خامیوں خوبیوں پر اچھی طرح خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔ اسی لیے ایک صاحبِ علم شخص ساری عمر لوگوں اور کتابوں سے سیکھتا رہتا ہے اور اس کے نظریات میں بھی بدلاؤ آتا رہتا ہے اور اگر کسی انسان کی زندگی میں فکری ارتقا نہیں ہو رہا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ انسان نہ مشاہدے کی قوت رکھتا ہے اور نہ ہی اس نے اپنی صحبت کو بدلا ہے اور نہ ہی مزید اس نے مطالعہ کیا ہے۔ گویا انسانی فکر اور میلانات کا ارتقا اس کی صحبت، علم اور پرورش و تربیت پر منحصر ہے اور پھر یہ ویسا ہی سوچتے ہوئے ویسا ہی ادب تخلیق کرے گا۔

یہی بات ان دونوں ادیبوں پر صادق آتی ہے کہ دونوں نے اپنے ماحول، ثقافت، تہذیب اور گردونواح سے جو کچھ لیا من و عن اسے ویسا ہی دنیا کو لوٹا دیا۔ خلیل جبران کا اسلوب بلند بانگ نعروں پر مشتمل رہا اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بپھرا سمندر اپنی موجوں کی روانی میں طلاطم کے ساتھ چیخ چنگھاڑ رہا ہے اور انتظار حسین کا اسلوب دھیما اور شائستہ ہے کہ کہیں بھی تبلیغ یا نصیحت کا گماں نہیں ہوتا بل کہ اس کا اسلوب ایسا ہے کہ جیسے سمندر کی اندرونی کیفیات ہوتی ہیں کہ اندر ہی اندر پیچ در پیچ منجدھار اور گرداب چلتے چلے جاتے ہیں اور دیکھنے والی نگاہ دیکھ لیتی ہے کہ یہ پانی کس قدر خطرناک ہے اور عام انسان کی آنکھ اس کے اندر چھپے رازوں تک اور علائم و رموز تک نہیں پہنچ سکتی جسے انتظار حسین نے علامتوں کے اندر گوندھ کر پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۴

۲۔ نعیم صدیقی، ہمارا ادبِ مطلوب، مشمولا: اسلامی نظریہ ادب، سید اسعد گیلانی، اختر حجازی (مرتبین)، ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۹۷

۳۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۷-۳۹۶

۴۔ شرابِ کہنہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، ص ۴۰۸

۵۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۶

۶۔ گل خزاں رسیدہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، ص ۴۰۸

۷۔ انسان کی تکمیل، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۳۷

۸۔ آتشیں حروف، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۸۷

۹۔ ایضاً، ص۴۸۸

۱۰۔ قیدی بادشاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۳۲

۱۱۔ عقاب اور لوا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۷۷

۱۲۔ انار کی قیمت، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۹۸

۱۳۔ مامتا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۰۴

۱۴۔ خطاب بہ لحد، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۲۸۔۶۲۷

۱۵۔ یہ دنیا ہماری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۶۷

۱۶۔ میں اور دانائی، مشمولہ: جوانی اور محبت، خلیل جبران، مکتبۂ اردو ادب، لاہور، س ن، ص۸۹

۱۷۔ انسان اور فطرت، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص۱۷

۱۸۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص۲۹

۱۹۔ ایضاً، ص۳۳

۲۰۔ ہارون الرشید، پروفیسر، اردو ادب اور اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۴۴

۲۱۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۳۹۶

۲۲۔ جل پریاں، مشمولہ: اشک و تبسم، خلیل جبران، مترجم: حبیب اشعر دہلوی، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۳۲

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۲۴۔ غلامی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۲۰

۲۵۔ بڑا دن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۳۶۔۵۳۵

۲۶۔ تیراک، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۴۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۴۹

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۵۰

۲۹۔ جرمِ غربت، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۹۲

۳۰۔ شمع سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۱۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۶۱۹

۳۲۔ انسان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۴۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۶۴۴

۳۴۔ پوشیدگی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۴۵

۳۵۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۳۳

۳۶۔ میرے بھائیو، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۷۵۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۵۲

۳۸۔ علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، تخلیقات بیگم روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۵

۳۹۔ بازیافت، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۹۳-۳۹۲

۴۱۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۳۹۷۔۳۹۶

۴۲۔ مجرم، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۱۳

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۱۴

۴۴۔ جل پریاں، مشمولہ: اشک و تبسم، ص ۳۴

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۶

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۷

۴۷۔ اے ملامت کار، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۴۱

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۴۲

۴۹۔ ملاقات، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۴۶

۵۰۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۷۰

۵۱۔ شاعر کی زندگی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۷۴

۵۲۔ جب طوفان گزر گیا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۰۰

۵۳۔ غلامی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۱۸

۵۴۔ بڑا دن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۳۴

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۳۴

۵۶۔ ہم اور تم، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۶۲۔۵۶۱

۵۷۔ لباس، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۹۰

۵۸۔ میدانِ حرب، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۴۱

۵۹۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۲۸

۶۰۔ انتظار حسین، قیوما کی دکان، مشمولہ: گلی کوچے، شاہین پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۲ (بار اول)، ص ۲۸

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۰

۶۲۔ انتظار حسین، خرید و حلوبیسن کا، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۴۲، ۴۳

۶۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۹۸

۶۵۔ انتظار حسین، چوک، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۵۱

۶۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۶۷۔ ایضاً، ص ۵۱۔۵۲

۶۸۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۱

۶۹۔ انتظار حسین، اجودھیا، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۸۶۔۸۷

۷۰۔ انتظار حسین، ایک بن لکھی رزمیہ، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۹۶

۷۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانے کی تنقید، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۹

۷۲۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۰

۷۳۔ انتظار حسین، استاد، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۲۵۹

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۸۰

۷۵۔ ایضاً، ص ۲۸۱

۷۶۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، انتظار حسین: تہذیب، معانی اور تجربہ، مشمولہ: ادبیات (انتظار حسین نمبر)، سہ ماہی، شمارہ نمبر ۱۱۱۔ ۱۱۲، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۷۹۔ ۲۸۰

۷۷۔ انتظار حسین، اصلاح، مشمولہ: کنکری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۵ (بار اول)، ص ۶۴

۷۸۔ ایضاً، ص ۷۸

۷۹۔ ایضاً، ص ۷۷

۸۰۔ انتظار حسین، اصلاح، مشمولہ: کنکری، ص ۲۱۲۔ ۲۱۳

۸۱۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ (بار اول)، ص ۲۵

۸۲۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۴۱

۸۳۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، انتظار حسین: تہذیب، معانی اور تجربہ، مشمولہ: ادبیات (انتظار حسین نمبر)، سہ ماہی، شمارہ نمبر ۱۱۱۔ ۱۱۲، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۸۲

۸۴۔ ایضاً، ص ۲۸۰

۸۵۔ انتظار حسین، کایا کلپ، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۹۰

۸۶۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ (بار اول)، ص ۲۴

۸۷۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۹

۸۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۸۹۔ ایضاً، ص ۳۰

۹۰۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان،، ص ۴۹۔۵۰

۹۱۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۸۶

۹۲۔ انتظار حسین، شرم الحرم، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۳۱

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۹۴۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵۳

۹۵۔ انتظار حسین، کانا دجال، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۴۳

۹۶۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۰

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۹۸۔ انتظار حسین، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۲۲۳۔۲۲۴

۹۹۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۱۰۰۔ انتظار حسین، کلیلہ چپ ہو گیا، مشمولہ: شہر زاد کے نام، سنگِ میل، لاہور، ۲۰۰۲ء (بار اول)، ص ۱۴۲

۱۰۱۔ انتظار حسین، عقیلا خالا، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۱۵۲

۱۰۲۔ سجاد باقر رضوی، دیباچہ، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۰

۱۰۳۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۴

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۰۵۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، انتظار حسین شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان،، ص ۴۹

۱۰۶۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۹۹

۱۰۷۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۲

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۰۹۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۸۶

۱۱۰۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۳۴۲

۱۱۱۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۱

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۱۴۔ انتظار حسین، دوسرا راستہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۷۵

۱۱۵۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۳۶۰

۱۱۶۔ انتظار حسین، بیرم کاربونیٹ، مشمولہ: خالی پنجرہ، سنگِ میل، لاہور، ۱۹۹۳ء (بار اول)، ص۱۷۶

۱۱۷۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، ص۳۹۶

۱۱۸۔ انتظار حسین، قیوما کی دکان، مشمولہ: گلی کوچے، ص۳۰

۱۱۹۔ شرابِ کہنہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، ص۴۰۸

۱۲۰۔ انتظار حسین، ایک بن لکھی رزمیہ، مشمولہ: گلی کوچے، ص۸۷

۱۲۱۔ گل خزاں رسیدہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، ص۴۰۸

۱۲۲۔ انتظار حسین، چوک، مشمولہ: گلی کوچے، ص۵۱

۱۲۳۔ انسان کی تکمیل، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۳۷

۱۲۴۔ انتظار حسین، اجودھیا، مشمولہ: گلی کوچے، ص۸۶۔۸۷

۱۲۵۔ آتشیں حروف، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۸۷

۱۲۶۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۳۹

۱۲۷۔ قیدی بادشاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۳۲

۱۲۸۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص۲۹

۱۲۹۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۴۱

۱۳۰۔ انتظار حسین، ٹانگیں، مشمولہ: آخری آدمی، ص۱۰۳

۱۳۱۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۳۵

۱۳۲۔ انتظار حسین، کایاکلپ، مشمولہ: آخری آدمی، ص۹۰

۱۳۳۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۳۹۷-۳۹۶

۱۳۴۔ انتظار حسین، شرم الحرم، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۳۱

۱۳۵۔ جل پریاں، مشمولہ: اشک و تبسم، خلیل جبران، ص۳۲

۱۳۶۔ ایضاً، ص۳۳

۱۳۷۔ انتظار حسین، استاد، مشمولہ: گلی کوچے، ص۲۵۹

۱۳۸۔ ایضاً، ص۲۸۰

۱۳۹۔ غلامی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۲۰

۱۴۰۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۲۵

۱۴۱۔ تیراک، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۵۰

۱۴۲۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۶۰

۱۴۳۔ بڑا دن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۳۶۔۵۳۵

۱۴۴۔ انتظار حسین، کانا دجال، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۴۳

۱۴۵۔ انسان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۴۴

۱۴۶۔ ایضاً، ص۶۴۴

۱۴۷۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۴۱

۱۴۸۔ پروانہ سے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۳۹۷۔۳۹۶

۱۴۹۔ انتظار حسین، عقیلا خالا، مشمولہ: گلی کوچے، ص۱۵۲

۱۵۰۔ جل پریاں، مشمولہ: اشک و تبسم، ص، ۳۴

۱۵۱۔ ایضاً، ص۳۶

۱۵۲۔ انتظار حسین، ایک بن لکھی رزمیہ، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۸۲

۱۵۳۔ ایضاً، ص۸۷

۱۵۴۔ اے ملامت کار، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۴۱

۱۵۵۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۶۱

۱۵۶۔ ایضاً، ص۱۶۷

۱۵۷۔ ملاقات، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۴۶

۱۵۸۔ شاعر کی زندگی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۷۴

۱۵۹۔ سجاد باقر رضوی، دیباچہ، مشمولہ: آخری آدمی، ص۱۰

۱۶۰۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۳۱

۱۶۱۔ ایضاً، ص۲۹

۱۶۲۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا، مشمولہ: مخزن (انتظار حسین نمبر)، شش ماہی، شمارہ نمبر ۳۲، قائدِ اعظم لائبریری، باغِ جناح، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۷

باب سوم:

خلیل جبران اور انتظار حسین کے مذہبی افکار کے فنکارانہ اظہار میں اخلاقی اقدار کا تقابل

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کا مطالعہ:۔

خلیل جبران کا زمانہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا تھا اور خصوصاً لبنان جہاں خلیل جبران نے جنم لیا تھا۔ کوئی بھی معاشرہ خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس کے اندر کچھ نہ کچھ عیوب اور نقائص ضرور رہ جاتے ہیں۔ جو اس ظاہری خوش کن اور صحت مند معاشرے کو اندر ہی اندر گھن لگا دیتا ہے اور کھوکھلا کر دیتا ہے۔ کبھی تو یہ امراض معاشرے کے گندے جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں تو کبھی یہ حکمرانوں کی عیاشی اور نالائقی کے ساتھ اخلاق و قوانین کے فسادات اور انتشار سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو کبھی مذہبی اجارہ اداروں کے

بے جا حرص و طمع اور لالچ سے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی اہلِ قلم اور دانشوروں کی عدم فرض شناسی سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور کبھی عوام کی پست ہمتی اور بزدلی سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر بد قسمتی سے جبران کا دور ان تمام مہلک امراض کا شکار ہو چکا تھا اور معاشرے کا کوئی بھی ایسا شعبی نہیں تھا جو ان تمام امراض میں مبتلا نہ ہو مگر عجیب اتفاق ہے کہ جبران ان تمام امراض کے درمیان رہ کر پلا اور وہ ان سے متاثر نہ ہوا بلکہ ان کے خلاف اس کے اندر لاوا پیدا ہو رہا تھا اور زمانے کی لگام سنبھال کر چلنے کی تمنا بھی۔ خلیل جبران کے عہد کے بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد یوں رقم طراز ہیں:

"جبران کا عہد سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی، اور ادبی غرضیکہ ہر حیثیت سے بد ترین عہد تھا، پورا لبنان سرمایہ داری کی زہریلی وبا، مذہبی پیشواؤں کی بد کرداری اور ادیبوں ،شاعروں کی کم ظرفی اور ملک و قوم کے حالات سے بے التفاتی کا شکار تھا۔ ریاکاری، مکر و فریب، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، زر پرستی، ظلم و ستم اور قوت و جبروت اس دور کے خاص اوصاف تھے، ہر صاحبِ حیثیت خود کو فرعونِ وقت سمجھتا تھا۔"(۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جبران کا عہد کس دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور اسی عہد میں خلیل جبران نے کس طرح لوگوں کے گرے ہوئے اخلاق کو بہتر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی کہانیوں کے ذریعے لوگوں کے شخصی اوصاف، گناہ و ثواب اور جزا و سزا کے معیار کو درست کرنے کی ٹھانی۔

i. گناہ و ثواب کا تصور

یہ گناہ و ثواب کا تصور ہی ہے جس کے ذریعے سے انسان معاشرے میں برے کام سے بچتا اور نیک کام کرنے کی تمنا اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب معاشرے کے گناہ و ثواب کا معیار ہی بدل چکا ہو اور لوگ ثواب کی اصل تشریح سے دور ہوں اور گناہ کی جھوٹی دلدل میں پھنس چکے ہوں تو معاشرہ اپنی اصل سے بھٹک کر دور جا پڑتا ہے اس لیے معاشرے کے اندر گناہ و ثواب کا اصل چہرہ سامنے آنا چاہیے۔ چاہے کوئی

مذہبی معاشرہ ہو یا غیر مذہبی کسی نہ کسی طرح اچھے برے کی تمیز ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے اور اسی سے معاشرے کے گناہ وثواب کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں پروفیسر اکرم رانا لکھتے ہیں:

"مذہب جہاں معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی اقدار کا تحفظ کرتا ہے وہاں انسان کو زندگی میں روزی کمانے اور اسے خرچ کرنے کے ذرائع بھی بتاتا ہے۔ انسان کے اندر حلال وحرام پاک وناپاک کی تمیز پیدا کرتا ہے۔ المختصر زندگی کا کوئی شعبہ ہو مذہب کی ضرورت واہمیت سے انکار نہی کیا جاسکتا۔"(۲)

خلیل جبران نے اپنی کہانیوں کے ذریعے معاشرے لے لوگوں میں یہی شعور پیدا کیا اور انھیں اچھے برے کی تمیز کے ساتھ گناہ وثواب میں فرق سمجھایا۔ اسی طرح جبران نے اپنے افسانے "خانقاہ" میں گناہ و ثواب کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں دو آدمی ایک دور پہاڑ پر موجود خانقاہ کی رہبانیت پر تبصرہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسی کون سی پارسائی کہ انسان معاشرے کی خوشیوں اور غمیوں سے کٹ کر دور چھپا اللہ اللہ کرتا رہے، اس سے تو معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور یہ خدا کے قرب اور نجات ومعرفت کا طریقہ درست نہیں۔ مگر دوسرا دوست اس سے اتفاق کرنے کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے ہاں خود کو اچھا سمجھ کر اچھوں کے بارے میں برے خیالات دل میں لانے سے تو کہیں بہتر ہے۔ مکالمہ سنیے:

"ان میں سے ایک نے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے خانقاہ دیکھ رہے ہو! اس میں ایک راہب رہتا ہے۔ جس نے مدتوں سے دنیا کو تج رکھا ہے۔ اسے صرف خدا کی تلاش ہے اور دنیا کی کسی اور چیز سے اسے رغبت نہیں۔"

دوسرا بولا۔

"جب تک وہ اس خانقاہ اور اس خانقاہ کی تنہائی کو چھوڑ کر دنیا میں واپس نہیں آتا۔ خوشی میں ہمارا ساتھی اور غمی میں ہمارا مونس بننے کے لیے شادی کی محفلوں میں ناچنے والوں کے ساتھ مل کر ناچنے اور موت کے سانحوں پر ،رونے والوں کے ساتھ آنسو نہ بہائے، اسے خدا نہیں مل سکتا!"""(۳)

یہاں تک تو ہمیں گناہ و ثواب کی ایک کنجی اور بھید کی سمجھ آتی ہے اور یہ ہم ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں اور مذاہب بھی اسی کی تلقین کرتے ہیں کہ لوگوں کے دکھ بانٹنے سے ہی اپنے دکھ کم ہوتے ہیں اور خدا کا قرب بھی انھیں لوگوں حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے اور لوگوں کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ خود کو گناہوں سے بچا کر خدا کا قرب حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ انسان دوسرے انسان سے بھی باخبر نہ ہو۔ اسی تناظر میں علی عباس جلال پوری نے کہا تھا:

"ذاتی نجات کے حصول کے لیے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ دنیا سے کنارہ کشی کر کے تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے اور اس دنیا میں عوامی بہبود کے لیے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں غلطاں رہے ہیں۔ جس سے معاشرے کی ترقی پرور قوتوں کو ناقابلِ بیان صدمات پہنچتے رہے ہیں۔ قدما کے خیال میں فرد معاشرے کے لیے ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کے لیے نہیں ہوتا۔"(۴)

یہاں تک تو ہمیں پہلا نظریہ ہی نظر آتا ہے مگر جبران گناہ و ثواب کا دوسرا نظریہ بھی ہمارے سامنے رکھتے ہیں اور تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی دوسرے سے خود کو اچھا سمجھ کر اس دوسرے پر بے جا تنقید کر کے خود کو ثواب کار ثابت نہیں کرنا چاہیے۔ نہیں تو ہم سے تو وہ ہی اچھا رہے گا جو دنیا کی غیبت اور برائی کرنے سے بہتر خدا سے لو لگائے دنیا سے منھ چھپا کر بیٹھا ہے۔ اسی افسانے کے آخری حصے میں پہلا آدمی دوبارہ گویا ہوتا ہے:

"پہلا اگرچہ قائل ہو چکا تھا کہنے لگا۔

”تم نے جو کچھ بھی کہا مجھے اس سے اتفاق ہے۔ لیکن پھر بھی، یہ میرا ایمان ہے کہ راہب بہت اچھا آدمی ہے اور کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک بھلا آدمی ہزاروں ایسے لوگوں سے دور ہی رہے جو اپنے آپ کو بھلا سمجھتے ہیں۔““(۵)

یہ ہمارے گناہ ثواب کے نظریے کا دوسرا رخ ہے جس کو ہمیں ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہیے۔

جبران اپنے ایک اور مختصر افسانے ”یہ دنیا ہے!“ میں بھی گناہ وثواب کا نظریہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ جس میں ایک ایسے نیک و پارسا شخص کا حال بیان کیا ہے جو خود تو دوسروں کا نیک کام کرنے کی تلقین کرتا ہے مگر خود نیک کام نہیں کرتا۔ اس افسانے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں نیک آدمیوں کو بھی دنیاداری سے کچھ حاصل کرنے کی تلقین نظر آتی ہے۔ کیوں کہ جبران کا ماننا ہے کہ یہ تو ہمیں حکم ہے کہ وہ بات نہ کہو جو خود نہیں کرتے مگر ہم اس بات میں تخصیص نہیں کرتے کہ کیا کیا کام ہمیں کرنے چاہییں۔ مثلاً ایک نیک آدمی دوسروں کو سخی ہونے اور مخیر ہونے خیرات کرنے کا درس دیتا ہے مگر خود اس لیے خیرات نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس دولت نہیں ہے اور اس نے اس دنیا سے کبھی دل نہیں لگایا۔ یا وہ نیک آدمی اس دنیا سے کچھ بھی لینا نہیں چاہتا تو مصنف کا کہنا یہ ہے کہ ایسی نیکی کی تلقین بھی نہیں کرنی چاہیے جو آپ خود نہ کر سکتے ہوں۔

”آج سے ان گنت سال پہلے ایک راہب رہتا تھا۔ وہ مہینے میں تین بار شہر جاتا اور چوک میں کھڑے ہو کر لوگوں کو باہمی اشتراک و بخشش کی نصیحت کرتا، اس کے بیان میں زور تھا اور زبان میں اثر۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی!“(۶)

ایک شام تین لوگ اس راہب سے ملنے آئے اور گفتگو کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم حاجت مند ہیں لہٰذا آپ ہماری مدد کیجیے۔ کیوں کہ آپ ایک نیک اور پارسا شخص ہیں اور لوگوں میں دوسروں کی مدد کرنے کا کہنا آپ کا دستور ہے۔ تو اب آپ ہماری مدد کیجیے۔ تو آگے سے راہب نے جواب دیا:

"میرے دوستو! میرے پاس اس بستر، چٹائی اور لوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ کے یہ کسی کام آسکیں تو انھیں لے جایئے، اس کے علاوہ میرے پاس نہ چاندی ہے نہ سونا!"

اس پر وہ ناراض ہو کر چل دیے۔ مگر تیسرا جاتے جاتے دروازے میں رک گیا اور کہنے لگا۔

"تم دھوکے باز ہو، تم فریبی ہو۔ تم مکار ہو۔ تم دوسروں کو ایسی نیکی کی تلقین کیوں کرتے ہو، جس پر خود عمل نہیں کرسکتے!""[۷]

تیسرے آدمی کی گفتگو ہی ہمارے گناہ و ثواب کے دہرے معیارات کی قلعیاں کھول رہا ہے۔ یقیناً ہمیں اس بات کا درس دینا چاہیے جس پر ہم خود بھی عمل کر سکیں اگر نہیں کر سکتے تو کم از کم دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو نویدوں اور وعیدوں کے جھنجھٹوں سے دور رکھنا چاہیے۔

جبران نے گناہ ثواب کے موضوع پر دلکش کہانیاں لکھی ہیں جو کہ جبران کے اسلوب کا کمال ہیں اور ان کہانیوں کو پڑھ کر ایک خاص شاہکار فنکار کے فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جبران نے اپنے افسانے "تارک الدنیا" میں بڑے ہی عمدہ اسلوب کے ساتھ گناہ و ثواب کے فلسفے کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے خود کو متکلم کے طور پر پیش کر کے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ جس میں وہ کسی تارک الدنیا بزرگ سے ملتا ہے جو دنیا کو تیاگ کر دور ایک پہاڑی پر دن رات عبادت کرتا ہے اور اسی پوجا پاٹ میں مصروف رہتا ہے۔ دل کا سچا اور نیت کا سُچا شخص ہوتا ہے۔ ایک دن ایک ڈاکو اس کے پاس اپنے گناہوں کے ازالے اور معافی کے لیے آتا ہے اور وہ جس جس گناہ کو بخشوانے کے لیے بتاتا ہے، ساتھ ہی وہ بوڑھا نیک شخص بھی خود کو اسی گناہ میں ملوث بتاتا ہے تاکہ وہ ڈاکو خود کو اور اس بزرگ کو اپنے جیسے ہی پائے اور خوشی و اطمینان سے زندگی گزارے اور وہ گیت گاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ جبران کی اس کہانی کا ایک اقتباس دیکھیے:

"ڈاکو نے کہا۔ "میں نے ان گنت جرم کیے ہیں۔"

درویش کہنے لگا۔ "میں نے خود بھی لاتعداد جرم کیے ہیں۔"

تب وہ ڈاکو اٹھ کھڑا ہوا اور درویش کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں اک عجیب سی تھکاوٹ تھی اور جب وہ ہم سے الگ ہوا تو وہ پہاڑی سے جست لگا تا گیا۔

میں درویش سے مخاطب ہوا اور کہا۔ "آپ نے خود کو ناکردہ گناہوں کا مجرم کیوں ٹھہرایا۔ کیا آپ کا یہ خیال نہیں کہ یہ آدمی آپ سے بد ظن ہو کر گیا ہے۔"

درویش نے جواب دیا۔ "یہ درست ہے کہ اب اسے مجھ پر اعتقاد نہیں رہا لیکن وہ یہاں سے بے حد مطمئن گیا ہے۔""(۸)

یہ اقتباس افسانے کا آخری حصہ ہے۔ مگر پورے افسانے کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔ جس میں اندازہ ہوتا ہے کہ گناہ و ثواب کا تصور جبران کے ہاں یہ ہے کہ لوگوں کی خوشیاں اور ان کی آسانیاں ہی آپ کو اصل ثواب دے سکتی ہیں اور دل کا سکون بھی۔

انسان کے دل پر سے گناہ و ثواب کی کشمکش کا بوجھ کبھی بھی ہلکا نہیں ہوتا۔ بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے کیے ہوئے گناہوں کا پچھتاوا اور بھی زیادہ ہونے لگتا ہے اور اس وقت گناہ اور بھی شرمندہ کرنا شروع کر دیتے ہیں جب کہ آپ معاشرے کی نظر میں ایک نیک، پارسا اور متقی انسان ہوں اور اس وقت آپ کی کیا حالت ہو گی جب آپ ایک نیک و پارسا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عالمِ دین یا پھر پادری ہوں اور لوگ آپ کے پاس اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے آتے ہوں۔ آپ دوسرے لوگوں کو تو گناہوں سے چھٹکارا دلوا دیں گے کہ وہ آپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے ہیں مگر آپ اپنے گناہوں کا اقرار کس سے اور کس کے سامنے کریں گے۔

اسی تناظر میں جبران نے ایک افسانہ "پسِ پردہ" لکھا ہے جس میں ایک پادری ایک خوبصورت عورت سے پیار کرتا ہے مگر وہ اپنے اسٹیٹس اور رتبے کی وجہ سے کبھی اس سے کہہ نہیں سکتا مگر دل ہی دل میں

اس سے پیار کرتا ہے۔ ایک دن وہ لڑکی فوت ہو جاتی ہے اور اس کا خاوند بھی پاس ہی ہوتا ہے تو پادری اس کو پاس بلا کر اس لڑکی کے لیے بخشش کی دعا کرتا ہے اور پھر اس کے خاوند کو تسلی دے کر کمرے سے باہر بھیج دیتا ہے۔ بعد میں اس لڑکی کو فرطِ محبت و جذبات میں چومنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے لیے وہ خود کو روک نہیں پاتا۔ لاش کو چومنے کے بعد اس کے دل میں ایک قسم کی شرمندگی پیدا ہوتی ہے حالانکہ اسے دیکھا کسی نے بھی نہیں اور گناہ و ثواب کا ایک سیلاب امڈ تا ہے اور وہ اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگنے لگتا ہے۔ شاید اسی لیے مصنف نے اس کہانی کا نام "پس پردہ" رکھا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"۔۔۔۔۔۔سرگوشی کے انداز میں یہ الفاظ کہہ کر وہ لاش پر جھک گیا اور اس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کے بوسے لینے لگا۔۔۔۔۔۔طویل، گرم اور خاموش بوسے۔۔۔۔وہ مقدس بوسے جو اس کی روح کے ان تمام اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے، جن کا تعلق محبت اور غم سے تھا!

اچانک وہ پیچھے ہٹا اور خزاں زدہ پتہ کی مانند، زمین پر گر پڑا۔ گویا راحیل (لڑکی کا نام) کے برفانی چہرہ کے لمس نے جذبہ ندامت کو اس کے باطن میں بیدار کر دیا تھا۔

وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دوزانوں بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما! میں آخر وقت تک ثابت قدم نہ رہ سکا اور ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔۔۔۔۔یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!""[۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے ایک بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کسی بھی وقت گناہ کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ مگر اس کے دل میں گناہ و ثواب اور اس کی جزا و سزا کا معیار ہمیشہ ذہن نشین رہنا چاہیے۔ جیسے پادری نے

گناہ پس پردہ کیا مگر پھر بھی خدا سے گڑ گڑا کر معافی کا خواستگار ہوا۔ اس کہانی سے ہمیں یہ سبق بھی حاصل ہوتا ہے کہ گناہ چاہے چھپ کر بھی کیا جائے اس کی معافی ایسے ہی مانگو جیسے کسی نے دیکھ لیا ہو۔ دوسرا یہ کہ ہمارے مذہبی رہنما بھی گناہوں سے پاک و مبرا لوگ نہیں ہیں۔ یہ بھی غلطیاں اور گناہ کرتے ہیں اگرچہ یہ چھپ کر اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر گناہ کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو ہم سے زیادہ شرمندگی خدا کے حضور ہوتی ہے۔ جس کا اظہار مندرجہ بالا اقتباس میں پادری نے کیا ہے۔

جب انسان دنیاداری میں پڑ جاتا ہے اور اپنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگتا ہے تو اسے اس بات کا بھی احساس نہیں رہتا کہ وہ ہوس و ہوا میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے کہ گناہ و ثواب کا امتیاز بھی اس نے بھلا دیا ہے۔ بل کہ اسے پھر مال ہی مال نظر آتا ہے اور اسے مطلق اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ میں کسی کو جواب دہ بھی ہوں۔ گناہ و ثواب سے بیگانہ انسان پھر کیا کیا کچھ کر گزرتا ہے اور اسے بالکل بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مالک کے قرب سے کتنا دور ہو چکا ہے اور کتنا معتوب ہے۔

جبران نے انسان کے اسی گناہ و ثواب کے رویے اور من مانی دنیا بسا لینے اور اس قائم دنیا میں اپنی مرضی کے قوانین بنا لینے پر ایک خوبصورت کہانی "یہ دنیا ہماری" لکھی ہے۔ جس میں جبران نے خدا کو بھی متوجہ کیا ہے اور خدا سے مخاطب ہو کر اسے دنیا کے بدلتے ہوئے منظر نامے اور لوگوں کی بے پروائیوں سے آگاہ کیا ہے اور خدا کو بتایا ہے کہ یہ دنیا بالکل بھی گناہ و ثواب سے بیگانی ہو گئی ہے اور اسے احساس تک نہیں کہ جو کام یہ اپنے فائدے کے لیے کر رہی ہے، مستقبل میں اس کے کس قدر غلط نتائج نکلیں گے یا پھر یہ سارے کام دوسروں کو دھوکا دے کر کیے جا رہے ہیں۔ جبران افسانے میں کہتا ہے:

"اے گمشدہ روحوں کے خدا تو جو خود دیوتاؤں میں کھویا ہوا ہے۔ میری آواز سن۔

ہاں ہماری پاگل آوارہ روحوں کی نگرانی کرنے والے میرے الفاظ پر توجہ صرف کر۔

میں ایک نامکمل ہستی ہوں لیکن ایک کامل قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں انسانیت کے منتشر عناصر کا مجموعہ ہوں۔ میں ایک ایسی کامل دنیا میں رہتا ہوں جس کے لیے قوانین اور ضابطے مکمل اور جن کے تصورات دائرہ تحریر میں آسکتے ہیں۔

اے مالک ان کی نیکیاں گنی ہوئی اور گناہ تلے ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ لاتعداد ایسی چیزیں جو شام کے دھندلے میں گناہ اور ثواب سے ماورا ہیں، شائع اور درج کی جاتی ہیں۔"(۱۰)

اس بات میں شک نہیں کہ اگرچہ اے خدا ہمارے اعمال گناہ و ثواب بالکل لکھے اور تولے ہوئے ہیں اور ہم اپنے تمام اعمال کا تجھے جواب دہ بھی ہیں مگر پھر بھی شام ہوتے ہی لوگ اپنی ہی طرز کے اعمال اور کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہاں دن رات اور اس کے چال چلن پر سخت اور کڑی پہرے داری بھی ہے اور تمام اعمال موسموں کی طرح تقسیم کیے ہوئے ہیں اور پھر انھیں اصولوں کی کڑی زنجیروں میں خوب جکڑا ہوا بھی ہے تو پھر لوگ کیوں اے خدا تیرے اختیار سے باہر ہیں اور یہ سب کچھ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

جبران نے اس افسانے کا اختتام اپنے ہونے اور نہ ہونے کی وجوہ پر کیا ہے اور خدا کے ہونے پر بھی ایک سوالیہ نشان چھوڑا ہے کہ ہم اس دنیا میں کیا کیا کچھ کرتے چلے جا رہے ہیں اور اے ہمارے خدا تو کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

جبران کے افسانوں اور کہانیوں پر نظر ڈالیں تو ایک خاص قسم کی کسک اور درد ہمیں دکھائی دیتا ہے جو وہ انسانیت کی کلبلاتی، تڑپتی اور بے بس زندگی میں دیکھتا ہے۔ ایک فلسفی، شاعر اور ایک ماہر کہانی کار ہی ایسا درد اپنے اسلوب کا شاہ کار بنا کر پیش کر سکتا ہے اور انسانی ہمدردیوں اور مصائب پر جبران کے کئی ایک افسانے بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انسانی تباہ کاریوں اور زمانے سے اپنی بے التفاتی پر مصنف موصوف نے بار بار لکھا ہے اس کی وجہ مصنف کی زمانے اور بالخصوص اپنے معاشرے کے پسے ہوئے خیالات پر گہری نظر تھی اور اسی وجہ سے اس کے افسانوں میں زمانے کی بے درد ہوا کے سامنے ایک بند باندھنے اور جہالت کے خلاف لڑنے کی ایک خاص تڑپ ملتی ہے۔ اسی تڑپ اور اسی درد کو جبران نے اپنے افسانے "انسان دیوتا" میں بڑی خوبصورت اور

رعنائیِ اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا پر آنے والے مصائب اور مشکلات میں کافی انسان کے گناہوں کا بھی ہاتھ ہے اور انسانی اعمال ہی انسان کو مصیبتوں اور مشکلات میں گھیرتے ہیں۔ اس افسانے کو پڑھیں تو لگتا ہے کہ جبران ہمیں سیدھا یہی کہنا چاہ رہے ہیں کہ انسان اگر اپنے اعمال کو ٹھیک کرلے تو یہ دنیا ضرور بالضرور امن کا گہوارہ بن سکتی ہے اور اسی دنیا کو ہم جنت نظیر کہہ سکیں گے۔

اس افسانے میں جبران نے دنیا کے حسین و جمیل مناظر کو دکھایا ہے جہاں بہاروں کی آمد، جھرنوں کا تسلسل کے ساتھ بہنا، پرندوں کا خوشی میں چہچہانا، گل ہائے رنگا رنگ کا مسکرانا اور ایسا مسکرانا کہ انسانی روح مسرت سے بھر جائے۔ انسانی ذہن مطمئن ہے اور یہاں تک کہ قناعت بھی کر سکتا ہے۔ مگر انسانی اعمال اور کردار کی وجہ سے زمین اتنے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکی اور ایکا ایکی ہی دنیا نے ان گناہوں کے بوجھ کو گرانے کے لیے حرکت کی اور تمام کے تمام مناظر دھوئیں کا ڈھیر بن کے رہ گئے۔ جس سے دفعتاً فطرت کی آنکھیں پھر گئیں اور وہ شدید غصے اور خفگی کے عالم میں اپنا آپ دکھانے لگی۔ وہ جو خوبصورت شہر تھے وہ نیست و نابود ہو گئے اور اسی ہنستے مسکراتے انسان کو قدرت اور فطرت کی مسکراہٹ و ہنسی ایک خواب معلوم ہونے لگی اور اس کی وہی شیریں لبی ایک کھٹاس اور ترش فضا خیال ہونے لگی۔ فطرت کی مہر و محبت ایک خواب سا نظر آنے لگی اور ہر طرف تباہی ہی تباہی نظر آنے لگی۔

یہ سارا سماں چل ہی رہا تھا کہ اسی تباہی اور آگ کے ہلاکت بار شعلوں اور انسانوں کے تباہ شدہ ملبوں کے نزدیک کھڑے ہو کر روح کچھ سوچ بچار میں مصروف دکھائی دی اور روح ایک خاص فکر میں مبتلا تھی جو گھٹا ٹوپ اندھیرے نت زندگی کے حسن کو راکھ کے کفن میں لپیٹ کر پیدا کر دی تھی۔ یہ فکر اسی تباہی اور ہولناکی پر تھی جو ان ہولناک زلزلوں اور تباہ کن بربادیوں اور ہلاکتوں کے درمیان زمین کی گہرائیوں سے پیدا ہوئی تھی۔ بس! روح محوِ فکر تھی کہ اس نے ان تمام خوشگوار معاملات کو بھی قریب سے اور اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس تباہی کو بھی اپنی ہی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے روح نے ان تمام مصائب کی وجہ انسانی اعمال اور

گناہوں کو قرار دیا۔اسی تناظر میں روح بسیار تفکر اور سوط کے اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ سب کچھ انسانی اعمال کا نتیجہ ہے اور روح یوں گویا ہوئی:

> "اور جس وقت افسردہ اور پژمردہ روح قانونِ فطرت اور اس کی نا انصاف پسندی پر کھڑی غور کر رہی تھی تو سرگوشی کے لہجے میں سکوت وخامشی کے کانوں میں کہنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔آگ ،زلزلے اور طوفان کا زمین کے ساتھ وہی تعلق ہے جو نفرت، حسد اور برائی کا انسانی دل سے ہے۔جس وقت انسانیت نے کائنات کو آہ وبکا سے بھر دیا تھا۔میرے تخیل نے میرے ذہن پر وہ تمام سانحے، تمام المیے اور وہ تمام تعزیریں منعکس کر دیں جو گزشتہ زمانوں کے سٹیج پر پیش ہو چکی ہیں۔"(۱۱)

جبران کے اس افسانے میں موجود کردار "روح" کے بیان سے تو یہی لگتا ہے کہ جبران بالکل اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اپنے گناہ وثواب سے ہی دنیا میں اچھے اور برے حالات کا ذمے دار ہوتا ہے اور جو کوئی اچھے اعمال کرتا ہے وہ ضرور اچھے حالات میں زندگی گزارتا ہے اور جو کوئی غرور، حسد، کبر، نفرت اور برائی میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے ضرار مشکلات اور خدا کے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جس سے چھٹکارا پانا اتنا آسان نہیں اور بعض اوقات تو بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی جان نہیں چھوٹتی اور انسان صدیوں آگے جانے کے بجائے صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے۔

جبران نے اپنے کئی افسانوں میں ایسے ہی خیالات کو بھرپور انداز میں اور کمال اسلوب میں پیش کیا ہے۔وہ انسانوں کو معاشرے میں مثبت رویے اور ایجابی اصولوں پر دیکھنے کا خواہاں تھا۔جس کی زندگی بھر اس نے اپنے قلم سے مقدور بھر کوشش کی۔جبران نے عموماً تو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھے ہیں مگر بعض افسانے اس کے اپنے موضوع کے تقاضے کے حوالے سے طویل بھی ہیں۔ایسے ہی افسانوں میں سے ایک افسانہ "مرشد کا فرمان" بھی ہے۔یہ افسانہ بڑا دلچسپ اور اپنے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے بڑا خاص افسانہ ہے۔اس افسانے میں ایک استاد جو کہ مرشد بھی تھا اپنی زندگی نیک اصولوں اور علمی کمالات کے بل بوتے پہ

گزار کر مر جاتا ہے جس کے جنازے میں شہر لبنان کے بڑے بڑے معزز اور عمائدین آتے ہیں جو اس کے غم میں نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں مگر جنازے کے بعد ہی اس کا ایک شاگرد سامنے آتا ہے جو خود کو اپنے استاد اور مرشد کے علم کا وارث کہتا ہے اور شہر بھر میں اپنے مرشد کے فرامین کو عام کرنے کی سوچتا ہے اور اسی طرح وہ پورے شہر میں جگہ جگہ اپنے مرشد کی تعلیمات اور فرمودات کا پرچار کرنا شروع کرتا ہے۔ جس وجہ سے اس کی شہرت اپنے استاد کے علم اور علمی خیالات کو بیان کرنے کی وجہ ایم شہر سے نکل کر دوسرے شہروں تک بھی پھیل جاتی ہے اور یوں وہ ایک نہایت معتبر اور اعلا درجے کا مبلغ بن جاتا ہے۔ لیکن ابھی بھی وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مرشد واستاد کی تعلیمات اور ان کے فرمودات کو صحیح طریقے سے سمجھنے سے قاصر ہے اس لیے وہ راہبانہ طور پر ایک دفعہ پھر لوگوں سے کٹ کر اپنے استاد کی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے اور یوں مدتوں لوگ اس سے ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں مگر وہ کسی سے نہیں ملتا اور علمی تدبر میں مشغول رہتا ہے اور ایک دن جب وہ دوبارہ وعظ کرنے کے لیے شہر میں نکلتا ہے تو لوگ پہلے سے اس کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں جو اس کا استقبال کرتے ہیں اور اس پر پھول نچھاور کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے علمی سوالات بھی پوچھتے ہیں اور آخر پہ مصنف بتاتا ہے کہ یوں اس شاگرد نے اپنے مرشد کے فرامین پر عمل کرنے سے اپنے مرشد سے بھی زیادہ عزت اور توقیر معاشرے میں حاصل کر لی تھی۔

افسانے کا پلاٹ تو یہی ہے مگر اس سارے افسانے کے دوران مصنف نے جو اپنے خیالات کو بیان کیا ہے اس کی تکنیک کمال ہے کہ وہ شاگرد جہاں بھی اپنے استاد اور مرشد کے فرامین کو بیان کرتا تو لوگوں سے جب مخاطب ہوتا تو انھیں نیکی اور بھلائی اور بہتری کی باتیں بتاتا۔ یوں مصنف نے کمال تکنیک سے اپنے خیالات بیان کیے ہیں۔ اور انھیں خیالات میں گناہ وثواب پر بھی کھل کر بات کی ہے کہ جو لوگ گناہ اور تخریب کی زندگی گزارتے ہیں ان کی زندگی زندگی نہیں بل کہ معاشرے کے لیے اور خود ان کی اپنی ذات کے لیے عذاب ہے اور جو لوگ عمدہ، نفیس اور نیک زندگی گزارتے ہیں ان کا جینا ہی اصل جینا ہے اور وہ معاشرے کو ایک اہم رجحان اور جینے کی امنگ فراہم کرتے ہیں۔ اس افسانے میں جب وہی شاگرد اپنے مرشد اور استاد کے

فرمودات کا چرچہ کرتا ہے تو یہ بھی کہتا ہے کہ گناہ و ثواب کی اس زندگی میں جس نے نیک اعما کیے اور لوگوں کے لیے دن رات محنت کی وہ شخص جب دنیا سے جائے تو اس شخص پر کبھی بھی آنسو نہیں بہانے چاہییں بل کہ خوش ہونا چاہیے کہ اس شخص نے اپنا کام مکمل کیا اور لوگوں کو نیک کاموں کی تبلیغ اور تلقین کر کے دنیا سے رخصت ہوا اور اس کے برعکس وہ شخص جو دنیاداری میں ہی الجھا رہا اور لوگوں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا بل کہ اپنے ذاتی مفاد کو ہمیشہ معاشرتی و قومی مفاد پر ترجیح دیتا رہا اور اس کی زندگی گناہوں میں لتھڑی رہی ایسے شخص کی وفات پر ضرور آنسو بہانے چاہییں کیوں کہ اس نے اپنی زندگی فضولیات میں گنوا دی اور اپنے لیے عذاب کو دعوت دی۔ اسی شاگرد کی زبانی سنیے:

> "ایک حقیقت ہمیشہ یاد رکھو۔ تمھارے آنسوؤں کے وہی لوگ مستحق ہیں جو زندگی کی بارگاہ میں تو حاضر رہتے ہیں لیکن وہ لوگ اپنے ماتھے کے گاڑھے پسینوں سے زمین کو ثمر ور بنانے کے لیے اس پر ایک قطرہ تک نہیں گراتے، ایسے لوگ (نیک لوگ / محنتی لوگ) جب مر جاتے ہیں تو ان کے لیے رونا دھونا ضروری نہیں۔"[۱۲]

جبران نے گناہ و ثواب کے ضمن میں اپنا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ اس پیراگراف سے ظاہر ہے کہ جو لوگ زمانے کے لیے نیکی اور ہمدردی کی راہ ہموار نہیں کرتے ان لوگوں کے ہی جنازوں کے ساتھ ماتم کرنا چاہیے کہ یہی تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے زندگی کے میدان میں شکست کھالی ہے اور اب ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح واپس اپنے گھر کو افسردہ لوٹ رہے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے نیکی اور بھلائی کی راہیں کھولیں اور لوگوں کو سیدھے راستے کی علمی تلقین وہ ضرور بالضرور کامیاب ہوئے اور جو کامیاب ٹھہرے اور مقابلہ جیت کر اپنے گھر کلو لوٹے تو ایسے فاتح کی گھر آمد پر جشن منایا جاتا ہے نہ کہ آنسو بہائے جاتے ہیں۔

قانون اور اس کی بالا دستی کے ساتھ ساتھ نا انصافی پر بھی جبران کے ہاں افسانے اور کہانیاں ملتی ہیں۔ جس میں بڑے خوبصور انداز میں جبران اپنے گناہ و ثواب کے نظریے کو بیان کیا ہے۔ جن سے پتا چلتا ہے کی مصنف موصوف کے ہاں گناہ اور ثواب کا کیا درجہ اور پھر انھیں گناہوں پر کس طرح کی اور کون سی سزا دینا

رواہے اور پھر سزا دینے والے بھی کیسے ہونے چاہییں اور پھر مزے کی بات ہے مصنف اس بات پر بھی کھل کر بات کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بننے والا قانون آخر کس کی ایجاد ہے؟ کیا یہ کسی خاص طبقے کی اجارہ داری کا ہی دوسرا نام تو نہیں؟ ان سب سوالوں کو جبران کے اس افسانے "قانون" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں وہ زمانے کے لوگوں سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ لوگوں کہ گوہیوں اور شہادتوں پر ایک جج کسی کو سزائے موت دے دیتا ہے کہ اس نے گناہ کیا ہے اور لوگوں کی ہی شہادتوں پر اسے جزا کی نوید سنائی جاتی ہے کہ اس نے نیک کام کیا ہے تو آخر یہ قانونی پیچ وخم کس نے ترتیب دیے ہیں کہ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام گناہ اور یہ کام ثواب ہے۔ مصنف نے منصفوں کے طریقۂ واردات اور کارروائی کو بھی نشانہ بنایا ہے اور سب کے سامنے کھل کر کہا ہے کہ یہ گناہ وثواب کا معیار ٹھیک نہیں ہے۔

جو لوگ گناہ وثواب کے غلط معیار کی وجہ سے سولیوں پہ لٹکا دیے گئے اور جو انصاف اور بہادری کے قصور میں دار پر جھول گئے ان کے بارے میں کیسا گناہ اور کیا معیارِ ثواب ہے کہ سزا دینے والا اس لیے سزا دے رہا ہے کہ وہ اپنے معاشرے سے گناہوں کو دور کر رہا ہے اور ثواب ونیکی کی راہ کو ہموار کر رہا ہے۔ افسانے کے آغاز سے ہیں مصنف کچھ یوں گویا ہوتا ہے:

> "آدم کے تین بیٹے کل زندگی کی شاخوں پر جھول رہے تھے لیکن آج وہ موت کی آغوش میں ہیں۔
>
> تینوں نے انسانوں کو ناموس سے روشناس کرنے کی غلطی کی۔ اندھے قانون نے ہاتھ لمبا کیا اور انہیں بے رحمی سے کچل کر رکھ دیا۔
>
> تینوں کو جہالت نے مجرم گردانا کیونکہ وہ کمزور تھے۔ قانون نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ وہ طاقتور ہے۔"[۱۳]

اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر گناہ وثواب کا معیار صرف اور صرف اثر ورسوخ اور آدمی کی ظاہری حالت پر ہے اگر آپ امیر ہیں تو آپ کے گناہ بھی ثواب اور نیکی میں بدلے جاسکتے ہیں اور اگر آپ

امیر اور دولت مند نہیں ہیں تو ہمارے قانون دان ہر پارسائی اور نیک نامی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپ کو گناہ گار ثابت کر کے ہی چھوڑیں گے کیوں کہ آپ کے پاس نہ ہی اتنے پیسے ہیں کہ آپ سچ کا مقدمہ لڑ سکیں اور نہ آپ کے پاس اتنا اثر ورسوخ ہے کہ آپ گواہوں اور قانون کو بکنے سے روک سکیں۔ اسی لیے تو مصنف نے گناہ و ثواب کے جھمیلوں سے بھی آگے بڑھ کر اس بات پر سوال اٹھایا ہے کہ ہمارا یہ قانون ہی غلط ہے کیوں کہ یہ انسانوں نے اپنی بھلائی اور دوسروں کے نقصان کے لیے بنایا ہے اور اس لیے کوئی قانون، قانون نہیں۔ کوئی ثواب، ثواب نہیں اور اسی طرح کوئی گناہ، گناہ نہیں۔ سب اس قانون کی دلالی میں بکتا ہے اور اس کا سرِعام بکنا بھی جائز ہے کیوں کہ اس کے بکنے کا بھی قانون موجود ہے اسی لیے مصنف کہتا ہے کہ میں تو اس وقت اس قانون کو مانوں گا کہ جب اسے کسی نے آسمان سے اترتا دیکھا ہو یا فرشتوں کی زبانی سنا ہو۔ اقتباس دیکھیے:

"قانون۔۔۔۔۔۔؟ قانون کیا چیز ہے۔۔۔۔۔۔؟

کس نے اسے سورج کی روشنی کے ساتھ آسمان سے نیچے اترتے دیکھا تاکہ انسان کے متعلق اس کی مشیت کو معلوم کرے۔

کس آواز میں فرشتے لوگوں میں پکارتے پھرے کہ کمزوروں پر زندگی کا نور حرام کر دو، گرتوں کو تلواروں کے واروں سے فنا کر دو اور خطاکاروں کو لوہے کی تیز دھاروں سے تہس نہس کر کے رکھ دے۔"(۱۴)

جب آدمی کا گناہ و ثواب کا تصور ہی خراب ہو جائے اور معاشرے میں قانون کی بالادستی فقط امیروں کی گود سے شروع ہو انھیں کی جیبوں پہ آکر ختم ہو تو پھر ایسے ہی قانون کے باغی اور سرپھرے پیدا ہوں گے اور ان کا تصورِ گناہ و ثواب بالکل ہی ناپید ہو جائے گا یا پھر یونہی غلط رہے گا۔

جبران نے اپنے مختلف اندازِ بیان سے گناہ و ثواب کے نظریے کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح گناہ و ثواب سے انسان اندر سے کھوکھلا اور مضبوط ہوتا ہے۔ ایک عجیب انداز سے جبران نے گناہ کے اندر سے بھی ثواب اور نیکی کا پہلو نکالا ہے اور بتایا ہے کہ بعض اوقات تو غلط انداز سے بھی انسان پر مثبت اثر پڑ

جاتا ہے۔ جبران کا ایک مختصر افسانہ "ضمیر کی بیداری" اپنی نوعیت کا انوکھا اور زبردست افسانہ ہے جس میں ایک شخص اپنے ہمسائے کے باغ سے ایک تربوز چوری کرتا ہے مگر جب گھر لا کر اسے کھانے کے لیے چیرتا ہے تو وہ تربوز کچا نکل آتا ہے تو اس چور کا ضمیر زندہ ہو جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ تم نے ناحق اپنے ہمسائے کا پھل چوری کیا۔ اس لیے اسے ندامت اور شرمندگی ہوئی اور اس کا ضمیر زندہ ہو گیا۔ اقتباس دیکھیے:

> "ایک اندھیری رات میں ایک شخص اپنے ہمسائے کے باغ میں داخل ہوا اور اپنی سمجھ میں سب سے بڑا تربوز چرایا اور اسے لے آیا۔
>
> جب اس نے اسے چیرا تو دیکھا کہ وہ ابھی کچا ہی تھا۔
>
> تب ایک معجزہ رونما ہوا۔
>
> اس شخص کا ضمیر بیدار ہوا اور اسے ندامت سے جلانے لگا اور وہ تربوز چرانے پر پچھتایا۔"(۱۵)

ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ وہ سچ جس سے فساد پھیلے، اس جھوٹ سے بدتر ہے جس سے امن پیدا ہو اور جبران نے اپنے اس افسانے میں ایسا ہی کچھ ہمیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر گناہ سے انسان ثواب اور نیکی کے راستے پر آ جائے تو یہ بھی ایک طرح کا ثواب کا ہی کام ہے اور انسان ہمیشہ کے لیے سدھر بھی جاتا ہے۔

ii. شخصی اوصاف

کوئی بھی انسان اپنے شخصی اوصاف سے ہی پہچانا جاتا ہے اور معاشرے میں اس کی شناخت اس کے شخصی اوصاف سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ مگر جب انسان اپنی زندگی کا مقصد بھول جائے اور خرافات میں پڑ کر اپنے اوساف کی اہمیت سے غافل ہو جائے تو اسے کسی ایسے مصلح کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے اس کے مقام سے آشنا کروائے اور اسے معاشرے میں ایک قابل اور سود مند شخص بنائے۔ ورنہ ایک جانور اور انسان میں کوئی فرق

نہی رہتا۔ خلیل جبران کے افسانوں میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کے اندر تحریکِ عمل پیدا کر سکے۔ جس نے اپنے معاشرے میں عملی انقلاب برپا کرنے کے ساتھ مغرب کے بڑے سے بڑے نقاد کو بھی اپنے فن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مضبور کر دیا۔ جبران کے افسانوں میں یہ جوہرِ محرک ہی ہے جو لوگوں کو ایک خاص شناخت کی طرف بلاتا اور انھیں عمل پر اکساتا ہے۔ ہر کہانی ہی ایک خاص مقصد لے کر تخلیق ہوئی ہے جس سے انفرادی زندگی ہمارے اجتماعی نظامِ زندگی میں کیسے سود مند ہو سکتی ہے، وہ رموز شامل ہیں۔ جس کے متعلق نعیم صدیقی لکھتے ہیں:

"اجتماعی زندگی بغیر اس کے ترقی پذیر نہیں رہ سکتی کہ اس کے اندر جو جوہر محرک کام کر رہا ہو، جو اس کی روحِ عمل کو اکساتا رہے اور مقصدی ادب اس جوہرِ محرک کو زندہ و بیدار رکھتا ہے۔ یہی جوہرِ محرک ہوتا ہے جو انسان کے اندر سے تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، یہ کشمکشِ حیات میں خون کو گرم رکھنے کا وسیلہ بنتا ہے اور تاریخ کے بڑے بڑے معرکے اسی کے بل پر لڑے جاتے ہیں۔"(۱۶)

خلیل جبران کی کہانیوں میں واقعی ایک جوہرِ محرک کام کرتا ہے۔ اپنے افسانوں میں جبران نے جہاں غالب و حاکم کو برا کہا ہے وہاں اس کے ظلموں کے نقش بھی گنوائے ہیں۔ کیوں کہ جبران نے ایک محکوم وطن اور محکوم و مغلوب قوم میں جنم لیا اس لیے جہاں یہ اپنے لوگوں کو آزادی اور بہادری پر اکساتا ہے وہاں یہ ظالموں کو ان محکوم لوگوں پر ترس کھانے اور رحم دلی پر بھی آمادہ کرتا نظر آتا ہے اور ان حاکموں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"کیا محکوم قوموں کے پہلو میں دل نہیں ہوتے یا دلوں میں آرزوئے آزادی نہیں ہوتی۔۔۔۔جب تم میں جذبہ احساس ہی نہ رہا، جب اوروں کو محکوم بنا کر خود کو حاکم کہلانے میں تمھیں مسرت محسوس ہو اپنی خواہشات کے لیے مظلوموں کی تمناؤں کو

خون آلودہ کر دینے میں باک نہ ہو۔۔۔۔۔۔ تو تم غلاموں سے کہیں بد تر ہو اور محکوم
قوموں سے کہیں گئے گزرے تم آزادی کے قطعی غیر مستحق ہو۔"(۱۷)

یہ اقتباس افسانہ "آزادی" سے لیا گیا ہے۔ جس میں جبران نے نہایت کمال اسلوب سے آزادی کے نہ ہونے کے عذاب اور آزاد قوموں کو دوسری قوموں کو غلام بنا لینے پر تنقید کی ہے۔ یہ بالکل بیانیہ انداز میں لکھا ہوا افسانہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ نہایت اختصار پر مبنی ہونے کے باوجود یہ افسانہ حاکم اور محکوم دونوں قوموں کے جذبات کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ افسانے میں کلائمیکس اس وقت آتا ہے جب مصنف کہتا ہے کہ "تم (آزاد قوم) غلاموں سے کہیں بد تر اور محکوم قوموں سے کہیں گئے گزرے۔" یعنی غلام اور محکوم قوموں کی ہمدردی میں بات کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ جو قومیں محکوم ہو جاتی ہیں اور ان میں جذبۂ حریت مفقود ہو جائے تو وہ واقعی میں بد تر اور گئی گزری قومیں ہو جاتی ہیں۔ ان قوموں کے افراد میں آزادی کی تڑپ والے شخصی اوصاف بالکل مر جاتے ہیں اور حاکم قوم اس قدر بے حس اور مریل ہو جاتی ہے کہ اس میں انسانیت کہلوانے کے بھی شخصی اوصاف باقی نہیں رہتے۔

یہ افسانہ ایک شخص کی غلامانہ شخصیت سے شروع ہو کر ایک قوم کی شخصی خصوصیت کو بے نقاب کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس میں جبران نے نہایت چابکدستی سے اپنے قلم کو رواں رکھا ہے۔

جبران کے ہاں کہانیوں اور موضوعات کی بہت وسعت ہے اور پھر مستزاد یہ کہ کہانی کو بیان کرنے کا ڈھنگ اور اسلوب بھی انوکھا ہے اور جو کہانی جس عنوان اور انداز سے بیان کرتے ہیں لگتا ہے یہ کہانی اس سے بہتر پیرائے میں بیان نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ایک افسانہ "پاگل خانہ" کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس میں کہانی کی بنت تو دو کرداروں کے ذریعے بُنی جاتی ہے مگر اس کہانی میں جگہ کا بھی بڑا اہم کردار ہے۔ ایک پاگل خانہ ہے جس میں ایک پاگل ایک بنچ پر بیٹھا ہے کہ مصنف کی اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ (چونکہ مصنف نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے) اور مصنف اس سے پوچھ لیتا ہے کہ بھائی آپ یہاں کیسے پہنچے تو آگے سے وہ

پاگل شخص جو جواب دیتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے مجموعی شخصی اوصاف کی عکاسی کرتا ہے۔ آگے سے پاگل کا جواب کیا تھا سنیے:

"میرے باپ کی یہ خواہش تھی کہ میں ہو بہو اس کا نمونہ بنوں اور یہی تمنا میرے چچا کی تھی، میری ماں کی آرزو تھی کہ میں مرحوم نانا کے نقشِ قدم پر چلوں۔۔۔۔۔۔اور میری ہمشیرہ اپنے بے باک ملاح خاوند کو میرے لیے بہتر نمونہ سمجھتی تھی۔ میرا بھائی سوچتا کہ مجھے اور کچھ نہیں، بس اس کی طرح ایک نامی گرامی پہلوان بننا چاہیے!"(۱۸)

یہیں آکر اس پاگل کا پاگل پن ختم نہیں ہوتا بل کہ وہ تو آگے بھی کچھ کہتا ہے:

"اور یہی حال میرے اساتذہ کا تھا۔ فلسفے کے استاد، موسیقی اور منطق کے، سب کی یہی خواہش تھی۔۔۔۔اور وہ بڑی جانفشانی سے اس کوشش میں تھے کہ وہ مجھ میں اپنے جوہر اس طرح معکوس دیکھیں، جس طرح آئینہ میں اپنا عکس دیکھتے ہیں!"(۱۹)

اس افسانے میں ہمارے معاشرے کی مجموعی کیفیت اور شخصی اوصاف کو بڑے قرینے اور سلیقے سے بیان کر دیا گیا ہے اور وہ بھی ایک پاگل کی زبان سے اور پاگل شاید اسی وجہ سے پاگل ہو گیا ہو گا۔ ہر آدمی دوسرے آدمی پر اپنا رعب اور اپنی شخصیت کی چھاپ بٹھانے کے درپے ہے حالانکہ ہر شخص خدا کی طرف سے اپنی شخصیت اور اپنا وجود لے کر آتا ہے۔ اس افسانے میں دلچسپ موڑ اس وقت آتا ہے جب پاگل مصنف سے سوال کر لیتا ہے کہ آپ یہاں کیسے پہنچے، اونچی تعلیم یا اچھی صحبت کے فیض سے؟ اس سوال سے تو لگتا ہے کہ پاگل کے نزدیک وہ پاگل خانہ، پاگل خانہ نہیں بلکہ وہاں پہنچنے کے لیے اچھی صحبت اور اعلا تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو آگے سے مصنف کا جواب اور اس پاگل کا ردِ عمل دیکھیے:

"نہیں، نہیں میں تو ملاقاتی ہوں۔"

ہوں۔ وہ بولا۔

میں تو سمجھا آپ ان میں سے ہیں جو اس دیوار کے اُدھر والے پاگل خانے میں رہتے ہیں۔"[۲۰]

پاگل کے جواب سے اندازہ لگائیں کہ وہ ہمیں پاگل سمجھتے ہیں اور ہم ان کو پاگل سمجھتے ہیں۔

اس افسانے کی یہی خوبصورتی ہے کہ انتہائی اچھے اسلوب اور مکالمے سے ہمیں ہماری سوسائٹی کے لوگوں کا چلن سمجھ آتا ہے کہ ہر کوئی دوسرے کو کم تر اور پاگل سمجھتا ہے۔ اب یہ کسی کو نہیں معلوم کہ پاگل کون ہے یا پھر وہ خود ہی پاگل ہے۔

جبران کے افسانے "چودھویں کا چاند" نے ہمیں ہمارے معاشرے کے چند عجیب الاخلاق لوگوں کا اصل چہرہ دکھایا ہے جو لوگوں کو تو نصیحتیں کرتے رہتے ہیں اور ان کو نصیحتیں کر کر کے ان کے دماغ کھا جاتے ہیں اور ان کی نصیحتوں اور وعظوں سے معاشرے میں بدامنی اور انتشار پھیلا دیتے ہیں۔ لوگوں کو ناصح اور واعظ جیسے لوگوں سے نفرت سی ہو جاتی ہے اور ہوا میں صرف ان کی تقریریں ہی گردش کرتی رہتی ہیں اور وہ بھی کھوکھلی تقریریں۔

اس افسانے میں خوبصورتی سے علامتی اور استعاراتی انداز اپنایا گیا ہے اور کتوں کو علامت بنا کر پیش کیا ہے اور یہ کتوں کی عادت ہوتی ہے کہ آسمان پر چودھویں رات کا چاند چمکتا دیکھ کر چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ بل کہ اس چاند پر بھونکنے لگتے ہیں۔ تو ایک ناصح کتا بھونکنے والوں کو چپ کرواتا ہے مگر سب چپ کر جاتے ہیں تو وہ پھر بھی صبح تک بھونکتا رہتا ہے۔ جبران کے اسلوب میں دیکھیے:

"چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ شہر کے تمام کتوں نے چاند پر بھونکنا شروع کر دیا۔

صرف ایک کتا خاموش رہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دوسروں سے کہا۔

"سکوت کو اس نیند سے نہ جگاؤ اور چاند کو اپنی للکار سے زمین پر نہ بلاؤ۔"

دوسرے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ ہولناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کتا جس نے دوسروں کو چپ رہنے کو کہا تھا۔ ساری رات خاموشی کی تلقین میں بھونکتا رہا!"(۲۱)

اس افسانے کو کئی اور بھی استعاروں کے تناظر میں بیان کیا جا سکتا ہے اور یہی جبران کے اسلوب کا کمال ہے۔

شخصی اوصاف ہی کسی قوم اور انسان کی پہچان اور عظمت کی دلیل ہوتے ہیں مگر یہ اوصاف کم ہی قوموں اور معدودے چند لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ موقعہ شناس، فی الوقتی، کم ظرف، لالچی اور مفاد پرست قسم کے ہوتے ہیں۔ سستی، کاہلی اور تغافل نے ان کی تمامتر خوبیوں کا زنگ لگا دیا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خود کے زورِ بازو پر جینے کے بجائے غیر کے ٹکڑوں پہ پلتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے انعامات کے لیے نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کی خوشامد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ غلامی اور چاکری ان کی قسمت میں لکھ دی جاتی ہے اور تمام عمر، نسل در نسل یہ غلامی ہی کرتے چلے جاتے ہیں اور ایسے ہی کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی بسر کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں جبران نے افسانہ "بوڑھی ملکہ" لکھا ہے۔

"بوڑھی ملکہ" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انداز و اسلوب عام فہم، مکالماتی اور کسی حد تک تمثیلی بھی ہے۔ اس میں ایک بوڑھی ملکہ کو سوئے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اسی بوڑھی ملکہ کے پہلو میں ایک بلی بھی سوئی ہوتی ہے۔ چار غلام کھڑے اس ملکہ کو پنکھا جھل رہے ہوتے ہیں اور وہی غلاموں سی فطرت میں باتیں کرتے ہیں کہ جب مالک و آقا غیر موجود ہو تو نوکر چاکر اس کی برائیاں کرنے لگتے ہیں۔ یہ چاروں غلام جو جو باتیں کرتے ہیں ان کے جواب جبران نے بلی کی زبانی دلوائے ہیں جو جبران کے شخصی اوصاف کے بارے میں کمال مکالمے ہیں اور ہر غلام کے جواب میں بلی بات کرتی ہے جو کہ سوئی ہوئی ہے:

"پہلے غلام نے کہا۔"بوڑھیا نیند میں کس قدر بد صورت نظر آتی ہے۔ دیکھو تو اس کا چہرہ کیسے لٹک گیا ہے اور سانس کس طرح لے رہی ہے۔ جیسے شیطان اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔"

بلی نے غراتے ہوئے کہا۔"یہ نیند کے عالم میں اتنی بد نما معلوم نہیں ہوتی جتنے کہ تم غلام، بیداری کی حالت میں معلوم ہوتے ہو۔"

دوسرے غلام نے کہا۔"تم یہ سوچ رہے ہو گے کہ نیند میں اس کی جھریاں گہری ہونے کے بجائے نکھر رہی ہیں۔ یہ ضرور کوئی براخواب دیکھ رہی ہے۔"

بلی نے غرا کر کہا۔"کاش تم بھی سو کر اپنی آزادی کے خواب دیکھتے۔"

تیسرے غلام نے کہا۔"غالباً یہ ان لوگوں کا جلوس دیکھ رہی ہے جو اس نے قتل کیے۔"

بلی نے غراتے ہوئے کہا۔"ہاں یہ تمھارے آباؤ اجداد اور تمھارے ورثا کا جلوس دیکھ رہی ہے۔"

چوتھے غلام نے کہا۔"اس کے متعلق باتیں کرنا تو ایک اچھا مشغلہ ہے لیکن کھڑے کھڑے پنکھا جھلنا کچھ کم مصیبت نہیں۔"

بلی نے غراتے ہوئے کہا۔"تم ابد تک پنکھا جھلتے رہو گے۔ جیسے تم زمین پر ہو، ویسے ہی آسمان پر رہو گے۔""(۲۲)

اسی طرح کا ایک اور طویل مکالمہ غلاموں اور بلی کے درمیان موجود ہے۔ جس میں اسی انداز مین غلاموں سے بلی آزاد لوگوں اور غلام لوگوں کے شخصی اوصاف پہ بات کرتی ہے اور آکر پہ ان غلاموں پہ بلی طنز کرتے ہوئے کہتی ہے:

"بلی نے غرا کر کہا۔ "جھلتے جاؤ۔ ہاں پنکھا جھلتے جاؤ بے وقوفو اور اس آگ کو ہوا دیتے جاؤ۔ جو تمھیں لپیٹ میں لے رہی ہے۔"(۲۳)

ایک آزاد انسان اور غلام انسان کی فطرت اور سوچ پر یہ ایک بہترین افسانہ ہے جو انسان کو ایک انقلابی شخصی اوصاف پہ اکساتا نظر آتا ہے۔

جبران کا افسانہ "غلامی" شخصی اوصاف اور ان کی تہذیب وترتیب پر لکھا بہترین افسانہ ہے۔ جس میں جبران نے انسانی زندگی کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ میں نے مشرق ومغرب کے بڑے لوگوں اور علم کا مطالعہ کیا ہے اور در در کی خاک چھانی ہے، قوموں کو قریب سے دیکھا ہے اور لوگ مجھے مدرسے، عبادت گاہوں، بازاروں، گلی محلوں، کھیتوں، محلاتوں، جھونپڑیوں، قربان گاہوں اور معبدوں بلکہ ہر جگہ ہی غلام دکھائی دیے ہیں۔ اور اسی غلامی کی بدولت انسان کے شخصی اوصاف بالکل ہی مسخ ہو جاتے ہیں اور انسان بالکل بھی سوچنے کی صلاحیت سے مجروح ہو جاتا ہے۔ جبران افسانے کا آغاز ان سطور سے کرتا ہے:

"انسان زندگی کا غلام ہے اور یہ غلامی اس کے دنوں کو ذلت وخواری کے پردہ میں لپیٹ دیتی ہے اور اس کی راتوں کو اشک وخوں کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے۔"(۲۴)

ان دو لائنوں سے بھی انسانی اوصاف میں گراوٹ کی وجہ سے انسان کے حالات کی صاف تصویر کشی کی گئی ہے۔ انسان معاشرے میں سر اٹھا کر جینے سے قاصر ہو جاتا ہے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونا اور آہیں بھرنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کی ساری زندگی آہوں اور سسکیوں میں ہی گزر جاتی ہے۔ جبران ایسے غلام مختلف حیلے حوالوں سے دنیا بھر میں جگہ جگہ دیکھے جن کے بارے وہ کہتا ہے:

"میں شاہی محلوں، مدرسوں اور عبادت گاہوں میں گیا۔ قربان گاہوں اور معبدوں کے سامنے کھڑا ہوا اور دیکھا۔ مزدور تاجر کا غلام ہے۔ اور تاجر سپاہی کا، سپاہی سپہ سالار کا غلام ہے اور سپہ سالار بادشاہ کا۔ بادشاہ کاہن کا غلام ہے اور کاہن صنم کا اور صنم مٹی ہے جسے گوندھ کر شیطانوں نے مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب کر دیا ہے۔"(۲۵)

شخصی اوصاف اس قدر گر گئے ہیں کہ ہر انسان آگے کسی اور مقتدر کا غلام ہے اور اس طرح ہمارا معاشرہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ظاہر ہے جس معاشرے میں سونے کو زنگ لگ جائے اس میں لوہے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اس کی کیا اوقات۔ ایک عام آدمی سے لے کر ایک صاحبِ اقتدار اور مذہب کا ٹھیکیدار تک انھیں کانٹوں میں الجھا ہوا ہے اور سب سے پریشانی کی بات جبران کے ہاں یہ ہے کہ ان سے نکلنے اور جان چھڑانے کا کوئی راستہ بھی نہیں کیوں کہ یہ سب مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب ہے۔

جبران نے اس افسانے کے آخر میں غلام کی سوچ کی بدولت پیدا ہونے والی غلامی کی اقسام پر بھی تنقید کی ہے اور بڑے ہی موثر اور بلیغ انداز میں غلامی کی قسموں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ان غلامی کی قسموں میں حمیدہ غلامی، رنگ برنگی غلامی، متعدی غلامی، کبڑی غلامی، زندگی کی غلامی، قوتِ استمرار کی غلامی، اندھی غلامی، لنگڑی غلامی، بہری غلامی، ادھیڑ غلامی اور گونگی غلامی شامل ہے۔جو انسان کے شخصی اوصاف کو اپنے اپنے انداز سے گراوٹ کا شکار کرتے کرتے کسی معاشرے کے لیے ناکارہ اور فضول بنا دیتی ہیں۔

جبران نے زمانے کی سختیاں سہہ سہہ کر خود کی ایک خاص پہچان اور عادت بنالی تھی۔ اس لیے جبران کا اندازِ تحریر اور روشِ فکر اس وقت کے تمام مشرقی ادیبوں سے مختلف تھا۔ مگر یہ اسلوب اور ایسا سخت پن اس کی تحریروں اور تقریروں میں ایک پل سے نہیں آیا۔یعنی جبران کی تحریروں میں باقاعدہ انتہا پسندی اور سمجھوتے سے جرٔت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کسی بھی بات سے پھرنے اور ایک لمحہ بھی سمجھوتہ کرنے کو تمام عمر تیار نہ ہوئے اور یہی ان کی انفرادیت تھی۔ جبران ایک ہمدرد، حساس اور نرم دل شخص تھا۔ جو ہر لمحہ اپنی قوم اور اہلِ وطن کی حالت پر کڑھتا رہتا تھا اور نالاں بھی۔ ہم عصر مشرقی ادیبوں کی طرح یہ من موہنی کہانیاں، دلدوز اور محبت بھرے نغمے لکھنے کے بجائے ذہن و دل میں اضطراب پیدا کر دینے والی تحریریں لکھتا رہا اور انقلاب کی طرف دعوت دیتا رہا اور اس کی ہر تحریر میں بغاوت کی بُو آنے لگی۔ یہ بات ایسی بھی نہیں کہ یہ انتہا پسندانہ اسلوب اس کی تحریروں میں پہلے ہی دن نہیں آیا اور ہر لفظ میں زہر ٹپکنے کے لیے ایک خاص وقت

لگا ہے۔ جس کے لیے اس نے پہلے حالات کا بغور جائزہ لیا اور ہر طبقے کا قریب سے مشاہدہ کیا، پھر محبت آمیز طریقے سے سمجھایا، ہر قسم کے اتار چڑھاؤ اور اونچ نیچ سے آگاہی دی۔ پھر بھی ان لوگوں کو سمجھ نہ آئی تو انھیں جھڑکا اور پھر سرزنش شروع کر دی۔ مگر پھر بھی ان کے کانوں پر جُوں تک بھ نہ رینگی تو پھر جبران کے اسلوب میں نفرت، حقارت اور ہر لفظ میں کرب واذیت ٹپکنے لگی۔ اس طرح اس کی تحریروں میں انتہا پسندانہ اسلوب در آیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> "سارے جہاں کا درد اپنے سینے میں اس طرح سمویا کہ خود مجسم غم بن کے رہ گیا، پاگلوں کے دماغ درست کرتے کرتے خود پاگل ہو گیا۔ قوم کے مصائب دیکھنے کی تاب نہ رہی تو خود خلوت نشین ہو گیا۔ کوئی ہمدوم و دوست نہ ملا تو کوہساروں، قبرستانوں، شب کی تاریکیوں اور سمندر کی موجوں کو ہمراز بنالیا، ملک کی زبوں حالی پر پورا زورِ قلم صرف کیا تو انتہا پسند بن گیا۔ رائج قوانین اور مذہبی رسوم سے اختلاف کیا تو باغی اور کافر بنا دیا گیا۔"(۲۶)

جبران اپنی زندگی کے ہر معاملے میں انتہا پسندانی نظریے کا قائل ہے۔ اسے اس بات پر یقین ہے کہ ہر کام انتہا درجے پر ہی سوچنے سے ممکن ہوتا ہے نہیں تو کام کام نہیں رہتا۔ اور یہی انتہا پسند ہی ہوتے ہیں جو زندگی کے سمندروں میں بھی غوطہ زن ہونے سے دریغ نہیں کرتے۔

جبران اپنے انھیں خیالات کا کھل کر اظہار اپنے افسانے "میں کس سے محبت کرتا ہوں" میں کرتے ہیں۔ جس افسانے کے دو حصے ہیں اور بالکل بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس کے پہلے حصے میں انتہا پسندوں کی خوبیاں گنوائی گئیں ہیں اور ساتھ میں تصریح بھی کی گئی ہے کی انھیں وجوہات کی بنا پر مصنف ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے اور دوسرے حصے میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مصلحت پسند اور اعتدال کی راہ پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ جبران ایسے لوگوں کو قطعاً اچھا نہیں سمجھتا بلکہ ان کو دنیا کی ترقی میں رکاوٹ، امن کا دشمن اور معاشرے کی تعمیر میں سب سے بڑا رخنہ قرار دیتا ہے۔ افسانے کے پہلے حصے سے اقتباس دیکھیے:

"میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں اترتے اور زندگی کی بلندیوں پر چڑھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو کلیتاً اشیاء کی یکتائی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور دو متضاد چیزوں کے درمیان کبھی سرگشتہ و فکر مند کھڑے نہیں ہوتے۔

میں ان دلیر انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں جو اپنے شوق و آرزو کی آگ میں جلتے ہیں، اپنے دلوں کے وجدان سے سے بے چین ہیں۔ اپنے جذبات کی اطاعت کرتے ہیں، اصولوں کے میدانِ کارزار سے ہٹ کر "اصل اصول" کو اپنا مرکز قرار دیتے ہیں۔"(۲۷)

جبران کا ماننا ہے کہ انتہا پسند ہی اصول پسند ہوتے ہیں جو اپنے نظریات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ افسانے کے دوسرے حصے میں جبران نے اعتدال پسندوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

"میں اعتدال پسندوں کو جانتا ہوں، میں نے ان کے ارادوں کو تولا ہے ان کی کوششوں کو جانچا ہے اور انھیں بزدل پایا ہے جو بادشاہ کی شکل میں "حق" سے اور شیطان کی صورت میں "باطل" سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے عقائد و قواعد کے ان درمیانی حلقوں میں پناہ لے لی ہے جو نہ مفید ہیں نہ مضر، اور ان آسان راہوں پہ چلنے لگے ہیں جو انھیں سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہیں۔۔۔۔ ان سنسان جنگلوں میں جو ہدایتوں اور گمراہیوں سے خالی ہیں۔ جہاں کامیابیوں اور ناکامیوں اور ناکامیابیوں کا کال۔"(۲۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے لگتا ہے کہ جبران اعتدال پسندوں سے اسی لیے نفرت کرتا تھا کہ ان کی زندگی مقاصد سے خالی ہوتی ہے اور بالکل ہموار جس میں کسی بھی قسم کی کامیابی یا پھر ناکامی کا خوف بھی نہیں

ہوتا۔ایسے لوگوں کو جبران موقع پرست اور مفاد پرست سمجھتا ہے جو فقط اپنے فائدے کے لیے اعتدال اور مصلحت کا راستہ اپناتے ہیں۔

جبران ایک انقلابی فکر اور زندگی کو بہتر سے بہترین کرنے والا ایک مصلح شاعر اور ادیب ہے۔ جس نے اپنی شاعر اور کہانیوں سے عوام اوراپنے لوگوں کے درمیان جینے کی ایک نئی امنگ اور تڑپ پیدا کی اور انھیں اپنے ہی قدموں پر قائم رہنے والی زندگی کی راہ سجھائی۔ جبران نے اس سلسلے میں قوم کے شخصی اوصاف کو بدلنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی اور اس پر بے شمار تحریریں رقم کیں اور ہر ہر لفظ میں ایسی ہی تڑپ اور کرب ودرد ملتا ہے۔

جبران کے نزدیک جب کسی قوم میں "فن" سے محبت اور رغبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ قوم اور وہ لوگ ضرور بالضرور دنیا پہ حکومت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ثقافت، تہذیب اور تمدن کو اپنے فن سے عروج بخشتے ہیں وہ لوگ ہمیشہ ہی دوسرے لوگوں سے آگے اور بلندی ورفعت پہ رہتے ہیں۔ جبران نے اپنے یہ خیالات اپنے افسانے "فن" میں بیان کیے ہیں۔ یہ ایک مکالماتی افسانہ ہے، جس کا انداز و اسلوب تو بیانیہ ہے مگر افسانہ نگار مسلسل "فن" کے ساتھ مکالمے میں رہتا ہے اور اپنے خیالات فن سے ہی مخاطب ہو کر بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ مختلف اقوام کی بلندی کا سبب اس فن کو ہی قرار دیتا ہے اور ان اقوام کے نام بھی گنواتا ہے جن میں مصر، ایران، روم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ فن کے بارے میں افسانہ نگار یوں کہتا ہے:

> "تیرے تخت کے سامنے قومیں بیدار اور مترنم کھڑی رہتی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے جو گزر چکی ہیں وہ تیری موجودگی کے سبب موجود ہیں اور جو آنے والی ہیں وہ اس وقت بھی تیرے دامن کے گرد طواف کر رہی ہیں۔
>
> قوموں کی عظمت، اسی وقت باقی رہتی ہے جب تک تُو (فن) باقی رہے اور اسی وقت زائل ہو جاتی ہے جب تو زائل ہو جائے۔ اس لیے کہ قوموں کی زندگی میں تیرا وہی درجہ ہے جو درجہ جسم میں دل کا ہے۔"[۲۹]

اس کے علاوہ جب جبر ان کہانی کے آخر پہ پہنچتا ہے تو "فن" کے حضور گڑ گڑاتا ہے کہ تو مجھے اپنا غلام اور خادم بنالے اور وہی شخص زندگی کے حاکم بنتے ہیں جو لوگ فن سے قربت اور محبت رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اے فن! مجھے اپنے ان خادموں میں ایک خادم بنالے جو زندگی پر اپنا اقتدار رکھتے ہیں۔ اپنے ان سپاہیوں میں ایک سپاہی بنالے جو زمانہ پر غالب ہیں۔ میری آزادی کو اپنی مشیت کی پرستش کرنے دے اور میری روح کو اپنی شعاع سے مس کر! بہت ممکن ہے کہ اس طرح وہ خود سے اور تجھ سے قریب ہو جائے۔"[۳۰]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی قوم کے عروج اور بلندی کے لیے اس قوم کے افراد کی شخصی اوصاف میں "فن" سے لگاؤ اور دلچسپی کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ اس لیے فن سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اس سے غلامی کی حد تک پیار کرنا چاہیے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جس شخص کے زندہ رہنے سے دنیا کو فرق پڑتا ہے، اس کے دنیا سے چلے جانے سے بھی دنیا کو فرق پڑتا ہے۔ مگر جس شخص کے دنیا میں رہنے سے دنیا والوں کو کوئی فرق نہیں پڑا، اس شخص کے دنیا سے چلے جانے پر بھی دنیا میں بالکل امن اور شانتی ہی رہے گی اور دنیا اسے کبھی بھی یاد نہیں کرے گی۔ ہم سب تو زمین کا بوجھ ہیں مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جو زمین کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور معاشرے کے لیے کچھ کارہائے نمایاں کرتے ہیں اور دنیا کو آسانیاں اور سہولتیں باہم پہنچاتے ہیں۔ جن کا نام رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رہتا ہے۔

دنیا میں جینا تو دوسروں کے لیے جینا ہے، خود کے لیے تو انسان نہیں جانور جیتے ہیں۔ ایسے ہی موضوع پر جبران نے ایک کہانی "ہم اور تم" لکھی ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے مختلف طریقوں سے دنیا والوں کو دو حصوں میں بانٹ کر کہانی کو بڑے خوبصورت انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ جس میں "ہم" سے مراد نیک، پارسا، کیمیا گر، سائنس دان، شاعر، ادیب، فلسفی اور دنیا میں فکری انقلاب پیدا کرنے والے لوگ ہیں اور

''تم'' سے مراد دنیاوی حرص و طمع، لالچ اور دنیا کے جھمیلوں میں پھنسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایمان و ایقان بیچنے والے موقعہ پرست، فی الوقتی لوگ ہیں۔ جو دنیا میں ننگِ انسانیت ہیں۔

جبران اپنے اس افسانے میں ایسے تمام لوگوں سے سختی سے مخاطب ہے اور انھیں طنز اور طعنوں کے تیروں سے چھلنی کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم دنیا سے بے کار گئے اس لیے آج فراموش ہو گئے اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو دنیا پہ، دنیا کے لیے کچھ کر کے گئے جو ناقابلِ فراموش ہیں اور دنیا ہمیشہ انھیں یاد رکھے گی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جبران یوں رقم طراز ہے:

> ''تم نے مسیحؑ ناصری کو سولی چڑھایا اور چاروں طرف کھڑے ہو کر اس کا مذاق اڑایا، برا بھلا کہا۔ لیکن جب وہ گھڑی گزر گئی تو وہ صلیب سے اترا اور حق و روح کے ساتھ قوموں پر غلبہ پاتے ہوئے اور دنیا کو اپنے حسن و بزرگی سے روشن کرتے ہوئے ایک دیو کی طرح چلا گیا۔
>
> تم نے سقراط کو زہر دیا، پال کو سنگسار کیا، گلیلیو کو موت کے گھاٹ اتارا، علی ابنِ طالبؓ کو شہید کیا، مدحت پاشا کو پھانسی چڑھایا، اور یہ سب کے سب آج بھی فتح مند بہادروں کی حیثیت سے زندہ ہیں، لیکن تم انسانیت کے حافظہ میں ان لاشوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہو جو خاک پر پڑی ہوں اور جنھیں نیستی و فراموشی کی تاریکیوں میں دفن کرنے والا نہ ملتا ہو۔''(۳۱)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں جو لوگوں کی کاطر جیتے ہیں اور ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیتے ہیں۔ برے لوگ اور برائی کا ساتھ دینے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیے جاتے ہیں۔ یہی تو اوصاف اور کردار کی صفائی اور پاکیزگی ہے۔ جو کسی بھی شخص کو دنیا میں انمول بناتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے اوصاف کے بھی مالک ہوتے ہیں جو بات کو اصل معنوں میں سمجھے بغیر اور اصلیت کو جانے بغیر ہی آگے پہنچا دیتے ہیں اور بات کا رنگ کچھ سے کچھ ہوتا چلا جاتا

ہے۔ایسی باتیں بعض نے گلیوں محلوں سے سنی ہوتی ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتی ہوئی کیا کا کیا رنگ اختیار کر لیتی ہیں اور کچھ نے ایسی ہی من گھڑت باتیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنی ہوتی ہیں۔ مگر اصلیت تک پہنچنا اور اصل بات کی ٹوہ لگانا یہ کوئی آسان کام نہیں۔

جبران نے ایسا ہی ایک افسانہ ”ایک مسافر“ کے نام سے لکھا ہے۔ جس میں ایک مسافر ایک شہر ”زاد“ سے گزرتا ہے۔ اس مسافر نے اس شہر کے بارے میں سنا ہوتا ہے کہ یہاں کبھی جنگ ہوئی تھی اور شاہ الہم نے دشمنوں پر فتح پائی تھی، مگر یہاں کا ایک دیہاتی اسے بتاتا ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے یہاں کھیت ہی کھیت دیکھے ہیں۔ اس لیے تمھیں کوئی غلط خبر دی گئی ہے۔ وہی مسافر آگے چلتا ہوا کسی اور آدمی سے اسی شہر کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ یہاں تو شہر بھی نہ تھا مگر ایک خانقاہ ضرور آباد تھی، جسے دکھشنیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

یہ مسافر چلتا چلتا آگے کسی اور آدمی سے اس خانقاہ اور شہر کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے اپنے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ یہاں آسمان سے ایک شہابِ ثاقب گرا تھا جس سے یہ تباہی ہوئی اور بعد میں آہستہ آہستہ یہ شہر آباد ہو گیا۔ اب یہ مسافر بہت پریشان تھا کہ جتنے منھ اتنی ہی باتیں اس کو سننے کو مل رہی تھیں۔ لہٰذا چلتے چلتے اسے ایک بزرگ آدمی دکھا، اور اس مسافر نے اس بوڑھے کو یہ تینوں باتیں بتائیں اور کہا کہ میں تذبذب کا شکار ہوں اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا سمجھوں اور کیا کروں۔ کیوں کہ ہر آدمی نے دوسرے سے مختلف بات بتائی اور دوسرے کے بیان کو جھٹلایا بھی ہے۔ اس کے بعد اس بوڑھے آدمی نے ہمارے معاشرے کے اجتماعی شعور کو بھی بیان کیا ہے اور ہمیں اصل شخصی اوصاف کا بھی بتایا ہے۔ بوڑھے کا بیان سنیے:

”بوڑھے نے اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”یہ بات نہیں میرے دوست ہر ایک نے تم سے وہی کچھ بیان کیا ہے۔ جو واقع تھا لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں، جو حقیقت کو حقیقت میں اس طرح سمو دیں کہ سچ اجاگر ہو سکے!“”(۳۲)

اس کہانی سے جہاں ہمیں بات کو حقیقت تک سمجھنے کی تلقین ہے وہاں ہمیں اس بات پر بھی یقین رکھنا چاہیے کہ ہر آدمی اتنا ہی سچ بول سکتا ہے کہ جتنا اس تک پہنچا ہو اور سچ کی کھوج کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ہم اپنے کردار اور شخصیت کے سحر سے کسی قابلِ نفرین شخص کو بھی راہِ راست پر لا سکتے ہیں اور دوسروں میں بھی اچھے کردار کے اوصاف پیدا کر سکتے ہیں تاکہ وہ بھی معاشرے میں مثبت ذہنیت لے کر اور سر اٹھا کر زندہ رہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو اچھے ہونے کے ساتھ برے لوگوں سے بھی اچھا سلوک کریں۔ کیوں کہ اچھوں کے ساتھ تو سبھی اچھے ہوتے ہیں مگر برے لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسا کرنا پھر اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ جب آپ ایک صاحبِ ثروت انسان ہوں اور آپ سے نفرت کرنے والا شخص آپ سے کہیں کم تر اور غریب ہو۔ اور غریب اکثر امیروں اور باکمال لوگوں سے دل میں نفرت رکھتے ہی ہیں۔

جبران کے ہاں اسی نفرت کے موضوع پر ایک کہانی موجود ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ ایک اچھے برتاؤ سے کسی نفرت کرنے والے کے دل میں بھی محبت پیدا کی جا سکتی ہے۔ مگر اسی افسانے میں ایک احتیاط بھی بتائی ہے اور اس کہاوت کے مصداق کہ ”سیکھ نہ دیجیے ماندراجو گھر بئے کا جائے، سیکھ اکو دیجیے جاکو سیکھ سہائے“ یعنی اس آدمی کو ہی نصیحت اور اچھا مشورہ دینا چاہیے جس کو اچھے مشورے اور نصیحت کی قدر ہو۔ کسی بندر صفت کو اچھا مشورہ دیں گے تو وہ آپ کے ہی بالوں کو نوچے گا اور آپ کے ہی گھر میں تباہی لانے کی سوچے گا، مراد آپ کا دشمن ہو جائے گا اور مزید آپ سے نفرت کرنے لگے گا۔

جبران کا یہ افسانہ ''نفرت کا علاج'' اپنے نام سے ہی واضح ہے۔ اس میں ایک شہزادہ ہوتا ہے جو بصاری شہر پر حکومت کرتا ہے اور بہت ہی نیک دل اور انصاف پسند شہزادہ ہوتا ہے۔ جس سے ساری شہر پیار کرتا ہے اور اس کی دل سے قدر کرتا ہے مگر اسی رعایا میں ایک قلاش بھی رہتا تھا جو اس شہزادے سے بہت نفرت کرتا ہے اور اسے دل سے برا سمجھتا ہے۔ تو شہزادے نے اس کے دل سے اپنی نفرت مٹانے کے لیے سردیوں کی ایک رات کو اپنے غلام کو آٹے کی ایک بوری، صابن کا ایک گٹھا اور شکر کا ایک توڑا دے کر قلاش کی خدمت میں بھیجا اور اسے عطا کرنے کا کہا۔

غلام نے جب قلاش کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ چیزیں پیش کیں تو وہ قلاش الٹا پھولا نہ سمایا اور شہر کے مفتی کے پاس جا کر کہنے لگا؛ کہ شہزادے نے میری خدمت اور خوشامد کے لیے نذرانہ بھیجا ہے۔ مفتی نے جب اس قلاش کا یہ گھمنڈ دیکھا تو کہنے لگا:

> ''ہاں میں نے دیکھا کہ کس قدر دانش مند ہے شہزادہ اور کس قدر بے وقوف ہو تم۔ لیکن تم بھی نہیں سمجھے کہ وہ باتیں استعاروں میں کرتا ہے۔ آٹے کی بوری یہ تمھارے خالی پیٹ کے لیے ہے۔ صابن میلے لباس کو اجلا کرنے کے لیے ہے اور شکر کڑوی زبان کو شیریں بنانے کے لیے!''''(۳۳)

اس اصلیت کو جاننے کے بعد قلاش کو خود سے نفرت ہو گئی اسور مفتی کو زہر سمجھنے لگا۔ شہزادے کی عظمت اس پر عیاں ہو ہی چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے تمام عمر شہزادے کے خلاف اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ ہر انسان اپنے اندر ایسے ہی شخصی اوصاف پیدا کر کے معاشرے میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ مگر اہلِ علم اور مفتی حضرات کو بھی ویسی ہی استعارانہ اور کنایانہ زبان استعمال کرنی چاہیے جس طرح کی شہزادے نے استعمال کی تھی۔ تا کہ معاشرے کے افراد ان سے بھی نفرت نہ کریں اور ان کو زہر سمجھنے کے بجائے مٹھاس سمجھیں اور ان سے رجوع کریں۔

ہم نے چھوٹے ہوتے سے ایک کہانی پڑھی ہوئی ہے "شیر اور گڈریا"۔اور یقیناً یہ کہانی معاشرے کے ہر فرد نے پڑھی ہوئی ہے یا پھر سنی ہوئے ضرور ہے۔بالقین یہ کہانی دنیا کے ہر معاشرے میں پڑھی، پڑھائی اور سنی ،سنائی جاتی ہو گی۔اس کہانی کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں اس کہانی کا مطمح نظر آجاتا ہے اور ہم اس کے بارے میں سوچ سوط کر خود کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اسی طرح ہماری زندگی میں اگر کسی شخص کے اوصاف ایسے ہوں کے اسے لوگوں کو کسی بات پر بار بار تنگ کر کے جھوٹ موٹ مزہ آتا ہو یا پھر لوگوں کو کسی ایک بات پر تنگ کرنا اس کا وتیرہ بن جائے تو ہم اس کی کسی بھی بات کا اعتبار نہیں کرتے اور اس کا ہر بار کسی بات پر ضد کرنا ہمیں یوں ہی لگتا ہے کہ یہ آنسو بھی اسی پہلے والی بات کی وجہ سے ہی بہہ رہے ہوں گے۔اس طرح وہ شخص معاشرے میں اور لوگوں کے درمیان اپنی ہر اچھی اور بری بات کی اہمیت کھو دیتا ہے اور ہر شخص اسے ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

جبران نے اسی موضوع کو جب کہانی کے پیرائے میں ڈھالا تو افسانہ "روپہلے آنسو، سنہرے سکے" وجود میں آیا۔اس کہانی میں ایک عورت ہمیشہ اپنے خاوند سے بازار سے خوبصورت خوبصورت زیورات لینے اور خریدنے کی تمنا کرتی ہے اور وہ ہر بار اسے ان نئے زیورات کو خریدنے اور پہننے کے لیے پیسے دیتا رہتا ہے مگر یہ عورت ہر بار کہتی ہے کہ تم نے میرا کبھی خیال نہیں رکھا اور ا کبھی مجھے پیسے نہیں دیے کہ میں وہ زیورات خرید کر پہن لوں۔جس طرح دوسری عورتیں خرید کر پہنتی ہیں۔یہ مرد پھر بھی غصہ نہیں کرتا اور اسے اور پیسے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنا دل چھوٹا نہ کرو اور کا کرا اور زیور خرید لو۔بس یہ عورت ہر دفعہ یونہی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے اور اپنے مرد کو تنگ کرتی ہے۔بس اس کا مرد سمجھ جاتا ہے کہ جب بھی میری عورت روتی ہے تو اس کا مسئلہ زیورات کی خریداری ہی ہوتا ہے۔

ایک دفعہ وہ عورت بہت روتی ہے اور وہ مرد کتنے دن ہی اسے پیسے اور رقم دیتا رہتا ہے اور بار بار اسے کہتا ہے کہ مجھے علم ہے کہ تم زیورات کے لیے رو رہی ہو مگر مجھے بتاتی نہیں۔بس وہ عورت مسلسل روتی رہتی ہے اور اس کا خاوند اصل بات جانے بغیر اسے زیورات کی خریداری کا کہتا رہتا ہے۔حالانکہ اس کی عورت کو کسی

نوجوان اور خوبرو لڑکے سے عشق ہو جاتا ہے۔ مگر نہ یہ اپنی خاوند کو بتا سکتی ہے اور نہ وہ سمجھ سکتا ہے کہ اسے علم ہے کہ میری عورت ہمیشہ زیورات کے لیے روتی ہے۔ اس کہانی کا آخری اقتباس دیکھیے:

> ”جاؤ میری جان اور جو کچھ تمھیں پسند ہو، خرید لاؤ“، اس دن کے بعد، اس نوخیز اور حسین بہری جورو کو جب بھی کسی شے کی ضرورت ہوتی۔ تو وہ اپنی آنکھوں میں، روپہلے آنسو لیے اپنے نوجوان خاوند کے پاس آجاتی۔ اور وہ چپ چاپ مٹھی بھر اشرفیاں نکال کر اس کے سامنے ڈال دیتا۔
>
> اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس حسین عورت کو کسی دوسرے نوجوان سے محبت ہو گئی۔۔۔۔۔۔ جو لمبی لمبی سیاحتوں کا شوقین تھا! اب یہ نوجوان جب بھی کہیں باہر جاتا تو یہ نوجوان خوبصورت عورت صبح و شام کھڑکی میں کھڑی روتی رہتی!
>
> ادھر جب اس کا خاوند اسے یوں اپنے گال آنسوؤں میں بھگوتے دیکھتا تو اپنے دل میں کہتا۔
>
> ”شہر میں ضرور کوئی نیا قافلہ، نئے نئے لبادے، قیمتی قیمتی ہار اور نایاب موتی لے کر آیا ہے!“
>
> وہ مٹھی بھر اشرفیاں نکالتا اور اس کے سامنے ڈال دیتا!“[۴۴]

اس کہانی سے بھی ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے شخصی اوصاف اس قدر سپاٹ اور چھوٹے نہیں ہونے چاہییں کہ کوئی بھی ہماری اور ہمارے دل کی حالت اور مسائل کو سمجھ ہی نہ سکے۔ ایک ہی ضد ہمارے شخصی اوصاف کو گھن لگا دیتی ہے اور ہمیں ہمارے ضمیر کے ساتھ الجھا دیتی ہے۔ اور لوگ ہمارا اعتبار کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

انسانی اوصاف میں جب شدت اور سختی آجاتی ہے تو کسی بھی شے اور کام میں حسن باقی نہیں رہتا ۔کیوں کہ کام کا حسن تو اعتدال میں ہے۔ ہر انسان کو چاہیے کہ اپنے کام تحمل اور بردباری سے کرے اور اپنے تعلقات میں بھی مناسب رویے اپنائے رکھے۔ وگرنہ انسان دل میں اترنے کے بجائے دل سے اتر جاتا ہے۔ شخصی اوصاف ایک دفعہ جب معاشرے میں پہچان بن جائیں تو تمام عمر انسان انھیں کے ہمراہ چلتا ہے اور کبھی بھی اس کی یہ پہچان اور رویہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔

جبران نے انسان کے شدت پسندانہ رویے پر صبر اور نرمی کو ترجیح دی ہے اور حوادث پر بھی ہنسی خوشی سے نبھانے کا درس دیا ہے۔ جبران اپنے افسانے "سرسراتے ہوئے جھونکو!" میں ہوا کے تیز اور دبیز جھونکو کو مخاطب کر کے انھیں اعتدال اور نرمی کی دعوت دیتا ہے اور انسان کے شخصی اوصاف کو بھی اسی صبر اور نرمی کی طرف راغب کرتا ہے۔ افسانے میں کہتا ہے:

"سرسراتے ہوئے جھونکو! تم اس قدر آشفتہ نوا کیوں ہو؟ بردباری کی جگہ بے قراری نے کیوں لے لی؟--------

محو گریہ جھونکو! اس قدر ملول ہونے سے کیا فائدہ اور ازمنہ ماضیہ کے اوراق پلٹنے سے کیا حاصل؟--------

عنانِ صبر تو ہاتھ سے دینا ہی کفر ہے اور ناامیدیوں کا سب سے بڑا سبب!----فطرت نہ معلوم کس کس طرح امتحان لیا کرتی ہے خواہ اس میں پورے اترو یا منزل اولین پر ہی تھک کر بیٹھ رہو۔

اس لیے! محو الم جھونکو! اس قدر پژمردہ خاطر نہ ہو، خرام ناز اٹھکیلیوں کی جگہ درد وناشکیبائی کچھ زیبا نہیں معلوم ہوتی۔

جو لمحہ موجِ حوادث سے ہنستے کھیلتے گزر جائے وہی غنیمت ہے اور وجہ سکون و قرار۔"[۳۵]

بلا شبہ اگر انسان ان باتوں پر عمل کر لے تو اس کے شخصی اوصاف ایسے ہو سکتے ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں مچالی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہیں۔ شوریدگی، سختی اور انتہا پسندانہ جذبات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ انسان غصہ کرتے کرتے ایک نفسیاتی مسئلہ اور کیس بن جاتا ہے۔ جس سے سب محبت کرنے کے بجائے نفرت کرتے ہیں۔

دنیا کے ہر ذی شعور اور دانشور شخص نے علم و عقل کی سربلندی کی بات کی ہے اور سرفرازی کا سرچشمہ محنت کے ساتھ ساتھ علم و عقل کو ہی قرار دیا ہے۔ اس لیے جبران نے اپنے افسانے "علم و عقل" میں ان دونوں کے درمیان باہمی ربط اور تعلق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تمام کامیابیوں کی کنجی بھی انھی دو کو قرار دیا ہے۔ اس افسانے میں مصنف موصوف نے علم و عقل کے بارے میں حکایات کو بھی بیان کیا ہے جس سے ان دونوں کی اہمیت اور بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ افسانے کے آغاز میں ہی مصنف کہتے ہیں:

> "جب عقل تمہیں اپنی طرف پکارے تو اس کی بات دھیان سے سنو۔ اس کی باتیں سن کر اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر لو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل سے بڑھ کر کوئی رہنما پیدا نہیں کیا اور نہ عقل سے بڑھ کر کوئی موثر ہتھیار ہے جس وقت عقل تمہارے دل کی گہرائیوں سے ہمکلام ہوتی ہے تو وہ تمہیں حرص و آز سے بچا لیتی ہے۔ عقل ایک نہایت ہی خوش فکر واعظ ہے۔ ایک باوفار ہبر ہے اور ایک دانشور وکیل ہے۔ عقل تاریکی میں قندیل بن کر نور افشاں رہتی ہے۔ غم و غصہ تاریکی پھیلاتا ہے۔ اس لیے ہوش سے کام لو اور جذبات کی بجائے ہمیشہ عقل کو چراغِ راہ بناؤ۔"(۳۶)

انسانی شخصی اوصاف میں مصنف خلیل جبران کے نزدیک عقل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جس کو عقل نہ ہو اس کا علاج بقول مصنف حضرت عیسیٰؑ کے پاس بھی نہ تھا کیوں کہ وہ جذامیوں، کوڑھیوں اور اندھوں کا علاج تو کر سکتے تھے مگر عقل کے اندھوں اور عقل کے جذامیوں کا علاج وہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جبران عقل کے ساتھ ساتھ علم کے بھی قائل نظر آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عقل بھی علم کے بغیر

ناقص ہے اور علم بھی عقل کے بغیر کسی کام کا نہیں۔ دونوں کا ساتھ دامن اور چولی کا ہے۔ اس سارے افسانے میں جبران نے علم و عقل کا باہمی تعلق اور انسانی اوصاف میں سب سے بڑھ کر ان دونوں کی اہمیت بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علم اور عقل کے آپسی تعلق کے بارے میں جبران لکھتا ہے:

> "لیکن ایک بات نہایت ضروری ہے۔ عقل کے ساتھ علم کا ہونا لازمی امر ہے کیونکہ عقل، علم کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ عقل، علم کے بغیر بالکل ویسی ہے جیسے کوئی مفلس بے گھر پھر رہا ہو اور اسی طرح علم، عقل کے بغیر بالکل ایسا ہے جیسے ایک مکان ہو لیکن اس کا کوئی محافظ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر عقل دستگیری کے لیے مستعد نہ ہو تو محبت، انصاف اور نیکی جیسی ارفع اور برتر چیزیں بھی بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔"(۳۷)

مندرجہ بالا اقتباس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جبران کے ہاں شخصی اوصاف میں علم اور عقل دونوں ہی بڑے اہم ہیں۔ علم عقل کے بغیر کچھ نہیں اور عقل علم کے بغیر اپنا آپ دکھانے سے قاصر ہے اور ایک فضول شے ہے۔ انسان جب تک علم کے حصول میں لگا رہتا ہے زمانے میں سرفراز رہتا ہے اور دوسروں کی نظر میں باوقار ٹھہرتا ہے۔ مگر جیسے ہی علم اور عقل کو چھوڑتا ہے تو بے وقوف، کم ظرف اور جاہلِ مطلق کہلاتا ہے۔ جس کی زمانے میں کوئی عزت اور آبرو نہیں ہوتی اور یہاں تک کہ عقل کے بغیر تو محبت، انصاف اور نیکی بھی کسی کام کی نہیں رہتی بلکہ انسان شاید نیکی، محبت اور انصاف جیسے برتر جذبات سے ہی محروم ہو جاتا ہے۔

شخصی اوصاف ہی کسی بھی انسان کی ضمانت اور معاشرے میں اس کا معیار ہیں اس لیے جبران کے ہاں شخصی اوصاف کے موضوع اور اس خیال پر بھی افسانے اور کہانیاں ملتی ہیں۔ مختلف شخصی اوصاف جن میں امانت، دیانت، ریاضت، محبت، خلوص، عقیدہ، صداقت کے علاوہ جبران کے ہاں سب سے زیادہ اور اہم چیز جو کسی بھی شخص کے شخصی اوصاف میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ ہے "علم و حکمت"۔ یعنی جبران کے ہاں اس

چیز کی اتنی اہمیت ہے کہ اگر یہ علم و حکمت کسی شخص کے اوصاف کا حصہ نہ ہوں تو باقی ماندہ چیزیں بھی کسی کام کی نہیں رہتیں۔

جبران کا ماننا ہے کہ انسان کی جتنی بھی قدر اور حیثیت ہے وہ فقط اسی علم و حکمت کی بنیاد پر ہے اور انسان کی قدر اس کے خانوادے اور خاندانی پس منظر سے نہیں بل کہ اس کے علم سے ہوتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے آپ دشمنوں سے مقابلہ کیے بغیر ہی انھیں شکست دے سکتے ہیں اور اپنے آپ کو جاہلوں سے ممتاز کر سکتے ہیں۔ اپنے افسانے "دانشمندی" میں جبران نے علم کی اہمیت پر زور دیا ہے اور جیسا کہ اپنے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ سارا افسانہ علم و حکمت کی اہمیت پر ہی لکھا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بلا شبہ دانا اور دانشمند آدمی وہی ہے جو تعظیم و انکساری کے ساتھ خدا کے سامنے جھک جاتا ہے۔ انسان کی اصل وقعت اس کے رنگ نسل و قومیت میں نہیں بلکہ اس کے اچھے کارناموں اور علم و فضل میں ہے۔ اے میرے دوست! اس کو ہمیشہ یاد رکھو کہ قوم وملت کی نظر میں اس گڈریے کے لڑکے کی قدرومنزلت جو صاحبِ علم و فضل ہے، تخت و تاج کے اس وارث سے کہیں زیادہ ہے جو بے علم و حکمت ہے۔ تمہارا باپ کسی قوم نسل سے تعلق رکھتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری خاندانی شرافت وبرتری کی نشانی صرف تمہارا علم ہے۔"[۳۸]

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف پتا چلتا ہے کہ جبران حسب نسب کی بجائے صرف اور صرف علم کو ہی برتری اور افضلیت کی کنجی سمجھتے ہیں۔ اس افسانے میں جبران نے علم کے اور بھی بہت سے فائدے گنوائے ہیں جن میں کہتا ہے کہ علم روح کو تنگر کرتا ہے اور روح کی تونگری ہی انسان کو ہشاش بشاش رکھتی اور اس کے ناصیے کو چمک عطا کرتی ہے۔ علم و حکمت ہی انسان کو سمجھ بوجھ عطا کرتے ہیں اور ان سے بہتر زندگی کا ہمسفر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ علم سر کا تاج اور حکمت تمہارا عصا ہے اور ان دونوں کے ساتھ دنیا کا ہر خزانہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان کسی دوسرے انسان کے جذبات کو سمجھتا ہے اور جذبات کو سمجھنے والا شخص

کسی بھی عزیز اور رشتے دار سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ علم سے آپ اچھے برے میں تمیز کر سکتے ہو جس کی بنا پر آپ کسی احمق کے دھوکے اور چالاک آدمی کی ہشیاری سے بچ سکتے ہو۔ علم اور دانش مندی سے ہی دوسرے انسانوں کے ذہنوں کو روشن کیا جا سکتا ہے۔ اور بھی کئی ایک خوبیاں علم اور حکمت کی جبران نے گنوائی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف موصوف کے ہاں انسانی اوصاف میں سب سے اہم اور بڑھ کر کوئی خوبی یا وصف ہے تو وہ صرف علم اور حکمت ہی ہیں۔

iii. جزا و سزا کا تصور

اگر کسی بھی معاشرے سے جزا و سزا کا معیار ختم کر دیا جائے اور یہ شرط اٹھالی جائے تو کوئی بھی انسان نیکی کا طرف مائل نہ ہو اور گناہ سے خود کو دور نہ رکھے اور اس طرح آہستہ آہستہ معاشرہ زوال کا شکار ہو کر تباہ ہو جائے۔ مگر ہمارے مذہبی رہنما لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے تو استعمال کرتے ہیں، ان سے نذریں نیازیں تو لیتے ہیں مگر حقیقی معنوں میں معاشرے کی مذہب کی خدمت نہیں کرتے۔ ایسے نظریات اور خیالات جبران کی کئی کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔ اسی مذہبی جزا و سزا کے متعلق پروفیسر غلام رسول کہتے ہیں:

> ”دین نے انسان کو محاسبے کا تصور دیا ہے اور یہ بتایا ہے وہ بے کار پیدا نہیں ہوا کہ وہ دنیا میں کھائے پیے اور چند دن گزار کر اس دنیا سے اٹھ جائے بل کہ اس کی زندگی کا ایک ارفع مقصد ہے اس کے ماتحت زندگی گزارنی ہے۔“[۳۹]

جبران کے افسانوں میں معاشرتی ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کی بنا پر سزا اور انسانی ہمدردی و رواداری کے سلوک پر جزا کا تصور بھی ملتا ہے۔ مگر یہ سزا و جزا کا معیار اور فیصلہ اللہ نے کرنا ہے نہ کہ ہمارے معاشرے کے کسی وڈیرے، چودھری اور کسی عاقل و فلسفی نے کرنا ہے۔ جبران کا افسانہ ”اے ملامت کار“ ایک ایسے ہی شخص ہو موضوعِ افسانہ بنایا گیا ہے جو لوگوں کو اپنے طعنوں کے نشتروں سے چھلنی کرتا رہتا ہے اور انھیں ہر کام پر نصیحتیں جھاڑ جھاڑ کر پریشان کرتا رہتا ہے۔ جو لوگوں کے اس طرح نصیحتیں کرتا ہے جیسے جزا و سزا کا سارا ذمہ

اسی شخص نے لے رکھا اور تمام اچھی باتیں اسے وحی کی جاتی ہیں۔ایسے شخص سے جبران نے پناہ مانگی ہے اور اس سے کہا ہے کہ اپنا منھ بند رکھو اور اپنی راہ لو۔ لکھتے ہیں:

"اے ملامت کار مجھے تنہا چھوڑ دے!

مجھ سے اور میرے خوابوں سے کوئی واسطہ نہ رکھ اور کل تک کے لیے صبر کر! کل جو چاہے گا، میرے متعلق فیصلہ کرے گا۔

تُو نے نصیحتوں سے اپنا خلوص ظاہر کیا، لیکن نصیحت ایک سایہ ہے جو روح کو حیرت کے سبزہ زار میں لے جاتا ہے، اس مقام کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، جہاں زندگی مٹی کی طرح جامد ہے۔

ممنوعات کا ذکر چھوڑ! کہ میرے ضمیر کی عدالت مجھ پر منصفانہ احکام صادر کرتی ہے۔اگر میں بے گناہ ہوں گا، تو وہ مجھے سزا سے بچائے گی اور اگر مجرم ہوں گا، تو ثواب سے محروم کردے گی۔"(۴۰)

مصنف نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ایسے ملامت کار ہمیں ممنوعات سے روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور ایسے کام کرنے پر گناہِ کبیرہ کا فتویٰ لگا کر ہمیں بڑے بڑے عذاب اور سزاؤں کی وعید بھی سناتے ہیں۔ ہمیں عذاب و سزا سے ڈراتے اور دھمکاتے ہیں۔

بعض اوقات معاشروں میں جزا و سزا کے نظام بڑے عجیب اور بے بنیاد سے ہوتے ہیں کہ کسی کی سزا کسی کو دے دی جاتی ہے اور جو آدمی اصل جزا کا حق دار ہوتا ہے کبھی اس تک اس کا حق پہنچتا ہی نہیں اور یوں معاشرہ بدنظمی کا شکار ہو کر زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایسے معاشرے اور ایسے قوانین سے حتیٰ نالامکان بچنا چاہیے۔ مگر ایسے نظام میں ہمارے کچھ سیاست دان، صاحبِ اقتدار، مفاد پرست ٹولہ اور کچھ تخریبی قوتیں شامل ہوتی ہیں جو معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کرنے کے درپے ہوتی ہیں۔

جبران نے ایسے ہی معاشرے اور ایسے ہی سزاوجزا کے نظام کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ "انصاف" لکھاہے۔ جس میں جبران نہایت کمال اسلوب اور چابک دستی سے ایک صاحب اقتدار بادشاہ کے رویے اور انصاف کو بیان کرتا ہے۔ جس میں ایک شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے جس کی آنکھ پھوٹی ہوئی ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے انصاف چاہیے کہ میں چوری کرنے سیٹھ کی دکان پہ گیا پر غلطی سے ایک جولاہے کے گھر گھس گیا اور گھستے ہی اس کی کھڑکی سے سے میری آنکھ لگی اور زخمی ہو گئی کیوں کہ کھڑکی خراب بنی ہوئی تھی۔ اس لیے جولاہے کہ بھی آنکھ پھوڑ کر مجھے انصاف دلوایا جائے۔ تو جولاہے کو جب حاضر کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا کام دو آنکھوں کا لہٰذا میری آنکھ کی بجائے موچی کی آنکھ نکالی جائے کیوں کہ اس کا کام ایک آنکھ سے کیا جاسکتا ہے اوراس طرح سزا کے طور پر موچی کی آنکھ نکال لی گئی۔ افسانے کا اقتباس دیکھیے:

"۔۔۔۔۔انھوں نے دیکھا کہ اس کی ایک آنکھ باہر نکل آئی ہے اور خالی جگہ سے خون بہہ رہا ہے۔

بادشاہ نے پوچھا۔

"تم پر کیا مصیبت پڑی ہے۔"

اس آدمی نے کہا۔

عالی جاہ! میں ایک پیشہ ور چور ہوں۔۔۔۔۔۔۔ سیٹھ کی دکان لوٹنے گیا لیکن غلطی سے جولاہے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جونہی میں کھڑکی میں سے کودا۔۔۔۔۔۔۔ میری آنکھ پھوٹ گئی۔ عالی جاہ! میں اس جلاہے کے معاملے میں انصاف چاہتا ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ نے جولاہے کو طلب کیا اور فیصلہ سنایا کہ جولاہے کہ آنکھ نکال دی جائے۔

جولاہا بولا۔

جہاں پناہ! آپ کا یہ فیصلہ درست ہے کہ میری آنکھ نکال دی جائے لیکن عالی جاہ! میرے کام میں دونوں آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔البتہ میرے پڑوس میں ایک موچی ہے جس کی دونوں آنکھیں سلامت ہیں، اس کو ویسے بھی ان دونوں آنکھوں کی ضرورت نہیں۔

یہ سن کر بادشاہ نے موچی کو بلوایا اور اس کی ایک آنکھ نکلوادی۔

اور اس طرح انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا۔"[۴۱]

اس کہانی سے ہمیں یہ سبق تو ملتا ہی ہے کہ ہمارے صاحب اقتدار اصولوں کے بجائے اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے مطابق فیصلے کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران، سیاست دان اور قانون دان کس قدر انسانیت اور فلاح سے بے خبر ہیں کہ قوانین کا احترام اور سبھاؤ بھی انھیں نہیں آتا۔ جزا و سزا کا اپنا ہی معیار بنا رکھا ہے ان وڈیروں اور شاہی خاندانوں نے۔ جن کے چنگل میں پھنس کر زمانہ ہمیشہ پیچھے ہی دھکیلا جاتا رہا ہے۔

جبران اپنی زندگی میں انتہا پسند ادیب اور شاعر تھا اور انتہا پسندی کا ہی قائل تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ جو بھی کام کرو اس کو انتہا تک لے کر جاؤ، سوچو تو بھی انتہا درجے پر سوچو، اور لکھو بولو بھی تو انتہا درجے کا۔ مصلحت اور سمجھوتے کو جبران بالکل بھی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اسے تو ایسے مصلحت پسندوں سے سخت نفرت تھی۔ یہاں تک وہ مذہب میں بھی انتہا پسندی کا قائل تھا کیوں کہ اس کا ماننا تھا جو مذہبی عالم انتہا پر مبنی خیالات کا مالک نہیں ہوتا وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار نہیں رہتا۔ اور وہ جزا و سزا میں تذبذب کا شکار رہتا ہے۔

جبران کے افسانوں میں جزا و سزا کے ایسے کردار اور ایسے خیالات ملتے ہیں۔ اپنے افسانے "میں کس سے محبت کرتا ہوں" میں کہتے ہیں:

”جو کوئی دین میں اعتدال سے کام لیتا ہے،وہ سزا کے خوف اور جزا کی خواہش کے درمیان حیرانی وسر گشتگی کے عالم میں کھڑا رہتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی اہلِ ایمان کے جلوس کے ساتھ چلتا ہے، لکڑی کے سہارے چلتا ہے اور جب کبھی بحالتِ نماز رکوع میں جاتا ہے تو اس کی فکر اس کے سامنے کھڑی ہو کر اس کا مذاق اڑاتی ہے۔“(۴۲)

جبران کے خیال میں کسی بھی جزاوسزا دینے والے کو ایک انتہا پر قائم ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ فیصلہ کرنے میں خود مختاری محسوس کرے۔

جزاوسزا کا خیال ہمیشہ ہی انسان کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ چاہے وہ کوئی زندگی کی دوڑ ہو یا پھر کوئی امتحان ہو یا پھر خدا کے حضور حاضر ہونے کا شوق اور خوف۔ جب کوئی انسان گناہ یا ثواب کا کام کرتا ہے تو یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ثواب کے بعد جزا اور گناہ کے بعد سزا کا ضرور سوچتا ہے۔ شاید اسی لیے ثواب کا کام کر کے اسے اطمینانِ قلب اور گناہ کا کام کر کے اضطرابِ قلب رہتا ہے۔ اسی لیے وہ خدا کے حضور گڑگڑاتا اور روتا ہے اور معافیاں مانگتا ہے۔ اب چاہے یہ گناہ چھپ کر اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر کیا ہو۔

جبران کا افسانہ ”پس پردہ“ اسی خیال پر لکھا ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں ایک خوبصورت لڑکی سے ایک پادری کو پیار ہو جاتا ہے جو تقریباً سات سال تک پیار کرتا رہتا ہے مگر زمانے کے ڈر سے اس کا اظہار لڑکی سے نہیں کرتا کیوں کہ وہ شادی شدہ ہوتی ہے۔ ایک دن لڑکی فوت ہو جاتی ہے تو یہی پادری عالمِ نزع میں اس کے پاس ہوتا ہے یا پھر اس کا خاوند۔ پادری خاوند کو تو کسی بہانے سے دعائے مغفرت کروا کر کمرے سے باہر بھیج دیتا ہے اور خود اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور اس خوبصورت لڑکی کی نرم ونازک لاش کو چومنا شروع کر دیتا ہے۔ ٹھنڈی لاش پر جھک کر اس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کے بے شمار بوسے لینے لگتا ہے۔ لمبے لمبے، گرم اور پر جوش بوسے لیتا ہے جو واقعی میں محبت اور غم میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اسے گناہ کا احساس ہوتا ہے اور وہ خدا کے حضور معافی مانگنے لگتا ہے اور رونا پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ کیاں کہ

اب اسے احساس ہے کہ اس نے ایک پادری ہو کر نہ صرف ایک لاش کی بے حرمتی کہ ہے بلکہ ایک خاوند سے بھی دغا کیاہے اور دعائے معافی مانگنے کے بجائے مردے کو چومنا شروع کر دیاہے۔

اب وہ خدا کے حضور سزا کے خوف سے تڑپتااور روتا ہے کہ اس کی حالت افسانہ نگار نے یوں بیان کی ہے:

> "وہ اسی طرح روتا، پیٹتااور دائیں بائیں سر دھنتا رہا۔ وہ راحیل (لڑکی کا نام) کے مردہ جسم کی طرف جان بوجھ کر نہیں دیکھتا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں اس کے اسرارِ نفسانی اس کی روح کو پامال نہ کر دیں۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اس نے ان ہیولانی نقوش پر اپنی گلابی چادر ڈال دی جنھیں محبت، مذہب، زندگی اور موت نے بنایا تھا۔"(۴۳)

جزا کا شوق اور سزا کا خوف انسان کا کبھی بھی پیچھا نہیں چھوڑتا اور اگر انسان نیک وپارسا بھی ہو تو یہ طلب اور بھی شدت اختیار کر جاتی ہے۔ انسان کو کسی بھی حالت میں اپنے خدا سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

انسان اپنے انسانی تقاضوں کے پیشِ نظر زندگی بھر جتنا بھی گناہوں سے بچے کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کوئی گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے اور پھر یہ بھی اس کی فطرت ہے کہ گناہ کر کے ندامت کا شکار ہوتا ہے اور پھر اس کے کفارے لے لیے نیکی کی راہ یا پھر نیک انسان کو جانے والی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی گناہوں کا لتھڑا ہوا شخص کسی نیک وپارسا پادری یا عالمِ دین کے پاس آئے تو اسے نفرت سے دھتکارنے کے بجائے اس کی بات سننی چاہیے اور اسے اچھی نوید سنانی چاہیے تا کہ اس کا مذہب، انسانیت، خدا اور معاشرے پر یقین بنا رہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسے کئی عالم، فاضل پادری پائے جاتے ہیں جو ان باتوں کا خیال کیے بغیر ہی فیصلے سنا دیتے ہیں۔ حالانکہ جزا اور سزا کا فیصلہ اللہ نے ہمیشہ سے اپنے پاس رکھا ہے اور اس کا معیار کیا ہے یہ بھی اسی کو ہی معلوم ہے۔

جبران کا ایک افسانہ ”ایندھن“ ایسے ہی موضوع پر لکھا گیا ہے جس میں ایک پادری کے پاس ایک عورت گناہوں سے شرمندہ ہو کر آتی ہے مگر وہ غیر مذہب ہوتی ہے تو پادری اسے کہتا ہے کہ یہاں صرف مذہبی لوگوں کے لیے ہی نجات ممکن ہے۔ کسی اور کے لیے نہیں۔ مگر خدا کو یہ بات پسند نہیں آتی اور اسی وقت آسمانی بجلی اس کلیسا پر گرتی ہے اور پادری سمیت سارا کلیسا جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ مگر عورت کو لوگ بچا لے جاتے ہیں۔ افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> ”ایک طوفانی شام جبکہ ایک عیسائی پادری اپنے گرجے میں تھا ایک غیر عیسائی عورت آئی اور اس کے حضور میں کھڑی ہو کر بولی۔
>
> ”مقدس راہب میں عیسائی نہیں ہوں۔ لیکن کیا میرے لیے بھی دوزخ کی آگ سے نجات کا کوئی ذریعہ ہے؟“
>
> پادری نے اس کی طرف نخوت سے دیکھا اور کہا۔
>
> نہیں۔۔۔ نجات صرف ان کے لیے ہے جن کی روحیں پاک روح سے اصطباح کر چکی ہیں۔“
>
> وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ خوف ناک گرج کے ساتھ آسمان سے بجلی کوندی اور اس کے گرجے کو اپنے مہیب شعلوں میں لپیٹ لیا۔
>
> شہر سے لوگ بھاگے ہوئے آئے انھوں نے اس عورت کو تو بچا لیا لیکن پادری جل کر راکھ ہو چکا تھا۔۔۔ آگ کا ایندھن!“(۴۴)

اس افسانے کی رو سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے اور خدا سے بخشش کی امید رکھنی چاہیے اور دوسروں کو بھی یہی امید دلانی چاہیے کیوں کہ یہ ظاہری اعمال کا دارومدار ہمارے اور خدا کے

درمیان ایک واسطہ تو ہے مگر نجات، جزا اور سزا کے معیارات اس کے اپنے ہیں۔ جن میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہو سکتا دوسروں کے لیے بخشش کی دعائیں کرنے والا اپنی نجات کا راستہ ہموار نہ کر سکے۔

انسان نے دنیا میں ہوش سنبھالتے ہی اور عقل آتے ہی کئی چیزیں خود سے ہی گڑھ لیں اور کئی اس کے ذہن میں خود سے آگئیں اور کچھ ضرورت اور علم کے تحت اس کے درمیان آگئیں۔ اسی طرح انسان کب، کیسے مذہبی ہو گیا اور اس کے درمیان یہ مذہب کیوں آگیا اسے آج تک معلوم نہیں۔ مگر کہا جاتا ہے کہ پہلا سوچنے اور سمجھنے والا انسان بھی مذہبی تھا۔ اور اسی طرح انسان کا رشتہ خدا سے جڑتا چلا گیا اور انسان خدا کی پوجا اور عبادت کرنے لگا۔ اسی عبادت اور پوجا کا بجالانے میں خدا کے احکامات ماننے اور تعلیمات ماننا بھی ضروری ہو گیا۔ جس پر عمل نہ کرنے پر طرح طرح کی وعیدیں اور تاکیدیں بھی سنائی گئیں اور عمل کرنے پر نویدیں اور بشارتیں بھی سنائی گئیں۔ بس یہیں سے انسان کا خدا سے محبت اور خوف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

انسان خدا سے محبت کے سلسلے میں اس کے بتائے ہوئے احکامات اور تعلیمات کو بجالانے لگا اور طرح طرح کی عملی سرگرمیوں، پوجا اور عبادتوں میں میں اپنے دن رات گزارنے لگا۔ یہ دقت طلب اور مشکل کام تو تھا مگر اس سے مذہبی انسان کو سکون اور اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہونے لگی۔ اور انھیں عبادتوں کے نہ کرنے پر جب اسے سزاوں کا خوف بڑا تو اس نے اور اور طرح سے اس کا حل نکالنا شروع کر دیا اور یہاں تک کہ خدائی تعلیمات اور نظریات میں ردوبدل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ پہلے اس کے بھیجے برگزیدہ بندوں، رسولوں اور پیغمبروں سے انحراف کرنے لگا اور آہستہ آہستہ خدا کے ہی وجود میں چونکہ، چنانچہ اور یوں، ووں کرنے لگا۔ بس انسان ہر وہ کام پسند کرنا چاہتا تھا جس سے خدا کی معرفت اور قرب بھی حاصل ہو اور اسے کم سے کم مشقت کرنی پڑے یا پھر نہ کرنی پڑے۔ دوسری طرف ان لوگوں نے جنھوں نے مذہبی لبادہ اوڑھا وہ لوگوں کو خدا کی طرف راغب کرنے کے لیے اور مذہبی اجارہ داری قائم رکھنے اور لوگوں کو اپنی سامنے کھڑے اور جھکے ہوئے رکھنے کے لیے مذہب میں سختیوں اور مشقتوں کا بڑھ چڑھ کر ذکر کرنے لگے۔ اس سے انسان نے پھر راہِ فرار نکالنی شروع کی اور خدا کے ہی اس وجود کو ماننا چاہا جو انھیں رحیم و کریم اور شفیق بن کے ملے اور ان کے ہر

جائز و ناجائز کام سے در گزر کرے اور ان پر ہمیشہ اپنی رحمت کا سایہ بھی رکھے۔ بس پھر انسان اس خدا کو پسند کرتے جو اس کی سمجھ میں آجاتا اور اس خدا سے انکاری ہو جاتا جو اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ ہر اس آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کر لیتے جو ان کو ان کے اپنی مرضی کے خدا سے متعارف کرواتا اور اس رہنما سے دور بھاگتے اور اسے برا بھلا کہتے جو ان کے مطابق اور من مرضی کے خدا سے نہیں ملاتا تھا اور انھیں سختیاں جھیلنا پڑتی تھیں یا پھر مصائب اور تکالیف کا اندیشہ رہتا تھا۔

جبران نے لوگوں کے ایسے ہی جزا و سزا کے تصور اور معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ایک افسانہ "خدا اور دیوتا" لکھا ہے۔ جس میں چار مختلف لوگ، چار مختلف خدائی نظریات کا پرچار کرتے ہیں اور ہر کوئی اپنی اپنی مرضی کا خدا چن لیتا ہے اور اس رہنما کا ماننے والا بن جاتا ہے اور سب سے زیادہ لوگ اس آدمی اور خدا کو پسند فرماتے ہیں جو خدا کو رحیم، رحمٰن اور شفیق کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے خدا کے ساتھ ماں اور بہن جیسے رشتے بھی قبول کر لیتے ہیں۔ یہی خدائی نظریات جبران کے الفاظ میں دیکھیے:

> "کیلافش کے شہر میں ایک فسطائی مندر کی سیڑھیوں میں کھڑا بہت سے دیوتاؤں کا پرچار کر رہا تھا اور لوگ اپنے دلوں میں کہہ رہے تھے۔
>
> "ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ کیا یہ سب دیوتا ہمارے ساتھ نہیں رہتے اور جہاں کہیں بھی ہم جائیں ہمارا پیچھا نہیں کرتے؟"
>
> تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص چوک میں کھڑا لوگوں سے کہہ رہا تھا۔
>
> "کوئی خدا نہیں۔ جس نے بھی اسے سنا۔ خوش ہوا کہ انھیں خداؤں سے ڈر لگتا تھا!"
>
> پھر کسی اور دن ایک اور آدمی آیا۔ اس کے بیان میں فصاحت تھی اور اندازِ تکلم میں دلکشی، اس نے کہا۔
>
> "لوگو! خدا صرف ایک ہے۔"

سننے والے یہ سن کر افسردہ ہو گئے۔ کیوں کہ دل میں وہ ایک خدا کے انصاف سے بہت سے خداؤں کے انصاف کی نسبت زیادہ ڈرتے تھے!

اسی سال ایک اور آدمی آیا اور اس نے لوگوں سے کہا۔

"اصل میں خدا تین ہیں اور وہ تین اوپر، ایک بن کے رہتے ہیں۔ ان کی ایک بہت مہربان ماں ہے۔ جو ان کی جورو بھی ہے اور بہن بھی!"

اس پر کیلافش کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔

"ایک خدا، ایک میں تین۔ یقیناً ہماری خطاؤں اور کمزوریوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔ اور پھر ان کی مہربان ماں وہ ہم کمزور دلوں کی خطا پوشی ضرور کرے گی۔""(۴۵)

اس افسانے کا لبِ لباب خود افسانہ نگار نے افسانے کے آخری حصے میں اس طرح دیا ہے کہ پھر سے آج تک کیلافش کے لوگ آپس میں خدا کے وجود اور ناوجود پر جھگڑ رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے جھگڑے میں صحیح چیز اور بات بھی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ بس پھر وہ سارے لوگ ایک خدا، تین خداؤں، ان کی ایک ماں اور وہ بھی مشفق، پر مناظروں ہی میں وقت گزارنے لگے اور یہی آج تک ہوتا آرہا ہے۔ یہ سارا جھگڑا جزا و سزا کے معیار اور بچاؤ سے ہی پیدا ہوا۔

خدا نے انسان کو دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر بھیجا اور اسی بنا پر اسے فشتوں سے سجدہ بھی کروایا اور تمام مخلوقات میں افضلیت بھی عطا کی۔ اس کی وجہ انسان کا منصب اور اپنے ذمے کچھ فرائض تھے۔ مگر انسان دنیا میں آ کے اپنے فرائض بھول گیا اور دنیا داری کے پیچھے پڑتا چلا گیا۔ روحانیت کی جگہ مادیت نے لے لی۔ امن و آشتی کی جگہ جنگ اور قتل و غارت نے لے لی۔ آزادی کی جگہ غلامی جیسی لعنت دنیا پر مسلط کر دی گئی۔ علم جیسے

نور کی جگہ، جہالت جیسی تاریکی اور ظلم نے اپنے پنجے گاڑھ لیے۔ انسان سے اس کی انسانیت چھین لی گئی اور اسے "اسفل سافلین" بنا کر تمام مراتب سے گرادیا اور اسے معتوب ٹھہرایا گیا۔

یہ بجا ہے کہ جزاوسزا کے فیصلے آخرت میں ہوتے ہیں مگر کچھ کے فیصلے خدا دنیا میں ہی کر دیتا ہے۔ تاکہ بعد کی انسانیت اس سے سبق سیکھے اور اپنے اعمال درست کرلے۔ مگر ایسا بھی کم کم ہی ہوتا ہے اور خدا کو اور عذاب بھیجنے پڑتے ہیں، کبھی وبا، کبھی بیماری اور کبھی فاقہ و غربت کی صورت میں۔ اور یہ سب کرنا اس کی فطرت ہے۔

اسی تناظر میں جبران نے اپنے افسانے "انسان" میں تمام انسانیت کو مخاطب کیا ہے اور اسے اس کے کرتبے کی وجہ بتائی ہے اور آخر پر اپنے مرتبے سے گرنے کی وجہ سے سزا کی بھی وعید سنائی ہے اور وجہ بھی بتائی ہے، اشارے بھی دیے ہیں۔ لکھتا ہے:

> "انسان! جسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہے جسے فرشتوں نے سجدہ کیا اور مالکِ دو جہاں نے زمین کا حکمران بنایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔زمین نے افتخار سے اسے اپنی وسیع آغوش میں بٹھایا اور آسمان نے ضیا پاش نگاہوں سے عقیدت کے پھول برسائے۔۔۔۔۔۔۔
>
> آہ انسان! قدرت نے اسے ایک بہت بڑا عطیہ دیا تھا لیکن اس نے اس کی قدر نہ کی۔ اس سے جائز فائدہ نہ اٹھایا اور اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی ارزل المخلوقات ہو کر رہ گیا۔
>
> آج انسانیت اس کے ہاتھوں نالاں ہے اور اس کی چیرہ دستیوں پر انگشت بدنداں۔۔۔۔۔۔اس کی معصومیت مصیبت میں بدل گئی اور مذہب پر مادیت چھا رہی ہے۔"(۴۶)

انسان کا اپنے معیار سے گرنا، محبت پر نفرت کا غلبہ، آزادی پر غلامی کی افضلیت، امن پر جنگ کی فتح اور سب سے بڑھ کر مذہب پر مادیت کا چھانا یہ انسان کے لیے دنیا میں ہی اس کی گراوٹ پر سزائیں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جزا و سزا کو آخرت پہ ہی نہ چھوڑے بل کہ دنیا میں بھی اس کا انتظار کرے۔

انسان نے اس قدر دنیا میں اپنے اصول وضوابط گھڑ لیے ہیں اور خدا کی بنائی ہوئی سرزمین اور کائنات میں اسی کی مخالفت کر رہا ہے کہ لگتا ہے کہ انسان بالکل بھی خدا کو بھول گیا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگا ہے۔ انسان حرص و ہوا کا اس قدر دلدادہ ہوا ہے کہ جزا و سزا کے معیار اور حقیقت کو بھی پسِ پشت ڈال بیٹھا ہے اور اب بالکل ناعاقبت اندیشی میں وقت گزار رہا ہے۔ جبران کے ہاں انسان کو ایسی تمام غلط کاریوں اور خدا کے تصور سے بیگانگی پر کئی ایک کہانیاں ملتی ہیں۔ جن میں جبران انسان کو تنبیہ کرتے نظر آتا ہے اور اسے دبے ہوئے انداز میں سمجھانے کی بھی کوشش کرتا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن مقرر ہے تو دنیا میں ایسے اعمال نہ کر کہ کل تو اس کے انجام سے بری طرح نڈھال ہو گا اور تجھے انسان ہونے پر شرمندگی ہو گی۔

جبران کے نزدیک انسان اس قدر گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ تبسم دکھا کر لوٹ لینے کا کام کرتا ہے۔ کسی کی غلط ملط تعریف اس لیے کرتا ہے کہ اس سے اپنا ذاتی فائدہ نکال سکے۔ اپنی غلطیوں کا انتہائی چالاکی کے ساتھ دوسروں کے سر الزام دھرتا ہے۔ سادگی کے بجائے عیاری اور ہشیاری سے کام لیتا ہے۔ خدا کا کام بھی کرتا ہے اور شیطان سے ہاتھ بھی ملاتا ہے اور دوستی رکھتا ہے۔ انسان مطلق اپنے اعمال کے بارے میں جزا و سزا سے بے خبر ہے یا پھر اس نے اپنے ہی میزان اور ترازو بنا کر اپنے ہی اصولوں سے جزا و سزا کا معیار بنا رکھا ہے۔

اسی تناظر میں جبران کی کہانی "یہ دنیا ہماری" ملتی ہے۔ جس میں جبران نے انسان کے اسی رویے پر کھل کر تنقید کی ہے اور اسے خدا کے حضور سربسجود رہنے کی تلقین بھی کی ہے اور ایسی تمام حرکتوں سے باز رہنے کا کہا ہے جس میں انسان خدا سے دور اور دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کہانی میں جبران خدا سے بھی

مخاطب ہوتا ہے اور اسے دنیا کے اعمال سے آگاہ بھی کرتا ہے اور اسے یہ بھی بتاتا ہے کہ تیری دنیا تیرے ہوتے اے خدا کیا سے کیا کرتی چلی جارہی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس دیکھیے:

"ایک زیرِ لب تبسم کے ساتھ اپنے پروسی کو لوٹ لینا۔ ہاتھ کو شان سے ہلا کر خیرات کرنا، کسی کی جان بوجھ کر تعریف کرنا، دوسروں پر انتہائی چالاکی سے الزام عائد کرنا، کسی شخص کی زندگی کو ایک ہی لفظ میں بتا دینا اور جب دن بھر کا کام ختم ہو جائے تو نہایت عیاری سے ہاتھ دھو لینا۔

ایک مضبوط ارادے کے ساتھ محبت کرنا۔ ہوشیاری سے کسی کو خوش کرنا۔ بن ٹھن کر خدا کی عبادت کرنا۔ تپاک سے شیطان کے ساتھ اتحاد کرنا اور پھر سب کچھ بھول جانا۔

سوچ سمجھ کر کسی چیز کی تمنا کرنا۔ خندہ پیشانی سے ملول ہو جانا اور پیالہ خالی کر دینا تا کہ اسے کل پھر بھرا جائے۔"(۴۷)

بے شک انسان نے جزا و سزا کے معیار اور خدا کے خوف کو بھلا کر ہی انسانوں سے ایسا برتاؤ کرنے کی ٹھانی ہے۔ مگر یہ جزا و سزا کا عمل ٹلنے والا نہیں کیوں کہ خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ انسان کو چاہیے کہ ایسے تمام کاموں سے دور رہے جو روزِ قیامت ہمیں خدا کے عتاب کا نشانہ بنائیں۔

جبران نے اپنے افسانے "علم و عقل" میں نہایت شاندار طریقے اور بیانیہ تکنیک کے ذریعے سے علم اور عقل کا باہمی رشتہ اور ان کے فوائد پہ روشنی ڈالی ہے۔ یہ بحث اتنی دلچسپ اور گداز ہے کہ قاری پڑھتا چلا جاتا ہے اور اسی اسلوب و افکار کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے یہ بات انسان اور خدا کے باہمی تعلق کو بھی واضح کرنے لگتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ جزا و سزا کا معیار بھی ہمارے علم اور عقل پر منتج ہے۔ اس افسانے میں جبران نے دو حکایتوں کا بھی سہارا لیا ہے اور ان حکایتوں سے بھی علم و عقل، بے وقوفوں اور دانشوروں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے جس میں جبران کامیاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس افسانے میں ناصحانہ بھی کئی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں جن کے ذریعے سے مصنف بتاتے ہیں کہ ہر روگ دور ہو سکتا ہے مگر ایک کم عقل، جاہل اور بے وقوف کا یہ یہی روگ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے لیے وہ حضرت عیسیٰؑ کی مثال دیتے ہیں کہ وہ بھی اندھوں، کوڑھیوں اور جذامیوں کا علاج کرتے تھے۔ لیکن بے وقوفی اور حماقت کا علاج ان کے پاس کوئی نہ تھا۔ افسانہ نگار کے نزدیک عقل کو استعمال کرتے ہوئے معاملے کے ہر پہلو پر غور کر کے فیصلہ کرنا چاہیے۔ افسانے کے آخر میں مصنف جزا و سزا کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”جس وقت زندگی میں کوئی مفید اور کار آمد موقع آئے تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو کیونکہ جو شخص ایسے موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس کی مثال ایسی ہے کہ وہ موقع کو اپنے ساتھ ضرور دیکھتا ہے لیکن اس کے استقبال کے لیے آگے قدم نہیں اٹھاتا۔
>
> اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی برائی منسوب نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہمیں عقل و خرد اور علم و فضل سے مسلح کر دیا ہے تاکہ ہم زندگی کی راہوں پر غلط کاریوں اور تباہیوں کے گڑھوں سے بچ کر چلیں۔
>
> یقیناً وہ لوگ خوش نصیب ہیں جن پر ذاتِ باری تعالیٰ نے علم و فضل کی بارشیں کی ہیں۔“(۴۸)

اس افسانے کی رو سے جبران کے نظریات کی یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اس کے ہاں انسانی عقل ہی جزا و سزا کی موجب قرار پاتی ہے۔ اس سے جبران یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ انسان کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور ہر لمحے اپنی عقل کو استعمال میں لاتے ہوئے زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے اقدامات اٹھانے چاہییں۔ انسان کسی بھی صورت خدا کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی رضا کی بدولت میں گناہوں کا مرتکب ہوا یا میں خدا ہی کی مرضی سے دنیا میں پسپا رہا اور ہمیشہ دوسروں سے پیچھے رہا اور غربت کی چکی میں پستا رہا کیوں کہ میرے مقدر میں خدا نے یہ سب کچھ لکھ دیا تھا۔ بل کہ جبران اسے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا

نے جب تجھے عقل و خرد اور سمجھ عطا کر دی ہے تو تُو کس برتے پر خدا سے شکوہ کناں ہے اور اپنی غلطیوں سے کیوں بھاگ رہا ہے۔ اس کی جزا یا سزا اب تمھیں تمھارے اعمال کی وجہ سے مل کر ہی رہے گی۔

انسانی زندگی، اس کے اعمال اور معاشرے میں اس کے کردار پر جبران کی نظر بہت گہری تھی اور اسی کی بنیاد پر جبران نے اپنے فلسفے کو شعر و نثر میں ایک کمال مہارت سے بیان کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر یا سن کر انسان کو پتا چلتا ہے کہ جبران کو انسانیت سے قدر ہمدردی تھی اور کس عمیق نگاہی سے وہ اسے سمجھتے تھے اور اس کی تہوں میں اترے ہوئے تھے۔ اسی لیے جبران کے کئی افسانوں میں جزا و سزا کے بارے میں ایک خاص انداز میں بحث اور تبصرے ملتے ہیں جن میں وہ اپنے کرادروں اور پھر انھیں کرداروں کے مکالمات سے ایک خاص انداز سے انسان کے اعمال اوور انھیں نیک و بد اعمال کی بنیاد پر جزا و سزا کی بات کرتا ہے۔ چوں کہ جبران ایک انقلابی فکر اور ترقی پسند خیالات کا حامل شخص تھا اس لیے اس کا رجحان معاشرے میں دائیں بازو کی طرف زیادہ تھا وہ اسطرح کہ جبران معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کو اپنے قدموں پر کھڑا کرنا چاہتا تھا اور ہر انسان کو خوش حال دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے ہمیشہ ہی اچھے اعمال کا درس دیا اور ہر انسان کو آگے بڑھ کر معاشرے کی خدمت کرنے کی ترغیب دی۔

انھیں خیالات پر مبنی جبران کی ایک کہانی اور افسانہ "انسان دیوتا" ہے جس میں جبران نے نہایت چابک دستی اور ہشیاری سے کہانی کی بنت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک پڑھتے چلے جائیں انسان اکتات نہیں اور کہیں بھی جھول دکھائی نہیں دیتا بل کہ قاری کو یوں لگتا جسے یہ کہانی اسی کے معاشرے، زمانے اور عہد کی ہے اور وہ ان سب حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔

اس کہانی میں مصنف موصوف نے خوشیوں، بہاروں اور طرح طرح کے مناظر کا ذکر کیا ہے اور دکھایا ہے کہ انسان ان تمام مناظر اور خوش گوار حالات میں کس قدر مصروف ہے اور وہ جزا و سزا سے بالکل بیگانہ ہو گیا ہے اور دنیا کی رنگا رنگی مصروف ہے۔ انھیں خوشیوں میں غم کی لہر نکلتی ہے اور یہ غم کا اندھیرا ساری خوشیوں کی روشنی کو نگل جاتا ہے اور ساری دنیا زمین کی ایک ہی جنبش سے تہہ و بالا ہو جاتی ہے۔ کیوں

کہ انسان نے اچھے اعمال چھوڑ دیے تھے اور برے اعمال میں اس قدر غرق ہو چکا ہے کہ اپنی جزاو سزا کو بھی بھول گیا ہے وہ بھول گیا ہے کہ کل کو اسے کسی کے سامنے حاضر بھی ہونا ہے اور کسی کے حضور کیے گئے اعمال کا جوب بھی دینا ہے۔ اسی لیے زمین ہمارے گناہوں کا بوجھ زیادہ نہیں اٹھا سکتی اسی لیے آج اس نے اپنے اندر چھپے ہوئے لاوے کو زہر کی طرح لوگوں پر ہی اگل دیا ہے اور انسان بالکل تباہ و برباد ہو گیا ہے۔

اسی تباہی کے دہانے پر انسان کی روح کھڑی محوِ تجسس و متفکر ہے اور سوچ رہی ہے کہ انسان کی ہنستی کھیلتی زندگی کو ایک ہی لمحے میں کس کی نظر لگ گئی اور یہ سارے کے سارے مناظر آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں کیسے آ گئے اور زمین کو آخر کار کس پر غصہ ہے جو یوں لوگوں کو برباد کرنے اور زلزلوں پر آمادہ ہو گئی ہے۔ زمین نے اپنے عذاب کی بھرمار انسان پر کیوں کر دی ہے۔ ان تمام معاملات پر روحِ انسانی خاموشی سے سوچ رہی تھی کہ اسے جو سمجھ آئی وہ ذرا آپ بھی سنیے اور روح کی زبانی سنیے:

”میں نے نظر اٹھا کر انسان کی گزشتہ تاریخ کے اوراق کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کہیں تو وہ فتح و نصرت کے مینار نصب کر رہا تھا اور کہیں محلوں، شہروں اور معبدوں کی تعمیر میں مصروف تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ زمین نے غصے میں ایک انگڑائی لی اور اپنے سینے پر بنی ہوئی تمام تعمیروں کو ایک ہی جنبش سے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اپنی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔

میں نے طاقتور اور جوشیلے انسانوں کو ناقابلِ تسخیر قلعوں کی تعمیر کرتے دیکھا اور عظیم فن کاروں کو ان قلعوں کی دیواروں پر نقش و نگاری میں مصروف دیکھا اور اسی اثناء میں زمین نے ایک جمائی ہی لی اور منہ کھول کر جو کچھ ہنر مند ہاتھوں اور روشن دماغوں نے تخلیق کیا تھا، چشم زدن میں نگل گئی۔“[۴۹]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جبران بالکل اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کے اعمال ہی کی بنیاد پر جزاو سزا کا فیصلہ ہو گا اور اس افسانے سے تو یہ بھی بات سمجھ آتی ہے کہ مصنف

موصوف کے نزدیک اچھے برے اعمال کی جزاو سزا دنیا میں بھی ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں دنیا میں نیک اعمال کرنے چاہییں نہیں تو دنیا ہمیں ایک ہی انگڑائی میں نگل لے گی اور ہم کسی بھی کام کے نہیں رہیں گے۔ دنیا میں بڑے بڑے ناقابلِ تسخیر قلعے اور فصیلیں بنانے سے اچھا ہے کہ لوگوں کے دلوں کو اس طرح تحفظ دیں کہ کوئی غم ،کوئی تکلیف اس کے دل کے پاس نہ آنے پائے اور انسان خوشی سے اپنی زندگی گزارے۔ دنیا میں بڑی بڑی تہذیبی تبدیلیاں لانے کی بجائے اپنی ذات میں تہذیبی تبدیلی لانی چاہیے اور دنیا کو اسی کے بطن سے اگنے والے سرسبز وشاداب کھیتوں میں خوش رہنے دینا چاہیے۔اس کے لیے ہمارے سامنے عظیم تہذیبوں کی مثالیں موجود ہیں کہ بابل، نینوا، پامیرا، رومن اور بومپیائی تہذیب کے کھنڈرات اب ہمارا منہ چڑا رہے ہیں۔

جبران کو دنیا میں اپنے تشخص، حیثیت اور وقار کو قائم کرنے جیسے بے شمار مسائل کا سامنا تھا اور بچپن سے ہی والد کی سختی نے اور ماں کی گھر میں بے حیثیتی نے اس کی ہر حیثیت اور اہمیت کو تار تار کر دیا تھا حتیٰ کہ اس کی عزتِ نفس بھی مجروح تھی اور اسے گھر میں کسی قسم کی کوئی آزادی مہیانہ تھی اور بھائیوں میں بھی اس کا دوسرا نمبر تھا جس وجہ سے اسے کسی بھی کام میں فوقیت حاصل نہ تھی اور جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہجرت کا غم اور وطن سے دوری کا احساس دامن گیر ہوا۔ اس کے بعد علمی سطح پر جب دنیا پہ نظر ڈالی تو ہر طرف اپنے وطن کی حالت نہ گفتہ بہ دیکھی۔ ان تمام مسائل اور چیزوں کو دیکھتے ہوئے جبران نے انسانی ضمیر کو جنجھوڑنے اور اپنے لوگوں کو نیکی اور ترقی کی راہوں پر گامزن کرے کی ٹھان لی۔ اسی وجہ سے اس کا قلم بے انقلابی، باغیانہ اور مروجہ ذہنوں پر جمی کائی کو اتارنے پر مصروف ہو گیا۔ جس وجہ سے اسے سر عزنش اور داد و تحسین کے طور پر کئی ایک تحریروں میں جزاو سزا کا بھی ذکر کرنا پڑا اور ایسے خیالات اس کی کئی ایک کہانیوں میں عم،دہ ترین اسلوب کے ساتھ سامنے آئے۔ ایسے ہی خیالات کا افسانہ ”مرشد کا فرمان“ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کہانی اور افسانے کا پلاٹ اتنا اہم نہیں جتنی اس کی تکنیک اور ہیئت اہم ہے۔ اس افسانے میں ایک شاگرد اپنے استاد کے فرمودات کو بعد از وصال وام کرنے کی ٹھانتا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ میں اپنے استاد جسے

میں مرشد بھی مانتا ہوں، کے خیالات کو پہلے خود سمجھوں گا اور پھر مکمل طور پر لوگوں کے سامنے بھی ضرور پیش کروں گا۔لوگ اس شاگرد کے منھ سے اس کے استاد کے عظیم فرامین سنتے ہیں اور اش اش کر اٹھتے ہیں اور اس کے استاد کی عزت اور اس شاگرد کی عزت لوگوں کے دلوں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ یہی شاگرد اپنے استاد کی کتابوں اور علمی نسخوں کے ساتھ کچھ سالوں کے لیے روپوش ہو جاتا ہے اور راہبانہ طور پر اپنے استاد کی علمیت اور فرمودات پر نظر اور مراقبہ کرتا ہے لوگو اسے ملنے دور دراز سے آتے ہیں مگر یہ اس مراقبے کے زمانے میں کسی سے نہیں ملتا آخر کاتر ایک دن یہ دنیاوالوں کے سامنے اپنے استاد اور مرشد کے مکمل علم کے س اتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو لوگ پہلے ہی اس کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں اور اسے پلکوں پہ بٹھاتے ہیں۔اس طرح اس کی شہرت اپنے استاد سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

اس ساری کہانی میں شاگرد جگہ جگہ اور مختلف شہروں میں اپنے استاد کے نظریات کا پرچار کرتا ہے جو دراصل مصنف خلیل جبران کے نظریات کا پرچار ہے اور ہمارے سامنے آتے ہیں اس افسانے میں زندگی میں متعلقہ بڑے اہم اور اچھے نظریات پڑھنے کو ملتے ہیں جن میں جزاوسزا کا نظریہ بھی ملتا ہے۔مصبف موصوف کے نزدیک نیک اور بھلائی کا کام کرنا اہم ہے یہ اہم نہیں کہ ہمیں زندگی میں لوگوں کی طرف سے اس کی جزا ملی ہے یا نہیں اور لوگ ہماری قدر کرتے ہیں کہ نہیں۔بس ہمیں اپنا بھلائی کا کام کرنا ہے تو دنیا سے بے نیاز ہو کر، صلے تمنا اور ستائش کی پروزہ کیے بغیر ہمیں یہ کام کرنا چاہیے۔کیوں کہ اچھے کام کا صلہ ضرور ملتا ہے اگر دنیا میں نہیں ملا تو اس کی جزا بعد از مرگ بھی ملے گی۔اور اسی کے برعکس ایک آدمی زندگی میں برے کام کرتا ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس برے آدمی پر اللہ کا عذاب نہیں آرہا اور اسے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے تو مصنف کا کہنا یہ ہے کہ ایسے معاملات اللہ کے حضور ہی رہنے دینے چاہییں کہ اللہ مرنے کے بعد ضرور اس کو سزا دے گا یہ اس کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔اور اپنے چھوٹے سے چھوٹے بھلائی کے کام کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے کہ کل انسانی تاریخ میں یہی کام ایک اہم سنگِ میل اور کامیابی و بھلائی کی کڑی بن کر ہمارے سامنے آئیں گے۔اقتباس دیکھیے:

"وہ کام جن کو ہم آج غلطی سے کمزوریوں سے تعبیر کرتے ہیں کل انسانی ارتقا میں ایک
نہایت ضروری کڑی کی حیثیت سے نظر آئیں گے۔

اور جن ظلم و ستم کو برداشت کرنے کی ہمیں کوئی جزا نہیں ملی وہ جزا کل ہماری عظمت بن کر چمکے گی اور ہماری سربلندی کا اعلان کرے گی اور وہ صعوبتیں جن کو ہم نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا وہی صعوبتیں کل ہماری کامیابی کا سہرا بن کر ہمارے سروں کی زینت بنیں گے۔"(۵۰)

اس اقتباس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کے تصورِ جزا و سزا پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جبران کے نزدیک ایسا ہے کہ کبھی کبھی ہم اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر صرفِ نظر کر دیتے ہیں یا پھر اپنے چھوٹ سے نیکی کے کام کو زیادہ خیال نہیں کرتے تو جبران کا کہنا یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے کام آگے مستقبل میں بہت بڑے کام کا ارتقائی پہلو ہوں یا پھر کسے بڑے کام کا سنگِ میل ثابت ہوں۔ انسان آہستہ آہستہ ہی تھوڑی تھوڑی محنت سے ہی آگے بڑھتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ نیکی کے کام میں لوگوں کے منھ سے تعریف کے بجائے کام پہ مستقل مزاجی چاہیے ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو یہاں اپنے برے اعمال پہ سزا نہیں ملتی خدا نے ان کے لیے کہیں نہ کہیں ضرور سزا کا انتظام کر رکھا ہے اور اسی طرح نیکوں کے لیے جزا کا بھی اہتمام کر رکھا ہے۔ خوف اور رجا کی کیفیت سے کبھی بھی نہیں نکلنا چاہیے۔

جزا و سزا کا تصور اور معیار اور پھر اس کو قائم و دائم رکھنا کسی بھی معاشرے کی ساکھ اور اس کی سالمیت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے کوئی بھی باشعور آدمی معاشرے میں قانون کی بالا دستی کو لازمی قرار دیتا ہے اور اس کا ماننا ہے قانون کی بالا دستی کے بغیر کوئی بھی معاشرہ صحیح معنوں میں نہیں پنپ سکتا۔ بہت سے معاشرے اس لیے اجڑ جاتے ہیں اور ان کی قسمت میں تباہی لکھ دی جاتی ہے کہ وہاں قانون کی بالا دستی نہیں ہوتی یا پھر امیر اور غریب کے لیے دو مختلف قانون موجود ہوتے ہیں کہ امیر تو اپنے روپے پیسے کے عوض بڑے سے بڑے گناہوں سے پیسے دے کر چھوٹ جاتے ہیں مگر غریب پیسے نہ ہونے کی وجہ سے قانون کے جال میں

پھنس جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ معاشرے میں قانون بنایا ہی کمزور اور غریب لوگوں کو بچانے کے لیے اور امیر کبیر لوگوں کو چھڑانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ ایسے لوگ جو قانون کے شکنجوں میں فقط اس لیے کس دیے جاتے ہیں کہ وہ قانون سے چھوٹنے کے لیے پیسے نہیں رکھتے یا پھر ان پر الزام لگانے والے اثر ورسوخ رکھنے والے افراد ہیں اور پھنسنے والا غریب ہے بھی بے قصور، تو ایسے لوگوں کو جبران اپنی زبان میں شہیدِ قانون کہتا ہے اور اسی عنوان پر بھی جبران ایک افسانہ بعنوان "شہیدِ قانون" لکھا ہے۔ جس میں مصنف موصوف نے اپنے معاشرے میں قانون کی بھینٹ چڑھنے والے افراد کو حوصلہ دیتے ہوئے انھیں اس بات کی تسلی دلائی ہے کہ اگر دنیا میں آپ کو انصاف نہیں مل رہا تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ان دنیا کے آقاؤں کے علاوہ بھی ایک طاقت ہے جو ان سب سے جزاو سزا کا برابر حساب لے گی اور ان قانونی ٹھیکیداروں اور قانون کے دلالوں کو ضرور اپنے کٹہرے میں کھڑا کر کے سزا دے گا۔ لکھتے ہیں:

> "اے میرے کمزور بھائی! صبر سے کام لو اور خود کو تسلی دیتے رہو کیوں کہ اس مادی دنیا کے ماورا ایک عظیم ترین قوت ہے جو تمام تر انصاف، ترحم اور محبت ہے۔
>
> اے میرے بھائی! تم ایک برہنہ درخت کی طرح ہو جس کی کمر سرما کی برف کے بوجھ نے جھکا دی ہے۔ یقیناً ایک دن موسمِ بہار آئے گا اور تمھیں سبز پوشاک پہنائے گا۔ ایک دن سچائی کی فتح ضرور ہو گی۔ آج تمہارے تبسم پر آنسوؤں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کل سچائی ان پردوں کو چاک کر دے گی۔"(۵۱)

شہیدِ قانون کا دلاسا دینے لے لیے لکھا گیا جبران کا یہ افسانہ کمال ہے اور اس میں بہت سے کمزور لوگوں اور بے بس اشخاص کی زندگیوں پر بھی بحث کی گئی ہے کہ غریب غربا کو صرف چند معاشرتی لوگوں نے قانون کو خرید لینے کے بعد کس طرح قانون کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ جبران نے معاشرے کے بہت سے عیب گنوائے ہیں ان میں یہ قانون کا غلط استعمال بھی ہے۔ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تباہ و برباد ہو جاتا ہے جب اس میں قانون کا معیار گر جاتا ہے اور قانون امیروں کی جیبوں اور گودوں میں جا بیٹھتا ہے۔ لیکن جبران کو اس

بات کا یقین ہے کہ دنیا میں تو انسان مادیت پسندی کی وجہ سے تو اس قانون کا خرید لیتا ہے اور قانونی لوگ بک جاتے ہیں مگر ایک ذات ہے جو ہمارے تمام اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ ذات اور ہستی ایک نہ ایک دن ضرور حساب کتاب لے گا اور ان مجرموں کو ضرور سزا دے گا اور جو شہیدِ قانون ہوئے اور مزید ہوں گے ان کو ضرور کسی نہ کسی شکل میں جزا دے گا۔ تو یہ جزا و سزا کا معیار اور اس کا رکھ رکھاؤ دنیا میں اور دنیا کے بعد بھی چلتا رہے گا۔

مصنف کے ہاں ایسا ہی غلط جزا و سزا کے معیار پر لکھا ایک اور افسانہ ''قانون'' ملتا ہے اور قانون پر اس افسانے میں ایک الگ طرح سے روشنی دالی گئی ہے اور معاشرے میں اس بات کا شعور بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آدمی کو گناہ و ثواب کی جو سزا و جزا ملے اس کا ایک خاص پیمانہ ہونا چاہیے اور امیر گریب کے لیے الگ الگ قوانین ہونے کے بجائے سزا دینے والے لوگ بھی ویسے ہی پوتر، نیک اور پارسا ہونے چاہییں جیسا کہ وہ سزا دینے کے لیے کرتے ہیں۔ کہ آدمی سزا پا کر نیک اور پارسا ہو جائے۔ کسی بھی معاشرے اور کہانی کار کے ہاں ایسے خیالات نہیں پائے جاتے کہ سزا و جزا دینے والا سب سے پہلے ایک نیک آدمی ہو۔ ہمارے ہاں گناہ گار لوگ ہی لوگوں کو گناہوں پر سزا دیتے رہتے ہیں، مصنف کے نزدیک یہ کوئی اچھی اور مناسب بات نہیں۔ چوں کہ مصنف کی خود ایک مذہبی گھرانے میں اور مذہبی ماں کی گود میں پرورش ہوئی ہے اس لیے مصنف کا یہ نقطہء نظر ہے کہ اگر کسی کو کوئی جج یا منصف سزا دے تو وہ جج اور منصف ضرور بالضرور گناہوں سے پاک اور پارسا ہو۔ اگر جج خود گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے کسی نے ایسا حق نہیں دیا کہ وہ گناہ گاروں کو سزائیں دیتا پھر اور اگر ہمارے معاشرے مین ایسا ہی قانون ہے تو مصنف کا کہنا ہے کہ یہ قانون ہی غلط اور چند لوگوں کی ملی جھلی بھگت ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں سزا دے دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اسے سزا سے بچا لیتے ہیں بل کہ اسے جزا کا بھی حق دار بنا لیتے ہیں۔ مصنف ایسے قانون، ایسے منصفوں اور ایسے معاشرے سے بد ظن ہے۔ ایسے سزا و جزا کے رویے اور اصول پر مصنف یوں رقم طراز ہے:

''کیا قاضی نے اپنی زندگی میں کسی سے دشمنی نہیں کی؟

کیا اس نے کبھی اپنے کمزور پیروؤں سے پیسہ نہیں لیا؟

کیا اس نے ایک حسین عورت سے اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہی؟

کیا وہ خطاؤں سے پاک تھا کہ اس کے لیے قاتل کو پھانسی دینا، چور کو سزا دینا اور زانیہ پر پتھر برسوانا جائز ہو گیا۔

کون ہیں وہ جنہوں نے اس قاتل کو سولی پر لٹکایا؟

کیا وہ فرشتے تھے جو آسمانوں سے اتر کر آئے؟ یا وہ انسان تھے جو ہر ہاتھ آنے والی چیز کو غصب کرتے اور چراتے ہیں۔

اس قاتل کا سر کس نے قلم کیا؟ کیا فرشتے آسمانوں سے اتر آئے تھے یا وہ سپاہی تھے جو ہر اچھی چیز کے لیے خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔

اس زانیہ کو سنگسار کس نے کیا۔ کیا وہ راہب تھے؟ جو عبادت خانوں سے نکل کر آئے یا وہ انسان جن کی بزرگی کے پردوں میں تمام تر کمینہ حرکتیں چھپی ہوتی ہیں۔"(۵۲)

ان جملوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جبران نے جزا و سزا کے اس معیار کو بھی ٹھکرا دیا ہے جس میں ایک گناہ کی سزا کسی گناہ گار کے ہاتھوں دلوائی جاتی ہے۔ جزا و سزا کے معاملے میں جبران ایک ایسے پوتر اور پاکیزہ معاشرے کے متمنی اور خواہش مند ہیں کہ ذرا برابر بھی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرتے جس نے کبھی خود گناہ کیا ہو یا پھر اس میں گناہ کا احتمال بھی پایا جائے اور یہ بات جزا و سزا کے معاملے میں کتنی قرینِ قیاس اور دل کو بھلی معلوم ہوتی ہے، جس معاشرے میں ایسے لوگ ہوں جو خود گناہوں سے پاک ہوں وہ لوگ دوسرے سے انصاف برتتے ہوئے کبھی جھجھکیں گے نہیں اور انھیں ہر فیصلے سے پہلے اللہ کا ڈر بھی مانع رہے گا اور وہ جو فیصلہ کریں گے وہ ہر صورت میں معاشرے اور انسانیت کے بھلے کے لیے ہی ہو گا۔

ب۔ انتظار حسین کے افسانوں میں اخلاقی اقدار کا مطالعہ:۔

اخلاقی اقدار کسی بھی معاشرے اور معاشرے کے لوگوں کے معیارِ زندگی کا تعین کرتی ہیں۔ جو قومیں اخلاقی اقدار کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں ان کا اعتبار اور وقار دنیا میں ہمیشہ بحال رہتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے کی اخلاقی اقدار چند ایک بنیادی اقدار کے علاوہ مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے قومیں اور لوگ اپنے اپنے معاشرے میں اپنی اپنی اقدار میں ہی خوش اور زندہ رہتے ہیں۔ انتظار حسین کا تعلق چوں کہ ایک مذہبی گھرانے سے تھا اور ان کے والد ایک کٹر مذہبی آدمی تھے یہاں تک کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو عربی اور فارسی پڑھانا چاہتے تھے نہ کہ انگریزی۔ بل کہ انھیں انگریزی سے حد درجے تک نفرت تھی۔ (جس کا ذکر ہم پہلے باب میں تفصیل سے کر چکے ہیں) اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اخلاق اور اخلاقی اقدار کا لحاظ اور مروت کا ہونا انتظار حسین کے ہاں فطرتی بات ہے بل کہ اگر یوں کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ ان کی گھٹی میں یہ سب چیزیں میں موجود تھیں۔

اخلاقی معاشرے اور لوگوں کے وقار اور معیار کا تعین تع کرتی ہیں مگر لوگوں کو جینے اور پھر بہتر انداز سے زندگی گزارنے کے ڈھنگ بھی سکھاتی ہیں۔ لوگ دوسرے لوگوں سے محبت اور قرب کا سبب بھی انھیں اقدار کو سمجھتے ہیں۔ اخلاقی اقدار میں بنیادی طور پر دیکھا جائے تو مذہب سے جڑی اقدار کو معاشرے میں بنیادی درجہ حاصل ہوتا ہے جن میں گناہ و ثواب کا تصور، جزاسزو کا تصور اور پھر کسی شخص کی ذاتی زندگی اور پھر اس کے شخصی اوصاف کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک ادیب چوں کہ معاشرے کو جس باریک بینی اور عمیق نظری سے دیکھتا ہے دوسرا کوئی شخص دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادیب پر وہ تمام ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جو ایک عام شہری یا محلے دار پر نہیں ہوتیں۔ جن میں سب سے پہلے مذہبی اقدار کا شعور لوگوں میں اجاگر کرنا اور انھیں اس بات کی آگہی دینا کہ انسان کی عظمت اور حیثیت کا معیار ان مذہبی اقدار سے ہی ہے اور یہ احساس اس وقت اور بھی شدت اختیار کر جاتا ہے جب ہم ایک مذہبی گھرانے یا پھر مذہبی معاشرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ یقیناً انتظار حسین کے ہاں یہ دونوں باتیں پائی جاتی تھیں۔

انتظار حسین کے افسانوں میں مذہبی اقدار کی بُنت اور کہانت کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے کی ہر تکنیک اور فنی خوبیوں میں کہیں نہ کہیں مذہبی حوالے اور مذہبی اقدار ضرور نظر آتی ہیں چاہے پھر وہ کوئی اساطیری کہانی ہو یا پھر تصوف پر مبنی۔ جن میں زیادہ تر اقدار کا حوالہ ملتا ہے ان میں گناہ و ثواب کا تصور، شخصی اوصاف اور جزا و سزا کا معیار ہیں۔ اس کے علاوہ عام معاشرتی مسائل میں گھریلو مسائل اور لوگوں کے اخلاقی مسائل کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ جن سب پر افسانے کا اسلوب ہر لحاظ سے غالب اور اپنا جلوہ دکھاتا نظر آتا ہے اور ظاہر ہے کہ علامتی اسلوب انتظار حسین کا سب سے نمایاں اسلوب ہے۔

i. گناہ و ثواب کا تصور

خدا نے ہر کام کی بہتری کے لیے ایک میزان قائم کی ہے اور اسی طرح اس میزان پہ پورا اترنے کے لیے خدا نے کچھ ہدایات بھی دے رکھی ہیں اور انھیں اصولں کے تحت انسان نے بھی دنیا میں وقت اور زندگی گزارنے کے لیے اور اچھے برے میں فرق کرنے کے لیے کچھ اصول و طریقے وضع کر لیے ہیں تاکہ ہر انسان کی اچھائی اور برائی میں تمیز کی جا سکے۔ انسان جس بھی معاشرے میں رہے وہاں ایسی میزان کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتی ہے جسے ہم گناہ اور ثواب کے تصور سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ہاں تو گناہ و ثواب کا تصور تو باقاعدہ پایا جاتا ہے جس کے تحت اسے بتا دیا گیا ہے کہ یہ کام کروگے تو ثواب ملے گا اور اس طرح کے کام نہیں کروگے تو گناہ ملے گا اور گناہ و ثواب کے بعد ان کی جزا و سزا کا بھی تعین کر دیا گیا ہے۔ اس لیے مسلم معاشرے میں رہ کر یا کسی بھی مذہبی معاشرے می رہ کر کوئی بھی انسان گناہ و ثواب کے جھمیلوں اور مسائل سے خود کو کسی بھی طور نہیں بچا سکتا۔

انتظار حسین کا گھرانہ تو باقاعدہ مذہبی تھا اور ان کے والدِ محترم انھیں عالم بنانا چاہتے تھے جب کہ وہ خود بھی ایک عالم ہی تھے اور گھر میں ہر طرح کی مذہبی کتاب بھی ملی۔ بل کہ نہ صرف کتاب ملی اسے پرھا بھی اور صغر سنی میں ہی پڑھ ڈالا۔ انتظار حسین کے مذہبی تصورات ہند اسلامی کلچر کے عکاس ہیں مگر وہ زیادہ تر مسلمانوں کے ترجمان اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

"انتظار حسین مسلم کلچر کے ترجمان ہیں، لیکن ان کا کلچر کا تصور محدود نہیں۔ مذہب کو وہ ایک دینی قدر کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی اور معاشرتی قدر کی حیثیت سے لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔انتظار حسین اس لیے منفرد ہیں کہ انھوں نے عہدِ وسطیٰ کی ہند اسلامی تہذیب کی روح سے ہمکلامی کی سطح قائم کی ہے، اور ایک ہزار برس سے برصغیر کے علاقوں میں مسلمانوں کے اثرات سے جو کلچر ابھرا ہے، انتظار حسین کے یہاں اس کی بھرپور تخلیقی ترجمانی ملتی ہے۔"(۵۳)

اگر اس اقتباس کے حوالے سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں اسلامی تہذیب، اسلامی کلچر اور اسلامی اقدار اور روایات کی بابت کافی مواد مل جاتا ہے اور ایسا ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد بخوبی کہا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ "فجا کی آپ بیتی" جو ان کی پہلی ہی کتاب "گلی کوچے" میں پایا جاتا ہے، میں انھوں نے انھیں مذہبی اقدار نماز، روزہ، صدقات، قیامت، مدرسے کی تعمیر، مسجد میں چندہ دینا وغیرہ کو ایک خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند اسلامی مشترکہ تہذیب کے اندر رہتے ہوئے بھی مصنف کے ہاں گناہ و ثواب کے سوتے پھوٹتے رہے ہیں اور وہ اسلامی تعلیمات کا پرچار کرتے رہے ہیں۔

اس افسانے میں انھوں نے ایک عام آدمی "فجا" کو لے کر کہانی بیان کی ہے جو اپنی آپ بیتی سناتا جاتا ہے اور درمیان درمیان میں اپنی نفسیات کے مطابق بہت سی باتیں بھی کرتا جاتا ہے۔ جس سے اس دور کو ایک عام آدمی کی نگاہ سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ فجا تمام لوگوں کے پیار اور محبت سے رہنے کا قائل ہے مگر فسادات کے دوران وہ حیران ہے کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے لوگ ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہیں جس کا اسے بڑا قلق ہے اور سب سے بڑھ کر اسے اس بات کا افسوس ہے کہ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ جس کی وجہ وہ یہی بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے دینی فریضوں کو ادا کرنا چھوڑ دیا ہے اور آپس میں اتفاق اور پیار

محبت سے جو نہیں رہتے تو ان کو یہی سزا ملنی ہے اور ملنی بھی چاہیے۔ فجا مسلمانوں کی بربادی پر اس طرح نوحہ کناں ہے کہ ان کو اپنے گناہ اور ثواب کی تمیز نہیں رہی اس لیے کٹ مرے:

"مگر یار واب تو کوئی معجزہ بھی ہو کے نئیں دیتا۔ مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ گیا۔ اور اللہ میاں کچھ بھی تو نئیں بولا۔ وس کے بھید وہی جانے۔ پٹنہ میں تو مسلمانوں کا پڑا ہو گیا۔ امرتسر میں سکھوں کی کی چڑھ بنی اور دلی سات مرتبہ لٹی تھی۔ اب کے ہندوؤں اور سکھوں نے وسے اوجڑ کر دیا۔ کلمے محمدؐ کی قسم جب میں سنوں ہو تو میرا خون کھولنے لگے ہے۔"(۵۴)

ایک تو فجا مسلمانوں کے کٹ مرنے اور ذلالت پہ نوحہ خواں ہے اوپر سے اسے اس بات کا یقین ہے کہ مسلمانوں کے اس زوال کی وجہ ان کی دین سے دوری اور گناہ میں لتھڑ جانا ہے۔ اگر مسلمان آپس میں اتفاق اور اتحاد سے رہتے تو ان میں کسی بھی قسم کی کوئی پھوٹ نہ پڑتی اور یہ ہمیشہ کی طرح دشمن پر غالب رہتے۔ اب مسلمان نام کے ہی رہ گئے ہیں کسی کو کوئی نیکی کا کام اور نیک عمل یاد نہیں رہا۔ اگر کسی سے نماز سنو تو وہ نہیں آتی اور اگر کلمہ بھی سن لو تو نہیں آتا۔ اس لیے یہاں مسلمانوں کا زوال لازم تھا اور یہ سب کا سب زوال گناہ کی زندگی کی بدولت ہے اور نیکی اور ثواب سے دوری کا نتیجہ ہے۔ فجا اس بارے یوں اظہار کرتا ہے:

"مگر بھیا اب تو مسلمانوں میں ایکا ریا ہی نئیں۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہو ریا اے۔ آپس میں ہی لڑتے ہیں۔ محبت مروت خاک نئیں رہا۔ اگر ایکا یو تا تو دنیا کا تختہ الٹ دیتے۔ مگر فرعون بے سامان بنے پھرتے ہیں۔ وسی کی تو سزا بھگت رئے ایں۔ کلمے کی قسم مسلمانوں پہ عذاب پڑ ریا اے۔ اللہ پاک بھی سب دیکھتا ہے۔"(۵۵)

آپس میں اتفاق اور محبت نہ ہونے کی وجہ سے ہی ہم سب زوال کا شکار ہیں اور دشمن کی مار کھا رہے ہیں۔ اگر ہم آپس میں پیار اور محبت سے رہیں اور کوئی بھی کام گناہ کا نہ کریں تو ہم آج بھی دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں اور سب کا تخت الٹ سکتے ہیں۔ فجا کے نزدیک نیکی اور ثواب کا معیار بھی وہی روایتی مسلمانوں جیسا ہے کہ

کوئی مسجد بنوادی، چندہ دے دیا، باجماعت نماز پڑھ لی، مدرسہ کھلوادیا اور سود جیسی لعنت سے کسی بھی طرح بچے رہنا ہی نیکی اور بھلائی ہے۔ گناہ و ثواب کے اس کڑے احتساب کے بارے میں فجا یوں بات کرتا ہے کسی مختار صاحب کے بارے میں کہہ رہا ہے:

"اجی اب مسلمانی تو نام کی رہ گئی ہے۔ سب لکیر پیٹتے ہیں۔ دین ایمان کسی کا بھی سلامت نئیں اے۔ جو مسلمان بنے بنے پھرے ہیں و نکی مسلمانی بھی بس مطلب کی ہے۔ اب مختار صاب ہیں برا اسلام مسلمان کرے ہیں۔ مگر میں پوچھوں ہوں کہ وہ کون سا مسلمانی کا کام کرے ایں، کبھی جماعت میں شریک ہوئے؟ کبھی پیسہ دھیلا اللہ کے نام کا دیا؟ کون سی مسجد بنوا دی؟ کون سا مدرسہ کھلوا دیا؟ ہم نے کبھی و نہیں مسجد میں دو پیسے کے کڑوے تیل کا چراغ بھی نہ جلاتے دیکھا۔ اجی اس بات کو چھوڑو وہ سود کھاوے ہیں۔ میں پوچھوں ہوں کہ سود کھانا کون سا شرع شریف نے بتایا ہے۔"(۵۶)

اس پیراگراف میں بھی مصنف وہی روایتی مسلمانوں کے تصورِ ثواب و گناہ کا رونا رو رہے ہیں اور اس بات میں شک بھی نہیں کہ ظاہری سلام وغیرہ کر لینے سے ہی تو پورا اسلام میں آدمی داخل نہیں ہو جاتا بل کہ اسے اسلام کے دوسرے ارکان کو بھی ماننا پڑتا ہے اور نماز روزے کے ساتھ ساتھ صدقہ خیرات بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ باجماعت نماز بھی پڑھنی پڑتی ہے۔ فجا اپنی آپ بیتی بیان کرتے کرتے قیامت تک کا ذکر آ کر میں لے آتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی دنیا میں گناہ و ثواب کا صلہ نہیں پائے گا تو قیامت کو تو ضرور پکڑا جائے گا۔ کچھ لوگوں کے بارے میں فجا یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ اگر وہ لوگ میرے ہاتھ لگیں تو میں قیامت اور موت کا انتظار کیے بغیر ان کو مزہ چکھاؤں اور انھیں سخت سزائیں دوں۔ قیامت تک کا انتظار کون کرے۔

افسانے میں بڑی خوبصورتی سے گناہ و ثواب کے تصور کو ایک عام آدمی کی نظر سے بیان کیا ہے اور شروع سے لے کر آخر تک افسانہ ایک بیانیے انداز میں اپنے منطقی انجام کو بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ ” آخری آدمی “ اپنی بنت، اسلوب اور تخلیقی صلاحیت کے لحاظ سے جتنا منفرد اور اہم افسانہ ہے اسی لحاظ سے یہ مشہور اور معنی خیز بھی ہے۔ نقادوں نے اس کی کئی ایک تعبیریں کی ہیں اور اس کے کئی معنی نکالے ہیں۔ اس افسانے میں الیاسف بنیادی اور مرکزی کردار ہے جو اپنی بستی کا سب سے ذہین اور باقی بچ جانے والا آدمی ہے جو ابھی تک خدا کے عذاب کا شکار نہیں ہوا اور سارا افسانہ اسی کشمکش میں گزرتا ہے کہ الیاسف اپنے آپ کو بندر بنانے سے بچالے جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے اور آخر پہ بندر بن جاتا ہے۔

جس بستی پہ عذاب آیا یہ بست بنی اسرائیل کی قوم کی طرف اشارہ ہے اور واقعات کا طریقہ کار عہد نامہ عتیق سے مشتق ہے۔ اس بست میں اونچے اونچے برجوں والی حویلیاں اور عمارتیں تھیں اور ساری بستی کاروبار اور رونق چہل پہل کے لحاظ سے اپنے عروج پہ تھی۔ مگر اس بستی نے گناہ وثواب کے عمل اور حساب و کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا اور خدا کے حکم کی نافرمانی شروع کر دی۔ جس کی بدولت اس بست پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور حکم ہوا کے تم نے ہماری بات نہیں مانی اور سبت کے دن بھی مچھلیاں پکڑتے ہو اس لیے تم سب کے سب بندر بن جاؤ (اس کا ذکر قرآن کی سورۃ اعراف میں ملتا ہے آیات ۱۶۳ سے ۱۶۶ تک)۔ اور وہ سارے کی ساری بستی بندر بن گئی کیوں کہ انھوں نے گناہ کیا تھا۔

اس بستی کو سمجھانے والے اور تنبیہ کرنے والے نے بتایا کہ خدا کے حکم کو مانو اور سبت کے دن مچھلیاں نہ پکڑو مگر یہ کہاں مانتے تھے اور سبت کے دن جب کہ مچھلیاں زیادہ سطحِ آب پر آتی تھی تو یہ پکڑ لیتے تھے۔ اسی بات کا ان پر عذاب اترا اور یہ اس شخص سے بھی ٹھٹھا کرنے لگے تو اس نے آگے سے کہا تم خدا سے ٹھٹھا کرتے ہو تو یاد رکھو خدا بھی تم سے ٹھٹھا کرنے والا ہے اور یوں ہی ہوا کہ ان کے گناہوں کی بدولت خدا نے ان سے ٹھٹھا کیا اور ان کو سزا کے طور پر بندر بنا دیا۔ اقتباس دیکھیے:

> ”اس پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا۔ یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں۔ مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا

اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔"(۵۷)

جس معاشرے میں گناہ ثواب کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے اور اس افسانے میں مصنف موصوف نے ایسا ہی دکھانے کی کوشش کی ہے یہ کہانی بنیادی طور پر گناہ وثواب کی تمیز سے عاری معاشرے کے اجتماعی زوال کی کہانی ہے اور انحطاط کی بہتات کا قصہ ہے کہ جس کی بربادی یہاں تک ہوئی کہ ایک بھی آدمی انسان کی جون میں باقی نہ رہا حتیٰ کہ آخری آدمی بھی بسیار کوشش کے آدمی کی جون میں نہ رہ سکا۔ اعلیٰ اقدار کے معاشرے میں ختم ہو جانے پر اس افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر فرید حسینی لکھتے ہیں:

"جب آدمی انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ اسفل السافلین سے بھی بدتر منزل پر جا پہنچتا ہے اسے اس مقام پر احساسِ جرم کی کسک محسوس نہیں ہوتی پھر جانوروں سے تشبیہ بھی خود جانوروں سے زیادتی لگنے لگتی ہے۔ لفظ جب اپنا اثر کھو دے، تحریر معاشرے میں اپنے مقام سے گر جائے، وہاں کے باسی دونشور کی بات پر دھیان نہ دیں تو پھر روحانی زوال آتے ہیں۔"(۵۸)

ڈاکٹر صاحب کی بات سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ گناہ وثواب کی تمیز کیے بغیر اچھی بری تحریر اور داش ور کے الفاظ کو سمجھے بغیر کہا جہاں لفظ اپنے معانی ہی کھو دے ایک اچھے معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں بل کہ وہاں تو معاشرہ انحطاط اور زوال کا شکار ایک انسانوں کا گروہ نظر آتا ہے جو حرص وہوا میں پاگل سب ایک دوسرے کی جان ومال کے دشمن ہیں۔ کسی کو دوسرے کی کوئی خبر نہیں۔

جب گناہ کیے ہوں اور آدمی کا ضمیر اسے اندر سے جنجھوڑ رہا ہو تو آدمی کو کہیں بھی سکون میسر نہیں آتا اور وہ دن رات اضطراب کی کیفیت میں رہتا ہے۔ نامرادی، پریشانی اور الجھن اس کے بشرے سے نمایاں

ہو ہو جاتی ہے۔ نخوت و کدورت اس کی قسمت میں لکھ دی جاتی ہے اور ظاہری تماشے اور ملمع کاری کرنے سے بھی اسے سکون نہیں ملتا اور وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

انتظار حسین کے اس افسانے کا مرکزی کردار بھی اسی تناؤ اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے انسانوں سے دور بھاگ کر، خود کو علیحدہ کر کے بھی سکون نہیں ملتا اور اس کے اندر طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ جب سب سے گھبرا کر علیٰحدہ ہو کر سکون کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو پھر اسے اپنے ضمیر اور دل سے بے قراری کی آوازیں آتی ہیں کہ اس کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا ہے جو اب بہت دیر ہو جانے کی وجہ سے اس کی بہتری ممکن نہیں اور جب آدمی نے ایسا کیا ہو اور اس کا وقت بھی آن پہنچے تو پھر اس کی معافی نہیں ہوتی۔ اور پھر وہی پرانے لوگوں کی شکلیں اس کا پیچھا کرتی ہیں اور وہ مزید گھبرا کر مشکلات میں پڑ جاتا ہے معبود کو یاد کرتا ہے پر اس وقت کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے جس وجہ سے اس کی فریاد نہیں ہوتی اور اسے بھی موردِ الزام ٹھہرا کر سزا کا حکم ہو جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضا بگڑتے بدلتے جا رہے ہیں۔ اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔
>
> الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنوئیں میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا اے میرے معبود میرے باہر بھی دوزخ ہے، میرے اندر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنوئیں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری ہوئی یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔“(۵۹)

الیاسف کو اپنی بستی کے تمام لوگوں سے احساسِ برتری تو تھا ہی اور سب سے سمجھ دار بھی تھا مگر اس کی گستاخی اور گناہ نے اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ بلاشبہ یہ افسانہ ایک معاشرے کے اجتماعی انتشار، انحطاط اور زوال کی علامت ہے۔ ہم میں ایسے کئی لوگ موجو ہیں جو ایسے گھناؤنے کام ہر وقت کرتے رہتے ہیں جن سے

گناہوں کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔اس نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی انھیں اکیلا چھوڑا اور خود بھاگ کر علیٰحدہ ہو گیا۔

انتظار حسین کا افسانہ "زرد کتا" ان کے افسانے "آخری آدمی" ہی کا تسلسل معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے ایک آدمی کی اپنی جون میں ہی رہنے کی کوشش اور جدوجہد کو بیان کیا ہے اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے کیوں کہ اس نے آخر پہ اپنے خدا سے رجوع کر لیا تھا۔

اس افسانے میں راوی ابو قاسم خضری کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور وہ اپنے شیخ عثمان کبوتر سے سوالات کر کر کے راہِ سلوک کے معاملات سیکھتے ہیں جن میں ایک خاص آدمی سے لے کر عام آدمی تک کے لیے سیکھنے اور عمل کرنے کی کئی ایک باتیں زیرِ بحث آتی ہیں۔اس افسانے کا خمیر تو صوفیا کے اقوال اور ملفوظات سے اٹھا ہے اور اس افسانے کی زبان کے ساتھ ساتھ اس کی تکنیک بھی صوفیانہ رکھی گئی ہے یعنی سوال وجواب کے ذریعے سے اور چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصوں سے کہانی آگے چلتی چلی جاتی ہے اور اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔گناہ ثواب کا تصور اور اسی تصور سے معاشرے کے اندر پیدا ہونے والے انتشار اور زوال کا ذکر اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ طمع دنیا، نفسانی خواہشات۔لالچ اور حرص وہوا کو موضوع بنا کر اس کہانی میں دلدوز کے عناصر پیدا کیے گئے ہیں جس سے کہانی میں گناہ اور ثواب کی ایک خاص لہر نظر آتی ہے کہ جو گناہ کرتا ہے اس کا انجام کیسا ہوتا ہے اور جو اپنے نفس کے ہاتھوں زرد کتا بن جاتا ہے اور اس کا نفسِ امارہ اسے کس قدر دنیاوی حرص وہوا میں مبتلا کر دیتا ہے۔اس طرح معاشرے میں علم کی قدر گھٹ جاتی ہے اور سارا ہی معاشرہ بانجھ پن کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے جہاں لفظ اپنی حرمت کھو دیتا ہے۔ہر شخص اپنے منصبِ خلافت سے اتر کر گناہ کی دلدل میں دھنس جائے تو یہی کچھ ہوتا ہے۔اقتباس دیکھیے:

"یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا: یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا: اس میں طمع نہ ہو۔

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا: جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے، عالم تاجر بن جائے۔ دانشمند منافع کمائے۔"(۶۰)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر لوگ گناہ میں پڑ گئے ہیں کہ اپنے اپنے فرض اور منصب کو بھول کر دنیاوی لالچ اور حرص نے انھیں اندھا بنا دیا ہے جس وجہ سے یہ سارے کہ سارے زر دکتے بنتے چلا جا رہے ہیں۔ ان کا نفس ان پہ غالب آ چکا ہے اور یہ گناہ وثواب کے فلسفے سے عاری بالکل بھی خدا سے نہیں گھبراتے اور نہ ہی ان کے ضمیر انھیں جنجھوڑتے ہیں۔

راوی مرشد کے دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد دنیاداری میں آیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں تو لوگوں کو کچھ علم نہیں کہ کتنا بڑا سانحہ ہو گیا اور بازار میں پہلے سے رونق اسے نظر آئی۔ راوی کے جو ہم مکتب تھے وہ بھی دنیاداری میں کھو گئے کسی نے محل بنوا لیا تو کسی نے محل سرا اور کسی نے گھر بنا لیا اور کوئی قاجیِ شہر کی حویلی میں منتقل ہو گیا۔ اور حبیب بن یحیٰؒ تو گلیم پوش ہے لیکن شیخ کی قبر عقدت مندوں سے بھری پڑی ہے اور وہ سب سے نذرانے اور نیاز لے رہا ہے۔ یونی سب کے سب سگِ دنیا بنے پھرتے ہیں۔ ایسے میں راوی انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور آہستہ آہستہ انھیں میں مل جاتا ہے اور گناہ کی محفلِ رقص میں بیٹھ کر لطف اور حظ اٹھاتا ہے جس کو مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے:

"پھر رن رقاصہ آئی اور میں اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبھوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئیں۔ پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی اور لباس اس نے ایسا باریک پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالے اور کولہے اور

سیمیں ساقیں سب نمایاں اور مجھے لگا کہ میں نے مہکتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے
اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے
لگے۔"(۶۱)

یہ راوی بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر مرشد کی تعلیمات کو بھلا بیٹھا اور سگِ دنیا بن گیا اور ظاہری حسن اور لطف پہ مرنے لگا اور دنیا میں کھو گیا۔ اس کو ہاتھوں کے دشمن کے ساتھ مل جانے والا مرشد کا مقولا یاد آیا اور دیر تک گھنگروؤں کی شیریں کیفیت اس کا پیچھا کرتی رہی۔ گناہ کا ارتکاب کرتے ہی اس کا نفس بھی پھول گیا اور وہ زرد کتا بن گیا اور یہ اپنے معاشرے کے سے افراد جیسا ہو گیا اور جہاں سارا معاشرہ ہی گنہگار ہو وہاں خود کو محفوظ رکھنا کوئی آسان کام نہیں بل کہ آدمی گناہ میں مشغول ہو ہی جاتا ہے۔ سگِ دنیا ہونے اور لالچ میں آنے کے بعد جب راوی گھر آیا تو:

"جب میں گھر پہنچا اور حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بوریے پر ایک
زرد کتا سو رہا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر سکتہ میں آگیا اور مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے
لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دامن میں آکر گم ہو گیا۔"(۶۲)

سگِ دنیا ہونے کے بعد راوی و مرید جو سب کو مرشد کے فرامین سے سمجھایا کرتا تھا آج خود بھی زرد کتے کی زد میں آ گیا ہے۔ سارا معاشرہ ہی آلودہ ہو گیا ہے اور کوئی بھی شخص محفوظ نہیں رہا جیسا کہ "آخری آدمی" میں ہوا تھا۔ ہمیں تو یہ بھی حکم ہے کہ جو کام کرتے ہو اس کا حکم کرو اور جو نہیں کرتے اس سے دوسروں کو روکا کرو۔ مگر جب خود برا کام کرو تو دوسروں کو برائی سے روکنے کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔ ایسے معاشرے اور ایسی زوالا شدہ حالت کے بارے ہی سجاد باقر رضوی نے کہا تھا:

"یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں انسان انسانیت کی اعلیٰ سطح سے گر کر ادنیٰ حیوانی سطح پر
آجاتا ہے اور زرد کتا اس کے باطن میں گھر کر لیتا ہے۔"(۶۳)

اور جب زرد کتا انسان کے باطن میں ایک دفعہ گھس جائے تو پھر وہ مشکل سے ہی نکلتا ہے اور انسان سگِ دنیا بن کر ہی جیتا ہے۔ جب گناہ وثواب کا ایک آئینہ ہمارے سامنے ہو تو ہم حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ نیک کام کریں اور گناہوں سے کسی طور دور رہیں۔

اس افسانوی مجموعے کا ایک اور افسانہ "ہڈیوں کا ڈھانچ" دلچسپ اور حیران کر دینے والا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انسانوں کی لالچ، ہوس اور کمزور ایمان کو پیش کیا گیا ہے۔ جو ایک علامتی انداز میں بیان ہوا ہے۔ ایک سال شہر میں قحط پڑ جانے کی وجہ سے لوگ حرام چیزیں بھی کھانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگ کوے بلیاں چیل اور کتے بھی کھا جاتے ہیں مگر ان کی بھوک نہیں مٹتی۔ اسی شہر کا ایک انسان قحط سالی کی وجہ سسے مر گیا تھا مگر مرنے کے وقت اس کے پاس کوئی شخص نہیں تھا جس نے اس کو پانی پلایا ہو، یا اس کا منھ سیدھا کیا ہو یا اس کے جنازے یا کفنانے کا انتظام کیا ہو۔ اس لیے وہ مرنے کے بعد دوبارہ پھر جی اٹھتا ہے۔ اور اس کے سامنے قحط کے وہ مناظر پھر سے دوڑنے لگتے ہیں جن کے تحت وہ مرتا ہے۔

کہانی کے آغاز میں ہی غربت اور قحط سالی کا ذکر ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان بھوک اور مفلسی میں ہر گناہ وثواب اور جزا وسزا کو بھول جاتا ہے اور اس کا دھیان صرف پیٹ پوجا کی طرف ہوتا ہے کیوں کہ اگر زندہ رہے گا تو ہی باقی ماندہ کام بھی کرے گا اگرچہ نیکی ہی کیوں نہ ہو۔ افسانہ شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے:

> "ایک سال شہر میں سخت قحط پڑا کہ حلال وحرام کی تمیز اٹھ گئی۔ پہلے چیل کوے کم ہوئے، پھر کتے بلیاں تھوڑی ہونے لگیں۔ کہتے ہیں قحط پڑنے سے پہلے یہاں ایک شخص مر کے جی اٹھا تھا۔ وہ شخص جو مر کے جی اٹھا تھا اس کے تصور میں سما گیا۔"[۶۴]

یہی شخص جو مر کے جی اٹھا اس کے ذہن میں سما گیا تھا کہ قحط سے پہلے اور بعد کے سارے مناظر کیسے تھے اور انسان کس طرح حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھا تھا۔ اس طرح وہ نفسیاتی مریض ہونے لگتا ہے اور اس کو

بھوک کی شدت ہونے لگتی ہے اور اس طرح اسے ہر لمحے بھوک ستاتی ہے۔اس طرح وہ دستر خوان کا دستر خوان چٹ کر جاتا ہے اور ہر وقت لوگوں سے زیادہ سے زیادہ کھانے کی فرمائش کرتا ہے۔لوگ اس کو کھانا دینے لگتے ہیں اور اس کے کھانے کے انداز سے انھیں وحشت بھی ہونے لگتی ہے اور وہ کھاتا کھاتا سارے شہر کا کھانا کھا جاتا ہے اور لوگوں کو لگتا ہے کہ ہمارا رزق اب کم پڑ جائے گا اور لوگ اس سے کھانا چھپا چھپا کے رکھنے لگتے ہیں۔

لوگوں کا خدا پر سے یقین اٹھ جاتا ہے اور اس مر کے جی اٹھنے والے سے کھانا چھپانے لگتے ہیں جس وجہ سے وہ شخص جو دوبارہ زندہ ہوا ہے وہ لوگوں کے گھروں میں جھانکنے لگتا ہے۔اسے اتنی بھوک ہوتی ہے کہ جس گھر میں جھانکتا ہے وہاں کے کھانوں اور غذاؤں میں مہک اور خوشبو غائب ہو جاتی ہے اور باغوں میں جھانکنے کی وجہ سے پھولوں اور پھلوں میں سے خوشبو اڑنے لگتی ہے اور وہ بدبودار اور بے ذائقہ ہونے لگتے ہیں۔

اس افسانے میں جہاں لوگوں کے گناہ ثواب کو بھول کر توہمات اور عام پھیلے معاشرتی خیالات کو موضوع بنایا گیا ہے وہاں اس افسانے کے اندر انسان کے شخصی زوال اور ذاتی انتشار کو بھی بیان کیا ہے جو کہ افسانہ نگار کا ایک خاص وصف ہے۔

افسانہ نگار کے ہاں گناہ و ثواب کو پینٹ کرنے کا ایک خاص رجحان ملتا ہے اور اس سارے تسلسل کو وہ اپنے مسلک شیعیت سے ہی پیش کرتے ہیں۔ جس کی خاص وجہ ان کا مسلکی شیعہ ہونا بھی ہے۔اس کے علاوہ ان کا بچپن انھیں واقعات سے بھرپور ہے اور مذہبی شعار بھی انھوں نے یہی دیکھے ہیں تو لہٰذا ان کے ہاں مذہب کا پرچار انھیں حوالے سے آئے گا۔افسانہ مردہ راکھ میں انتظار حسین نے شیعہ مسلک کے چند اہم رسم رواج اور دینی شعار سے تلمیحات و واقعات لے کر کہانی کو آگے بڑھایا ہے جس میں امام کی سواری، علم کا بلند کرنا، محرم الحرام کا عاشورہ، ذوالجناح، دلدل اور ایسے دوسرے کئی مسلکی فریضے اس افسانے میں نظر آتے ہیں اور کہانی تو شروع ہی امام کی سواری سے ہوتی ہے کہ اس سال امام کی سواری نہیں نکلی اور جو دلدل نکالا ہے وہ اصل دلدل

نہیں بل کہ وہ تو کوئی عام گھوڑا ہے جو اصل دلدل تو متولی تراب علی کی غفلت اور پیسوں کی لالچ میں اسے صحیح طور خدمت نہ کرنے کی وجہ مر جانے پر استعمال کیا گیا ہے۔

گناہ وثواب سے بے گانے لوگ مذہبی شعار کی ادائیگی اور ان مقدس جانوروں تک کو اپنی بھوک، لالچ اور حرص کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور جس شخص نے تراب متولی کی گستاخی اور دلدل کو ہنٹروں سے پیٹنے کا آکر محلے والوں کو بتایا تو اسے ہی کسی طریقے متولی اور اس کے حواریوں نے پھنسا دیا۔ متولی سے جب اس بابت پوچھا گیا تو اس نے مہنگائی کا رونا رو کر جان چھڑانی چاہی۔ مگر جو شخص گناہ وثواب کے فلسفے اور اس کی اہمیت سے عاری ہو جائے اس سے کسی بھی گھٹیا سے گھٹیا کام کی امید کی جا سکتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”تراب علی متولی کہتے تھے کہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ میدہ تو کسی بھاؤ نہیں ملتا۔ مولوی فرزند علی تک جب یہ خبر پہنچی تو انھوں نے بہت سرد مہری سے کہا کہ ”کچھ چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں اور کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے۔“
>
> افضال حسین نے ٹکڑا لگایا: ہاں! کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے، کچھ دوسری مدوں میں خرچ ہونے لگی ہے۔“
>
> مگر اس ساری بیزاری کے باوجود اس خبر پر کسی کو اعتبار نہ آیا۔ کوئی لاکھ بے ایمان ہو گیا ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ دلدل کے دانے پانی میں بے ایمانی کرنے لگے۔ جس شخص نے دلدل پر ہنٹر پڑتے دیکھا تھا، وہ یہ خبر سنا کر خود ہی چور بن گیا اور اعتبار نہ کرنے والوں کی برہمی سے ڈر کر اپنا بیان بدلتا چلا گیا۔۔۔۔۔ مگر اب وہ سب خبریں سچی نکلیں۔ مولوی فرزند علی پھر بھی کچھ نہیں بولے، بس انھوں نے ایک ہی فقرہ کہا: ”جو شخص بڑا علم رکھ گروی رکھ دے اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہو سکتی۔“[۶۵]

اس اقتباس سے صاف صاف پتا چلتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے آستین کے کئی سانپ چھپے ہوئے ہیں جو موقع ملتے ہی نہ صرف ہمیں ڈس لیتے ہیں بل کہ الٹا رعب بھی جتلاتے ہیں۔ تراب علی متولی جیسے

کئی لوگ ہیں جن سے جب حساب کتاب مانگا جاتا ہے تو آئیں بائیں اور شائیں کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے بہانے بنانے شروع کر دیتے ہیں۔ہم مذہبی کام ہونے اور نیکی کے معاملات میں گناہ وثواب کے جھمیلوں سے درت ڈرت کوئی ایسی بات بھی نہیں کرتے جو کسی پر براہِ راست اٹیک کرے یا اس کا دل دکھائے اور ہمیں یوں ہی لگتا ہے کہ کوئی جتنا بھی گر جائے مگر دینی کاموں میں کس طرح لالچ کر سکتا ہے اور اپنی جیب گرم سکتا ہے۔

ایسا بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ جرم کرنے والے مضبوط ہوتے ہیں اور پورے کا پورا گروہ ایک دوسرے کو بچانے پہ لگا ہوتا ہے تو جو شخص کسی برے کے بارے میں راز بتا دے یا اس کے ظلم کے خلاف بول پڑے یا پھر اس کو رنگے ہاتھوں پکڑلے تو سار محاذ اسی کے خلاف کھل جاتا ہے اور وہ بے چارہ مدد کرتے کرتے اپنی جان بچانے لگتا ہے اور اپنے بیان سے مکر کر خود ہی مجرم بن بیٹھتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔مگر وقت کی دھار بڑی بے رحم ہے جو سب کا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیہتا ہے اور آخر کار سچائی سب کے سامنے آ کے ہی رہتی ہے جیسے اس افسانے میں متولی کے راز کھلے تو فرزند علی نے کہا کہ جو لوگ ایک کام غلط کر سکتے ہیں وہ ایسے اور بھی کئی کاموں میں چوری کر سکتے ہیں۔اگر آدمی گناہ وثواب کے فلسفے کو سمجھے تو ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات رونما ہوتے نظر نہ آئیں۔

جب آدمی مذہبی شعار اور فرائض کی قدر نہیں کرتا تو اسے اچھے برے میں تمیز مٹ جاتی ہے۔ایسے لوگ اپنے سیاہ کردار سے معاشرے کو سیاہ کرنے پہ تل جاتے ہیں معاشرے تباہی کے دہانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ایسے میں کچھ لوگ تو ہوتے ہی ہیں جنھیں اس گناہ کا احساس ہوتا ہے جو ایسی تباہی سے واقفیت بھی رکھتے ہیں مگر کچھ کہہ نہیں پاتے۔کہتے ہیں تو فقط یہی کہ اب گناہوں کی بہتات اور بارش نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا اور آج کے نیکیاں کرنے والے جو معدودے چند لوگ بچے ہیں ان کی نیکیاں بھی ایسی ہی ہیں جیسے رو گرداں ہو گئی ہیں اور وہ بھی کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں اور جب باطل سے پرہیز نہیں کیا جاتا تو یہی عذاب بن کر قوموں پر نازل ہوتا ہے اور انھیں تباہ وبرباد کرکے چھوڑتا ہے۔افسانے سے اقتباس دیکھیے:

"مولوی فرزند علی درد بھری آواز میں بولے:"عَلم ہم نے کھو دیا اور دلدل کو ہم نے۔۔۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گئے، پھر بولے: اب رہ کیا گیا۔۔۔اب رہ کیا گیا ہے۔ نیکیاں رو گرداں ہو گئیں اور حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے پرہیز نہیں کیا جاتا۔ سچ فرمایا تھا آپ نے، بہت سچ فرمایا تھا۔" مولوی فرزند علی کی آواز رقت سے کانپنے لگی تھی۔"(۶۶)

اس اقتباس میں افسانہ نگار نے مولوی فرزند کی زبانی پورے معاشرے کی زبوں حالی اور انحطاطِ انسانی کو بیان کیا ہے کہ جہاں گناہ و ثواب میں تمیز مٹ جاتی ہے وہاں نیکی، نیکی نہیں رہتی۔ ہر شخص گناہ میں پڑ کر باطل میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ثواب کی بیل اپنے درخت کو ڈھونڈنے میں وقت ضائع کر دیتی ہے کہ میں کس کے بل اوپر چڑھوں گی۔ اس طرح معاشرہ کھوکھلا ہو جاتا ہے اور کسی سے بھی حق پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ سارے کا سارا معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔

مذہبی اقدار میں گناہ و ثواب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ کوئی بھی شخص اس تصور کے علاوہ مذہبی اقدار کو کسی بھی طور اپنا نہیں سکتا اور نہ ہی ان پر عمل کر سکتا ہے۔ اس لیے گناہ و ثواب کے عمل اور اس کی نوعیت کو سمجھنا ہر ایک انسان کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کے ہاں ایسے موضوعات پر کئی ایک افسانے ملتے ہیں جن میں گناہ و ثواب کے عمل کو سمجھنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک گناہ کے عمل میں سوسائٹی کے اندر کتنا بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے یا پھر کس قدر عذاب نازل ہو سکتا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "دوسرا گناہ" اپنی نوعیت کا منفرد افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے گناہ کی عذابی حالت کو بیان کیا ہے۔ ہے تو یہ ایک تمثیلی کہانی مگر اس میں قرآن اور احادیث کا سہارا لے کر کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ جس کو پڑھ کر کہانی کار کی کہانی پر دسترس اور اس کے پلاٹ سے عملی زندگی کے مشاہدے کی خاص حیثیت واضح ہوتی ہے۔ اس کہانی میں ایک ایسی بستی دکھائی گئی ہے جو کہ پہلے ایک ویران اور بے جان زمین تھی جسے ایک حشام نامی نیک صفت آدمی اور اس کے باپ دادا نے آباد کیا تھا اور زمین اس لیے ان کے

ہاں نرم اور زرخیز ہو گئی اور زیادہ سے زیادہ اناج، گندم اور گیہوں دینے لگی کہ ان کا سربراہ حشام ایک نیک انسان تھا گناہوں سے پاک اور سب میں برابر بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح خود بھی بغیر چھنے آٹے کی روٹی کھاتا تھا اس لیے وہ بستی کا سربراہ اور منصفی کے منصب پر بھی فائز تھا۔

اس حشام کی ایک سو پچھتر سال کے بعد وفات ہو گئی جب کہ ابھی تک اس کی کمر سیدھی تھی۔ اس کے بعد اس کی اولاد میں سے زمران کو اس کی جگہ فائز کیا گیا اور اس کے عزیز الیملک کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہی تھا اور اس بستی میں سکون اور برابری کا خواہاں تھا۔ شروع شروع میں تو زمران بالکل اپنے باپ دادا کی طرح نیک کام کرتا رہا مگر بعد میں وہ اپنے آپ کو عام لوگوں سے علیٰحدہ کرنے لگا اور ایک دستر خوان پر بیٹھے ہونے کے باوجود چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے لگا جس کا رنگ اور ذائقہ دوسروں کی روٹی سے مختلف تھا اس لیے بستی میں مساوات سے عدمیت کی وجہ سے ایک گناہ ہو گیا اور بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ زمران کا گناہ یہ تھا کہ اس نے اپنی روٹی دوسرے لوگوں سے مختلف کر لی تھی یعنی اس مے مساوات کا جو مذہبی رویہ ہے اسے ختم کرنا چاہا تھا۔ اس کو بھی یہ ڈر لاحق تھا کہ اگر میں مساوات کا عمل ترک کروں گا تو اس گناہ کی وجہ سے معاشرے میں گیہوں کم اور بھوک زیادہ ہو جائے گی جس پر اس کے عزیز الیملک نے بھی اسے خبر دار کیا تھا۔ تو آٹا چھاننے کے بعد بچ جانے والا بھوسا یہ لوگوں کے آٹے میں ملا کر تقسیم کر دیتا تھا کہ کہیں آٹا کم نہ ہو جائے یہ بھی ایک اور طرح کا گناہ ہو جاتا تھا۔ اقتباس دیکھیے:

> ”زمران کے دستر خوان کے لیے آٹا باریک پیسا جاتا تھا اور ایک بڑی سی چھلنی میں چھانا جاتا تھا اور زمران نے چھنے ہوئے آٹی کی بھوسی کو دیکھ کر تشویش کی۔ زمران نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ان کی بھوک بڑھ جائے، تو اس نے یوں کیا کہ بچی ہوئی بھوسی کو لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ پس جنھیں آٹا کم ملا انھیں بھوسی زیادہ مل گئی۔ انھوں نے اپنے اپنے بے چھنے آٹے میں بھوسی ملا کر موٹی روٹی پکائی اور سیر ہو کر کھائی اور زمران کے آٹے سے جتنی بھوسی نکلتی تھی، لوگوں میں تقسیم ہو جاتی تھی

اور ان کے بے چھنے آٹے میں مل جاتی تھی۔ تو یوں زمران کے دستر خوان کی روٹی کی رنگت اور ہو گئی اور خلقت کی روٹی کی رنگت اور ہو گئی۔"(۶۷)

اس پیرا گراف میں اس افسانے میں بیان کیا گیا گناہ اور پھر گناہ کے بعد کیا جانے والا ایک اور گناہ بھی شامل ہے اور اس کے ساتھ جو گناہ گار زمران کو ڈر تھا کہ میرے گناہ کی وجہ سے رزق معازرے میں کم نہ پڑ جائے اس کو بھی خوف دکھایا گیا ہے۔ مگر وہ اس گناہ سے بعض نہ آیا اور اس کے اس گناہ سے لوگوں میں مساوات کا عمل ترک ہو گیا اور لوگ ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے باہمی نفاق بڑھتا گیا اور اتفاق ختم ہوتا گیا۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے اگرچہ معاشرے کے اندر معاشی نظام اور اس کی غیر مساویانہ تقسیم کی بات کی ہے جس سے ہمیں کارل کارکس کے مساویانہ دولت کی تقسیم کا فلسفہ یاد آتا ہے مگر اس افسانے کو ایک سطح پر سمجھنے سے اس کی سمجھ نہیں آتی۔ کیوں کہ یہ ایئک پرت در پرت میں لکھا افسانہ ہے کہ جس میں ایک خاص تمثیل کے ذریعے سے کہانی کو بیان کیا گیا جو ایک عام قاری پہ نہیں کھلتی۔ کہ کس طرح معاشرے میں ایک سربراہ اپنا رہنے کا اور زندگی گزارنے کا طریقہ مختلف کر لے تو سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور ایک صاحبِ ثروت آدمی گناہ گار بن جاتا ہے۔ اس پر ڈاکٹر نثار ترابی کہتے ہیں:

"عام قاری ان کے فنی رموز تک رسائی اس طرح آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا جتنی آسانی سے ایک بیانیہ طرز کی کہانی کا قاری حاصل کرتا ہے۔ ان کے افسانے اجتماعی طرزِ احساس کو کہانی کے تارو پود میں اس طرح منتقل کرتے ہیں کہ ان کی برتی گئی علامت کہانی میں ایک مرکزی کردار کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور آخر میں اسی علامت سے کہانی کا ردِ عمل مطلوبہ نتائج کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔"(۶۸)

بلاشبہ انتظار حسین کے ہاں علامتی، تمثیلی اور اساطیری پہلو اس طرح مل جل گئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا اور پھر انھیں سمجھنا ایک عام قاری کے بس کی بات نہیں اور یہ بات بھی ادبی سطح پر افسانہ نگار کو دوسے افسانہ نگاروں سے مختلف کرتی ہے۔

زمران نے اپنی بستی میں ایک گناہ تو یہ کیا کہ آٹا چھنا ہو استعمال کی اور دوسرا گناہ یہ کیا کہ اس نے اپنے لیے ٹاٹ کا لباس ترک کر کے باریک کپڑے کی پوشاکیں استعمال کرنی چاہیں جس میں اس نے اپنی بیٹی رافہ کو بھی شامل کر لیا۔ اور اسے بھی خوبصورت بدن پر خوبصور باریک کپڑے کی پوشاک بنوا دی۔ اس سے بھی لوگوں اور زمران اور اس کی بیٹی کے درمیان تفاوت کی خلیج بڑھنے لگی اور لوگ بے چین ہو کر معاشرے میں اپنی بے قدری اور ناانصافی پہ ملول ہونے لگے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”زمران نے باریک کپڑا آٹا چھنوانے کے لیے بنوایا تھا مگر یوں ہوا کہ وہ کپڑا پوشاک کے لیے بھا گیا اور سدا اسے موٹے ناج کی سنگت موٹے کپڑے سے اور باریک ناج کی سنگت باریک کپڑے سے چلی آئی ہے، تو زمران نے ٹاٹ اتار کر باریک کپڑا خود پہنا اور اپنی بیٹی رافہ کو بھی پہنایا اور رافہ اس ماں کی جنی تھی جس نے عمر بھر ٹاٹ اوڑھا اور چکی چلائی۔“(۶۹)

اور تیسرا گناہ جو کہ زمران سے ہوا جس سے اس کے اور بستی والوں کے درمیان فرق آتا گیا اور تفاوت بڑھتا گیا وہ زمران کا اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے آسائش کا سامان کرنا تھا۔ پہلے اس نے اپنے گھر کے دروازے لگوائے، پھر دیواریں تعمیر کروائیں، پھر نگہبان بٹھائے، پھر سواری کے لیے گھڑے لیے پھر گھومنے کے لیے سڑکوں کا جال بچھوایا اور اسطرح وہ گناہوں کی دلدل میں پھنستا چلا گیا اور اس کے عزیز الیملک نے اسے بہت سمجھایا کہ آسائشیں اپنے اور دوسروں کے درمیان فرق پیدا کرتی ہیں انسان کو کمزور اور آخر کار اس کا ضمیر مار دیتی ہیں اور وہ دوسروں کا سوچنے کے بجائے صرف اپنا سوچتا ہے۔ افسانے میں سے ایک ٹکڑا اس پر بھی دیکھیے:

”زمران نے پہلے اپنی ڈیوڑھی اونچی کی اور دروازہ بنوایا، پھر اس نے اپنی دیواریں اونچی کیں اور دروازے کو مضبوط کیا، پھر اس نے دروازے پر نگہبان بٹھائے، پھر اس نے سواری بنوائی کہ دروازے سے نکل کر اس میں بیٹھتا اور باہر جاتا، پھر اس نے سواری کے لیے شاہراہ بنوائی کہ بستی کے ارد گرد پھیل گئی اور زمران کے دودھیا گوڑھوں سے جتی ہوئی سواری اس پر ہوا کی مثال چلتی، پر الیملک نے زمران سے یہ کہا کہ میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا کہ جب سواری آجاتی ہے تو مردوں کی ٹانگوں کا زور گھٹ جاتا ہے اور جب شاہراہ بن جاتی ہے تو زمین تنگ ہو جاتی ہے اور فاصلے دراز ہو جاتے ہیں۔“(۷۰)

ان سب گناہوں کے کیا نتائج نکلتے ہیں اور آدمی کس طرح سوسائٹی اور زمانے میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے اس کے بارے میں الیملک اپنے بھائی اور عزیز کو بار بار سمجھا رہا ہے مگر جب آدمی گناہ کر رہا ہوتا ہے تو اس کے سامنے صرف اپنے گناہ کی وجہ سے اس کی لذت اور چاشنی ہی ہوتی ہے جس سے اسے اس کے نتائج یاد نہیں رہتے۔ آخر کار یہ گناہوں کا لاوا ایک دن ایسا پھٹتا ہے کہ سب کو اپنی گرفت میں لے کر جلا کر بھسم کر دیتا ہے اور سب نیک و بد اس میں پِس کر رہ جاتے ہیں۔ آدمی کو گناہ کے فلسفے کو سمجھنا چاہیے اور مستقبل میں ہونے والے اس کے خطرناک انجام سے بھی باخبر رہنا چاہیے۔ اس افسانے میں کہانی کار نے جو زمران کے ذریعے ایک بسی بسائی آبادی کے برباد ہونے کا جو نوحہ بیان کیا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بستیوں کو بساتے تو نیک لوگ ہیں مگر بستیوں کو اجاڑنے میں گناہ گار اپنی پوری کوشش کرتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے وہی نیک لوگ بستیوں سے نکال باہر کیے جاتے ہیں جن کی وجہ سے کبھی بستیاں بسی تھیں اور انھیں کی وجہ سے تو بستیوں میں برکتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔

ii. شخصی اوصاف

انسان جس صحبت میں رہتا ہے آہستہ آہستہ اسی رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے۔ آدمی عموماً ایسے ہی لوگوں میں بیٹھتا اٹھتا ہے جو اسے اپنے خیال اور عادات کے قریب محسوس ہوتے ہیں کیوں کہ آدمی اپنی ہی جون میں جینا چاہتا ہے اور ایسا ہی اسے اچھا لگتا ہے۔ مگر ہمیں حالات کا مقابلہ کرنے اور اس دنیا میں بہتر سے بہترین طریقے سے جینے کے لیے اپنے اندر ایسے اوصاف پیدا کرنا ہوتے ہیں جو ہمیں جیتے جی میں اعلا بنائیں اور مرتے ہوئے ہمیں کسی بھی تکلیف اور دکھ کا سامنا نہ کرنے دیں۔

زندگی تو مختصر ہے ہی مگر اس میں ہم اگر اچھے اوصاف اور اچھے گن خود میں پیدا کر لیں تو کم زندگی بھی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جنھوں نے زندگی میں کچھ کیا اور دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کیں انھیں کا نام دنیا میں باقی رہتا ہے۔ جو دنیا میں آئے اور ان کے آنے سے دنیا کو فرق پڑا تو انھیں لوگوں کے دنیا سے چلے جانے پر دنیا کو بھی فرق پڑے گا۔ یہ ایک آسان اور سیدھا سا کلیہ ہے۔ جو لوگ بغیر مقصد کے جیتے ہیں وہ جیتے نہیں اور جو لوگ کسی مقصد کے تحت مرتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنے جینے کا مقصد ڈھونڈنا چاہیے اور ہمیشہ خود میں اچھے اوصاف پیدا کرنے چاہییں۔

ہر لکھاری کی طرح انتظار حسین کے ہاں بھی اوصافِ حمیدہ اور باطلہ پر بات ملتی ہے اور انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ بات سمجھائی ہے کہ کس طرح ایک انسان کے دوسرے انسانوں پر اثرات ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ہمیشہ اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے اور انھیں سے اکتسابِ فیض کرنا چاہیے۔ مصنف موصوف نے اپنے افسانے "کنکری" میں اس طرف بھرپور اشارہ کیا ہے۔ جو ایک بیانیہ تکنیک کا افسانہ ہے جس میں دو کرداروں کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہے جس میں پہلا کردار صمد ہے جو شکار کا بہت شوقین ہے اور رات دن جنگلوں میں مارا مارا پھرتا شکار کرتا رہتا ہے۔ جس پر اس کی ماں اور گھر والے بھی سخت ناراض ہیں مگر یہ اپنی عادت کو کسی طور نہیں چھوڑتا۔ دوسرا اس کا دوست ہے جس کا نام مولا کنجڑا ہے جو قدیم ذہن کا مالک ہے اور پرانے اوہام اور باطل خیالات کا مجموعہ ہے۔ جن، بھوت، دیو، پریوں اور آسیب، سائے کو بھی مانتا

ہے مگر صمد ان سب باتوں سے خود کو دور رکھتا ہے اور ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا اور کہتا ہے کہ جب تک میں ان سب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں کسی کو نہ مانوں گا۔

مگر صحبت جو دونوں کی ایک تھی اس لیے مولا کنجڑا ہر وقت ایسی ہی باتیں کرتا تھا اور بتاتا ہے کہ کبھی بھی شام اور صبح کے درمیان یا سانجھ کے وقت شکار نہیں کرنا چاہیے کہ نشانہ چوک جاتا ہے اور چوکنے والی گولی کو ایک پرندہ ندی میں ڈال دیتا ہے جو گولی وقت کے ساتھ ساتھ پانی میں پڑی گھلتی رہتی ہے اور جیسے جیسے گولی گھلتی ہے وہ گولی چلانے والا بھی گھلنے لگتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ گولی ختم اور آدمی بھی ختم۔ مگر کبھی کبھی صمد بھی اس کی باتوں میں آجاتا ہے۔

اپنی باتوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے مولا ایک کہانی بھی گھڑ لیتا ہے اور صمد کو بتاتا ہے کہ اپنا علی جو تھا اس کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ اس نے پرندے کو اڑانے کے لیے ایک کنکری چھت پہ دے ماری اور ساتھ میں ہشت بھی کر دیا پھر کیا تھا کہ کنکری جلد گھل گئی اور علی بھی غائب ہو گیا۔ اس دن سے آج تک اس کا پتا نہیں۔ اب یہ بات صمد کے ذہن میں بیٹھ گئی اور اس کے ذہن پر ایسے ہی خیالات کا غلبہ ہو گیا۔ اب وہ خواب اور حقیقت دونوں میں ایسا ہی سوچنے لگا اور ایک دن تو وہ بیمار پڑ گیا اور اسے خیال آنے لگا کہ میری چوکی ہوئی گولی گھل رہی ہے اور میں بھی گھل رہا ہوں اور کمزور ہو رہا ہوں اور اسی طرح عنقریب مر جاؤں گا۔ اس کے شخصی اوصاف میں یہ خرابی اس کی صحبت کی وجہ سے ہوئی یقیناً انسان کے اوصاف ہی اس کی ذہنی نشو و نما کرتے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> ”سرمئی دھاری کو بھدے آسمانی رنگ میں گھلتے ملتے دیکھتا رہا پھر اسے خفقان ہوا اور وہ تھیلا گلے میں ڈال بندوق کاندھے پہ رکھ اٹھ کھڑا ہوا۔
>
> چلتے ہوئے رہٹ کے قریب پہنچ کر وہ بے دھیانی میں پانی کی کنڈی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ چلتے ہوئے پانی میں اسے اپنا چہرہ یوں دکھائی دیا کہ وہ گھل رہا ہے، لمبا ہوتا جا رہا ہے

جیسے علی۔۔۔اسے ایک ساتھ ہوش آیا اور ایک جھرجھری سی لے کر وہ آگے چل پڑا۔"(۱۷)

یہ صحبت کا اثر ہے اور جانو کہ صحبت کا اثر لازم ہوتا ہے۔اسی طرح اگر کسی شخص کے ساتھ کوئی برا شخص مل جائے تو اسے بھی برائی پہ ہی مائل کرلیتا ہے۔جیسے صمد جو اپنے ماں باپ کی بھی بات نہیں مانتا تھا مگر اپنے دوست کی باتوں پہ آکر شکار کرنا چھوڑ دیتا ہے اور آخر کار گولی تک نہیں چلاتا۔وہ آئینے کے سامنے بھی کھڑا ہوتو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گھل رہا ہے جیسے کہ گولی یا کنکری پانی میں پڑی گھل جاتی ہے۔

انتظار حسین کی تیسری افسانوں پر مبنی کتاب "آخری آدمی" تکنیک،اسلوب اور بنت کے لحاظ سے اہم ترین کتاب تھی جس نے اردو ادب کو اور بالخصوص اردو افسانے کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کروایا۔اس کتاب کا اہم ترین افسانہ بھی "آخری آدمی" ہے۔جس میں مصنف نے بڑی ہنرمندی سے انسانی شخصیت کے اوصاف حمیدہ اور باطلہ سمجھائے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار تو الیاسف ہے اور اسی کے ذریعے سے کہانی اپنے منطقی انجام تک پہنچتی ہے۔الیاسف جو اپنی قوم کا سب سے ذہین آدمی ہے جس کی قوم اجتماعی طور پر گناہ کرنے اور اپنے شخصی اوصاف کی اہمیت کو سمجھنے کی وجہ سے برائی میں پڑ جاتی ہے اور خدا انھیں سزا کے طور پر بندر ذلیل بنا دیتا ہے اور یہ آخری آدمی جو ابھی تک ذلیل بندر نہیں بنا اس کی کوشش ہے کہ میں آدمی کو جون میں پیدا ہوا تھا اور اب آدمی ہی کی جون میں مروں۔اسی کشمکش میں سارا افسانہ بیت جاتا ہے مگر آخر پہ یہ بھی ذلیل بندر کے روپ میں بدل جاتا ہے۔

اس آخری آدمی نے بھی کئی گناہ اپنی شخصیت سے گر کر کیے ہوتے ہیں جس کا احساس اس کو پکڑ کے نزدیک جا کر ہونے لگتا ہے کہ کس طرح اس نے ایک دوشیزہ بنت الاخضر کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں تھیں اوت کس طرح اس نے اپنی قوم کے ساتھ غداری کی تھی اور سب سے بڑھ کر اس نے خدا کے ساتھ استہزا کیا تھا اور کہنے والے نے اسے کہا کہ خدا عنقریب تمھارے ساتھ استہزا کرنے والا ہے۔اس افسانے کو اگرچہ مذہبی رنگ میں لکھا گیا ہے مگر اس میں پھر بھی وہ جنسی تلذذ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جس سے کسی بھی

شخص کی شخصیت مسخ ہو سکتی ہے اور وہ معاشرے کو اجتماعی طور پر گرا سکتا ہے۔ مصنف کے الفاظ میں الیاسف کے بارے اقتباس دیکھیے:

”اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا اور اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے۔“[۷۲]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ الیاسف کس کردار کا مالک تھا اور اس کی شخصیت کیسی تھی۔ ایسا شخص نہ صرف اپنے لیے بل کہ پورے پورے معاشرے کے لیے ننگ ہوتا ہے۔ کردار کے ساتھ بالکل منطقی سلوک انتظار حسین نے کیا ہے اور اس کو بھی اپنی انھیں بری عادتوں کی وجہ سے پوری بستی کی طرح بندر بنناہی پڑا اور یہ بھاگ بھاگ کر تھک گیا اور خود کو بندر کی جون میں پایا۔ افسانے میں مذہبی رنگ ہونے کے باوجود جنسیت کا ذکر اس خوبصورتی کے ساتھ کرنا انتظار حسین ہی کا خاصہ ہے۔ اس سے پہلے بھی انتظار حسین نے ٹھنڈی آگ، جنگل، دیولا اور کیلا جیسے افسانے جنسیت پر لکھے ہیں مگر اس افسانے کی نوعیت کچھ اور ہی ہے کیوں اس میں کمال مہارت سے عورت اور مرد کی نفسیات کو چھیڑا ہے اور کسی شخص کے اوصاف میں گھٹیا پن کے عنصر کو واضح کیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ افسانے کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے نہ کہ پلاٹ میں بوداپن آیا ہے۔ ڈاکٹر فرید حسینی اس افسانے کے اسی پہلو کے متعلق کہتے ہیں:

"انتظار حسین نے علامتوں سے گہری باتیں بھی کہانی کی روانی میں کر دی ہیں تا کہ قوم کے شعور میں شعوری کوشش سے وہ رشتہ بحال رہے۔ الیاسف اپنی محبوبہ بنت الاخضر کو جب یاد کرتا ہے تو اسے فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑی کی مانند قرار دیتا ہے۔ مذہبی رنگ غالب نہونے کے باوجود افسانہ نگار نے مرد اور عورت کے تعلق کی نفسیات کو ہلکا سا چھیڑا ہے۔"(۷۳)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الیاسف نے بنت الاخضر کو کس نظر سے دیکھا اور اسے اپنی شخصیت پہ بدنما دھبہ بنالیا کہ مشکل گھڑی میں بھی وہ اپنی محبوبہ کو یاد کر مزے لے رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ایک شخص کے گرنے کا مقام ہو سکتا ہے۔

انسان ایک نیک فطرت پہ پیدا ہوا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان دینِ فطرت پہ پیدا ہوا ہے۔ انسان جب تک بالغ نہیں ہوتا اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی رونق، نور اور بشاشت رہتی ہے اس کے بعد اس کے چہرے مہرے کے خدوخال اس کے اعمال پر منحصر ہوتے ہیں اور نیک روح اشخاص اپنے چہروں ہی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ مگر جب شخصی اوصاف میں سے نیکی کا حسن نکل جائے تو انسان جانوروں کی صفات میں آکر مہذب وحشی اور سلیقہ مند جانور بن جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی یہ بستی جنھوں نے اپنی تدبیر اور عقل سے خدا کو فریب دینے کی کوشش کی تو خدا نے ان کے ساتھ ایسا ہی مکر اور ٹھٹھا کیا اور ان کو بھی عبرت کا نشاں بنادیا اور سب کی شکلیں بدل گئیں اور سب سے آخر پر بستی کے آخری آدمی الیاسف کی شکل بدلی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حامد رضا صدیقی کہتے ہیں:

"جب انسان اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو خالق بھی اسے اسی شکل و شباہت میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر نیک بنتا ہے تو اس کے چہرے کو نور بار اور اگر بدی کرتا ہے تو اس کے چہرے پر دھتکار برسنے لگتی ہے انسان کے وجود میں ایک ایسا جانور چھپا ہوا بیٹھا ہے جو اس کو نظر نہیں آتا مگر جب وہ اپنی روح میں جھانکتا ہے تو اس کو اپنی ذات اور اپنے

وجود کا پتا چلتا ہے۔ جیسے الیاسف کے ساتھ ہوتا ہے۔اس کے بعد اس کی حالت بدلنے لگتی ہے اور اس کو اپنے وجود کا پتہ چلتا ہے۔"(۴۷)

اس افسانے میں ایسی ہی کہانی کو بیان کیا گیا ہے کہ جب آدمی اپنی فطرت سے بغاوت کر کے اپنے مالک کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کا انجام بھی پھر دیکھنے والا ہوتا ہے اور الیاسف اس کی بڑی مثال ہے۔

انتظار حسین نے اپنے افسانے "زرد کتا" میں ایک انسان کے اچھے اور برے دونوں اوصاف پر بات کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کھل کر معاشرے کے دونوں پہلوؤں پہ بات کرنا چاہتا ہے کہ ہر سطح کا آدمی دیکھے اور اس کا فیصلہ کر سکے کہ اس نے اچھی صفات کو اپنانا ہے یا پھر اس نے بری صفات کو اپنانا ہے۔اول الذکر کو اپنا کر انسان کا معیار زمانے میں بلند اور اس کا کردار قابلِ اعتبار ہو جاتا ہے جب کے بعد الذکر کو اپنا کر انسان جہاں رسوائے زمانہ ہوتا ہے وہاں اپنی ساکھ،شناخت اور عزت بھی کھو دیتا ہے اور اس کے دامن میں ایک زرد کتا دم اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں انتظار حسین ننے صوفیا،علما اور نیک لوگوں کے اقوال اور ملفوظات سے ایک کہانی گھڑی ہے جس میں انھوں نے زرد کتا نفس کو قرار دیا ہے جو طمع دنیا میں آکر ذلیل ہوتا ہے اور اپنے معیار سے گر کر اپنے اوصافِ حمیدہ کی دھجیاں بکھیرتا ہے۔اس کہانی میں ایک راوی ہے جس کا نام ابو قاسم خضری ہے جو جو اپنے مرشد شیخ عثمان کبوتر کے ہاں ارادت سے رہتا اور آتا جاتا ہے ساتھ میں راہِ سلوک کی منازل بھی طے کر رہا ہے۔جس کے ہم مکتب چار ساتھی بھی ہیں جن میں ابو جعفر شیرازی،شیخ حمزہ، حبیب بن یحیٰ،ابو مسلم بغدادی اور سید رضی شامل ہیں۔ شیخ ایک نیک صفت انسان ہیں جو ہوا میں اڑنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اسی لیے انھیں کبوتر کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے اور انھوں نے یہ اڑنے کی صلاحیت اور اپنے کردار میں نیک صفات کیسے پیدا کیں یہ ان کے شخصی اوصاف ہی کا کمال ہے۔اس بارے میں افسانہ نگار کے الفاظ دیکھیے:

"ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی،املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالمِ سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر

کبھی املی پر جا بیٹھتے، کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔ میں نے ایک روز استفسار کیا:

یا شیخ قوتِ پرواز آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟ فرمایا:

عثمان نے طمع دنیا سے منہ موڑ لیا اور پستی سے اوپر اٹھ گیا۔ عرض کیا: یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟

فرمایا: طمع دنیا تیرا نفس ہے۔"(۷۵)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو ایک اچھا انسان بنانا چاہتا ہے کہ وہ پستی سے اٹھ جائے اور ایک اعلیٰ انسان بن جائے تو ضروری ہے کہ وہ طمع دنیا سے منھ موڑ لے۔ اور طمع دنیا تو انسان کا نفس ہے اور وہ بھی نفسِ امارہ کہ جو انسان کو برائی کی طرف لے کر جاتا ہے اور ساری برائیوں پہ مائل کرتا ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کو کنٹرول کرلے تو وہ اس قدر نیک اور بلند ہو سکتا ہے کہ اڑنے کی صلاحیت بھی خود میں پیدا کر سکتا ہے۔

راوی کے شیخ کا ایک ہاتھ بھی کٹا ہوا تھا جس سے ہمیشہ وہ پناہ مانگتے تھے اور اسے دشمن سے مل جانے کی وجہ سے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ راوی نے پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ہاتھ کیسے کٹا ہے تو انھوں نے انسان کے شخصی کردار پہ بات کی کہ اگر انسان کا کردار گر جائے اور وہ طمع دنیا میں پڑ کر لالچ اور حرص کے جال میں پھنس کر سوال کرے اور مانگنے کے لیے ہاتھ دراز کرے تو اس کے ہاتھ کو کٹوا دیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کی قدر نہیں کی اور طمع دنیا میں پڑ گیا۔ اس لیے تیرا یہ انجام ہوا۔ اقتباس دیکھیے:

"شیخ ابو سعید رحمتہ اللہ علیہ کے گھر تیسرا فاقہ تھا، ان کی زوجہ سے ضبط نہ ہو سکا اور انہوں نے شکایت کی۔ تب شیخ ابو سعید باہر نکلے اور سوال کیا۔ سوال پر جو انہوں نے پایا وہ لے کر لوٹ رہے تھے کہ کوتوالی والوں نے انہیں جیب تراشی کے جرم میں گرفتار کر لیا اور

سزا کے طور پر ایک ہاتھ قلم کر دیا۔ آپ وہ ترشا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر لے آئے۔ اسے سامنے رکھ کر رویا کرتے تھے کہ اے ہاتھ تو نے طمع کی اور تو نے سوال کیا، سو تو نے اپنا انجام دیکھ لیا۔"(۷۶)

اس اقتباس سے شخصی اوصاف اور معاشرتی کردار میں پختگی ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان کو ہر حال میں صبر سے کام لے کر گزارا کرنا چاہیے اور ایسا کوئی بھی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے دامن داغدار ہو اور بعد میں اس کی سزا بھگتنی پڑے۔ جیسے ابو سعید کو یا پھر شیخ عثمان کبوتر کو بھگتنی پڑی۔

اس افسانے میں اور بھی کئی ایک جگہ شخصی اوصاف اور انسان کے کردار کی بات ملتی ہے۔ اس افسانے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت اور مقام و مرتبے کو سمجھ کر زندگی گزارنی چاہیے اور بلاشبہ یہ بھی ایک اچھے کردار کا وصف ہی ہے کہ اپنی حیثیت کو جاننا۔ یہ نہیں کہ بھیڑ چال چلیں اور سارے کے سارے لوگ ہی خود کو شاعر، صوفی یا پھر دانشمند سمجھنا شروع ہو جائیں اس سے بھی سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور اچھے برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ ہر زمانے مین ایسے لوگ کثرت سے رہے ہیں جنھوں نے خود کو اعلیٰ اور بڑا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے دراصل وہ ایسے تھے نہیں جس سے اصل لوگوں کی ساکھ کو نقصان پہنچا اور لوگوں کا ان پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا۔ یہاں بھی ایک حکایت کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جہاں دانشمندوں کی کثرت ہو جائے وہاں کوئی بھی دانشمند نہیں رہتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اس کے دربار میں ہر روز لوگ آتے تھے کہ خود کو دانشمند کہلواتے تھے اور بادشاہ سے انعام و اکرام پاتے تھے۔ ایک دن ایک عاقل وزیر نے بادشاہ کو سمجھایا کہ تیری سلطنت میں کوئی بھی دانشمند نہیں کیوں کہ ہر شخص ہی دانشمندی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ حکایت کے الفاظ دیکھیے:

"جہاں پناہ جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا: امان ملی۔ تب اس نے عرض کیا۔ خداوندِ نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں رہتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔"(۷۷)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ پھر انتشار اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے جس کا مقدر صرف اور صرف تباہی ہی ٹھہرتا ہے۔ سب دانشمند بننے لگتے ہیں علم غائب ہو جاتا ہے۔ عالِم اپنا علم چھپانے لگتے ہیں اور جاہل علم بگھارنے لگتے ہیں۔ اس سے عالم جاہل اور جاہل عالم قرار پاتے ہیں اور ہر طرف لفظ کی موت واقع ہو جاتے ہی ہے۔

افسانہ "شہادت" انتظار حسین اک وہ افسانہ ہے جو ہے تو وجودی اور لاشئیت کو شئیت میں لانے کی کوشش جس میں دوسرے کئی افسانوں کی طرح فرد اپنی شناخت کا متلاشی ہے مگر اس میں ضمنی طور پر کئی ایک باتیں آگئی ہیں جن میں سب سے اہم بات ایک شخص کے اچھے اوصاف کا حامل ہونا بھی ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کردار اور شخصیت میں ٹھہراؤ اور ثابت قدمی پیدا نہیں کرتا تو اس کو تاریخ میں گمنام جانا جاتا ہے اور اگر اس کی شناخت ہو بھی جائے تو غداروں میں یا پھر اسے بھگوڑوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس افسانے میں ایسے تاریخی واقعات سے سہارا لے کر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن میں پطرس کہ جو حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ تھا مگر اس نے بعد میں تین دفعہ انکار کیا اور کہا کہ میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہانی ایک ایسے فراریت سوچ پر مبنی لڑکے کی ہے جو بس میں سوار ہے مگر اپنی شناخت تو کجا نام تک بتانے سے ڈرتا ہے کہ یہ تقسیم کے وہ حالات ہیں کہ جب نام جان کر ہی جان لے لی جاتی تھی۔

اس کے بعد قافلے کو چھوڑ کر جانے والی کی بات ہے کہ جو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ قافلے میں صبح وشام تھا مگر رات کی تاریکی میں امام کے کہنے پر چھوڑ کر چلا گیا مگر روشنی ہونے پہ پتا نہ چل سکا کہ کون چھوڑ کے گیا ہے کہ چھوڑ جانے والوں اور قافلے سے بچھڑ جانے والوں کی شناخت اور نام باقی نہیں رہتے۔ جو کائنات کو بدلنے نکلا تھا خود کو قافلے سے جدا کر کے کائنتا کو درہم کر گیا۔ اس کے بعد اسی شخص کی شناخت دمشق میں ہوئی تو اس کے شخصی اوصاف پر ایک بزرگ نے یوں بات کی:

> "تب ایک مرد بزرگ نے اسے فرطِ غضب سے دیکھا" تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو دیکھا اور حق کی شہادت سے روگرداں ہوا" اس جھڑکی پر سر اس کا جھک گیا اور متاسف ہو کے بولا" کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کہ میں حق کا ہمسفر ہوا اور حق سے روگرداں ہو گیا۔ اے لوگو! تم میں سے جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کہ میں دن بھر اس قافلے کے ساتھ رہا۔ جب دھوپ ڈھلی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا جب شام پڑی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ جب رات نے خیمہ ڈالا تو میں اس سے جدا ہو گیا کہ رات دلوں میں خوف اور وسوسہ پیدا کرتی ہے اور قافلوں کو منتشر کرتی ہے۔"(۷۸)

شخصی اوصاف میں جھول ہو تو انسان کو زمانے کے سامنے اپنی کج ادائی سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے بل کہ عمر بھر کے لیے اپنا سر بھی جھکانا پڑ سکتا ہے۔ سوچ سمجھ کر اہلِ کردار ہی فیصلہ کرتے ہیں اور پھر اپنا سر کٹوا دیتے ہیں مگر اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔ مگر اپنے کردار سے عاری اور قاصر لوگ ہی یوں راستے میں چھوڑ کر جایا کرتے ہیں۔ اس افسانے سے زمانے کی تیز رفتاری اور مادیت پرستی کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ بس میں سوار نوجوان تیز رفتاری سے آگے تو بڑھتا جا رہا ہے مگر اسے اپنی شناخت اور اپنے بارے میں معلوم نہیں بل کہ وہ تو ساتھ بیٹھے لوگوں کو اپنا نام تک بتانے میں جھجھک رہا ہے۔

افسانہ نگار نے اپنے افسانے ”مردہ راکھ“ میں انسان کے شخصی اوصاف کو مذہبی رنگ میں بھی واضح کرنا چاہا ہے جس میں مصنف کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ انتظار حسین کا تعلق چوں کہ ایک شیعہ گھرانے سے تھا اور وہ بچپن سے ہی شیعہ مسلک کے مسلکی اور مذہبی مجلسوں اور جلوسوں میں آتے جاتے رہے تھے اس لیے ان کے ہاں مذہبی حوالے اسی مسلک کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں مگر مسلک یا مذہب کوئی بھی ہو انسان کو سمجھنے کے لیے اشارہ ہی چاہیے ہوتا ہے۔

اس افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ ایک متولی جس کے پاس امام باڑے کی رکھوالی اور خزانے کا سارا معاملا ہے جو اس نے ہر تقریب اور مذہبی معاملات میں استعمال کرنا ہوتا ہے مگر وہ ان روپوں کو اپنے ذاتی کاموں میں استعمال کرتا ہے اور اس میں کافی مال غیر ضروری کاموں پہ لگا دیتا ہے۔ جس سے اس سال امام کی سواری بھی نہیں نکالی جاتی اور ذوالجناح کا دلدل بھی خوراک کی کمی اور برے سلوک کی وجہ سے مر جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔

لوگوں کو پہلے اس پر شک تھا مگر جب پوچھا تو اس نے ادھر ادھر کی باتوں میں بات اڑا دی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ آدمی تراب علی متولی ٹھیک آدمی نہیں اور اس کا کردار بھی کوئی قابلِ بھروسہ نہیں یعنی اس کے شخصی اوصاف معاشرے کی نظروں میں جاتے رہے تو لوگ اس پر مستقبل کے غبن کے لحاظ سے بھی باتیں کرنے لگے کیوں کہ جب آدمی ایک دفعہ شخصی اوصاف کھو دے تو وہ دوبارہ ان کو کسی طور بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ افسانے میں سے اقتباس سے دیکھیے کہ لوگ اس کے اس رویے کے بعد کیسی باتیں بنا رہے ہیں:

”کیوں صاحب! یہ وقف علی الاولاد ہے کیا؟ افضال حسین نے سوال کیا۔

مولوی فرزند علی نے خشک لہجے میں کہا: ”آگے تو وقف علی الاولاد تھا۔“

”صاحب! بے ایمانی کی بھی حد ہوتی ہے۔“ افضال حسین کہنے لگے: ”آگے بڑے علم پر شیر مال تقسیم ہوا کرتے تھے اور دودھ کے شربت کی سبیل لگتی تھی۔ شیر مال تو پچھلے

برس ہی بند ہوگئے تھے، اب کے خالی پانی کا شربت رہ گیا۔ پچھلے برس میدہ مہنگا تھا، اب کے کہتے ہیں کہ دودھ کا توڑا ہے۔"

"اگلے برس چینی نہیں ملے گی۔ شکر کا شربت ہو گا۔" اختر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اگلا سال کس نے دیکھا ہے۔" محمد عوض کربلائی بولے: "وقف کی ساری جائیداد گروی پڑی ہے۔ جانے کیا انجام ہو۔ برے امام باڑے میں اب کے عزاداری ہوگئی، اسے غنیمت جانو۔ اگلے سال کیا خبر ہے عزاداری ہو کیا خبر ہے نہ ہو۔"(۷۹)

افسانہ نگار نے ایسا اسلوب اس بات کو سمجھانے میں استعمال کیا ہے کہ یہ ہمارا عام روزمرہ کا طریقہ کار اور گفتگو ہے کہ جب ہم میں سے کوئی شخص ایک کام نہیں کرتا یا ایک کام غلط کرتا ہے تو اس کے آگے کے کاموں کے بارے میں ہم ایسے ہی قیافے لگاتے رہتے ہیں اور بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے کہ حال ہی مستقبل کی نشان دہی کیا کرتا ہے۔ جیسے ہم سیاست دانوں کے جھوٹے وعدوں اور سبز باغ دکھانے پر اکثر جملے کستے نظر آتے ہیں۔ یارِ بے وفا کے جھوٹے وعدوں پہ طنز کرتے ہیں یا گھر میں کسی بات پر بگڑ کر ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی تراب علی متولی کے شخصی اوصاف کے حوالے سے ہوا اور یہ حقیقت کے بعید نہیں بل کہ بالکل مناسب اور بجا ہے۔ شخصی اوصاف سے عاری آدمی ایسے ہی تراب علی متولی کی طرح آہستہ آہستہ سب کاموں میں سرقہ اور خرد برد شروع کر دیتا ہے اور آکر کار اس کام کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

اور جب شخصی اوصاف اور برے حالات کی بات ہوتی ہے تو یہیں بیٹھے لوگ نواب آصف الدولہ کی مثال دیتے ہیں کہ اس نے تو قحط کے زمانے میں بھی لکھنو میں لوگوں کو کھانا دیا تھا اور عاشورہ کے تمام دنوں میں تمام کے تمام فرائض بڑی خوش اسلوبی سے نبھائے تھے اس کی وجہ صرف ایک تھی کہ اس کو لالچ، حرص یا کسی قسم کا ذاتی فائدہ درکار نہیں تھا۔ وہ جملے سنیے جو شخصی اوصاف پہ دال ہیں:

"مولوی فرزند علی کہنے لگے: "سب نیتوں کا پھل ہے۔ آگے کیا مہنگائی نہ ہوئی تھی؟ آصف الدولہ کے زمانے میں کیسا کال پڑا تھا۔ اسی زمانے میں لکھنو کے بڑے امام

باڑے کی نیم رکھی گئی۔ سخت کال پڑا تھا۔ خلقت میں تراہ تراہ پڑ گئی، لیکن لکھنو میں کوئی بھوکا نہیں مرا۔"

"صاحب! ان دنوں کال کا زمانہ بھی اچھا خاصا ہوتا تھا۔" محمد عوض کربلائی ٹھنڈا سانس بھر کر بولے: "اور نواب آصف الدولہ کی رعایا پروری کی کیا بات ہے۔ جس کو نہ دیں مولا، اس کو دیں آصف الدولہ۔"(۸۰)

مولوی فرزند علی کی بات سو فیصد درست اور بجا ہے کہ سب نیتوں کا پھل ہوتا ہے کہ نیت ہی آپ کا شخصی وقار بناتی ہے اور نیت ہی آپ کے اعمال طے کرتی ہے جس سے آپ کے اوصاف بنتے ہیں یا بگڑتے ہیں۔ نواب آصف الدولہ کی نیت اور شخصی کردار اور اوصاف حمیدہ تھے تو ہی اتنے برسوں بعد انتظار حسین نے ان کا نام اچھے لفظوں میں اپنے افسانے میں برتا ہے، وگرنہ کہاں کوئی کسی کو یاد کرتا ہے اور وہ بھی اچھی مثال کے لیے۔

افسانہ نگار کا افسانہ "مشکوک لوگ" اپنے نام سے ظاہر ہے کہ شک و شبہات پر لکھا گیا ایک دلچسپ افسانہ ہے جس میں جنگ کے زمانے کا دورانیہ دکھا کر لوگوں کی نفسیات اور پھر ان کا ایک دوسرے کی شخصی اوصاف پر شک کی نگاہ ڈالنا دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں کے کرداروں میں شفیق، اشتیاق، حسنین، عارف، طفیل وغیرہ شامل ہیں جو سب کے سب ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اکٹھے کھاتے پیتے اور اکٹھی ہی یاری نبھاتے ہیں مگر جب انسان کے اوصاف اور کردار میں ایک دفعہ شک کی گنجائش نکل آئے تو پھر یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر چیز میں شک کرنے لگتا ہے چاہے وہ اس کی اپنی عادت ہو یا کسی کا مشکوک رویہ اسے اس بات پہ مجبور کرے۔

یہ افسانہ ہے تو سیاسی اور جنگی حالات پر خوبصورت افسانہ مگر اس میں شخصی اوصاف پر جو کھل کر بات ہوئی ہمارا موضوع وہ شک کی کڑی کو ڈھونڈ نکالنا اور پھر اس کڑی کو درست کرنا بھی ہے۔ اس افسانے کا کردار طفیل اپنے دوستوں کے رویوں پہ یوں گویا ہوتا ہے:

"آدمی آخر کب تک اپنے آپ کو چھپا سکتا ہے، مگر شفیق کہتا ہے۔ خیر، شفیق تو سب ہی کے بارے میں کہتا ہے۔ حسنین کے بارے میں بھی، عارف کے بارے میں بھی، طفیل کے بارے میں بھی، تو گویا سب ہی کا دامن آلودہ ہے۔ حد ہو گئی، اور خود شفیق؟ شفیق، اشتیاق کے بارے میں کہتا ہے اور اشتیاق، شفیق کے بارے میں کہتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور طفیل دونوں کے بارے میں کہتا ہے۔ شفیق، اشتیاق، طفیل، حسنین، عارف، گویا سب ہی۔ حس ہو گئی۔ گویا ہم سب ہی کا دامن آلودہ ہے۔ یہ سوچتے سوچتے وہ ٹھٹھکا۔ ہم سب کہہ کر تو اس نے آپ کو بھی شامل کر لیا تھا۔"(۸۱)

جب اس قدر شخصی اوصاف میں شک اپنی جگہ بنا لے تو معاشرے کا کیا بنے گا اور شک ایک ایسا سوراخ ہے جو بڑے سے بڑے بند کو ایسے اندر ہی اندر گھن لگا دیتا ہے کہ وہ بڑا سا بند پانی کے ذرا سے ریلے کا بھی مقابلہ نہیں کر پاتا۔ سب یار دوست ہیں اور سب ہی ایک دوسرے پر شک کر رہے ہیں۔ اس افسانے کی خوبصورتی بھی اسی بات میں ہے کہ یار ایک دوسرے پہ جب اس قدر مشکوک اور شبہات کی نظروں سے نظریں دالے ہوئے ہیں تو معاشرے کے دوسرے افراد کا حال کیا ہے اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کے اپنی اوصاف مشکوک ہوں کیوں کہ چور ہی کو سارے چور نظر آتے ہیں۔

اس افسانے میں الیاسف کی طرح سارے آدمی ایک دوسرے پر شک کرتے ہیں اور آخر کار خود کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں جیسا کہ اوپر اقتباس میں دکھایا گیا ہے۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ میں شک سے بچا رہوں مگر جب وہ گھر جا رہا ہوتا ہے تو اسے کتے بلیوں پر بھی شک ہوتا ہے کہ یہ جانور ہی ہیں یا کچھ اور ہیں۔ جس سے اس کا شک اپنے عروج پہ پہنچ جاتا ہے اور گھر جا کر اسے اپنے ہونے پر شک ہوتا ہے جس وجہ سے وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ایک دفعہ دیکھتا ہے اور شک گزرتا ہے جس وجہ سے وہ آئینہ الٹ کر رکھ دیتا ہے۔ یعنی وہ خود بھی اپنے شک کی ذیل میں مشکوک ہو چکا ہے۔

افسانہ نگار نے ایسے ہی شخصی اوصاف کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اور بھی افسانے لکھے ہیں جن میں دوسرا گناہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس افسانے میں انتظار حسین نے ایک شخص کے شخصی اوصاف بگڑ جانے کی وجہ سے بستی کے تمام لوگوں کے برباد ہونے اور قحط میں مبتلا ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک بستی کہ جو کبھی ویران اور اجاڑ زمین تھی اچھی خصوصیات کے حامل اور نیک لوگوں نے بسائی تھی جس خاندان کے لوگ نیک اور پرہیز گار تھے کہ لوگوں میں برابری کا سلوک کرتے تھے اور انھیں اپنے ساتھ بٹھاتے اور انھیں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ سب کے سب لوگوں کی روٹیاں اور کھانے کا سامان ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ جس وجہ سے بستی آباد اور شاد تھی یعنی معاشی اور سماجی کسی قسم کا کوئی فرق موجود نہیں تھا۔ سب مل کر رہتے اور ایک دستر خوان پہ خاصہ چنا جاتا تھا اور ان کا بڑا بزرگ حشام نے بھی "تا عمر ٹاٹ پہنا اور سب کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر موٹی روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا۔"(۱۲) اسی وجہ سے اس حشام کے بیٹے کو اس کی وفات کے بعد اس کی جگہ دی گئی اور کرسیِ انصاف پہ بٹھا دیا گیا شروع میں تو اس نے باپ کی طرح اچھے کام کیے اور سب اس سے خوش رہے مگر آہستہ آہستہ اس کے شخصی اوصاف میں تبدیلی آتی گئی اور وہ عیش و آرام میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے سب سے پہلے اپنا کھانا پینا دوسروں سے بہترین کیا اور اس کے بعد اپنا گھر در تو دیوار اور ڈیوڑھی پختہ کروا کر اونچی کروالی اور اپنے لیے گارڈ اور درباری رکھ لیے اور ساتھ میں دودھیا گھوڑوں کی سواری رکھ لی اور شاہراہیں بھی تعمیر کروالیں۔

انسان اگر اچھا ہے تو اکثر اوقات اسے اس کے قریب رہنے والے اور مشوروں سے نوازنے والے لوگ بھی پٹڑی سے اتار دیتے ہین اور اسے زمانے میں برا بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اس بستی کے سربراہ زمران ابنِ حشام کے ساتھ بھی شروع میں یہی ہوا کہ جب اس کے عزیز نے اسے منع کیا تو اس نے اپنے حواریوں سے سمیت اپنا دستر خوان علیٰحدہ کر لیا اور اپنا وقار لوگوں کی نظروں میں کم کر بیٹھا۔

" اس دن الیملک دستر خوان سے بھوکا اٹھا اور جب دستر خوان سے بھوکا اٹھا تو بستی میں اس کا چرچا بہت ہوا۔ لوگ بہت حیران ہوئے اور انھوں نے سرگوشیاں کیں کہ الیملک

> دستر خوان سے نوالہ توڑے بغیر اٹھ گیا اور اس نے زمران سے اپنی روٹی الگ کر، پھر وہ سچ مچ ڈرے کہ کیا سچ مچ گیہوں اپنے چھلکے سے الگ ہو گیا ہے۔"(۸۲)

جب آپ کا کوئی اپنا آپ سے جدا ہوتا ہے اور دستر خوان سے کھانا کھائے بغیر اٹھ جاتا ہے تو اس کا صاف یہی مطلب ہے کہ آپ کے اوصاف میں وہ پہلے سی شگفتگی نہیں رہی یا پھر وہ حمید گی نہیں رہی جس سے لوگ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ الیملک کا اپنے عزیز بھائی سے علیحدہ ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اوصاف میں پاکیزگی ہونا کسی بھی شخص کے شخصی اوصاف کی پہلی نشانی ہے۔

زمران کے اوصاف بدلتے گئے اور اس نے پہلے اپنے بھائیوں، عزیزوں اور اہلِ بستی سے اپنا دستر خوان الگ کیا اور خود چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے لگا جس کا ذائقہ اور رنگ دونوں ہی اپنے لوگوں سے مختلف تھا اس کا تفاوت پن یہیں نہیں رکا بل کہ اس نے اپنے گھر پہ دروازے بھی لگوا لیے اور پھر دیواریں بھی اونچی کروالیں اور بعد میں ڈیوڑھی بھی بنوالی جو کہ بہت اونچی تھی۔ چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھا کھا کر اس کو خمار سا ہو گیا تھا اور اس کا تفاوت کا خناس بڑھ چکا تھا لہٰذا اس نے اپنے لیے ٹاٹ کا لباس ترک کر کے ایک باریک کپڑے کی پوشاک بنوالی اور نہ صرف خود پہن لی بل کہ اپنی بیٹی رافہ کو بھی پہنوا دی جس سے کا جوان اور شباب سے بھرا بدن کھل کر سامنے آنے لگا اور وہ اور بھی ظالم حسینہ بن گئی جس سے اس میں عفت کی بجائے شوخی اور بے حیائی نے جنم لیا اور اس میں بھی نزاکت کے سوتے پھوٹنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ الیملک کے بیٹے کی اس مڈبھیڑ ہو گئی اور اسی میں آنکھیں بھی چار ہو گئیں اور وہ اسے دل دے بیٹھا اور یہ محبت میں بہت قریب آ گئے۔ افسانے سے پیراگراف دیکھیے:

> "الیملک کے بیٹے بختاور کی بھی رافہ سے مڈبھیر کنویں کی من پر ہی ہوئی تھی اور رافہ گندم کے خوشے کی مانند شاداب اور میدے کی لوئی کی مثال نرم اور چٹی تھی۔ گات خوب اور خوشنما اور سینہ جیسے گھی دودھ میں گوندھے میدے کے دو پیڑ ے۔ تو، بختاور

نے بڑے کنویں کی من پر اسے تاکا اور پانی سے چھلکتے ڈول کی طرح اسے کھینچا اور سیراب ہوا۔"(۸۳)

باپ زمران نے ایسا کیا کہ اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے ایسا کپڑا لیا کہ جو باریک تھا اور پھر اس سے پوشاکیں بھی سلولیں تو کردار اور اوصاف میں ایک طرح سے بے ہودگی تو آنی ہی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ جس سے اس کا کزن بختاور اس کے عشق میں مبتلا ہوا اور آخر کار اسی میں جان دے دی اور رافعہ پھر اسے کبھی نہیں ملی۔ اس بات کا ذکر اس وقت ہمیں پتا چلتا ہے کہ بختاور نے جان دے دی ہے کہ جب اس بستی میں کال پڑتا ہے اور لوگ یہاں سے ہجرت کر کے دوسرے علاقوں میں جانے لگتے ہیں تو راستے میں جنگل میں بختاور کا باپ اور ماں زندہ ہوتے ہیں جنھیں زمران نے بستی بدر کر دیا تھا۔ماں اپنی فطرت کے مطابق پہلے اپنے بیٹے کے متعلق پوچھتی ہے جس پر آنے والے قافلے میں سے لوگ بتاتے ہیں کہ اس نے جان دے دی تھی۔ اقتباس دیکھیے:

"ایک قافلہ خراب وخستہ وہاں پہنچا اور الیملک سے پناہ کا طالب ہوا۔ الیملک نے انھیں پناہ دی اور پوچھا کہ اے دوستو! کدھر سے آنا ہوا؟ انھوں نے کہا کہ ہم زمران کی بستی سے آئے ہیں۔ یہ سن کر الیملک کی زوجہ نے سوال کیا کہ میرے بیٹے بختاور کے بارے کچھ کہو! انھوں نے جواب دیا کہ تیرا بیٹا اپنی آگ کا ایندھن بن گیا۔ اس نے رافعہ کے لیے زمران کی دیوار پر عقب سے کمند ڈالی اور زمران کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا۔ تب وہ اسی اونچی دیوار پر کھڑا ہوا اور نیچے کود گیا۔ خدا تیرے بیٹے پہ اپنی رحمت کرے۔ یہ ہماری بستی کی پہلی اونچی دیوار پر پہلی کمند تھی اور عشق کی پہلی واردات تھی۔

الیملک کی زوجہ نے یہ خبر سن کر اپنے سینے پر دوہتڑ ماری اور الیملک کا سر جھک گیا اور اس نے کہا بے شک! عشق موت کی مانند زور آور ہے۔ ہر مرد کا زور اپنے گریباں پر چلے گا اور جو عورت جس خمیر سے اٹھی ہے، اس خمیر میں واپس جائے گی۔"(۸۴)

جب شخصی وقار اور اوصاف میں وسعت نہ آئے اور زمانہ اس طرح عشق میں مبتلا ہونے لگے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑے بڑوں کی صاحب زادیاں جب اس طرح بے حیائی کا لباس زیبِ تن کریں گی تو دنیا ان پر فدا تو ہو گی اور اخلاق مین قطعاً کوئی اوصافِ حمیدہ نہیں آئے گا۔ کام تو باپ نے غلط کیا مگر اس کی سزا اس کی بیٹی اور اس کی بستی والے ہی بھگتیں گے۔

انتظار حسین کا افسانہ "گونڈوں کا جنگل" شخصی اور صاف پہ لکھا ایک بہترین افسانہ ہے جس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ جب انسان ذہنی انتشار کا شکار ہو تو اس کے اوصاف بھی تتر بتر ہو جاتے ہیں اور وہ حواس باختہ شخص بن کر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ آوارہ گردی اور گھر سے باہر اور دور رہنا اس افسانے کا خاصہ ہے۔ اس افسانے میں معین ایک مرکزی کردار ہے جو گھر میں حالات اور ملکی حالات ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ گھر سے باہر ہی گھومتا رہتا ہے کہ اس کی طبیعت جیسی سیلانی ہو گئی ہے اور گھر میں اس کا من ہی نہیں لگتا۔ اس کے دوست یار بھی آ کر گھر سے اس کا پوچھتے ہیں مگر اس کے باوا جان بتاتے ہیں کہ وہ گھر پہ ٹکتا ہی نہیں۔ کبھی معین اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا ہے اور کبھی اکیلا ہی جنگلوں بیابانوں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ گھر میں آئے معین کے دوست سے اس کی اماں پوچھتی ہے کہ تمھیں کچھ میرے بیٹے کے بارے پتا ہو یا اس نے آخری بار ملتے ہوئے تمھیں کچھ کہا ہو تو!

ساجد بتاتا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ شام کو گھر آ جانا تو کہیں باہر چلیں گے کوئی پکچر وغیرہ بھی دیکھیں گے مگر وہ نہ جانے ابھی کہاں ہو گا۔ ماں آگے سے کہتی ہے:

> "ہاں کئی دن سے گھر ہی پر تھا۔ کام تو ٹپ پڑا ہے۔ نکل کے کیا کرے۔ مگر صبح ہی صبح کو فون آ گیا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا بیٹے مت جاؤ۔ دن خراب ہیں۔ کہا کہ کام نکل آیا ہے۔ ابھی نبٹا کے ایک آدھ گھنٹے میں آ رہا ہوں۔ اچھا ابھی آ رہا ہوں۔ اب دن ڈھل رہا ہے اور ابھی تک اس کا کہیں اتا پتا نہیں۔"(۸۵)

ماں نے اس کے دوست ساجد میاں کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جیسے اپنے بیٹے کے اس آوارہ گردی پر پردہ ڈال رہی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ممتا سے مجبور اس بات کا اظہار بھی کر رہی ہے کہ ابھی تک معین آیا نہیں خدا جانے کہاں ہو گا اور وہ کس حال میں ہو گا۔ اس کہانی میں نہایت کمال اور چابک دستی سے انتظار حسین نے ملکی حالات کی وجہ سے نوجوانوں کی شخصیت میں آنے والے بگاڑ کو واضح کیا ہے۔ اس افسانے میں دیہاتی اور قبائلی لوگوں کا شہروں کی طرف ہجرت کر جانا اور پھر اس سے اوصاف میں آجانے معاملات اور مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔

iii. جزاو سزا کا تصور

کسی بھی معاشرے یا انسان کے ہاں اگر گناہ و ثواب کا تصور موجود ہے تو اس کے ہاں پھر جزاو سزا کا تصور بھی پایا جائے گا۔ وگرنہ گناہ و ثواب کے تصور اور خیال کا جواز ہی قائم نہیں ہوتا۔ کوئی بھی معاشرہ اپنی اقدار سے جانا جاتا ہے اور اس کی اخلاقیات اسی معاشرے کے مطابق تیار کی جاتی ہیں۔ جو اقدار ہمارے مشرقی معاشروں میں بری سمجھی جاتی ہیں ہو سکتا ہے کہ مغربی معاشرے میں وہ اقدار باعثِ تفاخر و اعزاز سمجھی جاتی ہیں اور جن اقدار و روایات کو ہمارے ہاں بھلائی اور نیکی کی علامت ہوں کسی اور معاشرے میں وہ بزدلی، کم عقلی اور برائی کی نشانی سمجھی جاتی ہوں۔ بہر حال مسلمان معاشروں کی اقدار ایک ہی جیسی ہیں چاہے کوئی بھی مسلمان دنیا کے کسی بھی کونے کھدرے میں رہتا ہو۔ ہاں کبھی کبھار علاقوں اور ملکوں کے تفاوت کی وجہ ان کے اطلاق میں اور عمل میں تھوڑا سا فرق ہو سکتا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی جزاو سزا کا تصور مختلف افسانوں میں مختلف طریقوں سے وارد ہوا ہے۔ وہ ایک خالص مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ہند اسلامی تہذیب، کلچر، روایات اور رسموں کو نہ صرف پڑھ رکھا تھا بلکہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ وہ جس تہذیب سے نکلے تھے تمام عمر وہی تہذیب اور تمدن ان کے اندر اپنی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی گئی اور یوں وہ اگلے زمانوں اور اگلی زمینوں میں رہنے کے باوجود پرانے زمانوں اور پرانی زمین کے ساتھ جیتے رہے اور اسی کے ساتھ جڑے رہے۔

انتظار حسین نے افسانے "فجا کی آپ بیتی" میں جزا و سزا کے تصور پر کھل کر بات کی ہے۔ اس افسانے میں مرکزی کردار فجا ہی ہے جو اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے جس کے دوران وہ بہت سی اور بھی باتیں لے آتا ہے۔ وہ ایک عام آدمی ہے اور ایک عام آدمی کس طرح مذہب اور اہالیانِ مذہب کے بارے میں سوچتا ہے اس لحاظ سے یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ فجے نے مسلمانوں کے زوال کی وجہ بھی بتائی ہے اور بتایا ہے کہ ہجرت کے دوران جو فسادات ہوئے ان میں مسلمانوں کے خون ہونے پر اس کے دل کا بھی خون ہو گیا مگر مسلمان دنیا میں اپنی نے اتفاقی اور آپسی لڑائی کی بدولت ذلیل ہو رہا ہے۔ نہیں تو یہ دنیا کا پانسہ پلٹ سکتے ہیں۔ نماز روزے سے دور ہیں اس لیے دنیا میں انھیں سزا مل رہی ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت جو نہیں کرتے اس لیے ہم سب رسوائے زمانہ ہیں۔ ہم تھوڑی سی انگریزی پڑھ لیں تو دین کو بھول جاتے ہیں۔ آیت الکرسی بھی نہیں ہمیں آتی تو ستر ستر بلائیں تو ہم پر چھائی رہیں گی۔ لڑکے کالجوں میں آزاد اور بے فکرے پھر رہے ہیں اور لڑکیاں بے حیائی میں سب سے بازی لے گئی ہیں منھ کھولے طباق سے لڑکوں کے ساتھ ساتھ مستیاں کرتی پھرتی ہیں تو یہ سارے عذاب ہم پر اسی وجہ سے نازل ہو رہے ہیں۔ اور فجا یہ سارا کچھ ایک مولوی صاحب کے حوالے سے بیان کر رہا ہے:

> "تو وہ (مولوی صاحب) کہہ رئے تھے کہ یو ساری آفتیں یوں آرئی ہیں کہ مسلمانوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ اجی تم نماز کی کئو ہو کلمے محمدؐ کی قسم لوگوں کو کلمہ تک ٹھیک یاد نہیں۔ یہ نئے نئے لونڈے جنٹلمین بنے پھرتے ہیں چار حرف انگریزی کے پڑھ کے سمجھ لیوے ہیں کہ ساتویں علم پڑھ لیے اور اگر کلام مجید کی ایک آیت کا مطلب پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ میں کئوں اوں کہ سارے علم تو کلام پاک میں ہیں۔ جس نے کلام پاک نہ پڑھا وہ خاک کا عالم ہے۔ ایک آیتہ الکرسی سے ستر بلائیں دور رہتی ہیں مگر یاد کسے ہے اور لونڈیوں نے تو سب کو ہی مات دے رکھی ہے جیسے دیکھو کالج میں پڑ رئی اے پریاں بنی بنی پھرے ہیں۔ طباق سامنہ کھلا ہوا، سر سے دوپٹہ غائب اجی یہ طور اشرافوں کے ہیں؟"(۸۶)

فجے کے مطابق مسلمانوں پر سارے عزاب اور ساری سزائیں ان کے بد اعمال کی بدولت ہیں اور ہمارا مسلمان ہونے کے ناطے یہ یقین بھی ہے کہ خدا ہمیں تنبیہ کرنے کے لیے کسی بڑی مصیبت سے بچانے کے لیے چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں ڈالتا رہتا ہے اور ہمارا امتحان لیتا رہتا ہے تا کہ ہم سچے اور کھرے ایمان والے مسلمان بنیں۔ یہ جزا و سزا کا تصور ہی ہے جو ہمیں راہِ راست پر لگائے رکھتا ہے اور ہمارا احتساب بھی ہوتا رہتا ہے۔

اس افسانے کے اختتام پر فجا یہ بھی کہتا ہے کہ یہ دنیا پاپ کا گڑھا ہے جو اپنے منھ تک بھر چکا ہے اس دنیا میں ہر شخص بے ایمان اور گناہوں میں لتھڑا ہوا ہے جس وجہ سے ساری دنیا اپنے گناہوں کی سزا پانے والی ہے اور سب کے سب غرقاب ہو جائیں گے۔ ہر کوئی چار بیس ہے۔ زمین آسمان اور پہاڑ وغیرہ سب ختم ہو جائیں گے۔ اور جنھوں نے مسلمانوں کو اذیت دی اس کا حشر تو انتہائی برا ہوگا۔ فجے کی زبانی سزا و جزا کے متعلق سنیے:

> "سب سالے چار سو بیسی ہیں۔ دل کا کوئی صاف نئیں۔ جب دین ایمان نہیں رہے گا تو یہی ہو گا۔ یہ سالی دنیا پاپ کا گڑھا ہے اجی بس اب یہ پاپ کا گڑھا منھا منہ بھر گیا ہے۔ کوئی دم میں غٹ سے ڈوب ہی جائے گا۔ سب مرے کے رہ جائیں گے۔ زمین، آسمان، پہاڑ، سمندر یہ سب سالے ایسے اڑ جائیں گے۔ جیسے دھنا روئی دھن دیوے ہے۔ میاں جنہوں نے مسلمانوں کا خون چوسا ہے ونکا حشر بڑا برا ہو گا۔"(۸۷)

یہ تو ہے کہ اگر انسان چار سو بیسی کرے گا تو سزا تو پائے گا۔ پاپ کرے گا تو اس کا بدلہ بھی چکائے گا۔ انسان کو دنیا میں نیک اعمال کرنے چاہییں تا کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں آرام اور آسانی کی زندگی گزار سکے۔ اگر سزا و جزا کا سلسلہ رک جائے تو انسان خود احتسابی کے عمل سے نہ گزرے اور تباہی اس دنیا کا مقدر ٹھہرے۔ اس افسانے میں فجے نے جو اپنی آپ بیتی سنائی ہے اس میں مسلمانوں کے حقوق کو خاص ملحوظ رکھا گیا ہے اور پتا چلتا ہے کہ مسلمان بھی مسلمان کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ اور ایسا ہمیں اسلامی تعلیمات

سے بھی حکم ملتا ہے۔یقیناً اس افسانے کی بنت میں انتظار حسین کا وہی مذہبی ذہن کار فرما رہا ہے جو بچپن میں دینی کتابوں کے مطالعے نے ترتیب دیا تھا۔

انتظار حسین کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''آخری آدمی'' ان کے فن اور افسانہ نگاری کا نیا موڑ ہے جہاں سے نہ صرف اردو افسانہ آگے بڑھا بل کہ افسانہ نگاروں کو نئے موضوعات اور نت نئے تجربات کا سامنا کرنے کو ملا۔افسانہ نگار نے اساطیر، مذاہب، لوک کہانیاں اور جاتک کتھاؤں کا مطالعہ اس قدر کیا ہوا کہ ان کی کہانیوں میں اکثر واقعات کے ساتھ ساتھ اسلوب بھی ویسا ہی در آتا ہے۔اس مجموعے میں اس کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔

اس مجموعے کا نمائندہ افسانہ بھی ''آخری آدمی'' ہے جس میں افسانہ نگار نے عہد نامہ عتیق کا سلوب اور واقعات سے کہانی گھڑی ہے اور اس واقعے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔جس کا اشارہ سورۃ اعراف میں ملتا ہے۔کہ ایک بستی تھی بنی اسرائیل میں جو سمندر کے کنارے تھی، اونچے اونچے برجوں اور میناروں والی حویلیاں تھیں وہاں اور وہاں کاروبار اور زندگی کی رونقیں اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھیں اور وہ لوگ سمندر کے کنارے مچھلی کا شکار کیا کرتے تھے جس سے ان کی گزر اوقات کا سلسلہ ذرا بہتر چلتا تھا۔اس بستی کو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے کا حکم نہیں تھا کیوں خدا کے حکم کے مطابق چھے دن مچھلیوں کا شکار کرنے کی اجازت تھی اور ساتویں دن نہیں تھی مگر امتحان کے طور پر ساتویں دن مچھلیاں بھی برلبِ ساحل زیادہ آیا کرتی تھیں۔۔تا کہ حکم ماننے والوں کا پتا چل سکے۔جب کہ لوگ اس حرکت سے باز نہیں آتے تھے اور سبت والے دن بھی مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔جس وجہ سے خدا نے انھیں حکم عدولی کی وجہ سے یہ سزا دی کہ ان سب کو بندر کی جون میں بدل دیا۔مگر جب وہ سب ہی بندر بن گئے تو انھیں محسوس ہی نہ ہوا کہ ہم سب خدا کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے بندر بنا دیے گئے ہیں تو ان کو بتانے والے نے جو انھیں خدا کا حکم سنایا کرتا تھا، بتایا کہ بندر تو تمھارے درمیان موجود ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتے۔اس تناظر میں افسانہ کا ایک اقتباس دیکھیے:

”اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغوں کو خراب کرتے تھے، نابود ہو گئے۔ اس پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا۔ یہ کہا کہ بندر تو تمھارے درمیان موجود ہیں مگر یہ کہ تم دیکھتے ہیں۔“(۸۸)

چوں کہ سب ہی بندر بن چکے تھے تو انھیں کہیں بندر دکھائی نہ پڑتے تھے۔ جو شخص انھیں خدا کا پیغام دیا کرتا تھا اور سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے روکا کرتا تھا انھوں نے اس کا مذاق اڑایا اور اس سے ٹھٹھا کیا تو اس نے بھی کہا کہ تم آج خدا سے ٹھٹھا کرتے ہو عنقریب خدا تم سے ٹھٹھا کرنے والا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا کہ ان کے اعمال کی پکڑ خدا کی طرف سے آگئی اور ان سب کو عبرت کا نشانہ بنانے کے لیے خدا نے ان سب کو بندر بنا دیا۔ ایک ایک کر سب کے احوال سامنے آتے گئے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار تو الیاسف ہے جس نے خدا کے ساتھ ایک خاص ترکیب سے دھوکا دے کر فریب کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ الیعذر، اس کی لونڈی، الیاب اور ابنِ زبلون، سب کو خدا نے ان کے گناہوں کے سبب سے اپنی پکڑ میں لے لیا اور ان کو سزا دی۔

خدا سے ٹھٹھا کرنے کے تیسرے روز ہی جب الیعذر کی لونڈی صبح سویرے اس کی خوابگاہ میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ وہاں الیعذر کی بجائے ایک بندر سو رہا ہے۔ یعنی الیعذر کو سزا کے طور پر آدمی کی جون سے بندر کی جون میں بدل دیا گیا۔ کیوں کہ الیعذر نے پچھلے سبت کے دن مچھلیوں کا زیادہ سے زیادہ شکار کیا تھا۔ اقتباس دیکھیے:

”اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجر دم الیعذر کی خواب گاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خواب گاہ تک گئی اور حیران و ہراساں واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خواب گاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر

کی خواب گاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بندر آرام کرتا تھا۔ اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھی۔"(۸۹)

الیعذر کے بندر بننے کی وجہ سے خبر پوری بستی میں پھیل گئی اور لوگ ایک دوسرے کو بتاتے جاتے تھے اور ان کے چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے جاتے تھے، منہ سرخ ہو جاتا تھا اور دانت نکل آتے تھے۔ اس طرح پوری کی پوری بستی کو ایک دوسرے پر استہزا اور خدا کے بندے پر استہزا کرنے کی وجہ سے بندر بنا دیا گیا۔

الیاب اور ابنِ زبلون دونوں نے ایک دوسرے پر لعن طعن کی، غصے ہوئے اور گالم گلوچ سے ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ تمھیں کچھ ہو گیا ہے، تمھیں کچھ ہو گیا ہے۔ دونوں کے چہرے بگڑتے چلے گئے، پھر ان کے اعضا بگڑے، پھر ان کی آوازیں بگڑیں اور خود سے گتھم گتھا ہو گئے اور لڑتے ہوئے ان کے الفاظ بھی خلط ملط ہو گئے اور غیر ملفوظ آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور وہ پھر چیخوں میں بدل گئیں اور آخر کار وہ مکمل بندر بن گئے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار جو کہ ایک ذہین انسان بھی تھا اس کا نام الیاسف ہے۔ الیاسف نے نہ صرف گناہ کیا بل کہ خدا کو بھی فریب دینے کی کوشش کی۔ جس وجہ سے اس کو کہانی میں سب سے زیادہ عبرت کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کی آدمی کی جون میں رہنے کی کوشش بھی سب سے زیادہ دکھائی گئی ہے۔ اس کے گنوہ کی نوعیت بھی سنگین تھی اس لیے اس کو سزا بھی سنگین ہی ملی۔ اس نے خدا کو اس طرح دھوکا دیا کہ سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کی ممانعت تھی مگر اس دن مچھلیاں سطح آب پر زیادہ آتی تھی۔ لہٰذا اس نے ساحل پر ایک نالی بنائی اور اس میں سے پانی گزار کر آگے ایک گڑھا بنا دیا جس کو پانی سے بھر دیا۔ اس طرح یہ مچھلیوں کا شکار تو نہیں کرتا تھا مگر اپنی تدبیر سے مچھلیوں کو اپنے گڑھے میں پھنسا لیتا تھا اور مچھلیوں کو پکڑ لیتا تھا۔ افسانہ نگار نے اسے یوں بیان کیا ہے:

"اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا سمندر سے فاصلہ پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر

اس کو سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔"(۹۰)

واقعی اس شخص نے خدا کے ساتھ مکر کرنے کی کوشش کی اور خود سے ایسی ترکیب نکال لی جو خدا کو ناپسند آئی اور یہی وہ آدمی ہے کہ جو بستی کا آخری آدمی ہے جو ابھی تک بندر کی جون میں تبدیل نہیں ہوا۔ اس نے کافی تردد کیا اور کوشش بھی کی مگر یہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور آخر کار بندر بن گیا۔ اس نے اپنے لوگوں کو دیکھا کہ وہ سب بندر بن گئے ہیں تو اس نے ان ست نفرت کی تو اسے یاد آیا کہ ابنِ زبلون نفرت سے ہی بندر بنا تھا تو اس نے اس سے بھی توبہ کر لی۔ پھر اسے ہنسی آئی تو اس نے ہنسی سے بھی بندر بن جانے کے خوف سے اسے ترک کیا۔ پھر لوگوں کے درمیان سے بھاگ کے علیٰحدہ ہو گیا اور علیٰحدگی میں بھی سکون نہ پا سکا اور ماضی کی یادیں اور گناہ کے دور عیاشی کے دن اور بنت الاخضر اسے یاد آنے لگی۔ پھر یہ جنگلوں میں بھاگ گیا اسے خود کے اعضا بدلتے ہوئے نظر آئے تو آنکھیں بند کر لیں مگر اندر ہی اندر ضمیر ستانے لگا۔ اس کی چیخیں نکلنے لگیں اور اس کو اس کی چیخوں نے آلیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اور بھاگتے بھاگتے ہی بندر کی جون اور ہئیت میں بدل گیا۔ افسانہ نگار کے الفاظ دیکھیے:

"الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے (جس میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا تھا)۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے۔ اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے

جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکادیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔"(۹۱)

الیاسف کو تو اپنے کیے سزا ملنی ہی تھی اور وہ ملی بھی۔اس کہانی میں مجموعی طور پر افسانہ نگار نے ڈر، خوف، ہوس، لالچ اور دنیا پرستی کو موضوع بنایا ہے۔جس میں کسی معاشرے کا مشترکا زوال اور انحطاط صاف دیکھا جاسکتا ہے۔سجاد باقر رضوی اس کہانی کے متعلق کہتے ہیں:

"پس لالچ اور مکر داخلی طور پر اور لفظوں کی موت خارجی طور پر روحانی زوال اور معاشرتی رشتوں کی شکست کی نشانی ہے اور انتظار حسین کے نزدیک ان دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔"(۹۲)

خدا کا سزا اور جزا دونوں کا نظام اصولوں پر مبنی ہے۔اس کی رحمت چاہے تو کسی کو بھی معاف کر دے اور چاہے تو بڑے سے بڑے صوفی کو بھی نہ بخشے۔مگر ایک کہانی نویس اور افسانہ نگار نے تو ظاہری پن اور ظاہری حقائق کی روشنی میں ہی اپنی بات سمجھانی ہوتی ہے دلیلیں پیش کرنی ہوتی ہیں۔

انتظار حسین کی کہانی "زرد کتا" بنیادی طور پر اخلاقی اور روحانی زوال کی کہانی ہے جس میں ایک معاشرے کا اپنی روایات، سماجیات، اخلاقیات اور روحانیات سے بالکل انکار کی کہانی ہے جس میں معاشرے کے نیک خو لوگوں کو نفس کے ہاتھوں مجبور ہوتے اور گناہوں کی دلدل میں دھنستے دکھایا گیا ہے۔

اس کہانی میں صوفیا کے ملفوظات اور اقوال شامل کیے گئے ہیں اور اس خوبصورتی سے شامل کیے ہیں کہ لگتا ہے یہ انتظار حسین کی ہی اختراع ہیں۔اس میں ایک مرید اور اس کا پیر دکھائے گئے ہیں جو آپسی گفتگو سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔شیخ کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے جو اس کو طمع دنیا میں لوگوں کے آگے ہاتھ دراز کرنے کی سزا ملی ہے۔شیخ اڑ بھی سکتا ہے اور انتہائی نیک شخص ہے۔مریدوں میں راوی ابو قاسم کے علاوہ پانچ اور لوگ بھی شامل ہیں جن میں حبیب بن یحیٰ، ابو جعفر شیرازی، حمزہ شیخ، ابو مسلم بغدادی اور سید رضی کے

نام ہیں۔ ان پانچوں نے بھی شیخ سے صحبت اور فرامین سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اسی کی وجہ سے یہ مردانِ باصفا بن گئے ہیں۔ شیخ حمزہ نے شیخ کی تعلیمات سے متاثر ہو کر دنیاے ترک کی اور بے چھت کے گھر میں رہنے لگے اور کہتے تھے کہ چھت مالک اور بندے کے درمیان رکاوٹ ہے۔ ابو مسلم بغدادی ایک صاحبِ حیثیت آدمی تھا جو باپ کی جاہ و حشمت والی زندگی چھوڑ کر مرشد کے در پہ پڑا رہتا اور کہتا کہ مرتبہ اور شان خدا اور بندے کے درمیان حجاب کا کام کرتے ہیں اس لیے ان کو ترک کر دیا۔ ابو جعفر شیرازی نے ذکر میں اپنا لباس تار تار کر دیا اور بے دھڑنگ پھرنے لگا کیوں کہ لباس انسان کو مٹی پر فوقیت دیتا ہے اور چٹائی اٹھا دی کیوں کہ چٹائی مٹی کو مٹی سے جدا کرتی ہے۔ اس لیے ننگ دھڑنگ پھرنے لگے۔

مگر یہی لوگ شیخ کی وفات کے بعد اپنے اعمال سے اور تعلیماتِ مرشد سے پھر گئے اور دنیا دار ہو گئے۔ سید رضی نے عالیشان گھر بنالیا، ابو مسلم بغدادی ایک محل سرا میں جا رہنے لگا، شیخ حمزہ نے ایک حویلی میں اپنا ٹھکانہ کیا۔ ابو جعفر شیرازی ایک گاؤ تکیے والی قالینی مسند پہ بیٹھنے لگا۔ اس طرح سب کے سب گناہ کے راستے پر آ گئے جہاں ان کے ضمیر نفسِ امارہ کے ہاتھوں پکڑے گئے اور پھر ان کی حالت یہ ہو گئی۔

> ”میں وہاں سے اٹھ کر آگے چلا اور میں نے سید رضی کے قصر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ اس کے پھاٹک میں ایک بڑا سا زرد کتا کھڑا ہے اور میں نے اس زرد کتے کو شیخ حمزہ کی حویلی کے سامنے کھڑا پایا اور ابو جعفر شیرازی کی مسند پر محوِ خواب پایا اور ابو مسلم بغدادی کی محل سرا میں دم اٹھائے کھڑے دیکھا۔“(۹۳)

جب شیخ کے مریدی جو ایک تربیت یافتہ نیک انسان تھے تو معاشرے کئ دوسرے افراد کا حال یقیناً ان سے بدتر ہی ہوا ہو گا اور سارے کا سار شہر زرد کتے کی زد میں آ گیا ہو گا اور ایسا ہی ہوا۔ حتیٰ کہ جو راوی تھا جس نے اپنے باقی دوستوں اور پیر بھائیوں کو پھر سے سمجھانا شروع کر دیا تھا۔ انھیں کے ساتھ مل کر زرد کتے کی زد میں آنے والی حرکات کر بیٹھا جس وجہ سے اسے بھی سزا کا مرتکب ٹھہرایا گیا اور زرد کتا اس پر بھی غالب کر دیا

گیا۔اس نے اپنے آپ کو بھی بچانے کی ہر ممکن جدوجہد کی مگر اس کے گناہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے اور وہ خدا سے ملتجی بھی ہوا کہ بار الٰہا مجھے آرام دے آرام دے آرام دے مگر اسے آرام میسر نہیں آیا۔

> ”اور میں نے اپنی پھٹی ہوئی انگلیوں اور لہو لہان تلوؤں اور پھوڑا چھالوں پر نظر کی اور اپنے حال پر رویا اور کہا کہ میں نے شیخ کے شہر سے ہجرت نہ کی ہوتی۔تب میرا دھیان اور طرف گیا۔میں نے مہکتے مزعفر کا خیال کیا اور صندل کی تختی اور گول پیالہ والی کا تصور باندھا اور شیخ کے مزار پر زر و سیم کی بارش پر قیاس دوڑایا۔اور میں نے سوچا کہ بے شک شیخ کے مرید شیخ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے۔“(۹۴)

اس اقتباس سے دیکھا جا سکتا ہے کہ جب راوی کو اس کے گناہوں کی سزا ملنا شروع ہوئی تو اسے اپنے گناہ کے لمحات بھی یاد آنے لگے بل کہ وہ رنگین لمحات اور وہ دلکش حسینہ اس کے سامنے فلم کی طرح چلنا شروع ہو گئی۔جس وجہ سے اس کے درمیان اور زرد کتے یعنی اس کے نفس کے درمیان ایک جنگ کا سا سلسلہ شروع ہو گیا۔کبھی راوی ابو قاسم خضری غالب آ جاتا تو کبھی زرد کتا آگے بڑھ جاتا۔اور زرد کتا اسے کہتا: کہ ”جب سب زرد کتے بن جائیں تو آدمی بنے رہنا کتے سے بدتر ہوتا ہے۔“(۹۵) راوی زرد کتے سے لڑتا اور اس سے جان چھڑانے لے لیے بھاگتا رہا مگر زرد کتا اسی کے ساتھ ساتھ رہا اور کبھی اس کے اندر گھس جاتا تو کبھی آنکل سامنے کھڑا ہوتا۔

اسی کشمکش میں راوی سو گیا جب صبح اٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ زرد کتے کی پچھلی ٹانگیں شہر میں اور اگلی ٹانگیں میری چٹائی پر اور اس کے گرم نتھنے میرے ہاتھوں کی انگلیوں کو چھو رہے ہیں جس سے مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا ہاتھ دشمن سے مل گیا تھا اور اسی لیے اب کٹا پڑا ہے۔یہ کہانی اجتماعی طور پر ایک ایسے شخص کی اپنی ذات کو پاکیزہ رکھنے اور نفس پر کنٹرول رکھنے کی کہانی ہے جو اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے اور روحانی زوال اور اخلاقی انحطاط اس کے سارے معاشرے میں پھیل چکا ہے اور یہ اس زوال سے خود کو بچا نہیں

پا رہا۔ ایک شخص کی کہانی ہوتے ہوئے بھی پورے سماج کی نمائندگی کرتی اور یہی تو افسانہ نگار کی افسانہ نگاری کا فسوں ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "ہڈیوں کا ڈھانچ" ایک ایسا افسانہ ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے سزاوجزا کے تصور سے ماورا انسانوں کا طرزِ زندگی دکھایا ہے کہ کس طرح انسان اپنے معیار سے گر کر حلال و حرام کو بھول کر سب کچھ چٹ کرنے پہ تلا ہوا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک دفعہ مر کر دوبارہ جی اٹھا ہے اور وہ قحط کے زمانے میں بھوک سے مر گیا تھا اور جب وہ مرا تھا تو اس کا پرسانِ حال تو دور کی بات اس کا خیال رکھنے والا اور اسے پانی تک پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جی اٹھنے کے بعد پہلے کے سارے مناظر یاد کرتا ہے اور اسی نفسیات کی شدت میں اس پر بھوک کا اٹیک ہوتا ہے اور اسے شدت کی بھوک ستانے لگتی ہے۔ اس لیے وہ شہر بھر سے کھانا مانگتا ہے اور پہلے تو لوگ اسے کھانا دیتے ہیں مگر بعد میں اس سے کھانا چھپانے لگتے ہیں اور وہ لوگوں کے گھروں میں جھانکنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے لوگوں کے گھروں میں جھانکنے اور کھانے پر جھپٹ جھپٹ کر کھانے سے لوگ وحشت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس سے دور ہونے لگتے ہیں۔ لوگوں کو اس بات کا بھی وہم ہے کہ کہیں کھانا کم نہ پڑ جائے کیوں کہ اس کی تو بھوک ہی نہیں مٹتی۔ یہاں افسانہ نگار نے کچھ لوگوں کو کرداروں کی زبان سے سانسیا کہہ کر پکارا ہے جو بھوک کی شدت سے مغلوب ہو کر اور مرنے کے خوف سے بچنے کے لیے حرام کی چیزیں بھی کھا جاتے ہیں۔ جن میں چھپکلی، سانپ اور بچھو بھی شامل ہیں۔ لکھتے ہیں:

""""یار یہ سانسیے بہت گندے ہوتے ہیں۔ چھپکلی تک کو کھا جاتے ہیں۔"

"چھپکلی، ابے وہ تو سانپ تک کو کھا جاتے ہیں۔"

"سانپ۔۔۔۔۔ نہیں یار۔"

"مت مانو۔"

"مگر یار سانپ کوئی کیسے کھا سکتا ہے۔"

"قسم اللہ کی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ لمبا سانپ سانسیے نے اسے قتلے قتلے کر دیا۔ پھر اسے کڑھائی میں۔۔۔۔" وہ منہ نگاڑ کر چپ ہو گیا۔

اس یاد نے اس پر کچھ بہت ہی ناخوشگوار اثر کیا کہ طبیعت گجگجانے لگی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ آدمی کیا الا بلا اپنے پیٹ میں بھرتا رہتا ہے۔ چھپکلی، مینڈک، سانپ، بچھو۔۔۔۔ ہر چیز۔۔۔۔ تو آدمی پھر وحشی ہی ہوا نا؟ اور آدمی کا پیٹ؟ یہ پیٹ آخر ہے کیا بلا؟"(۹۶)

اس اقتباس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسان جب گناہ و ثواب میں تمیز ختم کر دے تو پھر وہ جزا و سزا کے تصور سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ پھر انسان وحشت پہ اتر آتا ہے اور خدا سے مانگنے اور نیکی کر کے صبر کمانے کی بجائے انسان طرح طرح کی حرام چیزوں کا استعمال بھی شروع کر دیتا ہے جس سے اس کا ضمیر تو مرتا ہی ہے ساتھ میں سوسائٹی کے اندر بگاڑ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ ایسے معاشرے پر طنز اور رزالت کا کاری وار افسانہ نگار نے کیا ہے۔

اس اقتباس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جب انسان جزا و سزا سے منھ موڑ لیتا ہے تو پھر وہ حرام و حلال کی تمیز بھول کر اپنے دوزخ کو کسی بھی طرح بھرنا شروع کر دیتا ہے اس کے لیے رشوت بھی لیتا ہے اور بھی ناجائز ذروئع استعمال کرتا ہے مگر اس کی لالچ اور ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی بھوک کبھی نہیں مٹتی چاہے وہ جتنا بھی روپیہ پیسا اکٹھا کر لے۔ اسی لیے انسان وحشی خونخوار درندہ بن چکا ہے اور دہشت گردی جیسی ابتلاؤں میں بھی جکڑا ہوا ہے۔ ساری مخلوقات کا درد اور رحم کھو کر یہ گوشت پوست کا انسان نہیں بل کہ ایک ہڈیوں کا بے رحم ڈھانچ بن کے رہ گیا ہے۔ جسے سوائے اپنا پیٹ بھرنے کے کسی کی بھی فکر نہیں اور جو کبھی بھی بھرنے کا نہیں۔

جزا و سزا کا تصور ذہن میں ہو تو انسان گناہوں سے بچنے اور مصیبتوں سے چھٹکارے کے لیے بھی صدقہ خیرات کرتے رہتے ہیں اور ان کا خیال ہوتا ہے کہ مصیبت سے صدقہ ہمیں بچالے گا۔ مگر اس افسانے

میں اس کا تصور تو پیش کیا گیا ہے کہ آدمی اپنے کیے کی دنیا میں جتنی سزا پاتا ہے اس سے بچنے کے لیے اکثر اوقات ہم صدقہ دیتے ہیں مگر اس صدقے کا اثر اس افسانے میں دکھایا نہیں گیا بل کہ لوگوں کی فطرت دکھائی ہے کہ اگر ان کو صدقہ دینے کے باوجود نقصان ہو جائے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا تو پیسا بھی ڈوب گیا اور فائدہ بھی نہیں ہوا۔ یعنی صدقہ و خیرات اور جزا و سزا کا جو ایک تصور تھا وہ بالکل مٹ کے رہ گیا۔ افسانہ نگار کے الفاظ دیکھیے:

""""بی بی مردے کو ساتھ ساتھ دیکھنا اچھا نہیں۔" اماں جی ڈرے ڈرے لہجے میں بولیں۔

"مولوی صاحب نے خواب سنایا تو چپ ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ صدقہ دو۔ ڈوبے نے صدقہ تو بہت دیا، پر ہونی تو ہو کر رہتی ہے، ساری جائیداد اوجڑ ہو گئی۔ بس اسی غم میں دماغ الٹ گیا، قبرستانوں میں مارامارا پھرتا تھا اور دیکھنے میں ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ غریب جیتے جی مر گیا۔""""(۹۷)

اس اقتباس سے تو لگتا ہے کہ آج کل کے انسان کے ہاں سے صدقہ و خیرات کا اصل تصور ہی ختم ہو گیا ہے یعنی پہلے لوگ کہتے تھے کہ صدقہ دینے سے دولت اور رزق میں اضافہ ہوتا ہے مگر اب لوگ کہتے ہیں کہ دولت گھٹ گئی یا ضائع ہو گئی۔ واقعی میں اس دور کا انسان ہوس اور لالچ میں پاگل ہو گیا ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "دوسرا گناہ" اپنے موضوع اور فکر کے لحاظ سے خاص مارکسی فلسفے کا لکھا افسانہ ہے کہ جس میں ایک سماج اور معاشرے کی معاشی حالت پہ تبصرہ کیا گیا ہے اور اس افسانے سماج کے اندر جزا و سزا سے بے نیاز ہو کر چوہدریوں اور سربراہوں کے گناہوں پر بھی بات ہوئی ہے کہ ایک سماج جہاں برابری قائم نہیں رہتی تو وہاں کس طرح تباہی اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہے۔

اس افسانے میں ایک خاندان ہے کہ جو کہ بھی کہیں سے ہجرت کر کے ایک غیر آباد بستی میں آباد ہوتا ہے اور محنت و مشقت سے اس کی زمین کو نرم کرتا ہے اور درخت لگا لگا اس کو ہرا بھرا کرتا ہے۔ وہاں

لوگ آتے جاتے ہیں اور وہ علاقہ ایک بستی کی شکل اختیار کر جاتا ہے جس جس کا سربراہ انھیں میں ایک نیک صفت آدمی حشام کو بنا دیتے ہیں اور وہ لوگوں میں انصاف کا بھی ضامن ہوتا ہے۔ وہ ٹاٹ کا لباس پہنتا ہے، بغیر چھنے آٹے کی روٹی کھاتا ہے اور سب لوگوں کی طرح ایک دستر خوان پہ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے اس طرح یہ ساری بستی ایک ساتھ محبت و خلوص کے ساتھ رہتی ہے کہ ایک سو پچھتر سال کی عمر میں حشام کا انتقال ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ اس کے بیٹے کو اسی مقام پہ بٹھا دیا جاتا ہے کہ اپنے باپ کے کام سنبھالے۔

حشام کا بیٹا زمران اپنے باپ کے کام سنبھالتا ہے جس پر اس کا عزیز اور بھائی الیملک بہت خوش ہوتا ہے کہ میرا بھائی اپنے باپ جیسے ہی نیک کام کر رہا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی آتی جاتی ہے اور وہ لوگوں کی بجائے اپنی فکر کرنے لگتا ہے۔ دستر خوان پر اس کے لیے جو روٹی آتی ہے اس کی رنگت دوسروں کی روٹی سے مختلف ہوتی ہے تو اس پر اس کا بھائی اسے سمجھاتا ہے کہ تمھاری روٹی چھنے ہوئے آٹے کی ہے اور تم نے اس طرح خود کو لوگوں سے الگ کر لیا ہے تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس پر زمران کو غصہ آتا ہے اور الیملک اسے سمجھاتا ہے کہ میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا تھا کہ اگر سربراہ اور عام آدمی میں فرق پڑ جائے تو گیہوں کے چھلکے گیہوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور کھانے کے لیے رزق کم پڑ جاتا ہے اور بھوک بڑھ جاتی ہے مگر زمران نے اس بات کی مطلق پرواہ نہ کی اور الیملک بغیر ایک نوالہ کھائے دستر خوان سے اٹھ گیا۔ جس کا چرچہ پوری بستی میں ہوا۔ جس پر لوگوں کو حیرانی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ جس جس کو غصہ آیا یا پھر وہ حیران ہوا زمران نے اسے اپنے دستر خوان سے علیٰحدہ کر دیا۔ اسی طرح زمران نے گھر میں دروازے لگوائے، دیواریں اونچی کروالیں اور اونچی ڈیوڑھیاں بھی بنوالیں۔ اپنی سواری کے لیے گھوڑے بھی رکھ لیے بستی میں سڑکوں کا جال بھی بچھوالیا اور ٹاٹ کا لباس چھوڑ کر باریک کپڑا خود بھی پہنا اور اپنی بیٹی رافہ کو بھی پہنوا دیا۔ اس طرح بستی میں اتار چڑھاؤ آگیا اور لوگوں کے حصے کا کھانا اب زمران کے گھوڑے اور اس کے نوکر چاکر کھانے لگے۔ جس پر اس کے بھائی الیملک نے اتراض کیا اور کہا کہ تو نے ہمارا کھانے اپنے گھوڑوں

کو کھلا دیا جس پر جھگڑا ہوا اور زمران نے سزا و جزا کے تصور کو پسِ پشت ڈال کر اپنے بھائی کو اپنی بستی سے نکال باہر کیا اور وہ اپنی بیوی کو لے کر جنگلوں میں چلا گیا۔ افسانے سے اقتباس دیکھیے:

> ”الیملک جو کی روٹی کھا کر گھر سے باہر نکلا اور زمران کی گھوڑیوں کو بھوسیوں کا راتب کھاتے دیکھ کر حسرت سے بولا کہ جو رزق میرے حصے کا تھا، وہ زمران کی گھوڑیوں کے پیٹ میں چلا گیا۔ زمران نے اس کا یہ کلام سنا اور کہا کہا ے الیملک! تو ہم میں سے ہے، سو تو ہمارے ساتھ ہمارے دستر خوان پہ بیٹھ اور ہمارے ساتھ روٹی توڑ! اس پر الیملک نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کہا کہ میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے جب گیہوں کو گیہوں کے چھلکے سے جدا کر کے کھاؤں اور ظالموں میں شمار کیا جاؤں۔
>
> زمران نے الیملک کے جواب کا برا مانا۔ اس نے الیملک کے سر پر غصے میں ڈنڈا مارا اور کہا کہ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے! کیا تُو مجھے ظالم کہے گا۔ سو تو ہمارے درمیان سے چلا جا۔“(۹۸)

زمران نے حکومت اور سربراہی کے زعم اور نشے میں اپنے عزیز کو اپنی بستی سے نکال باہر کیا اور وہ شریف بھی اپنی بستی سے چلا گیا۔ مگر وہ جو اپنے بڑوں کی بات کو بار بار دہراتا تھا کہ اپنے اور لوگوں کے درمیان جو فرق کرتا ہے اس کی بستی مٹ جاتی ہے۔ رزق کم ہو جاتا ہے اور بھوک بڑھ جاتی ہے کوئی کسی دوسرے کا نہیں سوچتا بل کہ ہر کوئی اپنا ہی سوچتا ہے۔ اس بات سے زمران ابھی بے خبر تھا کہ اس کام کا مجھے برا انجام بھی بھگتنا پڑ سکتا ہے اور میں سزا کا مرتکب بھی ہو سکتا ہوں۔ مگر اقتدار کے نشے میں وہ جھوم رہا تھا۔

اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ زمران کی بستی میں رزق کم ہونے لگا اور بھوک بڑھنے لگی اور اس طرح کرتے کرتے لوگ بھوکے مرنے لگے۔ لوگوں نے سوچا کہ اس بستی میں بھوک کے ہاتھوں مرنے سے بہتر ہے کہ کہیں جا کر اپنی قسمت آزمائی کی جائے اور یونہی ہوا اور کہ لوگوں نے اس بستی میں زمران کے

گناہوں کے بوجھ تلے دب کر بھوک کے ہاتھوں مرنے سے یہی بہتر جانا کہ یہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے اور لوگ قافلوں کی شکل میں یہاں سے جانے لگے۔

قافلے ایک ایک کر کے جنگل سے گزرتے تو آگے الیملک مہربان کو پاتے تو باغ باغ ہو جاتے اور اس کے پاس ہی رک جاتے کہ اس نے جنگل کی کافی زمین کو خود ہی نرم بنالیا تھا۔ وہ آنے والوں سے بستی کے متعلق پوچھتا تو وہ یوں گویا ہوتے:

> "قافلہ والوں نے کہا کہ دوسروں کی مت پوچھ۔ دیوار سے گر کر مر جانا اس سے اچھا ہے کہ آدمی فاقے کر کے مرے۔ کھیت، شاہراہوں اور اصطبلوں کی زد میں آگئے۔ کھیتوں والے کچھ نگہبان بنے، کچھ سائیس بنے، کچھ آوارہ ہو گئے اور گیہوں ہمارے درمیان تھوڑا رہ گیا اور گراں ہو گیا اور ہم نے اس بستی کی زمین کو اپنے آپ پر تنگ پایا اور نکل کھڑے ہوئے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔"(۹۹)

اس کے بعد زمران کی عیاشی اور گناہوں کی بدولت پوری بست پہ قحط غالب آ گیا اور سارے لوگ ایک ایک قافلے میں شریک اسی بستی میں آ کر رہنے لگے جسے جنگل میں الیملک نے آباد کیا تھا۔ اس افسانے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ جب کوئی انسان گناہ کر کے اس کی سزا سے غافل ہو جاتا ہے تو اسے ضرور پروردگار عبرت کا نشان بنا کر چھوڑ تا ہے کہ آنے والے انسان اس سے سبق سیکھیں اور اپنے وجود اور ذات کو لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے لیے وقف کریں۔

اس افسانے میں جہاں معاشی سطح پر اور گناہ و ثواب کے ساتھ ساتھ سزا و جزا پہ بات ہوئی ہے وہاں افسانے کی پرتیں کھولیں تو ہمیں سیاسی نکتے بھی نظر آتے ہیں کہ یہ سیاست دان بھی ہمیشہ اپنی اور اپنوں کے فائدے کی سوچتے ہیں مگر قوم یا عام انسانوں کا کم ہی سوچتے ہیں۔ عدم مساوات، معاشرت تفاوت، سیاسی، سماجی بے چینی اور استحصال، افلاس، معیشت اور دوسرے کئی عوامی عوامل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر حامد رضا صدیقی لکھتے ہیں:

"دوسرا گناہ انتظار حسین کی مارکسی فلسفہ سے متاثر کہانی ہے جس کو اسلامی تناظر میں پیش کیا گیا ہے جس میں سماجی طبقات کی تقسیم، عدم مساوات، غربت وافلاس، دولت ومعیشت کا تصادم جیسے مسائل کو بڑے تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔"(۱۰۰)

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ٹھیک ہے کہ اس افسانے کے کئی پہلوؤں کے بیان کرنے کے علاوہ اس افسانے میں دولت کی غیر مساوی تقسیم بھی ایک مسئلہ بہر حال ہے۔ اگر یہ حکمران اپنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت نہ دیں تو سارے کا سارا معاشرہ عزت اور سکون کی زندگی گزار سکتا ہے۔ اونچ نیچ چھوٹا بڑا اور سب سے بڑھ کر رزق کی جمع آوری اور رزق کی کمی جیسے مسائل سے جان چھوٹ جائے گی۔

ج۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں میں اخلاقی اقدار: تقابلی مطالعہ

انسان جہاں بھی رہے کسی نہ کسی قاعدے اور قرینے سے ہی زندگی گزارتا ہے اور ترتیب و تنظیم ہی زندگی ہوتی ہے جب کہ کچھ دانش وروں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بے ترتیبی بھی ایک ترتیب ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح معاشرے میں جینا اور اپنے آپ کو دوسروں کے لیے فائدہ مند بنانا، تعمیری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہی معاشرے کی اقدار اور اخلاقیات کو زندہ رکھتے ہیں۔ معاشرے کی اخلاقی اقدار کو جاننے کا ارادہ کریں تو ہمیں گناہ و ثواب کے فلسفے سے آگاہی ہوتی ہے، جزاوسزا جیسے معاملات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اس کے ساتھ ہمیں دیکھنا پڑتا ہے کہ معاشرے میں ہمارا کردار کیسا ہے جس سے ہماری شخصیت کے اوصاف طے ہوں گے۔ جس سے پتا چلے گا کہ ہمیں اپنے معاشرے میں سر اٹھا کر جینا ہے یا پھر منھ چھپا کر جینا ہے۔ ان سب معاملاتِ زندگی کو اکٹھا کریں اور دیکھیں تو یہی چند ایک معاشرتی اقدار بنتی ہیں اور مذہبی عناصر میں ان کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔

خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں کا مذہبی لحاظ سے تقابل کرتے ہوئے ہمیں حیات کے تصور کے ساتھ ساتھ اب مذہبی اخلاقی اقدار کا بھی جائزہ لینا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں

اخلاقی اقدار کو لے کر خیالات اور موضوعات کس کس طرح سامنے آئے ہیں۔ پہلے کی طرح اب بھی ہم مذہبی اقدار کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں تین حصوں میں ایک ایک کر کے جائزہ لیں گے۔

i. گناہ و ثواب کا تصور

کوئی بھی معاشرہ مذہب اور عقیدے سے خالی نہیں ہوتا اور جس بھی معاشرے میں ایمان اور عقیدے والے لوگ ہوتے ہیں وہاں گناہ و ثواب کی مذہبی نوعیت کا تذکرہ ضرور رہتا ہے اور دن رات ہمیں اس کی بازگشت گلی، محلوں، گھروں، سکولوں، یونیورسٹیوں اور چوک چوراہوں میں بھی ملتی ہے اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک باشعور ادیب اور شاعر ان موضوعات کو اپنی تحریروں کا حصہ نہ بنائے۔

جبران کا افسانہ "خانقاہ" گناہ و ثواب کے تصور پر ایک بہترین افسانہ ہے کہ جس میں ہمارے معاشرے کی ایک عام روش کو زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ اکثر ہم خود تو نیکی کا کام کوئی نہیں کرتے مگر نیک لوگوں پر تنقید کرتے اور ان کی ناہوئی خامیاں کو ڈھونڈ کر بیان کرتے رہتے ہیں اور یہ ہمارا بڑا عزیز مشغلہ بھی ہے۔ دوسری طرف ان نیک اور پارسا لوگوں پہ بھی افسانے میں جبران نے بات کی ہے جو خود تو نیک ہوتے ہی ہیں مگر معاشرے سے کٹ کر راہبانیت کی زندگی گزارتے ہیں حالانکہ انھیں چاہیے کہ وہ معاشرے کے اندر رہ کر معاشرے میں سے برائی کا خاتمہ کرنے کی سوچیں یا لوگوں کے کام آئیں۔ اقتباس دیکھیے:

"ان میں سے ایک نے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ سامنے خانقاہ دیکھ رہے ہو! اس میں ایک راہب رہتا ہے۔ جس نے مدتوں سے دنیا کو تج رکھا ہے۔ اسے صرف خدا کی تلاش ہے اور دنیا کی کسی اور چیز سے اسے رغبت نہیں۔"

دوسرا بولا۔

”جب تک وہ اس خانقاہ اور اس خانقاہ کی تنہائی کو چھوڑ کر دنیا میں واپس نہیں آتا۔ خوشی میں ہمارا ساتھی اور غمی میں ہمارا مونس بننے کے لیے شادی کی محفلوں میں ناچنے والوں کے ساتھ مل کر ناچنے اور موت کے سانحوں پر ،رونے والوں کے ساتھ آنسو نہ بہائے، اسے خدا نہیں مل سکتا!“““(۱۰۱)

اس حصے میں افسانے کے اندر ان نیک لوگوں کا حال دکھایا گیا ہے کہ جو گناہوں کو تیاگنے کے لیے پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں اور راہبانیت میں زندگی گزار دیتے ہیں کسی کے دکھ درد اور خوشی میں کبھی شریک نہیں ہوتے یعنی انھیں انسانیت کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں رہتا اور وہ اپنی دھن میں خدا کو تلاش کرنے کی جستجو میں مگن رہتے ہیں مگر ایسے انھیں خدا نہیں مل سکتا جب تک کہ وہ انسانوں کی نفسیات کو نہ سمجھیں اور ان میں آکر ان کا احساس نہ کریں۔

اسی افسانے کا دوسرا رخ بھی دکھایا گیا ہے کہ وہی دونوں نوجوان بات کرتے ہوئے نیکی اور بدی، گناہ اور ثواب کا یہ تصور بھی دیتے ہیں کہ ہم لوگ خود تو نیک کام کوئی نہیں کرتے بس دوسروں کے اندر عیب ڈھونڈتے رہتے ہیں چہ جائیکہ وہ نیک ہے یا بد۔ دوسرا حوالہ دیکھیے:

”پہلا اگرچہ قائل ہو چکا تھا کہنے لگا۔

”تم نے جو کچھ بھی کہا مجھے اس سے اتفاق ہے۔ لیکن پھر بھی، یہ میرا ایمان ہے کہ راہب بہت اچھا آدمی ہے اور کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ایک بھلا آدمی ہزاروں ایسے لوگوں سے دور ہی رہے جو اپنے آپ کو بھلا سمجھتے ہیں۔“““(۱۰۲)

جبران نے اپنے اس افسانے میں بڑے انصاف سے کام لیا ہے اور انسانوں کی دونوں طرح کی نفسیات پہ بات کی ہے۔ کہ ہم خود بھی نیک نہیں ہوتے اور دوسرے نیک لوگوں پہ انگلیاں اٹھاتے رہتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ نیکی نیکی نہیں رہتی جب تک کہ عوام کی شمولیت اس میں نہ ہو۔ ہر حال میں عوام کو ساتھ رکھنا چاہیے چاہے کچھ وقت کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

انتظار حسین کا افسانہ "فجا کی آپ بیتی" اس نوعیت کا بہترین افسانہ ہے کہ جس میں فجا اپنی آپ بیتی سناتے سناتے تھوڑا جذباتی ہو جاتا ہے اور طرح طرح کی باتیں کرتا کراتا درمیان میں ہجرت کے فسادات بھی لے آتا ہے اور درمیان میں مسلمانوں کے آپسی اتفاق کو بھی نشانہ بناتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں کا خون ہو رہا ہے اور سب مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے آرام کر رہے ہیں۔ اب کوئی معجزہ ہی ہے کہ مسلمانوں کو پھر سے عروج دے اور انھیں دوسری قوموں کے ہم پلہ لا کھڑا کرے اور ان کو زوال سے نکالے۔ اقتباس دیکھیے:

> "مگر یارو اب تو کوئی معجزہ بھی ہو کے نئیں دیتا۔ مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ گیا۔ اور اللہ میاں کچھ بھی تو نئیں بولا۔ وس کے بھید وہی جانے۔ پٹنہ میں تو مسلمانوں کا پڑا ہو گیا۔ امر تسر میں سکھوں کی کی چڑھ بنی اور دلی سات مرتبہ لٹی تھی۔ اب کے ہندوؤں اور سکھوں نے وسے اوجڑ کر دیا۔ کلمے محمدؐ کی قسم جب میں سنوں ہو تو میرا خون کھولنے لگے ہے۔"(۱۰۳)

اس کے علاوہ فجے کو غم ہے کہ دوسرے لوگ نیکی بھی تو نہیں کر رہے اور مزے کی بات ہے کہ اس کے نزدیک نیکی کا معیار بھی اپنا ہی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ نیکی کرنی ہے تو دوسروں کی مدد کی جائے اور انھیں کے لیے مدرسے، لنگر خانے کھلوائے جائیں یا پھر مسجد وغیرہ میں چندہ ہی دیا جائے۔

> "اجی اب مسلمانی تو نام کی رہ گئی ہے۔ سب لکیر پیٹتے ہیں۔ دین ایمان کسی کا بھی سلامت نئیں اے۔ جو مسلمان بنے بنے پھرے ہیں ونکی مسلمانی بھی بس مطلب کی ہے۔ اب مختار صاب ہیں برا اسلام مسلمان کرے ہیں۔ مگر میں پوچھوں ہوں کہ وہ کون سا مسلمانی کا کام کرے ایں، کبھی جماعت میں شریک ہوئے؟ کبھی پیسہ دھیلا اللہ کے نام کا دیا؟ کون سی مسجد بنوا دی؟ کون سا مدرسہ کھلوا دیا؟ ہم نے کبھی ونہیں مسجد میں دو پیسے کے کڑوے تیل کا چراغ بھی نہ جلاتے دیکھا۔ اجی اس بات کو چھوڑو وہ سود کھاوے ہیں۔ میں پوچھوں ہوں کہ سود کھانا کون سا شرع شریف نے بتایا ہے۔"(۱۰۴)

فجے کی تقریر اور لفظوں پہ غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر کوئی بھی الزام نہیں لینا چاہتا اور دوسروں کی نیکی کو بھی اپنے بنائے ہوئے پیمانے پہ ہی نیکی ماننا چاہتا ہے اس کے علاوہ نہیں۔ مسلمانوں کے ذلیل ورسوا ہونے کی ایک وجہ وہ آپسی اتفاق نہ ہونا بھی گردانتا ہے اور اس کے نزدیک یہ ساری باتیں دوسروں میں نہیں۔ وگرنہ آج مسلمانوں کا حال ایسا نہ ہوتا جیسا کہ ابھی ہے۔

> ”مگر بھیا اب تو مسلمانوں میں ایکا رہا ہی نئیں۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ ہو رہا اے۔ آپس میں ہی لڑتے ہیں۔ محبت مروت خاک نئیں رہا۔ اگر ایکا ہوتا تو دنیا کا تختہ الٹ دیتے۔ مگر فرعون بے سامان بنے پھرتے ہیں۔ وسی کی تو سزا بھگت رئے ایں۔ کلمے کی قسم مسلمانوں پہ عذاب پڑ ریا اے۔ اللہ پاک بھی سب دیکھتا ہے۔“(۱۰۵)

فجے کی آپ بیتی اور اس میں اس کے خیالات کو سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ گناہ وثواب میں ہمیشہ اپنے آپ کو نیک اور دوسروں کو گناہ گار سمجھتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں وہی الاپ الاپا ہے کہ ہماری مجموعی دور میں ایسی ایک عادت بن چکی ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں نیک آدمی کو دیکھ کر نیک ہونے کے بجائے اس کی نیکی والی صفات میں بھی غلطیوں کی گنجائشیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ حالانکہ جو حالات اور انسانیت کا زوال چل رہا ہے کہ اس میں اگر کوئی انسان دوسروں کی بہ نسبت کم نیکی بھی کرے تو اسے زیادہ سمجھنا چاہیے۔

جبران اور انتظار حسین دونوں کے ہاں اپنے اپنے افسانوں میں ایسی ہی نوعیت پائی جاتی ہے کہ ہم خود کو نیک سمجھتے اور دودھ میں دھلے خیال کرتے ہیں مگر ہماری حالت دوسروں کی نیکیوں کے پہاڑ کے سامنے ایک ذرے والی ہوتی ہے۔ جبران نے اپنے افسانے ”خانقاہ“ میں دو لوگوں کے مکالمے سے کہانی کو آگے بڑھایا ہے اور نیکی بدی کے دونوں پہلے بیان کیے ہیں۔ کہانی بالکل سادی اور سپاٹ ہے کہ جس میں بیانیہ انداز اختیار کر کے اور خانقاہ میں موجود بزرگ کو علامت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خانقاہ ایک علاقے کی علامت ہے یا کسی خاص طبقے کو موضوع بنایا ہے اگر دونوں حالتوں میں بھی دیکھا جائے تو افسانہ اپنی بنت، موضوع اور

اسلوب کے لحاظ سے کمال افسانہ ہے جس میں جبران نے نیک کو بد سمجھنے کا تصور اور نیک کو بد سمجھنے والوں کے تصورِ بدی اور نیکی پر دلچسپ پیرائے پر اس مختصر افسانے میں خوب بحث کی ہے۔

انتظار حسین نے بھی اپنے افسانے "فجا کی آپ بیتی" میں گناہ و ثواب کے فلسفے کو ایک عام آدمی کی نظر سے بیان کیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی گناہ اور ثواب کے اس معاملے کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور وہی شخص اپنے اعمال پر کبھی نگاہ نہیں کرتا بل کہ دوسروں کے معاملات پہ پوری توجہ رکھتا ہے۔

دونوں افسانہ نگاروں نے ایک عام آدمی کی نفسیات میں شامل یہ عنصر دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عام آدمی اس کام کو نیک تصور کرتا ہے کہ جس کا فائدہ عام آدمی اور عام معاشرے کے افراد کو ہو۔نہ کہ اس کام کو نیکی تصور کرتا ہے کہ جس سے وہ کوئی چھپ چھپا کے نیک بن رہا ہو یا کسی امیر اور بڑے آدمی کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔اسلوب کے لحاظ سے انتظار حسین کے افسانے میں موضوع کے علاوہ ہجرت کے مسائل کا بھی پتا چلتا ہے مگر جبران اپنے موضوع کو ہی بیان کرتے ہیں جس سے انتظار کا افسانہ مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے بھی جبران کے یک موضوعی افسانے کا مقابلہ نہیں کرتا،کیوں کہ وحدتِ تاثر اور جامعیت کسی بھی افسانے کی جان ہوتے ہیں اور انتظار کا افسانہ اس لحاظ سے کمزور دکھائی دیتا ہے۔

جبران نے ایسے کئی افسانے اپنے دلکش اور خوبصورت پیرائے میں لکھے ہیں کہ جن میں مختلف زاویوں سے گناہ و ثواب کو سمجھنے اور بیان کرنے کا انداز ملتا ہے۔جبران کا افسانہ "یہ دنیا ہے!" میں بھی ایسے ہی ایک گناہ و ثواب کے زاویے پہ بات کی گئی ہے کہ جس میں ایک نیک راہب اور عالم کو دکھایا گیا ہے جو ہر روز شہر کے بیچ و بیچ آ کے لوگوں کو نیکی اور اچھائی کی تلقین کیا کرتا تھا اور لوگ اس سے بہت متاثر تھے کہ الحمدللہ ہم میں ایسے نیک لوگ بھی موجود ہیں کہ ہمیں نیکی کا حکم کرتے ہیں اور خدا کے خوف سے بھی ڈراتے ہیں۔لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے عقیدت، محبت اور احترام بڑھتا چلا گیا۔مگر ایک شب ان کے ہاں تین مہمان آ گئے اور انھوں نے رہنے کے لیے جگہ مانگی تو اس راہب نے جگہ دینے سے انکار کر دیا تو ان میں سے ایک نے راہب

کے اس علمی اور نیکی کے کام پہ اعتراض کر ڈالا اور کہا کہ خود بھی لوگوں کے لیے نیکی اور ہمدردی کی راہیں ہموار کیا کریں صرف دوسروں کو ہی نہ کہتے رہا کریں۔ اقتباس دیکھیے:

"میرے دوستو! میرے پاس اس بستر، چٹائی اور لوٹے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ کے یہ کسی کام آسکیں تو انھیں لے جائیے، اس کے علاوہ میرے پاس نہ چاندی ہے نہ سونا!"

اس پر وہ ناراض ہو کر چل دیے۔ مگر تیسرا جاتے جاتے دروازے میں رک گیا اور کہنے لگا۔

"تم دھوکے باز ہو، تم فریبی ہو۔ تم مکار ہو۔ تم دوسروں کو ایسی نیکی کی تلقین کیوں کرتے ہو، جس پر خود عمل نہیں کر سکتے!""(۱۰۶)

اس افسانے میں جبران ایسے لوگوں کا حال بیان کر رہا ہے کہ جو دوسروں کو تو تبلیغ کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ نیکی کا کام کرو اور برائی سے بچو اور دوسروں کا خیال بڑھ چڑھ کر کرو مگر خود جب نیکی یا بھلائی کرنے کا وقت آتا ہے تو پیٹھ دکھا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاں گناہ کا تصور یہ ہے کہ دوسروں کو نیکی کی دعوت دیں اور خود چاہے جو مرضی کرتے رہیں اور ثواب ایسے لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ دوسرے نیکی کریں گے تو ان کے حکم اور تبلیغ کی وجہ سے تو ہمیں بھی اس کے ثواب میں سے حصہ مل جائے گا اور ہم چوں کہ تبلیغ دین کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں تو یقیناً ہمارے سر سے تو ویسے ہی گناہوں کا پلندہ اتار لیا گیا ہے اور ہم معصیت سے پاک اور سراپا ثواب ہی ثواب ہیں۔ حالانکہ دین ہمیں کہتا ہے کہ وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے۔

انتظار حسین کا افسانہ "مردہ راکھ" اسی نوعیت کا دلفریب افسانہ ہے کہ جس میں انتظار نے بڑی خوبصورتی سے ایسے مذہبی لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جو نہ صرف خود مذہبی کام نہیں کرتے بل کہ مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے ان کے پاس جو رقم جمع ہوتی ہے وہ بھی کھا جاتے ہیں۔ اس افسانے میں تراب علی متوالی نام کا

ایک آدمی ہے کہپ جو سب کو شیعہ مسلک سے متعلقہ کاموں اور فرائض پر معمور کرتا ہے اور سارا سال ان کاموں کے لیے جو چندہ وغیرہ امام بار گاہ میں جمع ہوتا ہے وہ بھی اسی کے پاس رکھا جاتا ہے۔ مگر اس دفعہ امام کی سواری بھی نہ نکالی جا سکی، دلدل بھی مر گیا اور لنگر بھی پورے عشرے میں دیکھنے کو نہ آیا بس ایک آدھ دن انھوں نے ایسا کیا اور دوسرے بھی دو چار آدمی ان کے ساتھ امام بار گاہ کا چندے اور نیاز والا سارا روپیہ ہڑپ کر گئے۔ مگر اس کا الزام حالات اور مہنگائی پر لگا دیا۔

"تراب علی متولی کہتے تھے کہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ میدہ تو کسی بھاؤ نہیں ملتا۔ مولوی فرزند علی تک جب یہ خبر پہنچی تو انھوں نے بہت سرد مہری سے کہا کہ "کچھ چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں اور کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے۔"

افضال حسین نے ٹکڑا لگایا: ہاں! کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے، کچھ دوسری مدوں میں خرچ ہونے لگی ہے۔"

مگر اس ساری بیزاری کے باوجود اس خبر پر کسی کو اعتبار نہ آیا۔ کوئی لاکھ بے ایمان ہو گیا ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ دلدل کے دانے پانی میں بے ایمانی کرنے لگے۔ جس شخص نے دلدل پر ہنٹر پڑتے دیکھا تھا، وہ یہ خبر سنا کر خود ہی چور بن گیا اور اعتبار نہ کرنے والوں کی برہمی سے ڈر کر اپنا بیان بدلتا چلا گیا۔۔۔۔۔۔ مگر اب وہ سب خبریں سچی نکلیں۔ مولوی فرزند علی پھر بھی کچھ نہیں بولے، بس انھوں نے ایک ہی فقرہ کہا: "جو شخص بڑا علم گروی رکھ دے اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہو سکتی۔"(۱۰۷)

مذہبی لوگوں کا پورے معاشرے پر بڑا کنٹرول ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ان کے خلاف کوئی آدمی کھل کر تو کیا عام ڈھکے چھپے الفاظ میں بھی بات نہیں کرتا کیوں کہ ایک تصور ہمارے ہاں ایسا بھی ہے کہ اگر آپ نے کسی مذہبی آدمی کے بارے یا خلاف بات کر دی تو غیبت کی وجہ سے آپ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ گناہ گار بھی ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کی حکم عدولی اور گستاخی کی وجہ سے آپ کا کوئی نیک

عمل بھی قابلِ قبول نہیں ہو گا اور ثواب والا سارا کھاتہ کھٹائی میں پڑ جائے گا اور آپ سب کچھ کر کے بھی کچھ حاصل نہیں کر پائیں یعنی مکے گئے مدینے گئے، جیسے گئے ویسے ہی آ گئے۔ انتظار کے افسانے میں یہ بات تو عیاں ہے کہ ہمارے مسلکی اور مذہبی شعار کی ادائیگی میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ساری ذمے داری اپنے اوپر اس لیے لے لیتے ہیں کہ ان روپے میں سے کچھ ذاتی جیب خرچ کے لیے اور عیاشی کے لیے بھی مل جائے گا اور سارا سال یہ لوگ دوسرے لوگوں سے چندے کی اپیل کرتے رہتے ہیں۔

جبران کا افسانہ اگرچہ ایک خاص راہب اور عالمِ دین کے بارے میں ہے مگر اس افسانے میں راہبوں کے دہرے معیارِ گناہ و ثواب کو موضوع بنا کر بات کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے لیے اور اپنے خاندانوں کے لیے گناہ و ثواب کا الگ معیار رکھتے ہیں اور ہم جیسے عوام کے لیے الگ ایک معیار رکھتے ہیں۔ افسانے میں تین لوگوں کا راہب سے گفتگو کرنا اپنی طرز میں بہترین ہے اور اس ڈرامائی انداز سے افسانہ اور بھی دلکش ہو جاتا ہے کہ جب ایک آدمی جاتا ہوا رکتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ جناب پھر آپ تو دھوکے باز اور فریبی ہیں کہ دوسروں کو نیکی کی دعوت دیتے ہیں اور خود نیکی نہیں کرتے۔

اسی طرح انتظار اپنے افسانے میں جب دلدل کے مرنے اور ہنٹر پڑنے کا ذکر کرتا ہے تو وہ آدمی ایسی ترکیب لڑاتا ہے کہ بتانے والا اور عینی شاہد ہی قصوروار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ متولی تراب علی اور افضل حسین مل ملا کر سارا سارا سال پیسے کھاتے ہیں اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں اور اس سال تو امام کی سواری بھی نہیں نکلی۔ اگر کوئی ہمت کر کے پوچھتا ہے تو صرف سرسری کہہ دیا جاتا ہے کہ مہنگائی بڑھ گئی ہے یا اس سال پیسے ہی کم جمع ہوئے تھے تو ساری بات ڈھانپ دی جاتی ہے۔

جبران نے اپنے افسانے میں ایک ایسا تصورِ گناہ و ثواب پیش کیا ہے کہ ہمارے معاشرے کی تصویر اس میں کھنچ کے رہ گئی ہے کہ تین آدمی اور تینوں ہی راہب کی بات سن کر من و عن تسلیم کر کے واپس لوٹتے رہے ہوتے ہیں کہ ایک کے دل میں آتا ہے اور وہ کچھ ہمت کر کے پوچھتا ہے، باقیوں کے دل اس بات میں

چپ اور دماغ گنگ ہیں کہ راہب کی گستاخی ہو جانے سے کہیں اعمال ہی نہ ضائع ہو جائیں یا پھر اس لیے چپ ہیں کہ ایک راہب بھلا کیسے غلط ہو سکتا ہے وہ تو گناہ کر ہی نہیں سکتا۔یعنی اندھی تقلید اور جہالت پر مبنی عقیدت۔

انتظار کے افسانے میں تو اس پر پوری بات ہوتی ہے جس سے لوگوں میں بیزاری کی لہر دوڑ جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے اور لاکھ بے ایمانی ہو جائے مگر دلدل کے دانے پانی میں ردوبدل کوئی نہیں کر سکتا، کوئی کتنا بھی گر جائے مگر اس قدر ذلیل حرکت نہیں کر سکتا کہ امام کی سواری نکالنے کے پیسے کھا جائے اور لنگر کا بجٹ اڑا جائے۔ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔مگر وہاں ایسا ہوا جس کی بعد میں شہادتیں بھی ملیں اور ہمارے معاشروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے مگر ہم جب تک یقین کرتے ہیں پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔

انتظار حسین اور خلیل جبران کے افسانوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جبران نے علامتی طور پر ایک راہب اور عالم کا ذکر کر کے ہر مذہب اور عقیدے کی بات کر کے اپنے افسانے کو عالمی بنا لیا ہے مگر انتظار نے مسلمانوں کے ایک مسلک صرف شیعیت پہ بات کی ہے جس سے افسانہ ایک مکمل دین اور مذہب کے بجائے ایک مسلک کا نمائندہ بن کے رہ گیا اور ساری مذہبی عقیدتیں اور شعار بھی شیعیت سے متعلق بیان کی ہیں۔

جبران کا افسانہ ''پسِ پردہ'' ایک عجیب منطق اور کہانی میں لکھا گیا افسانہ ہے کہ جس میں محبت کی فراوانی اور عشق کی بے بسی کے ساتھ مذہبی ہتھ کڑیاں اور مجبوریاں دکھانے کے ساتھ ساتھ خدا سے عقیدت پھر اس کے حضور شرمندگی اور شرمندگی سے گڑگڑانا اور رو رو کر معافی مانگنا سب شامل ہے۔اس افسانے مین جبران نے ایک نیک سیرت پادری کے عشق کی داستان رقم کی ہے کہ جو مذہبی اسٹیٹس کی وجہ سے لڑکی سے محبت کا اظہار نہیں کرتا مگر مر جانے کے بعد اسی لڑکی لی لاش کو خوب فرطِ محبت میں چومتا ہے اور پھر احساسِ شرمندگی سے خدا کے حضور ملتجی ہوتا ہے اور معافی مانگنے لگتا ہے۔اقتباس دیکھیے:

> ''۔۔۔۔۔سرگوشی کے انداز میں یہ الفاظ کہہ کر وہ لاش پر جھک گیا اور اس کی پیشانی، آنکھوں اور گردن کے بوسے لینے لگا۔۔۔۔۔طویل، گرم اور خاموش

بوسے۔۔۔۔وہ مقدس بوسے جو اس کی روح کے ان تمام اسرار کی پردہ کشائی کر رہے تھے، جن کا تعلق محبت اور غم سے تھا!

اچانک وہ پیچھے ہٹا اور خزاں زدہ پتہ کی مانند، زمین پر گر پڑا۔ گویا راحیل (لڑکی کا نام) کے برفانی چہرہ کے لمس نے جذبہ ندامت کو اس کے باطن میں بیدار کر دیا تھا۔

وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا کر دوزانوں بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں اس نے کہنا شروع کیا۔

"یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما! میں آخر وقت تک ثابت قدم نہ رہ سکا اور ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔۔۔۔۔یارب! میرا گناہ معاف کر دے!! میرے معبود! میری کمزوری کو نظر انداز فرما!""(۱۰۸)

اس افسانے میں گناہ و ثواب کے ایک مضحل تصور نے جنم لیا ہے کہ پادری نیک ہو کر گناہ کر لیتا ہے اور خدا سے دور ہو جاتا ہے اور جب گناہ گار ہو جاتا ہے تو خدا سے معافی مانگ کر خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ کسی بھی حالت میں انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے اور کسی بھی گناہ کے بعد خدا سے معافی طلب کی جا سکتی ہے۔ یہ اس افسانے کا مرکزی نکتہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ شرمندگی گناہ کرنے کے بعد ایک دفعہ ضرور انسان کو خدا کے حضور جھکنے پہ مجبور کرتی ہے۔ شرمندگی گناہ کا حاصل ہو اور آپ خدا کے حضور جھک جائی تو اس ثوب اور نیکی سے بھلی ہے کہ جس میں آپ نیکی کر کے غرور اور تکبر کی وجہ سے دوسروں سے دور ہو جائیں۔

انتظار حسین کے پاس تو گناہ کے احساس اور اس قسم کی زرمندگی اور ندامت پر آنسو بہانے کے لیے کئی ایک افسانے موجود ہیں کہ جن میں کردار گناہ کر کے خدا کے حضور معافی کے لیے حاضر ہوئے ہیں جن میں سے کچھ کرداروں کو معافی مل گئی اور کچھ ابھی تک بھٹک رہے ہیں۔ انتظار کا افسانہ "آخری آدمی" بھی گناہ کی

شرمندگی اور خدا کے حکم کے عدولی اور بندے کی گستاخی پر مشتمل ہے۔ جس میں ساری بستی کو ذلیل بندر بنادیا جاتا ہے اوران میں آخری آدمی الیاسف ابھی انسان کی جون میں باقی بچارہتا ہے کہ اسے اس بات کا ادراک ہو جاتا ہے کہ ہماری بستی کے لوگوں کو خدا کے بندے کی تذلیل اور گستاخی کے ضمن میں سزادی جارہی اور سب کی شکلیں بگاڑ دی گئی ہیں اور اگر مجھے اپنی اصل انسان کی جون میں باقی رہنا ہے تو مجھے معافی مانگنی ہو گی تو لہٰذا وہ اپنی قوم کے چند افراد لے کر اس کے حضور حاضری کو جاتا ہے مگر وہ جاچکا ہوتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”الیاسف نے کہ ان سب میں عقلمند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنارہا تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا آج وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔“[۱۰۹]

ایسا ہی گناہوں پہ شرمندگی کا احساس ”زرد کتا“ کے زرد کتے کو بھی ہوتا ہے کہ جس میں سارے ہی لوگ گناہ کی دلدل میں دھنس چکے ہیں اور اچھے برے کی تمیز چھوڑ کر نفس کے ہاتھوں غلام بن کر ہوس کے پجاری بنے بیٹھے ہیں۔ اس افسانے میں بھی مرکزی کردار کو گناہوں پہ شرمندگی ہے اور وہ دوسرے لوگوں کی طرح زرد کتا نہیں بننا چاہتا تو وہ بھی بہت بھاگتا ہے اور آخر کار خدا سے بخشش اور معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ مصنف کی زبانی سنیے:

> ”میرا دل اندوہ سے بھرا ہوا تھا اور میں نے دعا کی کہ الٰہا آرام دے، آرام دے، آرام دے۔ میں نے رات بھر دعا کی اور دریا کی طرف دیکھا کیا اور رات بھر غبار آلود تیز ہوا زرد رو پیڑوں کے درمیان چلا کی اور رات بھر درختوں سے پتے گرا کیے۔ میں نے دریا

سے نظر ہٹا کر اپنے گرد میں اٹے جسم کو دیکھا، اپنے ارد گرد زرد پتوں کی ڈھیریاں دیکھیں اور میں نے سوچا کہ یہ میری خواہشیں اور ارمان ہیں۔ خدا کی قسم میں آلائشوں سے پاک ہوا اور پت جھڑ کا برہنہ درخت بن گیا۔"(۱۱۰)

مندرجہ بالا اقتباسات جن افسانوں سے لیے گئے ہیں یہ انتظار کے نمائندہ افسانے ہیں جن کو پڑھ کر لگتا ہے کہ گناہوں کا احساس اور ان پر شرمندگی افسانہ نگار کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔

جبران کا افسانہ فنی طور پر انتظار کے دونوں افسانوں کا مقابلہ نہیں کرتا اور انتظار کے یہ افسانے بھرپور کہانی اور علامت پر مبنی ہیں۔ جبران کے افسانے میں یک پہلوئی بات کی گئی ہے اور کہانی بالکل سیدھے سادے اسلوب میں بیانیے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مگر انتظار کی دونوں کہانیوں میں اساطیر، علامت، قرآنی اور بائبل کے واقعات اور ان کے حوالے گھل مل گئے ہیں جس سے کہانی ایک سطح سے اٹھ کر کئی سطحوں تک پھیل گئی ہے اور زمانی قیود سے آزاد ہو کر شہرہ آفاق کہانیوں کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ جبران کی کہانی میں گناہ کی لذت اور عشق کا غلبہ بھی دکھایا گیا ہے اور انتظار کی کہانیوں میں بھی گناہ کرنے اور اس سے حظ اٹھانے کا ذکر ملتا ہے اور پھر اسی پر شرمندگی کا اظہار بھی نظر آتا ہے اس لحاظ سے دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں ایک جیسی کیفیت نظر آتی ہے۔ کہانیوں میں اگرچہ گناہوں کی کیفیات الگ الگ ہیں مگر لذت ایک ہی جیسی ہے اور ان کہانیوں میں شرمندگی کے احساس کے بعد معافی مانگنے کا طریقہ بھی ایک ہی جیسا ہے۔ جبران کا کردار کہتا ہے کہ میں کمزور ہوں اور میرے گناہ معاف فرما اے معبود مجھے معاف کر دے، معاف کر دے مجھے معاف کر دے اور انتظار کا کردار کہتا ہے کہ مجھے قرار نہیں اے میرے اللہ مجھے آرام دے دے، آرام دے دے، آرام دے دے۔

جبران کا افسانہ "مرشد کا فرمان" ایک دلچسپ افسانہ ہے کہ جس میں ایک مرید اپنے استاد اور مرشد کے مر جانے کی وجہ سے پریشان ہے اور استاد کے فرمودات اور تحریروں کو سینے سے لگائے زندگی کی قیمت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ جبران نے دنیا بھر کے لوگوں کا ذکر کیا اور مختلف

حکایات سے زندگی کے مختلف معاملات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں شہرت ہونے کے باوجود وہ مرید استاد کے فرمودات اور تعلیمات سے پیچھے نہ ہٹا اور زندگی کو سمجھنے کے لیے مرشد کی کتابوں کو لے کر روپوش ہو گیا اور وہ تب باہر آیا جب اس نے مرشد کی تعلیمات کو کافی حد تک سمجھ لیا۔ اقتباس دیکھیے:

> ”یہ کہہ کر اس کا شاگرد اپنی آرام گاہ میں چلا گیا اور کئی مہینوں تک لوگوں سے الگ تھلگ وہیں پڑا رہا۔ وہ تنہائی میں اپنے استاد مکرم کی کتابوں اور تحریروں کا بنظر عمق مطالعہ کرتا رہا۔ ہر وقت غور و فکر میں مستغرق رہتا اور اپنے مرشد کے خیالات کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔“(۱۱۱)

انتظار حسین کا افسانہ ”زرد کتا“ میں بھی مرشد اور مرید کے درمیان گفتگو کو دکھایا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ ایک مرید کس طرح اپنے مرشد کے فرمودات اور تعلیمات پہ عمل کر کے گناہ سے بچا جا سکتا ہے۔ انتظار کا کردار افسانے میں راوی بھی ہے اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جس جس نے مرشد کا فرمان نہیں مانا وہ نہ صرف ذلیل ہوا ہے بل کہ زرد کتا بھی بن جاتا ہے اور اپنے نفسِ امارہ کے ہاتھوں لالچ میں آ کر بک جاتا ہے اور غلط کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دنیا داری اور دنیا داروں سے گھبرا کر مرید اپنے مرشد کے فرمودات اور فرامین لے کر شہر سے دور چلا گیا تاکہ ان فرمودات پہ عمل کر کے گناہ سے بچ سکوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بچا سکوں۔ اقتباس دیکھیے:

> ”میں نے اپنے حجرے پر آخری نظر ڈالی اور منطق اور فقہ کی نادر کتب کو، جو برسوں کی ریاضت سے جمع کی تھیں، وہیں چھوڑ، ملفوظات شیخ بغل میں دبا، شہر سے نکل گیا۔ شہر سے نکلتے نکلتے زمین نے میرے پیر پکڑے۔ مجھے شیخ کی خوشبو مجلسیں بے طرح یاد آئیں۔“(۱۱۲)

اس افسانے میں بھی انتظار حسین نے گناہوں سے بچنے کے لیے اپنے مرشد کی تعلیمات کو اہم قرار دیا ہے۔ جبران اور انتظار دونوں افسانہ نگاروں نے گناہ سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کا اگر

استاد، مرشد اور شیخ نیک تعلیمات اور ملفوظات رکھتا ہو تو اس کے شاگرد اور مرید ضرور گناہوں سے بچے رہتے ہیں اور نیک کام بھی کرتے ہیں۔ تصوف میں ایسے ہی صوفیوں، پیروں اور مریدوں کے باہمی تعلق کا سلسلے ہوتے ہیں کہ جو اپنے اپنے مریدوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرتے ہیں اور گناہوں سے دور رہنے کی ہر ممکن نصیحت اور وصیت کرتے ہیں۔

جبران اور انتظار کے افسانوں کی کہانیاں بالکل ایک جیسی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جبران نے مرشد کے فرمودات اور ملفوظات کی عظمت کا ذکر جس طرح کیا ہے انتظار حسین بھی انھیں سے متاثر نظر آتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ انتظار کے پاس صوفیا، اولیا اور جاتک کہانیوں کے ساتھ ساتھ اساطیر کا ایک خاص اسلوب موجود ہے مگر یہ ایک اتفاقیہ امر ہے کہ گناہ و ثواب میں استاد اور مرشد کا تصور دونوں کے ہاں ایک جیسا ہے۔ کہانی میں بس اتنا فرق ہے کہ انتظار حسین کا مرید بستی سے باہر چلا جاتا ہے اور جبران کا مرید اپنے آپ کو بستی کے ایک گھر میں قید کر لیتا ہے دونوں ہی تخلیے میں مرشد کے فرامین پہ غور کرتے ہیں، غور کرتے ہیں کہ گناہوں سے کس طرح بچنا ہے اور ثواب کے راستے پہ کیسے چلنا ہے تاکہ انسانیت کے لیے راہیں مزید آسان کی جاسکیں۔

ii. شخصی اوصاف

کسی بھی شخص میں شخصی اوصاف کا ہونا نہ صرف آدمی کی بہتر شناخت کا ضامن ہوتا ہے بل کہ اس کے معاشرے میں بھی ایک نیک شگون ہوتا ہے اور معاشرے اپنے نیک لوگوں سے ہی آگے بڑھتے ہیں کہ جن میں معاشرے کو سیدھی راہ پہ لے کر چلنے کی سکت موجود ہوتی ہے۔ انسان کا کردار پہلی چیز ہے کہ جس میں کوئی دوسرا شخص اس پہ اعتبار کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی اور معاملات میں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔ انسان اپنے اور دوسروں کے لیے بہتر سے بہتر زندگی کا ماحول بنا سکتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے بھی دیکھیں تو دنیا اور آخرت دونوں بہتر ہو سکتے ہیں اور اگر اخلاقی سطح پر بھی دیکھیں تو انسان اشرف المخلوقات ہے تو اس کے جینے کے طریقے بھی باقی مخلوقات سے اشرف اور افضل ہونے چاہییں۔

جبران کے ہاں شخصی اوصاف پر بہترین کہانیاں مل جاتی ہیں کہ جن میں وہ لوگوں کع دنیا کی بے ثباتی اور پھر دنیا میں رہ کر اپنے کردار کو بہتر کر آخرت کے لیے کچھ کر گزرنے کی تلقین بھی بہم کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جبران نے انسان کے بنیادی حق یعنی حقِ آزادی پہ بھی افسانے لکھے ہیں کہ کسی بھی انسان کا کردار اس کے احساسِ آزادی کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ ایک آزاد آدمی کی زندگی اور سوچنے کا انداز دوسرے اس آدمی سے بالکل مختلف ہو گا کہ جو آزاد نہیں بل کہ غلام ہے اور ناداری کی زندگی اپنے ہی جیسے انسانوں میں گزار رہا ہے۔

جبران کا افسانہ ''آزادی'' ایسے خیالات سے بھرا پڑا ہے کہ جس میں آزاد اور غلام قوم کی نفسیات پہ بات کی گئی ہے اور اس کے ساتھ افسانے میں اس قوم کو بھی بدتر کہا ہے کہ جو کسی دوسری قوم کو اپنا گلام بنا لیتی ہے کہ یہ بھی انسانی اوصاف میں گرا ہوا مقام ہے کہ آپ کسی دوسرے سے اس کی زندگی کا سب سے بنیادی حق چھین لیں۔ افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> ''کیا محکوم قوموں کے پہلو میں دل نہیں ہوتے یا دلوں میں آرزوئے آزادی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔جب تم میں جذبہ احساس ہی نہ رہا، جب اوروں کو محکوم بنا کر خود کو حاکم کہلانے میں تمھیں مسرت محسوس ہو اپنی خواہشات کے لیے مظلوموں کی تمناؤں کو خون آلودہ کر دینے میں باک نہ ہو۔۔۔۔۔۔تو تم غلاموں سے کہیں بدتر ہو اور محکوم قوموں سے کہیں گئے گزرے تم آزادی کے قطعی غیر مستحق ہو۔''(۱۱۳)

انسانوں کی نفسیات بیان کرنے کے ساتھ جبران نے ان لوگوں پہ بھی بات کی ہے کہ جو کسی کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں اور انسانی اوصاف کو پامال کر دیتے ہیں۔ بل کہ یہ بھی افسانے میں ہمیں ملتا ہے کہ ایسے لوگوں کو غلام بنا لینا چاہیے کہ جو دوسروں کو غلام بنا لیتے ہیں اور ان کے احساسِ زندگی کو مجروح کر دیتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک شخص کے شخصی اوصاف سے شروع ہوتا ہے مگر اس میں ایک قوم کے اوصاف کا ذکر آ گیا ہے جو جبران کے لکھنے کی صلاحیت پر دال ہے اور کہانی کاری کی عظمت کی دلیل بھی۔

انتظار حسین کے ہاں تو ایسے افسانے کثرت سے ملتے ہیں کہ جن میں انسان کے ہجرت کر جانے کی وجہ سے اپنے دیس سے نئی زمین میں چلے جانے کی وجہ سے ہونے والی ذہنی قید کی ترجمانی ملتی ہے۔انسان کی ظاہری جسمانی کیفیت اگر غلام نہ بھی ہو تو جب انسان اپنے ذہن اور ضمیر کو غلام پاتا ہے تو یقیناً اس کے اندر بھی احساسِ کمتری اور غلامی جیسی کیفیات جنم لے لیتی ہیں۔

انتظار کا افسانہ ''ایک بن لکھی رزمیہ'' اس کا بہترین نمونہ ہے کہ جب آدمی ذہنی طور پر ہیجان اور انتشار کا شکار ہو جائے اور اس کا ذہن اور ضمیر بھی کہیں خود کو بے بس غلام تصور کرنے لگتے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار پچھوا ہے کہ جس نے پاک ہند کی تقسیم میں پاکستان کی حمایت اس لیے کہ تھی کہ وہ بھی مسلمان ہے اور اس کا علاقہ مسلمانوں کا علاقہ ہے اور یہ بھی پاکستان میں ہی آئے گا مگر تقسیم کے بعد اس کا علاقہ قادر پور پاکستان میں نہیں تھا جس پر وہ اپنی ذہنی کیفیت کہیں دور چھوڑ آیا اور اس کا دل جیسے بجھ گیا ہو۔بہ امر مجبور وہ پاکستان ہجرت تو کر گیا مگر ذہن سے ہجرت کی اضطرابی اور لاچاری نہ گئی اور وہ پاکستان میں بھی خود کو بے بس اور گلام تصور کرنے لگا کہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے کچھ کھانے کو مانگ سکتا تھا اور نہ ہی رہنے کے لیے اس کے پاس کوئی چھت تھی یونہی لگ رہا تھا کہ ساری ہجرت کا خمیازہ اکیلا پچھوا ہی بھگت رہا ہے۔اقتباس دیکھیے:

> ''پچھوا کو شکایت ہے کہ نعیم میاں پاکستان میں آکر اترانے لگے ہیں۔اس میں شکایت کی کیا بات ہے۔وہ ٹھہرے شہ کے مصاحب۔وہ نہ اترائیں گے تو کون اترائے گا، ظاہر ہے کہ ایسی کڑوی بات پچھوا قادر پور میں نہیں سن سکتا تھا اور قادر پور میں نعیم میاں کی یہ مجال ہو بھی کیسے سکتی تھی کہ پچھوا کو ٹیڑی نظر سے دیکھتے۔وہاں تو اس کے سامنے ان کی سٹی گم رہتی تھی۔لیکن اپنے گھر پہ چیونٹی بھی شیر ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ پاکستان نعیم میاں کا گھر ہے پچھوا کا گھر نہیں ہے۔''(۱۱۴)

ظاہر ہے کہ پچھوا پاکستان آکر ذہنی طور پر بھی ابھی ہندوستان میں ہی تھا اور اسی وجہ سے اسے ایک قسم کی غلامی کا احساس ابھی تک دامن گیر تھا کہ میں قادر پور میں ہوں اور جیسے چاہوں کر سکتا ہوں اور ایسی بے درد کیفیت اس کی غلام کیفیت نے کی تھی نہیں تو وہ بھی کسی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا یا کسی صاحب کا مصاحب ہو بیٹھتا، مگر وہ تو یہ کہنے پہ مصر ہوا جاتا تھا کہ نعیم میاں جو کہ بھیگی بلی بنے قادر پور میں ان کے سامنے سر نہیں اٹھاتے تھے اب یہاں مجھے عزت دے، نوکری دلوائے اور گھر بھی الاٹ کروا کر دے۔ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا تھا۔

جبران کے افسانے اور انتظار کے افسانے دونوں میں آزادی اور غلامی کی کیفیات کو بیان کیا گیا مگر جبران نے ذہنی سے زیادہ جسمانی غلامی کے اثرات پہ بات کی ہے اور ظاہر ہے کہ جسمانی غلامی سے ہی ذہنی غلامی کی ابتدا ہوتی ہے مگر انتظار کے ہاں صرف ذہنی کیفیت میں غلامی کے احوال اور آثار کے ساتھ اس کے اثرات کا ذکر ملتا ہے۔ انتظار کے افسانے کی کئی ایک جہتیں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں ہجرت کا کرب بھی مل سکتا ہے کہ ہجرت نے مہاجروں کے کیا حالات کر دیے تھے۔ اس لحاظ سے انتظار کا افسانہ جبران کے افسانے سے کہیں بڑھ کر تہہ دار اور پہلو دار ہے۔ اسلوب جبران کا سادہ مگر شعریت سے بھرپور ہے مگر انتظار جیسی تہہ داری نصیب میں نہیں ہوئی۔

ہمارے ارد گرد ہر وقت بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی سی ذہنیت اور اپنے خیالات کے مطابق ساری دنیا کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کا ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ساری دنیا سے خود کو افضل اور بہتر سمجھتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ دوسروں پر نصیحت کے انبار لگا دیتے ہیں اور اپنی نصیحت اور وعظ سے لوگوں کا جینا حرام کر دیتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ ان کی نصیحتوں اور دانائی نے سارے معاشرے کو دوزخ بنا دیا ہے۔

جبران کا افسانہ "چودھویں کا چاند" اس بارے میں ایک اعلیٰ افسانہ ہے کہ جس میں چند کتوں کو علامتی طور پر استعمال کر کے کہانی کو استعاراتی پیرائے میں خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے چند کتے رات بھر چاند پہ بھونکتے ہیں مگر چپ کروانے والا کتا صبح تک اپنی مشق جاری رکھتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ شہر کے تمام کتوں نے چاند پر بھونکنا شروع کر دیا۔

صرف ایک کتا خاموش رہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دوسروں سے کہا۔

"سکوت کو اس نیند سے نہ جگاؤ اور چاند کو اپنی للکار سے زمین پر نہ بلاؤ۔"

دوسرے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ ہولناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کتا جس نے دوسروں کو چپ رہنے کو کہا تھا۔ ساری رات خاموشی کی تلقین میں بھونکتا رہا!"(۱۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے کئی ایک کردار اور معاشی شخصی نمونے ہمیں روز دیکھنے کو مل جاتے ہیں کہ جو دوسروں پر تو بات کرتے رہتے ہیں اور خود اپنے آپ کو ان نصیحتوں اور نیک کاموں کے لیے تیار نہیں کرتے۔ اس افسانے میں چاند نیک لوگوں یا اعلیٰ صفات اور ہنرور لوگوں کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے کہ کم ظرف لوگ دن رات اس کی برائیاں بیان کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اس کے حسن میں غیبت جیسی بدکاری سے دوچار ہوتے ہیں مگر افسوس کہ چاند کو کوئی فرق نہیں پڑتا وہ تو آسمان کی گود میں ستاروں کے ساتھ اپنی پرواز میں رہتا ہے۔

انتظار کا افسانہ "کچھوے" اس لحاظ سے اہم افسانہ ہے کہ جس میں مختلف جاتک کہانیوں کو جوڑ کر ایک کہانی بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور کہانی ایک حکائی اسلوب میں بیان ہوئی ہے کہ جانوروں اور پرندوں کی دلکش جاتکیں اس میں سننے کو ملتی ہیں انھیں میں ایک جاتک کہانی کچھوے پر ہے کہ جس کو زیادہ بولنے کی وجہ سے سزا ملی اور آسمان سے زمین پر آگرا۔ کچھ مرغابیوں کی کچھوے سے دوستی تھی اور جس ندی کے پاس وہ رہتے تھے وہ خشک ہو گئی تو مرغابیوں نے اپنے دوست کو اکیلا چھوڑنے کے بجائے ساتھ لے جانے کی کوشش کی اور وہ اسے لے کر اڑ پڑیں مگر وہ منھ کھولنے کی وجہ سے زمین پر آ رہا۔ اقتباس دیکھیے:

”کچھوے نے چپ رہنے کا وچن دیا۔ مرغابیوں نے ایک ڈنڈی لا کے کچھوے کے آگے رکھی اور کہا کہ بیچ میں سے اپنے دانتوں سے پکڑ اور دیکھ! بولنا مت، پھر ایک مرغابی نے اپنی چونچ سے ڈنڈی کا ایک سرا اور دوسری نے اپنی چونچ سے دوسرا پکڑا اور اڑ لیے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک نگر سے گزرے تو بالکوں نے تماشا دیکھا اور شور مچایا کچھوے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ میرے متروں نے مجھے سہارا دیا ہے تم کیوں جل مرے؟ مگر اس نے یہ کہنے کے لیے جیبھ کھولی ہی کی تھی کہ ٹپ سے زمین پر گرا پڑا۔“(۱۱۶)

اس اقتباس سے سمجھ آتی ہے کہ زیادہ بولنا یا بے وقت بولنا انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے بعض اوقات بڑی مصلحت سے کام لینا پڑتا ہے اور بہت سی جگہوں پر بولنے سے پرہیز کرنی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو انسان خود تو ذلیل ورسوا ہوتا ہی ہے مگر اپنے اعزا اقربا کو بھی ذلیل کروا دیتا ہے اور جس محفل میں آپ بیٹھتے ہیں اس میں بھی رسوا ہوتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک بات اور سمجھ آتی ہے کہ بعض اوقات لوگ آپ پہ ہنستے ہیں یا طنز کرتے ہیں مگر آپ کو انھیں درگزر کر کے گزرنا پرتا ہے اگر آپ ایسا نہیں کرتے اور راستے میں بھونکنے والے ہر کتے کو اینٹ مارتے ہیں تو منزل تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔

جبران اور انتظار حسین دونوں کے افسانے علامتی اور استعاراتی انداز میں لکھے گئے ہیں کہ دونوں نے ایک خاص حکائی اور جاتکی اسلوب میں کہانی کو آگے بڑھایا اور بیان کیا ہے۔ جبران نے تو اپنی کہانی میں صرف زیادہ بولنے والوں اور بے وجہ بولنے والوں کو نشانہ بنایا ہے مگر انتظار کے افسانے میں ایسی اور بھی جاتک کہانیاں مل جاتی ہیں کہ جن سے دوسری بھی کئی ایک مفید باتیں سمجھنے اور پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔

ہماری روزمرہ زندگی اور آج کل کی انسانی فکر پر یہ افسانے بالکل منطبق ہوتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ آج کے معاشرے میں ہر شخص کے شخصی اوصاف ان کتوں جیسے یا پھر اس کچھوے جیسے ہو گئے ہیں۔

جبران نے اپنے ایک اور افسانے مین انسان کی اصل قدر اور اہمیت کی وجہ علم وحکمت اور دانائی کو قرار دیا ہے کہ اگر انسان غریب ہے، امیر ہے، اچھا ہے یا برا ہے، جیسا بھی ہے اس سے گزارا ہو سکتا ہے مگر اگر انسان میں دانائی اور عقل کی کمی ہے تو جبران کے نزدیک اسے ایک مہذب معاشرے میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انسان کی اصل قدر اس کے روپے پیسے یا ذات پات سے نہیں ہوتی بل کہ اس کی اصل قدر کی موجب اس کی دانش مندی ہے۔ اپنے افسانے "دانشمندی" میں جبران لکھتا ہے:

> "بلاشبہ دانا اور دانشمند آدمی وہی ہے جو تعظیم وانکساری کے ساتھ خدا کے سامنے جھک جاتا ہے۔ انسان کی اصل وقعت اس کے رنگ نسل و قومیت میں نہیں بلکہ اس کے اچھے کارناموں اور علم و فضل میں ہے۔ اے میرے دوست! اس کو ہمیشہ یاد رکھو کہ قوم وملت کی نظر میں اس گڈریے کے لڑکے کی قدرومنزلت جو صاحبِ علم وفضل ہے، تخت وتاج کے اس وارث سے کہیں زیادہ ہے جو بے علم وحکمت ہے۔ تمہارا باپ کسی قوم نسل سے تعلق رکھتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری خاندانی شرافت وبرتری کی نشانی صرف تمہارا علم ہے۔"(۱۱۷)

افسانہ نگار کے نزدیک کسی بھی انسان کے شخصی اوصاف میں سب سے قیمتی شے اس کا کی دانشمندی دانائی اور فہم کا ہونا ہے۔ اگر انسان کے پاس زمدگی کی ساری سہولتیں اور نعمتیں ہیں مگر اس کے پاس دانائی کی دولت نہیں تو وہ کسی ایسے جانور سے کم نہیں کہ جس کا مالک اسے ساری نعمتوں سے نواز کر رکھتا ہے اور اس کے کھانے پینے کے علاوہ اس کی اچھی رہائش کا بھی بندوبست کرتا ہے کیوں کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق تو علم وحکمت ہی کا ہے۔

انتظار حسین نے اپنے شہرہ آفاق افسانے "زرد کتا" میں علم اور عالم کی قدر اور اس کی بڑائی کا ذکر کیا ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جبران کی طرح انتظار بھی کسی بھی انسان کے اصل شخصی اوصاف میں علم وحکمت اور دانائی کے ہی قائل تھے۔ زرد کتا افسانے میں صوفیا کے ملفوظات سے افسانہ نگار نے اپنے خیالات کو

بیان کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک واقعہ عالم کے بارے ہے کہ جو اپنے شہر سے ہجرت کرتے ہوئے لوگوں کو کہتا ہے کہ یہاں ایک عالم اور دانش مند شخص آنے والا ہے کہ اس کی مدد کرنا اور اسے اپنے سروں پہ بٹھانا مگر جب وہ شہر والے اس شخص کے استقبال کو بندرگاہ پہنچے تو وہاں ایک موچی نے چالاکی سے ان کو اپنا سامان تھمایا ہوا تھا اس لیے وہ لوگ اس نیک شخص کو نہ پہچان سکے اور اس موچی کو نیک، دانش مند اور عالم سمجھ کر لے آئے اور عزت و تکریم کرنے لگے اس کے بعد کیا ہوا سنیئے:

"وہ بزرگ جب سفر سے واپس آئے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص جس کے چہرے پر علم و دانش کا نور عیاں ہے، جوتیاں گانٹھ رہا ہے۔ آگے گئے تو دیکھا کہ اکابرین و عمائدین کی ایک مجلس آراستہ ہے اور ایک بے بصیرت موچی مسائل بیان کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بزرگ سر سے پاؤں تک کانپ گئے اور بولے:

اے شہر تیرا برا ہو کہ تو نے عالموں کو موچی اور موچیوں کو عالم بنا دیا۔ پھر خود کفش سازی کا سامان خریدا اور اس عالم کے قریب ایک کوچے میں جوتیاں گانٹھنے بیٹھ گئے۔

یہ حکایت میں نے سنی اور سوال کیا، یا شیخ عالم کی پہچان کیا ہے؟

فرمایا: اس میں طمع نہ ہو۔

عرض کیا: طمع دنیا کب پیدا ہوتی ہے؟

فرمایا: جب علم گھٹ جائے۔

عرض کیا: علم کب گھٹتا ہے؟

فرمایا: جب درویش سوال کرے، شاعر غرض رکھے، دیوانہ ہوش مند ہو جائے۔ عالم تاجر بن جائے، دانشمند منافع کمائے۔"(۱۱۸)

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد افسانہ نگار کے ہاں ایک عالم، درویش، شاعر اور دانش مند کے علم کی قدر کا اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی انتظار کے ہاں بھی اصل شخصی اوصاف علم و حکمت کا ہونا ہی ہے باقی ہر چیز ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک اور جگہ پر انتظار دانش مندوں کے بارے میں بات کرتے ہیں:

"جہاں پناہ جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا: امان ملی۔ تب اس نے عرض کیا۔ خداوندِ نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں رہتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔"(۱۱۹)

مندرجہ بالا اقتباس ایک بادشاہ کی حکایت سے لیا گیا ہے جو اسی افسانے میں بیان ہوئی ہے کہ جس میں ایک بادشاہ کے دربار میں روزانہ اہلِ دانش حاضر ہو کر انعام پاتے تھے اور چلے جاتے تھے جس پر وزیرِ باتدبیر نے اس حکایت سے بادشاہ کو سمجھایا کہ تیری سلطنت میں اب کوئی دانشمند نہیں رہا۔ جس کی وجہ وزیر نے یہ بتائی کہ جہاں سب ہی اپنے آپ کو دانشمند ظاہر کرنا شروع کر دیں وہاں کوئی بھی دانش مند نہیں رہتا۔

جبران اور انتظار حسین کے ہاں شخصی اوصاف میں دانش مندی کا مظاہرہ اور اہلیت سب سے اہم اور قابل شے مانی جاتی ہے مگر دونوں کے طریقہ بیان میں اپنا اپنا رنگ ہے کہ انتظار حسین علامت اور حکایت میں بات بیان کرتے ہیں تاکہ سمجھنے والا ہی سمجھے اور جسے سمجھ نہ آئے اس کے لیے بہتر ہے کہ اسے ضرورت بھی نہیں۔ مگر جبران اپنے اسی منطقی اور سادے اسلوب میں بیانیے انداز میں بات بیان کر کے، بتا کے آگے نکل

جاتے ہیں سادگی کے لحاظ سے جبران انتظار سے آگے اور اسلوب میں تہہ داری ہونے میں اور ایک ہی بات کے کئی مفہوم نکالنے اور سمجھانے میں انتظار جبران کے مقابلے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

خلیل جبران نے انسان کے شخصی اوصاف پہ ایک اور دل چسپ افسانہ لکھا ہے کہ جس میں دو طرح کے اوصاف کو بیان کر کے اس کے فوائد اور نقصانات گنوائے ہیں جن میں ایک انتہا پسند افراد اور دوسرے اعتدال پسند افراد۔ مگر دونوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف انتہا پسند لوگوں کو پسند کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے کیوں کی اافسانہ نگار کا یہ ماننا ہے کہ انتہا پسند کا کوئی نہ کوئی موقف تو ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی بات کی تردید یا تائید تو کھل کر کرتا ہے مگر اعتدال پسند زندگی میں فیصلہ لے کر بھی کم زوری کا اظہار کرتا ہے اور اپنی بات پر خود ہی قائم نہیں رہ پاتا۔ جبران نے اس افسانے کا نام بھی "میں کس سے محبت کرتا ہوں" رکھا ہے کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی سوچ کو بیان کیا ہے:

"میں انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو زندگی کے سمندر کی گہرائیوں میں اترتے اور زندگی کی بلندیوں پر چڑھنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو کلیتاً اشیاء کی یکتائی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اور دو متضاد چیزوں کے درمیان کبھی سرگشتہ وفکر مند کھڑے نہیں ہوتے۔

میں ان دلیر انتہا پسندوں سے محبت کرتا ہوں جو اپنے شوق وآرزو کی آگ میں جلتے ہیں، اپنے دلوں کے وجدان سے سے بے چین ہیں۔ اپنے جذبات کی اطاعت کرتے ہیں، اصولوں کے میدانِ کارزار سے ہٹ کر "اصل اصول" کو اپنا مرکز قرار دیتے ہیں۔"(۱۲۰)

اب اعتدال پسندوں کے بارے میں مصنف کا موقف دیکھیے:

”میں اعتدال پسندوں کو جانتا ہوں، میں نے ان کے ارادوں کو تولا ہے ان کی کوششوں کو جانچا ہے اور انھیں بزدل پایا ہے جو بادشاہ کی شکل میں ”حق“ سے اور شیطان کی صورت میں ”باطل“ سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے عقائد و قواعد کے ان درمیانی حلقوں میں پناہ لے لی ہے جو نہ مفید ہیں نہ مضر، اور ان آسان راہوں پہ چلنے لگے ہیں جو انھیں سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہیں۔۔۔ان سنسان جنگلوں میں جو ہدایتوں اور گمراہیوں سے خالی ہیں۔ جہاں کامیابیوں اور ناکامیوں اور ناکامیابیوں کا کال۔“[۱۲۱]

افسانہ نگار جبران کا کہنا ہے کہ وہ انتہا پسند لوگوں سے محبت کرتا ہے کہ اس کا ماننا ہے کہ انتہا پسند لوگ کسی نہ کسی ایک موقف پہ ڈٹے اور اڑے ہوئے لوگ ہوتے ہیں جن میں فیصلہ اور حوصلے کی جرات ہوتی ہے مگر یہ اعتدال پسند لوگ ہمیشہ دوئی میں پھنسے رہتے ہیں اور کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔ بنیادی طور پر جبران یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر شخص اپنے اوصاف میں ایسے گن پیدا کرے کہ جو ایک دفعہ فیصلہ لے لیا پھر اس پر ڈٹ جائے۔ زندگی کو سنجیدگی سے لے اور ہر کام پوری توجہ، ضد اور انا کے ساتھ انجام دے۔ جب کہ اعتدال پسند آدمی مصلحت جُو تو ہو سکتا ہے، موقع پرست تو ہو سکتا ہے مگر کبھی بھی ایک فیصلے پہ کھڑا مردِ کردار نہیں ہو سکتا۔ ایسے آدمی سے کسی بھی کام کی توقع کرنا عبث ہے۔

انتظار حسین کے ہاں ان اوصاف پہ کھل کر بات نہیں ملتی مگر جبران کے تیار کیے ہوئے نقشے پہ ایک کہانی ”مجیدا“ نام سے ملتی ہے۔ جس کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ کہانی کی تمام ترجہات اور ڈائمینشن کا ذکر تو جبران نے کیا تھا مگر اس کو ایک کردار کی صورت بیان انتظار نے کر دیا ہے۔

انتظار نے ایک کردار ”مجیدا“ تخلیق کیا ہے کہ جو اپنے کردار میں بڑا ہمدرد اور نرم خو ہے اور اپنے محلے کے سبھی لوگوں کے سبھی کاموں میں امداد کرتا ہے اس کی بھی مدد کرتا ہے جو تعریف کرے اور اس کی

بھی جو اس کے کاموں سے نقص نکالے۔ اسی طرح مجیدے کی اپنے علاقے کے جج سے نہیں بنتی بل کہ اس کے برتاؤ اور سلوک کی وجہ سے مجیدا اس سے نفرت کرتا ہے۔ دیکھیے:

"جج صاحب سے مجیدا کو اللہ مارے کا بیر ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے ہاں اسے اس قسم کے فخر حاصل کرنے کا موقعہ کبھی میسر نہ آیا۔ اس نے حسبِ عادت مختلف موقعوں میں ٹانگ اڑانے کی کوشش ضرور کی۔ مگر جج صاحب کے نوکروں کے سامنے بھلا کس کی دال گلتی تھی۔۔۔۔۔۔ شبراتی کبابی کے چبوترے پر بیٹھ کر اس نے اعلانیہ کہا کہ "یار یو جج صاحب اللہ پاک کی قسم بہت سفلہ ہے۔"(۱۲۲)

ایک تو مجیدا کا یہ رویہ ہے کہ جج صاحب کی برائیاں کرتا ہے اسے دوستوں میں بیٹھ کر سفلہ یعنی گرا ہوا شخص کہتا ہے تو دوسری طرف اس کا برتاؤ دیکھیے:

"یوں مجیدا جج صاحب کے نام سے گھٹتا تھا۔ مفر جب ان کا آدمی اسے بار بار بلانے آیا تو کم بخت مروت کی آنکھ، اسے منع نہ کر سکا۔"(۱۲۳)

وہی ہوا کہ جس کا ڈر ایسے آدمیوں کی زندگی میں لگا رہتا ہے کہ ان کو ہر جاہ بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جب جج صاحب کے بلانے پر مجیدا ان کے ہاں جاتا ہے تو وہاں اس کی اچھی خاصی ہو جاتی ہے تو واپسی پر پھر اپنے دوست شبراتی کی دکان پہ آ کے کیا کہتا ہے:

"مجیدا بڑی فتح مندی کے احساس کے ساتھ جج صاحب کے یہاں پہنچا تھا۔ لیکن جب لوٹا تو اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ واپسی میں وہ پھر شبراتی کی دکان پر رکا اور چبوترے پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یار یو جج بڑا فرعون بے سامان بنا پھرے ہے۔ قسم اللہ پاک کی اب تو میں دس (اس) کی ڈونٹری پر قدم نہیں رکھوں گا۔"(۱۲۴)

اس اقتباس کو پڑھ کر اپنی رائے مستقلنہ رکھنے والا کا اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں ان کی کتنی عزت ور توقیر کی جاتی ہے یعنی جبر ان نے جو خاکہ ترتیب دیا اس کو کہانی کا جامعہ انتظار حسین نے پہنایا۔

دونوں افسانہ نگاروں کی کہانی میں یہی فرق ہے جو کہ ایک نقشے اور پھر اس کی عمارت میں ہوتا ہے یعنی جبران نے نقشہ بنایا اور جبران نے اس پر عمارت کھڑی کر دی۔ جبران کے ہاں دونوں تخیلات پہ بات ملتی ہے کہ اس نے انتہا پسندوں کے بارے میں بھی بات کی ہے اور ان کی خوبیاں بیان کی ہیں مگر انتظار حسین نے صرف اعتدال پسند اور عاجز لوگوں کو معاشرے میں آنے والے مصائب کا ذکر کیا ہے جس سے کہانی ایک سطح کو بیان کر سکی اور انتظار کا افسانہ جبران کے افسانے میں تفہیم کے لحاظ سے پیچھے رہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر کسی کردار یا کردار کے ایک آدھ جملے کو شامل اس طرح کیا جاتا کہ انتہا پسند اور چابت قدم لوگ ہی کامیابیاں سمیٹتے ہیں تو انتظار کا افسانہ جبران کے افسانے کے مقابلے کا افسانہ بن سکتا تھا۔

شخصی اوصاف کے مذہبی اور معاشرت تصور کے لحاظ سے خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زمانی اور زمینی اختلاف ہونے کے باوجود دونوں کی سوچیں ایک ہی جیسی تھیں۔

iii. جزا و سزا کا تصور

دنیا کے ہر معاشرے میں گناہ و ثواب کا تصور کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود ہے جو مذہبی، قانونی اور اخلاقی سطحوں پہ ہمیں نظر بھی آتا ہے اور اگر گناہ و ثواب کا تصور موجود ہے تو بلا شبہ جزا و سزا کا تصور بھی معاشروں کی ایک بنیادی اکائی ہو گی جس کے تحت ہی گناہ و ثواب کا ہونا معنی رکھتا ہے۔ جب کسی معاشرے سے جزا و سزا کا تصور ختم ہو جاتا ہے تو وہ معاشرہ اپنی تباہی کی طرف بڑھنے لگتا ہے یا امیر اور غریب دونوں کے لیے قانون الگ الگ ہو تو بھی معاشرہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ معاشرے کے اندر پنپنے والی بہت سی خباثتیں تصورِ جزا و سزا سے خود بخود ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں گناہ وثواب اور جزاو سزا کے خیالات اور تصورات پر مبنی افسانے ملتے ہیں۔ جیسے ہم نے گناہ وثواب پر مختلف اسلوب اور تکنیک میں افسانے دیکھے ہیں اب جزاو سزا کے موضوع پر دونوں افسانہ نگاروں کے افسانے دیکھتے ہیں۔

جبران کا افسانہ "اے ملامت کار!" میں سزا و جزا کی باتیں کرنے اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والوں کی بابت بات کی گئی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو ہمیں چھوٹی موٹی برائیاں پر اس قدر سرزنش کرتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہے اور اب اس گناہ کی سزا ہی سزا ہے اس کا کوئی اور حل یا ٹھکانا نہیں رہا۔ ایسے لوگ ہمیں نہ صرف گناہوں سے ڈراتے ہیں بل کہ زندگی کی امید بھی ختم کر دیتے ہیں۔ ایسے معاملے میں افسانہ نگار ملامت کار سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "اے ملامت کار مجھے تنہا چھوڑ دے!
>
> مجھ سے اور میرے خوابوں سے کوئی واسطہ نہ رکھ اور کل تک کے لیے صبر کر! کل جو چاہے گا، میرے متعلق فیصلہ کرے گا۔
>
> ٹُونے نصیحتوں سے اپنا خلوص ظاہر کیا، لیکن نصیحت ایک سایہ ہے جو روح کو حیرت کے سبزہ زار میں لے جاتا ہے، اس مقام کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے، جہاں زندگی مٹی کی طرح جامد ہے۔
>
> ممنوعات کا ذکر چھوڑ! کہ میرے ضمیر کی عدالت مجھ پر منصفانہ احکام صادر کرتی ہے۔ اگر میں بے گناہ ہوں گا، تو وہ مجھے سزا سے بچائے گی اور اگر مجرم ہوں گا، تو ثواب سے محروم کر دے گی۔"[۱۲۵]

جبران کے افسانے کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جزاوسزا کے معیار میں افسانہ نگار ملامت کاروں اور ناصحوں سے بہت نالاں ہے کہ جو ہر وقت کسی بھی انسان کو اضطراب کی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور انھیں گناہ گار گناہ گار کہہ کہہ کر ہمیشہ زچ کرتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگار ایسے نیک لوگوں سے بہت اکتایا ہوا ہے بل کہ وہ تو کہتا ہے کہ ای ناصح، اے واعظ، اے ملامت کار! تو اپنی راہ لے اور یوں مجھے تنگ اور مضطرب نہ کر کیوں کہ میرے ضمیر کی عدالت میں مجھ پر احکامات اترتے ہیں اور میں وہاں اپنے ضمیر کی عدالت میں جیسا ہوں مطمئن ہوں اور اگر میں نے خود کو ملامت میں پایا تو میں خود کو تبدیل کر لوں گا۔

انتظار حسین کے ہاں بھی ایسے ملامت کار کردار ملتے ہیں کہ جو دوسروں کو ان کے گناہوں کر سرزنش کرتے نظر آرتے ہیں جن کو دوسروں کو نصیحت کرنا اچھا لگتا ہے اور وہ ان کو دوسروں کے گناہ اپنے گناہوں سے زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ انتظار کا کردار فجا جس نے اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے سرزنش بھی کیا ہے اور انھیں ڈانٹا بھی ہے کہ نیکی کرو اور پھر اس پر مستزاد کہ نیکی کا معیار بھی بتایا ہے کہ نیکی کس کو کہتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> ”تو وہ (مولوی صاحب) کہہ رئے تھے کہ یو ساری آفتیں یوں آرئی ہیں کہ مسلمانوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ اجی تم نماز کی کئو ہو کلمے محمدؐ کی قسم لوگوں کو کلمہ تک ٹھیک یاد نہیں۔ یہ نئے نئے لونڈے جنٹلمین بنے پھرتے ہیں چار حرف انگریزی کے پڑھ کے سمجھ لیوے ہیں کہ ساتویں علم پڑھ لیے اور اگر کلام مجید کی ایک آیت کا مطلب پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ میں کئوں اوں کہ سارے علم تو کلام پاک میں ہیں۔ جس نے کلام پاک نہ پڑھا وہ خاک کا عالم ہے۔ ایک آیتہ الکرسی سے ستر بلائیں دور رہتی ہیں مگر یاد کسے ہے اور لونڈیوں نے تو سب کو ہی مات دے رکھی ہے جسے دیکھو کالج میں پڑرئی اے پریاں بنی بنی پھرے ہیں۔ طباق سا منہ کھلا ہوا، سر سے دوپٹہ غائب اجی یہ طور اشرافوں کے ہیں؟“(۱۳۶)

اس افسانے میں انتظار نے ایک عام آدمی کی ذہنیت سے بات کی ہے کہ ہمارے ہاں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو گلی کوچوں اور چوراہوں پہ بیٹھے دن رات نئی نسل کے لوگوں کو ان کی جدت پسندی پر سرزنش کرتے رہتے ہیں اور نصیحتیں بھی کرتے رہتے ہیں کہ بھئی تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنی تہذیب اور اپنی اصل سے بالکل ہی دور چلے گئے ہو حالانکہ تم لوگوں کو اپنے دین کی سمجھ ہونی چاہیے نہ کہ دنیاداری کی۔ بل کہ یہاں تو الٹی گنگا بہتی ہے کہ ہر کسی کو انگریزی تو فر فر آتی ہے مگر اسلام کے کسی رکن کو ادا کرنے کا صحیح طریقہ نہیں آتا۔ رکنِ اسلام تو کجا اسے تو قرآن کی ایک آیت تک نہیں آتی اور پوچھو تو ملک کے بہترین، جدید اور مہنگے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیسی تعلیم ہے کہ جو علم سے انسان کو دور کرتی چلی جاتی ہے۔

انتظار چوں کہ تہذیب، زمین اور اپنی جڑوں کی تلاش میں تمام عمر کہانیاں لکھتا رہا اس لیے اس کی کہانیوں میں جب ملامت کا عنصر آیا تو وہ بھی اپنی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ مذہب کی طرف مراجعت کا عنصر ہی غالب آیا۔

جبران کے افسانے میں ملامت کار لوگوں کو گناہ کے عذاب سے ڈرا کر انھیں سزا کی بابت بتاتا ہے اور انھیں بار بار عذابِ الٰہی کی عوید کرتا ہے جس سے افسانہ نگار تنگ آ کر اسے کہتا ہے کہ میرا ضمیر ابھی زندہ ہے کہ اگر میں نے نصیحت پکڑنی ہوئی تو اسی سے پکڑ لوں گا۔ دینی باتوں اور وعظوں سے تنگ کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہر انسان کے پاس اس کا ضمیر ہے کہ جو اسے کسی بھی غلط اور صحیح بات کی نشان دہی کے لیے کافی ہے۔ آپ کی ملامت سے معاشرے کے اندر ایک قسم کی طبقاتی جنگ کا شائبہ ہوتا ہے۔ مگر انتظار کے ہاں اس سے مختلف قسم کی مذہبی ملامت کاری ملتی ہے کہ کردار بار بار لوگوں کو اس لیے نصیحت کر رہا ہے کہ لوگ اپنے مذہب، عقیدے اور اسلام سے دور جا رہے ہیں اور کسی کو اس کی فکر نہیں کیوں کہ لوگ جدت میں اس قدر کھو چکے ہیں کہ انگریز بننے کو تو تیار ہیں مگر کسی بھی دینی فریضے کی ادائیگی میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

جبر ان کا گناہ گار آدمی واعظ کے وعظ سے تنگ آکر جواب بھی دیتا ہے اور اسے اس کی ملامت سے روکتا ہے اور اپنے کام سے کام رکھنے کو کہتا ہے مگر انتظار کا گناہ گار بجائے آگے سے جواب دینے کے بل کہ شرمندہ ہے اور چپ بیٹھا ہے کہ اسے دبے دبے انداز میں اس بات کا احساس ہے کہ ہم واقعی میں اپنی تہذیب، مذہب اور جڑوں سے بہت دور نکل آئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار اپنے خاص اسلوب اور مقصد کے بیان میں کامیاب ہوا ہے۔

جبر ان کے ہاں جزاوسزا کے تصور پر بڑے دلچسپ اور حیران کن افسانے بھی ملتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان کے تصورِ سزا پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔

"کیلافش کے شہر میں ایک فسطائی مندر کی سیڑھیوں میں کھڑا بہت سے دیوتاؤں کا پرچار کر رہا تھا اور لوگ اپنے دلوں میں کہہ رہے تھے۔

"ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ کیا یہ سب دیوتا ہمارے ساتھ نہیں رہتے اور جہاں کہیں بھی ہم جائیں ہمارا پیچھا نہیں کرتے؟"

تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص چوک میں کھڑا لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

"کوئی خدا نہیں۔ جس نے بھی اسے سنا۔ خوش ہوا کہ انھیں خداؤں سے ڈر لگتا تھا!"

پھر کسی اور دن ایک اور آدمی آیا۔ اس کے بیان میں فصاحت تھی اور اندازِ تکلم میں دلکشی، اس نے کہا۔

"لوگو! خدا صرف ایک ہے۔"

سننے والے یہ سن کر افسردہ ہو گئے۔ کیوں کہ دل میں وہ ایک خدا کے انصاف سے بہت سے خداؤں کے انصاف کی نسبت زیادہ ڈرتے تھے!

اسی سال ایک اور آدمی آیا اور اس نے لوگوں سے کہا۔

”اصل میں خدا تین ہیں اور وہ تین اوپر ،ایک بن کے رہتے ہیں۔ان کی ایک بہت مہربان ماں ہے۔جو ان کی جورو بھی ہے اور بہن بھی!“

اس پر کیلافش کے لوگ بہت خوش ہوئے۔وہ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔

”ایک خدا،ایک میں تین۔یقیناً ہماری خطاؤں اور کمزوریوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔اور پھر ان کی مہربان ماں وہ ہم کمزور دلوں کی خطا پوشی ضرور کرے گی۔“““(۱۲۷)

اس اقتباس میں دیکھیں کہ افسانہ نگار کے ہاں آج کا انسان ایسے خدا کی تلاش میں ہے کہ جو اس کے گناہوں پہ پردہ ڈالے اور ان کے جرم معاف کر دے اور ان پر کبھی بھی جرموں کا مواخذہ نہ ہو۔اس وجہ سے لوگ اپنے عقائد تو ایک طرف اپنے خدا تک پر سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ایسے انسان جزا و سزا سے بے نیاز ہو جانا چاہتے ہیں۔اس کے ساتھ ایک بات اس افسانے میں یہ بھی سمجھ آتی ہے کہ لوگ ایسے خدا کو ہی مانتے ہیں کہ جو رحیم ہو،کریم اور شفیق ہو نہ کہ ایسا خدا جو گناہوں پہ پرسش بھی کرے اور سزا کا بھی حکم رکھتا ہو۔یعنی ہم جزا و سزا سے بے نیاز ہو کر جو چاہیں اس دنیا میں کرتے پھریں اور ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔اگر ایسا ہو جائے تو ساری کائنات ہی درہم برہم ہو جائے اور ہر کوئی دوسرے کا حق مارتا پھرے اور جیبیں مارنا تو ایک طرف دوسروں کی گردنیں مارتا پھرے کیوں کہ اسے اس بات کا یقین ہو چلا ہے کہ ہمارا احتساب نہیں ہو گا بل کہ ہم معاف کر دیے جائیں گے۔جہاں ہم خدا سے نیک کام پر جزا کے حق دار بنتے ہیں وہاں ہمیں یہ بھی ادراک ہونا چاہیے کہ گناہ کرنے پر وہ ہمارا حساب بھی کرے گا اور احتساب بھی اور اس کے بعد ہمیں سزا بھی دے گا اور یہی بات عوام کو باور کرانا افسانہ نگار کا موضوعی خیال ہے۔

انتظار کے ہاں بھی ایسے افسانے ہیں کہ جہاں لوگ حساب کتاب سے بیگانے ہو کر خدا سے مکر اور فریب کرنے لگتے ہیں اور بھی ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم اپنی تدبیر سے خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا کیوں کہ وہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔مگر انسان باز نہیں آتے۔اس موضوع پر انتظار کا افسانہ ”آخری آدمی“

ہے کہ اس میں بستی کا سب سے ذہین آدمی اپنی دانست کو استعمال کر کے خدا سے مکر کت بیٹھتا ہے اور اس کے بعد سزا سے بھی بچنا چاہتا ہے جو کہ سراسر ناجائز اور غلط التجا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔ اور الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا سمندر سے فاصلہ پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اس کو سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔"(۱۲۸)

انسان اس طرح بھی کر سکتا ہے کہ وہ اپنے خدا سے مکر کرے اور پھر دنیاوی فائدہ اٹھا کر خدا کے سامنے معافی کا بھی خواستگار ہو تو ایک عجیب مخمصہ ہے مگر خدا کے حضور کچھ بھی بعید نہیں وہ چاہے تو معاف کر دے چاہے تو سزا دے مگر افسانہ نگار تو حقائق کے مطابق ہی افسانہ لکھتا ہے اور اس کے مطابق تو گناہ کی سزا ملنی چاہیے اور یہی منطقی اصول بھی ہے۔

جبران کے افسانے میں انسان کے جزا و سزا کے تصور کا کرداروں کی خواہشات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظامِ احتساب سے بریت چاہتے ہیں چاہے اس کے لیے انھیں ایک کے بجائے دو یا پھر ترین خداؤں کا نظریہ ماننا پڑے۔ جیسا کہ آج کل یورپ میں ایسا ہی ہے کہ لوگ مذہب سے اس لیے بیزار ہیں کہ مذہب خاص اقدار اور ان اقدار کے توڑنے پر مواخذے کا کہتا ہے مگر لوگ نام نہاد آزادی چاہتے ہیں کہ کوئی گناہ کرتا ہے تو کرتا رہے کوئی پوچھنے والا یا روکنے والا نہ ہو۔ جیو اور جینے دو کی پالیسی پہ عمل درآمد چاہتے ہوئے وہ تباہی کے دہانے پہ پہنچ چکے ہیں۔ چوں کہ جبران مغرب میں رہا اس لیے اس کے ہاں ایسی تنقید اور ایسا طنز بھی کچھ بعید از خیال نہیں کہ اس نے ایسے نظام پہ نکتہ چینی کی ہو۔ مگر انتظار نے تو اساطیری اسلوب میں قرآنی تلمیح استعمال کر

کے لوگوں کو گناہ کی دلدل کا عذاب چکھانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ گناہ کر کے اس سے بچنے کی سبیل کوئی نہیں اور نہ ہی آپ خدا کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ خدا سب جانتا ہے۔

جبران نے اپنے افسانے میں کچھ مثالیں دے دے کر لوگوں کا تصورِ خدا سمجھانے کی کوشش کی ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں اور بالکل اسلوب یانانی اساطیر اور دیومالا سے ملتا ہے اور انتظار نے قرآنی اساطیر سے کہانی گھڑنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں افسانہ نگار اپنی اپنی جگہ کامیاب دکھائی دیے ہیں۔ انتظار چوں کہ مشرقی افسانہ نگار ہے اس لیے اس کے ہاں جزئیات کی تفصیل جبران سے کہیں بڑھ کر ہے مگر جبران اپنی بات سیدھے اور سپاٹ انداز میں کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی نقادوں کے نزدیک انتظار کا اسلوب خشوزوائد سے بھرپور ہو اور بہت سی چیزیں کہانیکے پلاٹ میں اضافی آگئی ہیں جن کے بغیر کہانی مکمل ہو سکتی تھی۔ جس طتح ہمیں مغربی افسانہ نگار کا اسلوب بالکل مقصد کی طرف بڑھتا اور سادہ سا بیانیہ معلوم ہوتا ہے۔

جبران کا افسانہ "قانون" اپنے تمام تر حوالوں کے ساتھ صاحبِ مقنن حضرات پہ لکھا گیا ہے کہ جو عوام کی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف قوانین بنا دیتے ہیں بل کہ اپنی مرضی سے ان کے لیے سزائیں بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ جبران نے تمام ایسے مقننین کے لیے کھلا چیلنج کیا ہے کہ جب تم قوانین بناتے ہو تو یہ بھی دیکھ لیا کرو کہ تم نے بھی کبھی گناہ کیا ہوگا اور تم کبھی گناہ کر بھی سکتے ہو تو لہٰذا سزا ایسی تجویز کرو جو کہ تم خود بھی سمجھو کہ گناہ کے مطابق ٹھیک اور مناسب، قابلِ برداشت ہے نہ کہ ایسی سزا کہ سن کے ہی آدمی کی روح کانپ اٹھے۔ اس افسانے میں اس نے سزاؤں اور قوانین کے مطابق اور اہلِ قانون کے بارے میں اپنے مختلف نظریات کا پرچار کیا ہے۔ لکھتا ہے:

"کیا قاضی نے اپنی زندگی میں کسی سے دشمنی نہیں کی؟

کیا اس نے کبھی اپنے کمزور پیروؤں سے پیسہ نہیں لیا؟

کیا اس نے ایک حسین عورت سے اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہی؟

کیا وہ خطاؤں سے پاک تھا کہ اس کے لیے قاتل کو پھانسی دینا، چور کو سزا دینا اور زانیہ پر پتھر برسوانا جائز ہو گیا۔

کون ہیں وہ جنہوں نے اس قاتل کو سولی پر لٹکایا؟

کیا وہ فرشتے تھے جو آسمانوں سے اتر کر آئے؟ یا وہ انسان تھے جو ہر ہاتھ آنے والی چیز کو غصب کرتے اور چراتے ہیں۔

اس قاتل کا سر کس نے قلم کیا؟ کیا فرشتے آسمانوں سے اتر آئے تھے یا وہ سپاہی تھے جو ہر اچھی چیز کے لیے خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔

اس زانیہ کو سنگسار کس نے کیا۔ کیا وہ راہب تھے؟ جو عبادت خانوں سے نکل کر آئے یا وہ انسان جن کی بزرگی کے پردوں میں تمام تر کمینہ حرکتیں چھپی ہوتی ہیں۔"(۱۲۹)

اہلِ قانون اور قانون کے ٹھیکے داروں پہ ایسا سپاٹ اور جان دار افسانہ لکھنا یقیناً یہ جبران کا ہی خاصا ہے وگرنہ ہمارے ہاں تو علامت بہت سارے مفاہیم کو آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی اور بہت سارے قراء اس کو پڑھ کر سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں مگر موصوف افسانہ نگار نے نہ صرف بات واضح کی بل کہ کھل کر نام نہاد مقننین اور علماء وواعظین پہ تنقید بھی کی کہ یہ بھی تو گناہ کرتے رہتے ہیں مگر ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں کیوں کہ کوئی پاکیزگی کی چادر اوڑھ لیتا ہے اور کوئی قانون کی سیاہ پٹی آنکھوں پہ باندھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

انتظار نے اپنے افسانے زرد کتا میں ایسے نام نہاد لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنے قلم اور اپنی زبان کے ساتھ ساتھ اپنے علم کو بیچ دیتے ہیں انھیں ذرا بھی خیال نہیں آتا کہ ہم ہی تو اس کے امین اور پرچارک ہیں اور ان لوگوں پر انتظار نے افسوس بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔"(۱۳۰)

اصل میں یہ قرآن کی آیت ہے اور اس کو مصنف نے من و عن بیان کیا ہے اور اس میں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ لکھنے والے جن میں اہلِ علم، علما کرام اور قانون کے سب ٹھیکیدار شامل ہیں جو اپنے منصب اور فرائض سے چشم پوشی کرتے ہیں اور طاقتور کا بازو بن کر غریب کے سہارے چھینتے ہیں اور پھر اس بات پہ افسوس ہے کہ یہ اپنے علم سے ناجائز پیسا کماتے ہیں اور غیر قانونی فیصلے سر انجام دیتے ہیں جس سے معاشرے میں جزا و سزا کا معیار اور قانون بالکل گر جاتا ہے طاقتور، طاقتور ہوتا جاتا ہے اور کمزور، کمزور ہوتا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں۔

حسین عورتوں اور دوشیزاؤں سے لطف اندوز ہونے کا رواج آج بھی ہمارے معاشرے میں عام ہے کہ بہت سے ہمارے ناصح حضرات دوسروں کو تو نیکی اور پرہیز گاری کی تعلیم دیتے رہتے ہیں مگر خود یک گونہ بھی نیکی کی طرف نہیں آتے، یا پھر نیکی کرتے بھی ہیں تو صرف دکھاوے کے لیے کہ لوگ ہمیں نیک سمجھ سکیں اور پھر ہمارے گناہوں پر توجہ نہ کر سکیں۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں سے جبران کے افسانے "قانون" سے جو اقتباس درج ہے اس میں بھی حسین عورتوں سے ان نیک اور قانون کے رکھوالوں کے تعلقات ہونے پر سوال اٹھایا گیا ہے اور انتظار حسین کے دو مشہور و معروف افسانوں "آخری آدمی" اور "زرد کتا" میں بھی نیک نام لوگوں کے بازاری عورتوں سے تعلقات دکھائے گئے ہیں جن سے معاشرے کی صورتِ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

زرد کتا افسانے کا راوی خود کو مرشد کے فرامین کا پاسدار بتاتا ہے اور دوسروں کو بھی اس پر عمل کی دعوت دیتا ہے مگر خود بھی نفس کے جھانسے میں آکر دنیاداروں کے ساتھ مل جاتا ہے اور نفسِ امارہ کا غلام بن جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"پھر رن رقاصہ آئی اور میں اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبھوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئیں۔ پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی اور لباس اس نے ایسا باریک پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالے اور کولہے اور سیمیں ساقیں سب نمایاں اور مجھے لگا کہ میں نے مہکتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے لگے۔"(۱۳۱)

یہ ابو قاسم خضری کے الفاظ ہیں جو کہ اپنے مرشد کے ملفوظات اور فرامین سے دوسروں کو گناہوں سے باز رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا اور دوسروں کو گناہوں پر سزا ہونے کا یقین دلا دلا کر ان کو نیکی کی دعوت دیا کرتا تھا مگر خود بھی عورتوں کے حسین اور دودھیا جسموں پر اس کی نظر ہوتی تھی اور وہ بھی نیکی کا درس دیتے دیتے کسی کی گود میں جا بیٹھا تھا اور اپنے نفس کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچ چکا تھا۔

جبران اور انتظار دونوں افسانہ نگاروں نے ہمارے معاشرے کے ایسے ہی افراد پر یہ بات اٹھائی ہے کہ جب خود نیک کام نہیں کرتے تو دوسروں کا نیکی کا کس منہ سے کہتے ہیں۔ اگر خود گناہ کرتے ہیں تو دوسروں کو گناہ سے باز رہنے اور گناہ کی سزا کا کیوں کہتے رہتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں ایک مذہبی انسان کی طرف سے ہونے والی وعیدانہ سختیاں اور جنت دوزخ کی محبت اور نفرت اور اس سلسلے میں تقاریر کو موضوع بنایا ہے جس سے ایک عام گناہ گار آدمی اپنی زندگی سے منہ موڑ دے اور یہ نیک لوگ گناہ کی لذتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے رہیں اور دوسروں کو نیکی کا درس بھی دے دیا کریں۔

جبران کے افسانے میں سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان سوالوں کے جواب ایک بالغ اور باشعور معاشرے سے مانگے گئے ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں ان مذہبی لوگوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو بھی گناہوں سے بہر حال دور رکھنا چاہیے۔ مگر انتظار کے افسانے مکافات کے عمل میں داخل ہو جاتے ہیں اور مذکورہ بالا دونوں افسانوں میں گناہ گار نیک شخص کو سزا ملنے کا عمل بھی سامنے آتا ہے کہ وہ نیکی

کا درس دے کر خود برائی کرتے تھے تو خدا نے انھیں سزا دے کر عبرت کا نشاں بھی بنایا ہے یہ بات الگ ہے کہ پورے معاشرے کو بھی گرفتارِ سزا کیا ہے۔ اس لحاظ سے انتظار کی کہانیاں جبران کے افسانے سے آگے کی کہانیاں ہیں اور دونوں کا اسلوب اور پلاٹ بھی نہایت جاندار ہے۔ جبران کا اسلوب دوٹوک اور مقصد کے مطابق فلسفیانہ ہے مگر انتظار کا اسلوب اساطیری اور مذہبی کتابوں کی دومالا سے گوندھ کر تشکیل دیا گیا ہے۔

جبران کی کہانی "انسان دیوتا" اپنے موضوع اور جزا و سزا کے عنوان پر پوری اترنے والی کہانی ہے کہ جس میں انسان کی صدیوں کی محنت پر انسان کے گناہوں کی وجہ سے اترنے والے عذاب کی داستان بیان کی ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے دنیا کے اہم اور حسین وادیوں کا ذکر بڑے دلفریب انداز میں کیا ہے اور پھر انسان کی کوتاہی اور ظلم اور ناانصافی کی وجہ سے ان کو یک جنبشِ حالات زمیں بوس ہوتے دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں جہاں مکافات کا عمل اپنی شدت سے جلوہ دکھاتا نظر آتا ہے اسی شدت اور احساس سے انسان کے برے اعمال کی وجہ سے ان پر آنے والے عذاب اور سزا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھیے:

> "میں نے نظر اٹھا کر انسان کی گزشتہ تاریخ کے اوراق کو دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ کہیں تو وہ فتح و نصرت کے مینار نصب کر رہا تھا اور کہیں محلوں، شہروں اور معبدوں کی تعمیر میں مصروف تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ زمین نے غصے میں ایک انگڑائی لی اور اپنے سینے پر بنی ہوئی تمام تعمیروں کو ایک ہی جنبش سے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اپنی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔
>
> میں نے طاقتور اور جوشیلے انسانوں کو ناقابلِ تسخیر قلعوں کی تعمیر کرتے دیکھا اور عظیم فن کاروں کو ان قلعوں کی دیواروں پر نقش و نگاری میں مصروف دیکھا اور اسی اثناء میں زمین نے ایک جمائی ہی لی اور منہ کھول کر جو کچھ ہنر مند ہاتھوں اور روشن دماغوں نے تخلیق کیا تھا، چشم زدن میں نگل گئی۔"(۱۳۲)

بے شک انسان جب تعمیرات کرتا ہے تو ان کو لافانی نقشوں کے ذریعے سے ناقابلِ تسخیر طریقوں پر بناتا ہے مگر جب حالات کی ایک ٹھوکر انھیں لگتی ہے تو خدا کا عذاب ان پر سزا بن کر اترتا ہے اور لوگوں کے اعمال کا بدلہ خدا انھیں ان کے بلند وبالا مکانات، محلات اور مقامات کے زمین بوس ہونے پر دکھا دیتا ہے۔ دنیا میں انسان کے اعمالِ بد کی سزا خدا انھیں خطوط پر دکھاتا ہے۔ تاکہ یہ ہوش کے ناخن لے۔

انتظار کے ہاں بھی ایسی کہانیاں ملتی ہیں کہ جن میں دکھایا گیا ہے کہ جیتی جاگتی اور آباد وشاد بستیاں انسان کے گناہوں کی وجہ سے زمین بوس ہو گئیں اور آج ان کا نام تک لینے والا کوئی نہیں اور ان سے ہمیں عبرت پکڑنی چاہیے۔ آخری آدمی والی کہانی میں بھی آخری بچ جانے والا آدمی اسی بستی میں آخری آدمی تھا کہ جس کو آج بندروں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور لوگ اپنے اعمال کے سبب سب ہی بندر بن چکے تھے کبھی یہاں بھی اونچی حویلیاں اور بلند وبالا مینار اور برجیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے خدا نے سب تباہ کر دیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی سمندر کے کنارے، اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں اور عالی شان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے۔“(۱۳۳)

انتظار حسین کے ایک اور افسانے ”دوسرا گناہ“ میں بھی گناہوں کی وجہ سے سزا کے طور پر بستی کے اجڑنے کا حال ملتا ہے جس میں نہ صرف سزا کا ذکر ہے بل کہ کہانی کی بنت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھے اعمال کی وجہ سے جزا کا بھی سلسلہ جاری وساری ہے۔ سربراہِ بستی کے گناہوں اور بد اعمالیوں اور امتیازات کے سبب ساری بستی پر قحط نازل ہو جاتا ہے اور لوگ اپنی بستی چھوڑ دوسری بستیوں کا رخ کرنے لگتے ہیں۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں گناہ کے سبب بستی کے اجڑنے یا وہاں سے نکال دیے جانے کا تصور آدم کے جنت سے نکل جانے کی وجہ سے آیا ہے کیوں کہ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں اساطیری، روایتی، مذہبی، دیومالائی، حکائی اور تمثیلی اندازِ بیان ملتا ہے۔

جبران کا افسانہ "انسان دیوتا" اپنے عنوان اور موضوع دونوں کے لحاظ سے اساطیری اور دیومالایہ اور مذہبی روایات سے متاثر افسانہ لگتا ہے اور ایسا ہی ہے جب کہ انتظار حسین کے ہاں یہ ساری باتیں ان کے اسلوب میں گندھ گندھ کر پیش ہوتی ہیں۔ انتظار نے جس بستی کے اجڑنے کا ذکر کیا ہے اس کا حوالہ تو قرآن خود ہے اور جبران نے مجموعی طور پر جو گناہوں کی سزا کے سبب بستیوں کے اجڑنے کی جو بات کی ہے اس میں بھی گناہوں کے سبب ہی سزا کا ذکر ملتا ہے۔ جبران کی تکنیک سے ہمیں ہر دور میں گناہوں کے سبب ہونے والے نقصانات اور ملنے والی سزا کا ادراک ہوتا ہے جب کہانتظار نے ایک کہانی کے ذریعے ہر دور میں چوکنا رہنے اور نیک اعمال کرنے کی تلقین کی ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں ایک ہی موضوع مختلف پیرائے میں بیان ہونے کے باوجود آخر پہ ایک ہی رنگ دکھاتے نظر آتے ہیں۔

جبران اور انتظار دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں ایسے بھی جزاو سزا کے نظریات پر مبنی افسانے ملتے ہیں کہ جن میں گناہ گار کو تسلیاں اور طاقتور کو سزا کی سختیوں کی وعیدیں تک سنائی جاتی ہیں۔ جبران کے دو افسانے "مرشد کا فرمان" اور "شہید قانون" اسی موضوع پہ لکھے افسانے ہیں کہ جن میں معاشرے کے اندر ناانصافیاں کرنے والے لوگوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے اور مظلوم کو تسلیِ عبرت دے کر قیامت یا پھر مستقبل میں ظالم کی تباہی کا یقین دلایا گیا ہے جس سے لفظوں کے اندر ہی مظلوم کو سکون دینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بھی ہمارے معاشروں کے اندر سزا کا ایک طریقہ کار ہے کہ کبھی ہم مظلوم ہوتے ہوئے ظالم کو کہتے ہیں کہ ہم تمھیں کورٹ اور عدالت میں دیکھ لیں گے اور کبھی کہتے ہیں کہ ہم تمھیں خدا کے حضور قیامت والت دن پوچھیں گے اور کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ تم اپنے کیے کہ سزا ضرور پاؤ گے اور تم ضرور بالضرور تباہ ہو

گے۔ خدا کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ یہ سارے تصور جو سزا کے متعلق ہیں اور ہماری اور ہمارے معاشروں کی بے بسی کو ظاہر بھی کرتے ہیں۔ افسانہ ”مرشد کا فرمان“ سے اقتباس دیکھیے:

”وہ کام جن کو ہم آج غلطی سے کمزوریوں سے تعبیر کرتے ہیں کل انسانی ارتقا میں ایک نہایت ضروری کڑی کی حیثیت سے نظر آئیں گے۔

اور جن ظلم وستم کو برداشت کرنے کی ہمیں کوئی جزا نہیں ملی وہ جزا کل ہماری عظمت بن کر چمکے گی اور ہماری سربلندی کا اعلان کرے گی اور وہ صعوبتیں جن کو ہم نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا وہی صعوبتیں کل ہماری کامیابی کا سہرا بن کر ہمارے سروں کی زینت بنیں گے۔“(۱۳۴)

اور ”شہیدِ قانون“ سے اقتباس دیکھیے:

”اے میرے کمزور بھائی! صبر سے کام لو اور خود کو تسلی دیتے رہو کیوں کہ اس مادی دنیا کے ماورا ایک عظیم ترین قوت ہے جو تمام تر انصاف، ترحم اور محبت ہے۔

اے میرے بھائی! تم ایک برہنہ درخت کی طرح ہو جس کی کمر سرما کی برف کے بوجھ نے جھکا دی ہے۔ یقیناً ایک دن موسمِ بہار آئے گا اور تمہیں سبز پوشاک پہنائے گا۔ ایک دن سچائی کی فتح ضرور ہو گی۔ آج تمہارے تبسم پر آنسوؤں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کل سچائی ان پردوں کو چاک کر دے گی۔“(۱۳۵)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے جبران نے جہاں ہمارے معاشرے کے اندر موجود ناانصافی کی قلعی کھولی ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ آج اگر ہم کسی کے ساتھ ظلم یا ناانصافی کریں گے تو قیامت کو یا اسی دنیا کے اندر کسی نہ کسی صور اس کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ انسان مظلوم اور کمزور ہو سکتا ہے مگر خدا تو طاقتور اور انصاف کرنے والا ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی ایسے افسانے ملتے ہیں کہ جن میں انسان کو تسلی دینے کے لیے ظالم کے ظلم کا بدلے کا ذکر کیا گیا ہے اور مظلوم کو تسلیاں دی گئی ہیں یا کہانی کے اندر ہی ایسی صورتِ حال پیدا کی گئی ہے کہ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ افسانے کا منطقی اور اصل انجام تو یہی ہونا چاہیے۔ انتظار کا افسانہ ”دوسرا گناہ“ اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں ایک بدکار بھائی ایک بستی کی سربراہی حاصل کر کے اپنے بھائی اور اہلِ بستی والوں کا خیال نہیں رکھتا اور انھیں برا بھلا بھی کہتا ہے اور اپنے بھائی کو تو بستی سے بے دخل کر کے بستی سے نکال دیتا ہے۔ چوں کہ دوسرے بھائی الیملک کے پاس طاقت، ہمت یا پھر عہدہ نہیں تھا تو وہ بستی کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاتا ہے مگر جس بھائی زمران نے اس کو نکالا تھا اس کی بستی میں بھائیوں اور لوگوں پہ ظلم کرنے کی وجہ سے قحط پڑ جاتا ہے اور لوگ اس بستی اور ظالم حکمران کو چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لیتے ہیں جہاں وہ پہلے سے نکالا ہوا بھائی آباد ہو جاتا ہے اور نکالنے والا بے یارو مدد گار اپنی بستی کے اجڑنے اور کھنڈر بننے کا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”قافلہ والوں نے کہا کہ دوسروں کی مت پوچھ۔ دیوار سے گر کر مر جانا اس سے اچھا ہے کہ آدمی فاقے کر کے مرے۔ کھیت، شاہراہوں اور اصطبلوں کی زد میں آ گئے۔ کھیتوں والے کچھ نگہبان بنے، کچھ سائیس بنے، کچھ آوارہ ہو گئے اور گیہوں ہمارے درمیان تھوڑا رہ گیا اور گراں ہو گیا اور ہم نے اس بستی کی زمین کو اپنے آپ پر تنگ پایا اور نکل کھڑے ہوئے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔“(۱۳۶)

اس افسانے کے اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زمران نے اپنے بھائی کو دیس نکالا دیا تو اس کا بھائی الیملک اپنے بھائی سے جدا ہوا اور جنگلوں میں چلا گیا مگر اپنی بھائی کو کچھ کہہ نہ سکا اور خدا نے اس کے اس صبر کی اسے یہ جزا دی کہ جنگل میں ایک نئی بستی آباد کروا دی اور زمران کو اس کے ظلم کی یہ سزا دی کہ اس کی بستی برباد کر دی اور وہاں قحط نازل کر دیا اور لوگ بستی سے خود ہی مرنے کے خوف اور بھوک کے خوف سے ہجرت کر گئے۔

خلیل جبران کے دونوں افسانوں اور انتظار حسین کے اس افسانے سے یہ بات سزا کے لحاظ سے ظاہر ہوتی ہے کہ انسان جب اللہ پر چھوڑ دیتا ہے اور خود ظالم کا محاسبہ نہیں کر سکتا تو خدا خود اس کا مواخذہ کرتا ہے کہ ظالم اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ جبران نے اپنے افسانے میں فلسفیانہ اور منطقی اسلوب مین یہ بات کہی ہے اور دونوں افسانوں میں مقصدیت غالب ں طر آتی ہے اور اسی وجہ سے کہانی کہیں اندر دب کے رہ گئی ہے۔ جب کہ انتظار کے ہاں کہانی اپنے پلاٹ اور اپنے اسلوب سے کاص انداز میں جزئیات اور لوازمات کے ساتھ اپنے موضوع کو بیان کرتی ہے اسی لیے کہانی تمثیلی انداز میں بیان ہوتی ہے اور کہانی سے کئی اور مفاہیم بھی نکالے جا سکتے ہیں اور کئی ایک تعبیریں سامنے آتی ہیں کیوں کہ کہانی مکمل ہے اور مقصد بیانیے میں پورا ہو جاتا ہے۔ جبران کی کہانی بالکل سیدھی اور سادہ ہے کہ ایک عام قاری بھی کہانی پڑھ کر مقصدِ موضوع کو سمجھ سکتا ہے۔

خلیل جبران کی ایک خوبی ہے کہ جس مقصد کے لیے کہانی لکھتا ہے وہ بالکل سادے انداز میں اور شعریت میں بیان کر دیتا ہے مگر انتظار کا اسلوب اساطیری، مذہبی روایات اور خاص حکائی انداز میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ جس سے کہانی یک سطحی ہوتے ہوئے بھی کئی ایک تعبیریں لیے ہوتی ہے۔ انتظار کے اسی علامتی و تہذیبی زندگی پر مبنی اسلوب کے بارے عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں:

> "ایک خلاق ذہن، افسانے لکھے تو ایک نئی راہ نکالی، علامتی افسانوں میں ایسی علامتیں استعمال کیں جو ہماری تہذیبی زندگی سے وابستہ تھیں، داستانوں کو نئے معنی پہنائے۔ ادب برائے ادب کے قائل تھے مگر میرے نزدیک ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جو ادب برائے زندگی کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔"(۱۳۷)

مذہب کی اخلاقی اقدار بیان کرنے میں بھی دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں موضوعات کی فراوانی ہے اور دونوں نے اپنے فن کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ معاشرتی کردار ہو، گناہ و ثواب کا تصور ہو، شخصی اور اوصاف ہوں یا پھر جزا و سزا کا تصور موصوف افسانہ نگاروں کے ہاں ان کا اچھا خاصا مواد مل جاتا ہے۔ جبران کا یہاں بھی

وہی اسلوب ہے اور یہ بالکل سادہ اور بیانیہ انداز میں اپنی کہانی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ فلسفیانہ نکتے اور کئی ایک شعرانہ اسلوب پر امبنی افسانے مل جاتے ہیں۔ جن سے کہانی دلچسپ اور پڑھنے والے کو محظوظ تو کرتی ہے مگر اس میں تہ داری یا پہلو داری پیدا نہیں ہوتی، ہاں کچھ کہانیوں کو حکائی اور تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے جس سے کہانیوں میں ایک خاص چاشنی ابھر کے سامنے آئی ہے ۔ناصحانہ اور ناقدانہ اسلوب جبران کا غالب ہے۔ مگر انتظار حسین کے ہاں وہی اساطیری، روایات سے جڑا اور قصے کہانیوں سے گندھا ہوا اسلوب ملتا ہے جس میں وہ کوئی نقد کرتے اور نصیحت کرتے دکھائی نہیں دیتے بل کہ اپنی کہانی کہتے چلے جاتے ہیں اور اسلوب میں ایک خاص علامتی سلسلہ در آتا ہے جس سے کہانی میں پہلو داری اور تہ داری پیدا ہونے لگتی ہے یہی چیز تو انتظار کو جبران کی کہانیوں سے امتیاز دلواتی ہے۔ انتظار کے ہاں مذہبی قصے، کہانیاں اور حکایات پائی جاتی ہیں مگر جبران کے ہاں مذہب کے حوالے تو نظر آتے ہیں مگر مذہبی قصے اور ان سے جوڑ کر کہانی بنتی کم ہی نظر آتی ہے۔ مذہبی روایات کا سلسلہ جبران کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔

دونوں کے اسلوب پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جبران سامنے سے آکر تلوا سے وار کرتا ہے اور انتظار اپنی مہارت سے چھپ کر وار کرتا ہے جو زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے کیوں کہ سامنے کے آدمی کو روکا بھی جاسکتا ہے اور پوشیدہ ضرب کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں نے دنیا بھر کا نہ صرف ادب پڑھ رکھا تھا بل کہ مذہب کے ساتھ ساتھ کسی بھی مہذب معاشرے کی بابت تمام تر معلومات سے آشنائی ان دونوں کو حاصل تھی جس کے سبب یہ کسی بھی معاشروں میں موجود مذہطی اخلاقی اقدار کو بخوبی جانتے اور ان کو اپنے قلم سے بیان کرسکتے تھے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ شخصی اوصاف ہوں، گناہ و ثواب کا معاملہ ہو یا پھر جزا و سزا کے قانونی پیچ و خم دونوں افسانہ نگاروں نے اسے بخوبی بیان کیا ہے۔ اپنی سرزمین سے محبت کے ساتھ ساتھ ہجرت کا کرب انسان کو انسانیت سیکھا دیتا ہے اور یہی انسانیت سوز واقعات ہی ہیں کہ انسان کو انسانیت سے ہمدردی کے کئی ایک طریقوں سے

آشنا کروا دیتے ہیں اور انسان کھل کر معاشرت اقدار کی پاس داری کا پرچم اٹھالیتا ہے اور اخلاقی گراوٹ کے خلاف علمبر دار بن کر سامنے آجاتا ہے۔

معاشرتی انتشار معاشرے کے شریف اور رذیل ہر انسان پر یکساں اپنا عمل دکھاتا نظر آتا ہے اور جب سارا ہی معاشرہ اخلاقی زوال اور انحطاطِ آدمیت کا شکار ہو جائے تو کوئی بھی اپنی شخصیت، ذات اور جون کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ افضل سے افضل انسان بھی اسفلیت کے لبادے میں ڈھل جاتا ہے اور اپنی انسانی اور اخلاقی اقدار کو بھول کر خدا کی بارگاہ میں گناہ گار اور معاشرے کی نگاہ میں ایک انتشار کا باعث قرار پاتا ہے۔ جبران اور انتظار دونوں کے افسانے اور کہانیاں انھیں معاشرتی اقدار کے زوال کو ختم کرنے اور معاشرے کو اپنے قدموں پہ کھڑا کرنے اور سہارا دینے کی ایک کوشش ہیں۔

مذہب کسی بھی معاشرے کی اساسی اکائی ہے اور دنیا کا ایسا کوئی معاشرہ نہیں جہاں کسی نہ کسی طرح یا کسی نہ کسی طریقے سے مذہبی رسومات یا عبادات کی ادائیگی نہ ہوتی ہو اس لیے مذہب کو ہم مختلف زاویوں اور تعریفوں سے جانتے ہیں اور اسے پوجاپاٹ، آسمانی حکموں کو ماننے، فرائض کی ادائیگی، موت کا اقرار اور موت کے بعد کی زندگی، باطنی صفائی جیسی اخلاقی تعلیمات، مقدس، بالا اور اَن دیکھی قوت کے وجود کا اقرار، حقیقی مقاصد کا حصول، مافوق الانسانی قوتوں کی رضا جوئی، کامل احتیاج اور انحصار، قدیم زمانے کے انسان کی دہشت، نفسیاتی عدم توازن کے مماثل سمجھنے، بندش اور پابندیِ اذہان، ہمارے اور کائنات کے مابین ہم آہنگی کے ذریعے، ایک عقیدے اور ایمان بالغیب جیسی ماورائی باتوں پر سرِ تسلیم خم کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی لیے ایک مذہب ہی واحد سہارا بچتا ہے کہ جس پر عمل کر کے ہم اپنی تمام تر پریشانیوں کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں اور خود کو خدا کے سپرد کر کے آرام سے زندگی گزار سکتے ہیں اور اسی کا شکر بجالا کر دنیا اور آخرت میں درجات کی بلندی کا بھی حصول ممکن بنا سکتے ہیں۔ معاشرے کی اخلاقی اقدار ہوں یا کسی مذہب کی اپنی اقدار، گناہ و ثواب کا تصور ہو یا شخصی اوصاف کا تصور یا پھر سزا جزا کا معیار ہو ہر میدان میں مذہب ہی انسان کو سہارتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۷۰

۲۔ محمد اکرم رانا، پروفیسر ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰

۳۔ خانقاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۴۵٦

۴۔ علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، تخلیقات بیگم روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۱۵۵

۵۔ خانقاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص۴۵٦

٦۔ یہ دنیا ہے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص۴۵۸

۷۔ ایضاً، ص۴۵۸

۸۔ تارک الدنیا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص۴۹۳

۹۔ پس پردہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص۵۳۰

۱۰۔ یہ دنیا ہماری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص٦٦٦

۱۱۔ انسان دیوتا، مشمولہ: جوانی اور محبت، خلیل جبران، مکتبۂ اردو ادب، لاہور، س ن، ص٦۹

۱۲۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص۲۵

۱۳۔ قانون، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۷۵۳

۱۴۔ ایضاً، ص۷۵۴

۱۵۔ ضمیر کی بیداری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۷۸۴

۱٦۔ نعیم صدیقی، ہمارا ادبِ مطلوب، مشمولہ: اسلامی نظریہ ادب، سید اسعد گیلانی، اختر حجازی (مرتبین)، ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۱

۱۷۔ آزادی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۳۸۹

۱۸۔ پاگل خانہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۰۹

۱۹۔ ایضاً، ص۴۰۹

۲۰۔ ایضاً، ص۴۱۰

۲۱۔ چودھویں رات کا چاند، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۰۹

۲۲۔ بوڑھی ملکہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۹۱

۲۳۔ ایضاً، ص۴۹۲

۲۴۔ غلامی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۱۷

۲۵۔ ایضاً، ص۵۱۷

۲۶۔ اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، ص۱۷۹

۲۷۔ میں کس سے محبت کرتا ہوں، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۲۱

۲۸۔ ایضاً، ص۵۲۲

۲۹۔ فن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۲۶

۳۰۔ ایضاً، ص۵۲۵

۳۱۔ ہم اور تم، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۶۳

۳۲۔ ایک مسافر، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۷۵

۳۳۔ نفرت کا علاج، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۵۹۶

۳۴۔ روپہلے آنسو سنہرے سکے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۱۲

۳۵۔ سرسراتے ہوئے جھونکو، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۴۰

۳۶۔ علم و عقل، مشمولہ: جوانی اور محبت، خلیل جبران، مکتبۂ اردو ادب، لاہور، س ن، ص ۷۲

۳۷۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۸۔ دانشمندی، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۴۲

۳۹۔ غلام رسول چیمہ، پروفیسر، مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۸

۴۰۔ اے ملامت کار، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۴۱-۴۴۰

۴۱۔ انصاف، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۹۸

۴۲۔ میں کس سے محبت کرتا ہوں، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۲۲

۴۳۔ پس پردہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۰

۴۴۔ ایندھن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۵۸۱

۴۵۔ خدا اور دیوتا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۵۹۹

۴۶۔ انسان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۶۴۴

۴۷۔ یہ دنیا ہماری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۶۷۔۶۶۶

۴۸۔ علم و عقل، مشمولہ: جوانی اور محبت، خلیل جبران، مکتبۂ اردو ادب، لاہور، س ن، ص ۷۵

۴۹۔ انسان دیوتا، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۶۹

۵۰۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۲۷

۵۱۔ شہیدِ قانون، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۶۶

۵۲۔ قانون، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۷۵۴

۵۳۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر (مرتبہ)، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۳۹

۵۴۔ انتظار حسین، فجا کی آپ بیتی، مشمولہ: گلی کوچے، شاہین پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۲ (بار اول)، ص ۷۶

۵۵۔ انتظار حسین، فجا کی آپ بیتی، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۷۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۷۸

۵۷۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، کتابیات، لاہور، ۱۹۶۷ (بار اول)، ص ۲۰

۵۸۔ فرید حسینی، ڈاکٹر، تاریخ، تہذیب اور انتظار حسین، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۹ء، ص ۲۶۴

۵۹۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۶

۶۰۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۴۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۰

۶۳۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، زرد کتا، مشمولہ: انتظار حسین ایک دبستان، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (مرتب)، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۳۱

۶۴۔ انتظار حسین، ہڈیوں کا ڈھانچ، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۵۷

۶۵۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۸۶

۶۶۔ ایضاً، ص ۹۰

۶۷۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۲

۶۸۔ نثار ترابی، ڈاکٹر، انتظار حسین: ایک اہم علامتی افسانہ نگار، مشمولہ: ادبیات (انتظار حسین نمبر)، سہ ماہی، شمارہ نمبر ۱۱۱۔ ۱۱۲، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۳۴۱

۶۹۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۲۔ ۱۶۳

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔ ۱۶۶

۷۱۔ انتظار حسین، کنکری، مشمولہ: کنکری، مکتبہ جدید، لاہور، 1955 (بار اول)، ص ۳۲۶

۷۲۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۳

۷۳۔ فرید حسینی، ڈاکٹر، تاریخ، تہذیب اور انتظار حسین، ص ۲۶۴

۷۴۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۲۸۷

۷۵۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۲

۷۶۔ ایضاً، ص ۳۹

۷۷۔ ایضاً، ص ۳۳

۷۸۔ انتظار حسین، شہادت، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۳۳

۷۹۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۹۱

۸۰۔ ایضاً، ص ۹۱

۸۱۔ انتظار حسین، مشکوک لوگ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۹۱

۸۲۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۱

۸۳۔ ایضاً، ص۱۶۳

۸۴۔ ایضاً، ص۱۶۷۔۱۶۸

۸۵۔ انتظار حسین، گونڈوں کا جنگل، مشمولہ: خالی پنجرہ، سنگِ میل، لاہور، ۱۹۹۳ء (بار اول)، ص۶۹

۸۶۔ انتظار حسین، فجا کی آپ بیتی، مشمولہ: گلی کوچے، ص۷۷۔۷۸

۸۷۔ ایضاً، ص۸۰

۸۸۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص۲۰

۸۹۔ ایضاً، ص۲۴

۹۰۔ ایضاً، ص۲۶

۹۱۔ ایضاً، ص۲۹

۹۲۔ سجاد باقر رضوی، دیباچہ، مشمولہ: آخری آدمی، ص۱۰

۹۳۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۳۰

۹۴۔ ایضاً، ص۴۲

۹۵۔ ایضاً، ص۴۲

۹۶۔ انتظار حسین، ہڈیوں کا ڈھانچ، مشمولہ: آخری آدمی، ص۶۳

۹۷۔ ایضاً، ص۶۵

۹۸۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۶۷

۹۹۔ ایضاً، ص۱۶۸

۱۰۰۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ)، مقالہ نگار: حامد رضا صدیقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۱۷ء، ص ۳۵۶

۱۰۱۔ خانقاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۵۶

۱۰۲۔ ایضاً، ص ۴۵۶

۱۰۳۔ انتظار حسین، فجا کی آپ بیتی، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۷۶

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۷۸

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۷۷

۱۰۶۔ یہ دنیا ہے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۴۵۸

۱۰۷۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہرِ افسوس، ص ۸۶

۱۰۸۔ پس پردہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۰

۱۰۹۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۷

۱۱۰۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۴

۱۱۱۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۳۳

۱۱۲۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۶

۱۱۳۔ آزادی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران،، ص ۳۸۹

۱۱۴۔ انتظار حسین، ایک بن لکھی رزمیہ، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۲۱۲

۱۱۵۔ چودھویں رات کا چاند، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۰۹

۱۱۶۔ انتظار حسین، کچھوے، مشمولہ: کچھوے، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۱ء (بار اول)، ص ۸۷

۱۱۷۔ دانشمندی، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۴۲

۱۱۸۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۳

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۲۰۔ میں کس سے محبت کرتا ہوں، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۲۱

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۵۲۲۔۵۲۱

۱۲۲۔ انتظار حسین، مجیدا، مشمولہ: خالی پنجرہ، ص ۱۵۵

۱۲۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۲۵۔ اے ملامت کار، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۴۱-۴۴۰

۱۲۶۔ انتظار حسین، فجا کی آپ بیتی، مشمولہ: گلی کوچے، ص ۷۷۔۷۸

۱۲۷۔ خدا اور دیوتا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۹۹

۱۲۸۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۶

۱۲۹۔ قانون، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۴۷

۱۳۰۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۰

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۳۲۔ انسان دیوتا، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص ۶۹

۱۳۳۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۲۹

۱۳۴۔ مرشد کا فرمان، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص۲۷

۱۳۵۔ شہیدِ قانون، مشمولہ: جوانی اور محبت، ص۶۶

۱۳۶۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۶۸

۱۳۷۔ قاسمی، عطاء الحق، انتظار حسین، مشمولہ: مخزن (انتظار حسین نمبر)، شش ماہی، شمارہ نمبر ۳۲، قائدِ اعظم لائبریری، باغِ جناح، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۲۳

باب چہارم:

خلیل جبران اور انتظار حسین کے ہاں داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا تقابل

الف۔ خلیل جبران کے افسانوں میں داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا مطالعہ:۔

دنیا کے ہر ادب کی ابتدامیں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں پرانے قصوں،روایات، اساطیر، دیومالا اور مذہبی کہانیوں کا حصہ ضرور رہاہے اور اس سے آگے کہیں مذہبی عناصر نے جنم لیاتو کہیں خدا کے تصور میں یقین پیدا ہوا اور کہیں معاشرتی اخلاقیات کی قدروں کا تعین کیا گیا۔ حتیٰ کہ مذہبی ادب اور آسمانی صحیفوں میں بھی کہیں کہیں ایسی باتیں مل جاتی ہیں کہ جن کا تعلق داستانوی اسلوبِ بیان سے بخوبی ملتاہے۔اس طرح کہا جاسکتاہے کہ داستانوی انداز انسان کی گھٹی میں پڑاہے اور کہانی کہنے اور سننے سنانے سے شروع ہوئی تھی تولازم ہے کہ کہانی میں داستانوی انداز آج بھی کسی نہ کسی طور رائج ہو۔

جس طرح بڑے ادب میں داستانوں اورروایات پر مبنی کہانیاں مل جاتی ہیں اسی طرح ہر بڑاادیب ان داستانوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی کہانیوں کو داستانوی انداز اور افکار میں تشکیل بھی کرتا ہے جس سے کہانی بیان کرتے ہوئے ایک خاص قسم کی آسانیِ تفہیم مل جاتی ہے اور کہانی اپنی بنت میں ایک زمانے سے نکل کر کسی اور زمانے میں بھی داخل ہو جاتی ہے جس سے کہانی کا کینوس بہت بڑا ہو جاتا ہے اور تفہیم بھی وسیع تر ہو جاتی ہے مگر ایسا صرف وہی کر سکتاہے جس ادیب کا مطالعہ اپنے زمانے کے علم کے ساتھ ساتھ پہلے پہلے زمانے کے علوم ،مذہب کے علاوہ ادب کا بھی طویل مطالعہ ہو۔اسی لیے منتخب دونوں ادیبوں کے ہاں افسانوں میں داستونوی افکار اور اسلوب کی ایک خاص لے اور درجہ بدرجہ اس کی تفہیم و تشکیل ملتی ہے۔

پہلے خلیل جبران کے افسانوں میں داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا جائزہ لیں گے اور اس کو بھی دو مختلف حصوں میں تقسیم کرلیتے ہیں تاکہ سمجھنے اور بیان کرنے میں آسانی رہے۔

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار

خلیل جبران نے اپنے کئی افسانوں میں داستانوی فکر کو داستونی انداز پر مبنی کہانیوں کے اسلوب سے معاشرے میں اپنا پیغام پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔مافوق الفطرت عناصر کا داستانوں میں ذکر ایک عام

سی اور لازم و ملزوم بات ہے۔اس لیے خلیل جبران کے افسانوں میں داستانوی فکر کو سمجھنے کے لیے مافوق الفطرت عناصر کا جائزہ لے کر نقد کرنا ضروری ہے۔

خلیل جبران نے اپنے افسانے "محفلِ عندلیب" داستانوی انداز و افکار کے ذریعے مافوق الفطرت عناصر کا سہارا لیتے ہوئے زندگی کی بے ثباتی اور انسان کے فنا ہو جانے اور کائنات کے لافانی نہ ہونے کا ذکر کیا ہے اور پرندوں کی زبان اور خیالات سے ایسی ایک کہانی بنی ہے کہ داستانوی رنگ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔اس افسانے میں رات کے تاریک سناٹے میں چند بلبلیں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اڑ رہی ہیں اور رات کو جاتے ہوئے دیکھ رہی ہیں اور ان کے ذہن میں ایک عجیب طرح کا خیال منڈلا رہا ہے کہ جو انسان کے فانی ہونے اور اس کائنات کے ثبات پر ایک گہرا سوال بھی چھوڑتا ہے۔ان عندلیبوں کے ذہن میں ابھرنے والا خیال دیکھیے:

> "ان کا مطمح نظر تو صرف ایک ہی ہے محض ایک خیال ان کے قلوب پر ہاوی اور معصوم روحوں کو مجروح کر رہا ہے۔
>
> اور وہ یہ کہ اگر صباح فردا "حامل خزاں" بن کر آئی تو "رنگِ چمن" کیسا ہو جائے گا استبداد کے پنجہ آہنی میں گرفتار ہونے سے ساکنانِ چمن پر کیا بیتے گی اور یہ تجدید کتاب حیات کا کون سا ورق پیش نظر کرے گی۔"(۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل جبران کے ہاں پرندوں سے کہانیاں بنانے کا تصور ملتا ہے اور وہ قدیم داستانوی اسلوب کو اختیار کر کے پرندوں کی زبان سے بیان کروا رہے ہیں کہ کسی کو بھی آنے والے کل کی کوئی خبر نہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ خدا جانے کل کیا ہو گا۔دنیا کی بے ثباتی اور فنا کا عالم اس قدر طاری ہے کہ بلبلیں یہ تصور کر رہی ہیں کہ آنے والی صبح خدا جانے گلستان میں رہنے والوں کے لیے قیامت ہی کی صبح نہ ہو،رنگ چمن کے خوب صورت کنائے میں بھی ہر پردہ اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔زندگی اپنا کون سا ورق پلٹے گی اور کیا نظارہ پیش کرے گی اس کا کسی کو کوئی علم نہیں۔انسانی زندگی اور انسان کی اس کائنات کی فنا پذیری اس

افسانے میں صاف ظاہر ہو رہی ہے، پرندے جو دنیا ومافیہا سے بے نیاز آسمانوں میں اڑ رہے ہیں انھیں بھی دنیا کی بے ثباتی کا یقین ہے اور وہ ہمیں بھی بتا رہے ہیں اور انتباہ کر رہے ہیں یہ ایک دلچسپ امر ہے۔

خلیل جبران اپنے افسانے میں ایسی کئی باتیں چھپا کر بیان کی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے بات کہ تہہ میں اترنا پڑتا ہے جس کی وجہ خلیل جبران کا فلسفی وشاعرانہ اسلوب ہے اور سب سے بڑھ کر عربی ادب میں استعارے اور زبان کی بلاغت وفصاحت کا کمال ہے جو خلیل جبران کو اپنے گھر سے پیدا ہوتے ہی نصیب ہوئی۔

خلیل جبران اپنے ایک اور افسانے ”گل خزاں رسیدہ“ کے ذریعے بھی دنیا میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کو ایک لایعنی سی کیفیت سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی کس قدر فنا کا منتظر ہے اور یہی بات اسے دن رات اندر ہی اندر کھاتے چلی جا رہی ہے کہ اس نے کسی روز یہاں سے کوچ کر جانا ہے اور دنیا میں ہمیشہ بیٹھے نہیں رہنا۔ یہی خیال خلیل جبران نے ایک خزاں کے پھول کے منھ سے کہلوائی ہے اور داستانوی فکر میں پھولوں کے تسلسل کو بھی بحال رکھا ہے کہ جب کوئی بھی بے جان چیز بے اختیار بات کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس افسانے میں ایک پھول ہے جو اپنی زندگی کو ختم ہونے اور ختم کرنے سے پہلے چاہتا ہے کہ وہ کسی کام آ جائے یا کسی کے ہاتھوں میں چلا جائے مگر دنیا اور زندگی کی بے ثباتی اسے یہ بھی موقع فراہم نہیں کرتی اور وہ دنیا سے یہی حسرت لیے چلا جاتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”لیکن انہیں غنچوں میں ایک دہر کے المیہ کا مرقع بھی تھا۔ اس کا جگر فرطِ الم سے شق تھا اور پنکھڑیا منتشر۔
>
> آج سے ایک روز پہلے وہ اس چمن کا حسین ترین غنچہ تھا۔ بھنرے اس کے گرد بیتابی سے طواف کرتے اور آفتابی کرنیں بار بار اپنی رفاقت کا احساس دلاتیں۔۔۔۔۔۔
>
> ”میری ہستی بے کار ہے۔ غنچہ ہائے نو دمیدہ میں مجھ مردہ دیروز کا کیا کام۔“ اس نے رنجیدگی سے اک جھرجھری لیتے ہوئے کہا اور ہوا کا شوریدہ جھونکا اس کی باقی پتیوں کو بھی اڑا لے گیا۔“[۲]

اس افسانے میں خلیل جبران نے ایک پھول سے باتیں کہلوا کر زندگی اور دنیا کے فنا ہو جانے اور ہر لحظے موت کے ڈر کو بیان کیا ہے اور آخر کار ایسا ہی ہوتا ہے اور ہم موت کے منھ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اخلاقی طور پر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ انسان جب زندگی کی امید ہار جاتا ہے تو وہ یقیناً فنا کو آواز دے دیتا ہے اور زندگی کا آخری سانس خزاں کے اس جھونکے کی طرح آپ کے باقی ماندہ پتے بھی اڑا کر لے جاتا ہے۔ ایک اور بات اس افسانے میں خلیل جبران نے جو بتانے کو کوشش کی ہے کہ ہر ایک کو دوسرے خوش و خرم لوگوں میں خود کو خوش اور خرم ہی رکھنا چاہیے اور ہر وقت کا موت کا کھٹکا کسی وقت بھول بھی جانا چاہیے۔

داستانوں میں جس طرح بادشاہ اور اس کے مصاحبین ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت کے برابر پوری سلطنت میں کوئی نہیں ہو سکتا اس طرح خلیل جبران کا افسانہ "قبرستان" میں داستانوی انداز اپنا کر امیروں، سرداروں کا دبدبہ اور کنٹرول دکھایا گیا ہے۔ خلیل جبران کا افسانہ "قبرستان" اپنے موضوع کے اعتبار سے دنیا کے اوپر امیر لوگوں کی بادشاہت کے اقرار کا افسانہ ہے اور اس میں دنیا کے ساتھ ساتھ قبروں اور قبرستانوں پر بھی صاحبِ ثروت لوگوں کا قبضہ دکھایا گیا ہے جس میں امیر آدمی کا جنازہ تو بڑے بڑے لوگوں کے جلو میں آتا ہے اور اسے کئی علما فضلا دعا دینے کے لیے پہنچ جاتے ہیں مگر ایک غریب کو یہ سکون مرنے کے بعد بھی میسر نہیں آتا اور وہ مرتا بھی بالکل اکیلا ہے کہ جیسے دنیا میں لوگ اسے منھ نہیں لگاتے اسی طرح آخرت کے سفر پر بھی اس کے جنازے کو کندھا دینے کو تیار نظر نہیں آتے۔

جب ایک غریب آدمی کو قبرستان لایا جارہا ہوتا ہے تو افسانہ نگار نے جس طرح کتے کی وفاداری کو ظاہر کیا ہے اس سے اسلامی اسطورہ اصحابِ کہف والا کتا اور خواجہ سگ پرست داستان باغ و بہار کا کتا یاد آجاتا ہے کہ وہ دونوں کتے اپنے مالک کے ساتھ ہر حال میں رہے اور ان سے وفاداری کا ثبوت دیتے رہے۔ اس افسانے میں خلیل جبران نے اس داستانوی افکار سے استفادہ کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لیے چلے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت ہے، جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، گود

میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کتا ہے، جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف۔

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا، جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی، جو یاس و نومیدی کے آنسو بہا رہی تھی، ایک اس کا بچہ تھا، جو اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا، اور ایک اس کا وفادار کتا، جس کی رفتار سے اس کے رنج و غم کا اظہار ہو رہا ہوتا تھا۔

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور تابوت کو ایک قبر میں اتار دیا، جو مرمریں قبروں سے بہت دور ایک گوشہ میں تھی۔ اس کے بعد وہ پر اثر خاموشی کے ساتھ واپس ہوئے، کتا بار بار اپنے آقا کی آخری آرام گاہ کو دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ وہ سب درختوں میں روپوش ہو گئے۔"(۳)

کتے کی وفاداری اور اداؤں سے خواجہ سگ پرست کا کتا بار بار یاد آتا ہے اور یونہی لگتا ہے کہ یہ کتا اسی نسل سے ہے کہ اپنے مالک و آقا کا کس قدر احترام کرتا ہے اور کیسے اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کے کسی حکم کا منتظر ہو یا اس کے قبر سے باہر آجانے کا خیال اس کو بار بار مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر رہا ہو۔

فرشتے کسی بھی مذہب اور عقیدے میں بڑی اہم اور مافوق الفطرت مخلوق خیال کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے تمام لوگ انھیں عقیدت اور احترام کی نظر سے یاد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بھی پاکیزہ اور نیک صفت آدمی کو ہمیشہ فرشتہ کہہ کر پکارتے ہیں اور ہم فرشتے کہلوانا ہی بہتر خیال کرتے ہیں۔ داستانوں میں اکثر مقامات پر فرشتے نیک سیرت کرداروں کی مدد کرتے نظر آتے ہیں بھٹکے ہوؤں کو راستا دکھاتے ہیں اور ہیرو کے لیے ہاتف سے پکارتے اور مسائل کا حل بھی بتاتے ہیں۔

خلیل جبران کا افسانہ "نیکی اور بدی کے فرشتے" اپنی نوعیت کے لحاظ سے جتنا مختلف ہے اتنا دلچسپ اور مزے کا بھی ہے۔ اس کہانی میں دو فرشتے اپنے اپنے کام سے ناخوش ہیں اور دونوں ایک دوسرے پہ اس لیے

ناقد بنے ہوئے ہیں کہ دوسرے کا کام آسان ہے جب کہ اس کا اپنا کام مشکل ہے۔ بات چلتی چلتی ہاتھا پائی اور لڑائی تک پہنچ گئی اور کسی بڑے اور معتبر فرشتے نے آکر ان میں صلح کی تدبیر نکالی۔ اقتباس دیکھیے:

""""عجب بدتمیزی ہے" پہلے نے کہا۔

"میں تم سے ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور تم اسے صرف خیال بتاتے ہو!"

بات تو تو، میں میں سے بڑھ کر ہاتھا پائی پر پہنچی۔۔۔۔۔ اور لگے دونوں طرف سے مکے اور پر برسنے!

ادھر یہ دونوں گتھی ہوئے کہ ایک شوخ وشنگ فرشتہ۔۔۔۔۔ فرشتوں کا سردار کہیں سے آنکلا۔ اس نے دونوں کو علیٰحدہ کراتے ہوئے کہا۔

"بڑی شرم کی بات ہے کہ شہر کے دروازے پر دو مربی فرشتے یوں آپس میں لڑیں۔ اور پھر بے وجہ۔ مگر میں بھی سنوں کہ قصہ کیا ہے؟""(۴)

خیر اس نے دونوں میں اس طرح صلح کروائی کہ دونوں کے کام ایک دوسرے کو تفویض کر دیے مگر یہ اس پر بھی راضی نہ تھے۔ افسانے کا مطلب فرشتوں کی عظمت اور پاکیزگی کو سامنے رکھ کر ہی متعین کیا جاسکتا ہے کہ جب پاکیزہ اور نورانی مخلوق اس قدر خدا کے حکم اور تقسیم پر شکوہ کناں ہے تو عام آدمیوں کا کیا حال ہو گا کہ ہر مخلوق ہی اپنے منصب سے گر کر شیطانیت کی طرف راغب ہوئی جاتی ہے۔ فرشتوں کے کردار تو داستانوی، علامتی اور تمثیلی ہیں مگر اس میں اصل بات سمجھنے کی یہ ہے کہ جب کوئی بھی کسی حکم کی تعمیل دل سے نہیں کرتا تو وہ کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتا اور ہر وقت دوسروں میں کیڑے نکالتا اور اپنی تعریف کروانا چاہتا ہے۔

خلیل جبران نے اپنے مافوق الفطرت داستانوی اسلوب میں جانوروں، درختوں اور پھولوں سے بھی کام لیا ہے کہ ان سے مکالمات کے ذریعے یا پھر ان کو علامت بنا کر کئی باتیں ہمارے سامنے ایسی لا رکھی ہیں کہ جن سے زندگی کے کئی ایک پہلو ہم پر روشن ہوتے ہیں۔

خلیل جبران کا ایسے ہی دستانوی اسلوب پر مبنی ایک افسانہ "بنفشہ کا پھول" ہے جو اپنی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے زمین کے ساتھ ہی رہ کر اگتا اور اسی سطح پر بڑھتا ہے مگر گلاب کا پھول اس کے برعکس اور زمین سے کافی اوپر ہوتا ہے جس پر یہ بنفشہ کا پھول گلاب کے پھول پر حسرت اور رشک کرتا ہے اور خود کو اس کے مقابلے میں بڑا ادنیٰ، کم تر اور گیا گزرا خیال کرتا ہے جس پر گلاب کا پھول اسے خدا کا شکر ادا کرنے اور اپنے حال پہ خوش رہنے کا کہتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"بنفشہ کے پھول نے اپنے نیلگوں ہونٹ وا کیے اور سرد آہ بھر کر کہنے لگا۔

"نباتی خوشبوؤں میں میرا حصہ کتنا کم اور پھولوں میں میرا درجہ کس قدر پست ہے، فطرت نے مجھے حقیر و ذلیل بنا کر پیدا کیا ہے تا کہ میں زمین سے چپٹے چپٹے اپنی عمر گزار دوں، میں اپنا سر نیلگوں آسمان کی طرف اٹھا سکتا ہوں نہ اپنا رخ گلاب کے پھول کی طرح سورج کی طرف کر سکتا ہوں۔"

گلاب کے پھول نے اپنے پڑوسی بنفشہ کے پھول کی بات سنی اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔

"تو بھی پھولوں میں کتنا مور کھ ہے جو نعمت تجھے حاصل ہے۔ افسوس کہ تو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ تجھے فطرت نے وہ دلکشی، حسن اور خوشبو عطا فرمائی ہے جس سے اکثر پھول محروم ہیں۔ اپنے دل کو ان نا محمود خیالوں اور شیطانی آرزوؤں سے پاک رکھ اور اپنی تقدیر پر شاکر رہ۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جس کسی نے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیا گویا اپنے مرتبہ کو بڑھا لیا اور جس کسی نے حرص و طمع کی، گویا نقصان کو دعوت دی۔"""(۵)

اس طرح کے کردار اور معاملات لوک داستانوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جس میں داستانوی فکر میں لوگوں کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ بنفشہ کے پھول اور گلاب کے پھول کی باہمی گفتگو سے ہمیں صاف پتا چلتا ہے کہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہ رہا ہے اور کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں ہمیشہ خدا کا شاکر اور شکر گزار رہنا چاہیے کہ اس نے ہمیں اپنے وجود میں بہت سی خوبیاں دے کر بھیجا اور نوازا ہوتا ہے مگر ہم دوسروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اپنی خوبیوں کو بھول کر اس جیسا بننے کے لیے اس قدر بے چین اور مضطرب ہو جاتے ہیں کہ خدا کے شاکی ہی بن جاتے ہیں۔

بنفشہ کا پھول اس افسانے میں علامت ہے چھوٹے اور غریب لوگوں کی اور گلاب کا پھول علامت ہے بڑے اور امیر لوگوں کی جو کہ کسی بھی سورج کو سر اٹھا کر نظر سے نظر ملا کر بات کر لیتے ہیں۔ ویسے بھی ایک اچھا انسان ہمیشہ اپنے سے نیچے اور اپنے سے غریب لوگوں کو دیکھ کر زندگی گزارتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی نکتہ بھی افسانہ نگار نے گلاب کے پھول کی زبانی بیان کر دیا ہے کہ عاجزی اختیار کرنے والا ہی آگے بڑھتا ہے اور اسی کو خدا رنگ لگاتا ہے مگر شکوہ کرنے والے لوگ ہمیشہ گھاٹے اور نقصان میں رہتے ہیں اور ان کے اندر حرص اور لالچ جیسی برائیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

انسان مشکلات، حوادث، پریشانیاں اور تکالیف جھیل کر ہی بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیتا ہے کبھی کسی کو بھی گھر میں بیٹھے سکون سے منزل نہیں ملی۔ اس لیے انسان جب تک مشکلات کی گھاٹیوں کو عبور نہیں کرتا اسے منزل کا انعام نہیں ملتا۔ یہ داستانوی اندازِ بیاں کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ داستانوں کے ہیرو اپنے مقصد کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی جنگ اور مصیبت کا سامنا بھی کر لیتے ہیں اور سالہا سال کی مسافتوں کا بوجھ بھی اٹھا لیتے ہیں۔ جس کے لیے "فسانہ عجائب" کا شہزادہ دیکھا جا سکتا ہے جس نے طوطے کی زبانی ایک شہزادی کی خوبصورتی کا سن کر کتنی مصیبتوں کے باوجود سفر کا ارادہ کیا۔ خلیل جبران نے اس موضوع پر مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے دلچسپ افسانہ لکھا ہے کہ جس میں دو صدفوں کو

آپس میں گفتگو کرتے دکھایا ہے جن کی گفتگو سے یہ پتا چلتا ہے کہ انسان تکلیف، درد اور مشکلات سے ہی بڑے بڑے کام کیا کرتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"ایک صدف نے دوسرے سے کہا۔

"میرے اندر درد ہے۔۔۔ بڑی شدت کا درد! بوجھل اور گول سا۔۔۔۔ اور میں بہت ہی تکلیف میں ہوں!"

دوسرے صدف نے بڑی نخوت سے کہا۔

"سب ستائش ہے آسمانوں کے خدا کے لیے، میں تو اندر باہر سے بالکل ٹھیک ہوں۔"

اسی وقت ایک کیکڑا جو پاس سے گزر رہا تھا اور اس نے ان دونوں کی باتیں بھی سنی تھیں، بولا۔

"ہاں تم اندر باہر سے بالکل ٹھیک ہو۔۔۔ لیکن جو درد تیرے پڑوسی کے ہے وہ ایک انمول موتی ہے۔"(۶)

اس افسانے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ انسان جب تک تکلیفوں اور محنتوں کے درد کو برداشت کرنا نہیں سیکھتا یا ان کو برداشت نہیں کر لیتا تب تک وہ کوئی بڑی تخلیق پیدا نہیں کر سکتا۔ اگرچہ خلیل جبران نے ایک صدف سے زندگی کے مسائل سے بڑے حل نکالنا اور دردوں کا پھل ملنے کی نوید سنائی ہے مگر دیکھا جائے تو عام زندگی میں ایک ماں بھی یہی کردار نبھا رہی ہوتی ہے کہ وہ کئی کئی ماہ تکلیف اور پریشانی میں گزارتی ہے پھر جا کر خدا اس کی گود میں لال ڈالتا ہے ایک انمول موتی۔

خلیل جبران نے اپنے کئی اور افسانوں میں بھی داستانوی اور حکائی اسلوب اپنایا ہے کہ جس میں اس نے ایک طلسماتی فضا قائم کر کے کہانی کا پلاٹ تیار کیا ہے ایسا ہی ایک افسانہ "ایک ہزار قید خانے" ہے جس میں بادشاہ کی زیرک فہمی اور معاشرے میں پھیلے نام نہاد مقنن حضرات پہ بات کی گئی ہے کہ بادشاہ نے اہلِ قانون

حضرات کو یہ کہہ کر بلایا کہ آؤ اور مجھے انصاف پر مبنی قوانین بنا کر دو اور جو قوانین انھوں نے بنائے ہر جرم کے خلاف وہ ایک ہزار تھے تو بادشاہ سمجھا کہ میرے ملک میں ایک ہزار جرم ہو رہے ہیں تو اس نے قانون توڑنے والوں کو بنائے گئے قید خانوں میں ڈلوانے کا حکم دے دیا اور یہ وہی قانون تھے جو اہلِ علم لوگوں نے بنوائے تھے۔ اقتباس دیکھیے:

"آج تک ان قبیلوں میں، اسی لیے وہی ایک ہزار قانون رائج ہیں! یہ ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اس میں ایک ہزار قید خانے ہیں اور ان قید خانوں میں ایسے مرد ایسی عورتیں اور ایسے بچے بھرے ہوئے ہیں جو ہزاروں قانون روز توڑتے ہیں۔

بے شک یہ ایک بہت بڑا ملک ہے۔

یہ بہت ہی بڑا ملک ہے اور اس کی آبادی، ان ایک ہزار قانون سازوں کی اولاد کے دم سے ہے جن میں صرف ایک دانش مند بادشاہ تھا!"(۷)

ایسے افکار داستانوں کی زینت ابتدا سے ہی بنتے رہے ہیں اور داستانوں میں علی بابا اور چالیس چور، باغ و بہار میں بھی ایسے مناظر مل جاتے ہیں۔ داستانوں فکر نے اس افسانے میں کئی ایک اخلاقی اور مذہبی انصاف پر مبنی باتیں پنہاں کر دی ہیں کہ ایک تو یہ کہ قانون کی بالادستی لازم ہونی چاہیے اور اس پر کسی کو بھی چھوٹ نہیں ہونی چاہیے اور کسی کو بھی اس قانون کو توڑنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اور جب ایسا کوئی ملک ہو تو اس کے قوانین بناتے ہوئے تمام کمزوریوں اور سستیوں کو سامنے رکھ کر قانون سازی کرنی چاہیے یہ نہ ہو کہ بعد میں انسان خود اس جال میں پھنس جائے اگرچہ وہ قانون غلط بنایا گیا ہو۔ لوگ جب گناہ کرتے ہیں جیل خانے اور قید خانے بھر دیے جاتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصاف پسند بادشاہ کے ملک میں جو کہ ایک رحم دل اور شفیق بادشاہ بھی ہے، کتنے گناہ روز ہوتے ہیں۔ اس افسانے کی ایک تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب ہمیں اختیار ملے جیسا کہ مقنن حضرات کو ملا تھا تو ہمیں انصاف سے کام لینا چاہیے اور اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی

کمزوریوں کو بھی ذہن میں رکھ کر فیصلے کرنے چاہییں یہ نہ ہو کہ آپ سمجھیں کہ یہ باتیں تو اوروں کے لیے ہیں میرے لیے نہیں تو کل کو وہ اپنے سامنے بھی آسکتی ہیں۔

خلیل جبران کا افسانہ " رہبانیت " داستانوی مذہبی سنتوں اور سادھوؤں کے کرداروں پہ لکھا بہترین افسانہ ہے کہ جس مین ایک راہبِ پارسا کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے جو اس قدر نیکی اور پارسائی میں دنیاداروں سے آگے نکل گیا ہے کہ جنگلوں کے درندے، جانور اور چرند پرند بھی اس کے پاس تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اپنا تذکیہ نفس کرتے ہیں۔ مگر کوئی راہب جب صرف اللہ اللہ کرتا ہے اور اپنے معاشرے اور لوگوں سے کٹ جاتا ہے تو وہ اللہ کی نظروں سے گر جاتا ہے کہ جانور بھی اسے منہ نہیں لگاتے۔ اقتباس دیکھیے:

"ایک شام جب وہ محبت کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ تو ایک شیرنی نے اپنا سر اٹھایا اور راہب سے پوچھا۔

"حضور آپ ہم سے تو محبت کی کہانیاں کہہ رہے ہیں لیکن خود آپ کی اپنی جورو کہاں ہے؟"

راہب بولا۔

"میری کوئی جورو نہیں ہے۔"

اس پر چرندوں، پرندوں، درندوں کے اس انبوہ میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی، اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ سب اپنی ہی ہانکتے جاتے تھے۔ قیامت کا شور بے پناہ شور بپا تھا۔

"یہ ہمیں محبت کرنے کا، گھر بسانے کا درس کیوں کر دے سکتا ہے۔ جب کہ اس نے خود نہ کبھی محبت کی، نہ کبھی گھر بسایا!"

اس نفرت میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"(۸)

داستان کے جیسے طلسماتی فضا قائم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس میں مختلف جانور اکٹھے ہو کر ایک راہب سے تعلیم لیتے ہیں۔ مگر اس کہانی سے جو سبق کشید کیا ہے اور داستانوی افکار کی جھلک نے اس کو بہتر بنایا ہے اس کا جواب نہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے بتایا ہے کہ ہمارے مذہبی لوگوں اور علما وفضلا میں یہ مسئلہ ہے کہ بہت سے کاموں کی دن رات تبلیغ تو کرتے ہیں مگر خود عمل نہیں کرتے جس سے ان کی باتوں اور تبلیغ کا اثر نہیں ہوتا کہ مبلغ خود تیقن کی دولت سے خالی ہو تو بات میں اثر زائل ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنی سوسائٹی سے کٹ کر آپ اس قدر اسفل السافلین ہو جاتے ہیں کہ جانور تک آپ کے پاس بیٹھنے سے گریز کرتے ہیں اور آپ کو کوئی انسان پسند نہیں کرتا۔

ہماری زندگی میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم صحیح آدمی کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی یہ پہچان اس کی قدر عام ہو جاتی ہے کہ واقعی میں اس کی شناخت بن جاتی ہے اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بد سے بدنام برا۔ مگر اصلیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

جانوروں کے ذریعے اخلاقی اقدار کا پرچار اور انسانیت کی رہنمائی کرنا داستانوی افکار میں خاصے کی چیز ہے۔ خلیل جبران نے ایسی ہی حقیقت اور غلط فہمی کو اپنے افسانے ”آنسو اور قہقہے“ میں دو کرداروں لگڑ بھگڑ اور گھڑیال کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے نیل کے ساحل پہ ملتے ہیں اور دکھوں کا اظہار کرتے ہیں کہ گھڑیال کو دکھ ہے کہ لوگ اس کے دردِ اصلی پر نکلنے والے آنسوؤں کو بھی غلط سمجھتے ہیں اور اس کے آنسوؤں کو گھڑیال کے آنسو سمجھ کر جھوٹ جانتے ہیں۔ جیسا کہ اردو میں اس کے لیے ایک محاورہ ”مگر مچھ کے آنسو رونا“ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اب ممکن ہے کہ جاندار ہونے کے ناطے گھڑیال کو بھی آنسو اصل تکلیف میں آتے ہوں مگر کوئی بھی سچا نہیں جانتا۔ اقتباس دیکھیے:

”گھڑیال بولا۔

”کیا پوچھتے ہو بھائی! بری ہی حالت ہے۔ اگر کبھی درد کی شدت کے مارے آنکھیں امنڈ آئیں۔ تو دیکھنے والے قہقہے لگاتے ہیں کہ یہ گھڑیال (مگرمچھ) کے آنسو ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھو تو اس اذیت کی خلش ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔“(۹)

اسی طرح لگڑ بھگڑ کا بھی رونا ہے کہ وہ بھی دنیا کی خوبصورتی پہ ہنستا ہے اور لوگ اس کی ہنسی پہ اعتبار نہیں کرتے کہ یہ تو لگڑ بھگڑی ہنسی ہے جو کہ کبھی بھی سچی اور صحیح ہنسی نہیں ہنستا بل کہ لوگوں کو مکاری اور چالاکی سے بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔ اب لگڑ بھگڑ کی سنیے:

”اس پر لگڑ بھگڑ نے کہا۔

”ارے میاں! تم اپنے دکھ کا رونا روتے ہو۔ یہاں ذرا میری حالت بھی تو دیکھو میں دنیا کی خوبصورتیوں کو دیکھتا ہوں۔ اس کے معجزوں کو دیکھتا ہوں، اس کے کرشموں کو تو مارے مسرت کے باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ایسے جیسے صبح مسکراتی ہے۔ تو یہ ”جانگلی“ میرے اس وجدانی کیف پر بھی قہقہے لگاتے ہیں۔۔۔۔۔ ارے یہ تو لگڑ بھگڑی قہقہہ ہے!“(۱۰)

اس اقتباس میں لگڑ بھگڑ نے ہمارے انسانوں کے لیے جو جانگلی کا لفظ استعمال کیا ہے وہ ہی ہمارے لیے کافی ہے کہ جو شخص کسی بھی جاندار کے دکھ درد اور خوشی کو محسوس نہیں کر سکتا وہ تو جانگلی ہی ہے کہ اسے تو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ دوسرے بھی جاندار ہیں یا دوسرے بھی انسان ہیں کہ ایک آدمی جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بدکار یا برا ہے تو زمانے کی ہر برائی اسی کے ساتھ مشروط کر دی جاتی ہے اگرچہ وہ اچھے بھی کئی کام کرتا ہو اور اسی طرح اگر کوئی معاشرے میں نیک شخص ہے تو لوگ تصور ہی نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی برائی بھی کر سکتا ہے حالانکہ برائی انسان ہونے کے ناطے کسی سے بعید نہیں مگر لوگ یہاں آپ کو خدا تو مان لیں گے مگر انسان تسلیم نہیں کریں گے۔ یہ مافوق الفطرت کرداروں کے اندر داستانوی افکار کی ترسیل کے لیے تمثیل کا رنگ استعمال کیا گیا ہے۔

دیوی، دیوتاؤں کا ذکر تو داستان میں گویالازم چیز ہے اور اردو کے علاوہ دنیا کی ہر زبان کی داستانوں میں دیوی دیوتاؤں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ خلیل جبران نے افسانے کے اندر اسی داستانی فکر کو داستانوی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور داستانوی کرداروں کا سہارا لیا ہے۔ افسانہ نگار نے دو دیویوں کی مدد سے دنیا میں پھیلی اسٹیٹس کی جنگ اور دوڑ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جس وجہ سے دن رات اور روز بروز ہمارے ہاں ملمع کاری اور اوور کوٹ ہولڈر افراد کا اضافہ ہو تا جارہا ہے جس سے معاشرے کی ساکھ اور عزت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

افسانہ ''لباس'' کے ذریعے سے افسانہ نگار نے دو دیویوں کا احوال بیان کیا ہے کہ جس میں خوبصورتی کی دیوی اور بدصورتی کی دیوی اکٹھی سمندر میں نہاتی ہیں کہ بدصورتی والی خوبصورتی کی دیوی کا لباس پہن کر بھاگ جاتی ہے اور خود کو دنیا میں خوبصورت ظاہر کرتی رہتی ہے اور خوبصورت بدصورت کہلائے جانے لگتی ہے اس دھوکے اور اصلیت کی پہچان پر افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> ''آج تک سبھی مرد اور عورتیں ایک پر دوسرے کا دھوکا کھاتے ہیں: لیکن چند ایسے بھی ضرور موجود ہیں جو خوبصورتی کی دیوی کو دیکھ چکے ہیں اس کے لباس کے باوجود اسے پہچان لیتے ہیں اور یقیناً چند ایسے بھی ضرور ہوں گے، جنہوں نے بدصورتی کی دیوی کو دیکھا ہو گا اور اس کا لباس اسے ان کی نگاہوں سے چھپا نہ سکتا ہو!''(۱۱)

داستانوں میں دیوی دیوتاؤں اور اوتاروں کے ذریعے سے کہانیاں بیان کرنے کا ایک خاص رجحان موجود رہا ہے جس کا اثر مختلف مذاہب پر بھی ہے اور یونانی تو آج بھی وینس کی دیوی کو خوبصورتی کی دیوی مانتے ہیں اور یہ دیویوں سے مذہب کا پرچار اور اخلاقی باتوں کا بیان کرنا اساطیر اور داستان کا خاص حصہ ہے۔

مگر داستانوی فکر میں افسانے کی خاصیت ملمع کاری کی حقیقت کو واضح کرنا اور اس کے نقصانات اور غلط روی سے پردہ اٹھانا ہے کہ عقل مند لوگ آج بھی اچھے کپڑوں میں چھپے بدصورت آدمی کو پہچان لیتے ہیں اور

پھٹے اور گندے کپڑوں میں موجود ہیروں کو تلاش کر لیتے ہیں یہ انسان کے اپنے صاحبِ بصیرت ہونے اور دوراندیش ہونے کی بات ہے۔

غیر مرئی چیزوں کو جسم عطا کرنا اور تجسیم نگاری سے کہانیاں کہنا یہ بھی داستانوں کا خاصا رہا ہے کہ اردو میں اس کی بہترین مثال "سب رس" کی ملتی ہے۔ ایسے ہی تجسیم نگاری سے کردار بیان کرتے ہوئے داستان کو آگے بڑھانا تمثیل بھی کہلاتا ہے اور خلیل جبران کے کئی افسانوں میں ایسی داستانوی افکار و اسلوب پر مبنی کہانیاں ملتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی "تماشا گاہ" بھی ہے کہ جس میں خوشی اور غمی دونوں جھیل کے کنارے بیٹھی باتیں کر رہی ہیں اور دونوں اپنے اپنے حال کے مطابق دنیا کو بیان کرتی ہیں اور خوشی دنیا کو بہترین بتاتی ہے تو غمی کہتی ہے کہ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

اتنے میں جھیل کے اس پار سے دو شکاری گزرتے ہیں جو غمی اور خوشی کو اکٹھے دیکھ کر یوں گفتگو کرتے ہیں:

"جیسے ہی انہوں نے ادھر دیکھا تو ایک بولا۔

"جانے وہ دونوں کون ہیں؟"

دوسرا کہنے لگا۔

"کیا کہا تم نے دو۔۔۔۔ مجھے تو صرف ایک ہی دکھائی دے رہی ہے۔"

پہلے شکاری نے کہا۔

"نہیں بھئی دو ہیں۔"

دوسرا بولا۔

"وہاں تو صرف ایک ہی ہے۔ اور جھیل میں سایہ بھی تو ایک ہی دکھائی دے رہا ہے۔"

پہلا کہتا تھا۔

”نہیں دو ہیں اور پانی میں سایہ بھی دو ہی کا صاف نظر آرہا ہے۔“

دوسرے کا اب بھی وہی خیال تھا۔

”میں تو صرف ایک ہی کو دیکھ رہا ہوں۔“(۱۲)

دنیا کا یہی دستور ہے کہ کسی کو غمی اور خوشی دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں اور کوئی ان دونوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ تصور کرتا ہے مگر یہ دو ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہیں اور ایک ہوتے ہوئے بھی دو ہیں۔ افسانہ نگار نے اس دنیا میں موجود دونوں طرح کے لوگوں کا رویہ پیش کیا ہے جو کہ ایک عمدہ اسلوبی کاوش ہے یعنی ایک طرفہ فیصلہ نہیں سنایا۔

داستانوی اسلوب اور فضا بناتے ہوئے داستان نویس کو مختلف مافوق الفطرت عناصر کی گفتگو کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ان کو کہانی میں شامل کر کے ایک طلسماتی ماحول بنانا پڑتا ہے جس سے کہانی میں دلچسپی بھی قائم رہتی ہے اور داستانوی افکار بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ خلیل جبران نے چوں کہ زندگی بھر امن نہیں دیکھا اور دنیا میں ہجرت کی وجہ سے خاک چھانی اور ذلیل ہوتا رہا۔ ایک جنگِ عظیم (اول) بھی دیکھی اور لوگوں کو لٹتے پٹتے اور جلتے بلتے بھی دیکھا۔ اس لیے اس ادیب کے لیے امن ایک خاص معنویت کا حامل تھا۔ مگر اپنے اس امن کے فسلفے کو افسانہ نگار نے اپنے افسانے ”فلسفہ امن“ میں بیان کیا ہے۔ جس میں ان کے نزدیک انسان میں امن اور آشتی اسی وقت آسکتا ہے کہ جب انسان ایک دوسرے کے قریب آئے اور خلوص ووفا سے اس کا ساتھ دے۔ جس کے لیے انھوں نے دو ٹہنیوں اور چڑی چڑے کی مثال دی ہے اور ان کے کرداروں کے ذریعے سے فلسفہ امن سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

”ایک پھلی پھولی شاخ نے دوسری سے کہا۔

”آج کا دن بہت ہی اداس ہے اور ویران!“

دوسری شاخ بولی۔

" بے شک دن بہت ویران اور اداس بھی۔"

اسی آن ایک چڑیا۔ ایک شاخ پر آن بیٹھی اور پھر ایک اور چڑا! چڑے نے چوں چوں کر کے کہا۔

"میری جورو مجھے چھوڑ گئی ہے۔"

چڑیا بولی۔

"میرا ساتھی بھی مجھے چھوڑ گیا ہے۔۔۔"(۱۳)

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے پر نوچنے لگتے ہیں اور باہم شور مچانے لگتے ہیں کہ دو چڑیاں ان کو خوش دیکھ کر ان کے پاس آ جاتی ہیں کہ پھر سارے چپ ہو جاتے ہیں اور پر سکون امن کے بعد چاروں اکٹھے کسی سمت اڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر وہی شاخیں آپس میں گفتگو کرنے لگتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

"پہلی شاخ ساتھ والی شاخ سے کہنے لگی۔

"کیا بے ہنگم شور تھا۔"

دوسری شاخ بولی۔

"تم جو چاہو اسے کہو مگر میں تو اسے امن پرور اور راحت افزا سمجھتی ہوں اگر اوپر کی فضا میں امن ہے۔ تو نیچے بھی امن ہے!"

"کیا تم ہوا میں لہرا کر میرے قریب نہیں ہو سکتیں؟"(۱۴)

پھر دونوں ٹہنیاں لہرالہرا کے ایک دوسرے کے قریب ہو جاتی ہیں اور وہی ویران اور اداس دن ان دونوں کے لیے محبت اور پیار کی وجہ سے امن اور آشتی کے دن بن جاتے ہیں اور دونوں چڑیا اور چڑے کی طرح خوشی خوشی رہنے لگتی ہیں۔اور ہر طرف امن ہی امن پھیل جاتا ہے۔

خلیل جبران نے اس افسانے میں باہمی خلوص،پیار اور محبت کو امن کے فلسفے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ایسے کئی افسانے افسانہ نگار کے ہاں موجود ہیں کہ جن میں مختلف داستانوی افکار اور طلسماتی فضا سے کہانیاں کشید کر کر کے دوسروں تک اپنے خیالات پہنچائے گئے ہیں۔

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار

داستانوں کا ایک خاصا یہ بھی رہا ہے کہ اس میں ہمیشہ سچ،اخلاق اور ہمت کی جیت ہوتی ہے اس لیے داستانوں میں ایک مثالی و خیالی قسم کی نصیحتیں،فیصلے اور انصاف کے فیصلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اسی طرح داستانوی افکار پر مبنی اس باب میں خلیل جبران کے افسانوں میں موجود کسی داستانوی کردار،حیوان،چرند پرند یا پھر کسی حکایت سے متعلق داستانوی افکار کو جگہ دی جائے گی کہ ایک افسانہ نگار کس طرح طلسماتی فضا قائم کر کے حیوانات و چرند پرند کو اپنی کہانیوں میں شامل کر کے اور ان کو داستانوی رنگ دے کر ایک مثالی و خیالی ماحول بنا کر نصائح کرتا ہے۔

خلیل جبران کی کہانی "شاہ اردوس" داستانوی نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جس میں ایک بادشاہ کے ذریعے سے اخلاقی بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسا پرانی داستانوی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ جس میں بادشاہوں کے قصے اور ان کی من مانیاں نظر آتی ہیں۔

اس افسانے میں شہر کے کچھ زعما بادشاہ کے پاس عوام کے لیے ایک درخواست لاتے ہیں کہ بادشاہ عام لوگوں کے لیے شراب اور دوسری منشیات کو حرام قرار دے دے تو اس پر بادشاہ چپ کر کے چلا جاتا ہے تو حاجب ان کی حالت کو تاڑ کر کہتا ہے:

"محل کے دروازے پر وہ حاجب سے ملے اور حاجب نے معلوم کیا کہ انہیں کچھ رنج ہے۔اور وہ ان کے معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

پھر اس نے کہا۔"حالت قابلِ رحم ہے دوستو۔

لیکن اگر تم بادشاہ کو ایسی حالت میں ملتے جبکہ وہ نشہ میں چور ہوتا تو وہ تمہاری درخواست یقیناً قبول کرلیتا۔""(۱۵)

افسانے کے اس اقتباس سے وہی داستانوی انداز جھلکتا ہے کہ ایک بادشاہ ہے، اس کا وزیر بہت سمجھ دار ہے اور وہ لوگوں کو مزید باتیں سمجھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ مگر یہ افسانہ ہے داستان نہیں جس میں تہہ دار اور پہلو دار چند نکات نظر آتے ہیں اور بہت سی باتیں اخلاقی طور پر سامنے آتی ہیں کہ ایک تو یہ کہ بادشاہ جب ہوش و خرد سے بات کرے تو وہ سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے اور دور تک فائدہ اپنی نظر میں رکھتا ہے اور پھر فیصلہ کرتا ہے اور اگر بادشاہ کسی نشے میں دھت ہو اور وہ مکمل ہوش میں نہ ہو تو وہ ویسا ہی فیصلہ خوشی سے کر دیتا ہے کہ جیسا عوام چاہتے ہوتے ہیں۔ تیسرا اس افسانے سے سیاسی نکتہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ بادشاہ نے اس لیے زعما کی بات نہیں مانی کہ اگر ملک کے نوجوان نشہ نہیں کریں گے تو حالات سے واقفیت پا کر بادشاہ کے ہر کام پر نکتی چینیاں شروع کر دیں گے۔

بہر حال بادشاہ کے ذریعے سے بات آگے بڑھا کر خلیل جبران نے داستانوی کردار کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس میں بادشاہ عموماً سب کچھ کر سکنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

خلیل جبران اپنے افسانے میں ایسی کئی باتیں چھپا کر بیان کی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے بات کی تہہ میں اترنا پڑتا ہے جس کی وجہ خلیل جبران کا فلسفی و شاعرانہ اسلوب ہے اور سب سے بڑھ کر عربی ادب میں استعارے اور زبان کی بلاغت و فصاحت کا کمال ہے جو خلیل جبران کو اپنے گھر سے پیدا ہوتے ہی نصیب ہوئی۔

زندگی میں مشکلات سے گھبرانہ یہ کوئی مردوں کا شیوہ نہیں رہا اور ہر بہادر آدمی زندگی میں مشکلات کا ہنس کر مقابلہ کرتا ہے اور جان جوکھوں میں ڈال کر بھی اپنے آپ کو سرخرو کرلیتا ہے مگر کچھ لوگ ہم میں مشکلوں کا سامنا کرنے سے ڈرتے ہیں اور اس سے بچنے کے لیے دوسروں کو یا مشکلوں کو کوستے رہتے ہیں۔ خلیل جبران نے ایسے لوگوں اور ایسے خیالات پر ایک افسانہ ”مرغ باد نما“ لکھا ہے کہ جس میں ایک مرغ یعنی پرندے کے ذریعے داستانوی فضا اور ماحول قائم کر کے اخلاق، پند اور نصائح کی بات کی ہے کہ پرندہ اڑتے ہوئے ہوا کو اس کی سمت درست کرنے اور اپنے آپ سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ایک ہی سمت چلنے سے تم بالکل فرسودہ ہو چکی ہو اب اپنا راستہ بدلو اور میری راہیں بھی آسان کرو تا کہ میں ہوا میں آسانی سے اڑ سکوں مگر ہوا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرتی ہے اور اس کو جواب مصنف کی زبان میں فضا دیتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> ”مرغ باد نمانے ہوا سے کہا۔ ”تمہارا ہمیشہ ایک ہی طرح سے چلتے رہنا کتنا تھکا دینے والا ہے۔ کیا تم میرے چہرے سے ہٹ کر کوئی دوسرا رخ اختیار نہیں کر سکتیں؟ کیونکہ تم میری خداداد استقامت کو پریشان کئے دیتی ہو۔“
>
> لیکن ہوا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور فضا میں صرف ایک قہقہہ سنائی دیا۔“[۱۶]

یہ مختصر مگر جامع مکمل افسانہ ہے کہ جس میں خلیل جبران نے ہمارے معاشرے کے کئی ایک افراد کی بابت داستانوی انداز میں دلکش باتیں کی ہیں کہ ہم اپنی کام چوری کے کئی ایک بہانے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اکثر ایسا کرنے کے لیے اور ذاتی فائدہ نکالنے کے لیے ہم دوسروں کو کچھ کام کرنے کے فائدے بھی بتا دیتے ہیں جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ فائدہ ہم کو ہی ہونا ہوتا ہے۔ مگر ہوا کو داستانوی اسلوب میں شامل کر کے خلیل جبران نے جو اس سے خاموش رہنے کا ہنر دیا ہے وہ اپنی جگہ ایک معنی خیز جواب تھا یعنی خاموشی دور تک گونجی اور فضا میں ایک قہقہہ اس پرندے کی بے بسی لاچاری اور شکست کی آواز بن کے گونجنے لگا۔

جانوروں کے ذریعے سے اخلاقی اور ناصحانہ باتیں بیان کرنا اور کہانیاں بیان کرنے کا رواج تو انسان کے سوچنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا کیوں کہ اس نے اپنے شعور کی آنکھ جانوروں کے درمیان ہی کھولی ہے اور اسی سے اس کے جانوروں کے ساتھ تعلقات قائم ہوتے چلے گئے۔

خلیل جبران کا افسانہ "جل پریاں" ایک دلچسپ اور منفرد افسانہ ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے مختلف طریقوں سے انسان اور انسانی بے معنی اور لایعنی کاموں پہ نہ صرف تنقید کی ہے مگر انھیں دنیا کی تباہی کا بلاوجہ سبب بھی قرار دیا ہے۔ جل پریوں کا تصور انسان کا بہت پرانا تصور ہے کہ جن کا منہ انسان کی طرح اور باقی سارا دھڑ مچھلی کا سا ہوتا ہے۔ اس افسانے میں کچھ جل پریوں کو داستانوی کردار میں پیش کر کے مثالی پند و نصائح پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جل پریوں کو سمندر کے کنارے ایک نوجوان کی لاش ملی ہے اور سب جل پریاں باری باری اس کے مرنے کی وجوہات پہ بات کر رہی ہیں جو بالکل ایک داستان کا میدان محسوس ہوتا ہے اور جل پریوں کی بحث ایک طلسماتی فضا بنا دیتی ہے اور یہی گفتگو اس افسانے کے ذریعے خلیل جبران کے نظریات کو ہم تک پہنچاتی ہے۔ پہلے افسانہ نگار جنگ کی ہولناکیوں کو موضوع بناتا ہے:

"ایک بولی:

"یہ آدمی کل اس وقت پانی میں اترا تھا، جب سمندر بپھرا ہوا تھا۔"

دوسری نے کہا:

"سمندر تو بپھرا ہوا نہیں تھا، ہاں! انسان۔۔۔۔ جو اپنے تئیں دیوتاؤں کا جوہر سمجھتا ہے۔ ایک خوف ناک جنگ میں مبتلا ہے، جس میں اب تک اتنی خوں ریزی ہو چکی ہے کہ پانی کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔ یہ آدمی اسی جنگ کے مقتولوں میں سے ہے۔""[۱۷]

پہلے خلیل جبران نے کہانی میں جنگ کے مسموم اور مذموم مقاصد کو عیاں کیا ہے جس کی تہہ میں اترنے سے یہی سمجھ آتا ہے کہ خلیل جبران دنیا کو امن کا گہوارہ دیکھنا چاہتا ہے اور جنگوں سے انسان کو دور رکھنا

چاہتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خلیل جبران نے جنگِ عظیم اول کا زمانہ دیکھا تھا اور دنیا میں اس کی تباہ کاریاں بھی دیکھیں تھیں شاید وہ اسی لیے ایسے ماحول سے بے زار تھا کہ انسان محبت، خلوص اور پیار کو بھول کر تباہی کے راستے پر چل نکلا ہے۔

افسانے میں آگے محبت کا ذکر چھیڑ کر افسانے کو مزید جذباتی اور رومانوی بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ جب ایک جل پری کو لاش کی جیب سے ایک خط ملتا ہے، خطوں کا آنا اور اچانک موصول ہونا داستانوں کا مشہور طریقہ ہے۔ اس خط میں لاش والے شخص اور اس کی محبوبہ کے درمیان محبت کے جملے ملتے ہیں کہ محبوبہ تڑپ تڑپ کے خط میں لکھتی ہے:

> ”جب محبت نے ہمارے دلوں کو ایک کیا تھا، تو ہمیں امید تھی، ہمارے جسم آپس میں اس طرح گھل مل جائیں گے کہ ان دونوں میں ایک ہی روح گردش کرے گی۔
>
> اچانک جنگ نے تمھیں پکارا تم ”فرض“ اور ”وطنیت“ کے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔
>
> یہ کون سا ”فرض“ ہے، جو دو محبت کرنے والوں کو جدا کر دے، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم بنا دے؟
>
> یہ کون سی ”وطنیت“ ہے، جو معمولی معمولی باتوں پر شہروں کو تباہ و غارت کرنے کے لیے جنگ برپا کر دے؟“(۱۸)

اس خط کے اقتباس کو پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں آکر اپنا مقصد بھی بھول گیا ہے اور تباہی در تباہی کر کر کے دنیا کو اپنے لیے جہنم بنا بیٹھا ہے۔ اسے چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے جنت سے نکال دیا گیا تھا اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی انھیں حرکتوں کی وجہ سے اسے دنیا بدر کر دیا جائے۔ اس داستانوی و حکائی کہانی کے ذریعے خلیل جبران نے محبت اور امن کو جنگ اور بارود پر ترجیح دی ہے اور باہمی پیار محبت کو فروغ

دینے کی مثالی نصیحت کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ اب انسان کا دل نفرت، بغض، حسد اور لالچ میں پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو چکا ہے کہانی کے آخر پہ ایک جل پری کی بات ملاحظہ کیجیے:

> "جل پریوں نے وہ خط نوجوان کی جیب میں اسی طرح رکھ دیا اور غم ناک خاموشی کے ساتھ واپس ہو گئیں۔ تھوڑی دور جا کر ان میں سے ایک نے کہا:
>
> "انسان کے دل تو بتوں کے دل سے بھی زیادہ سخت ہیں۔"(۱۹)

اس اقتباس سے خلیل جبران کے نظریات کا کھل کر پرچار ہوتا ہے اور افسانہ نگار نے اپنے موقف کو بیان کرنے کے لیے کمال داستانوی اسلوب کو اپنایا ہے اور خوب نبھایا ہے۔ اب واقعی میں ایک جانور یہ کہہ رہا ہے کہ انسان کا دل بتوں پتھروں سے بھی بڑھ کر سخت ہو گیا ہے۔

خلیل جبران نے اپنے افسانے "چودھویں کا چاند" میں ایک کے سے کے انداز میں حیوانی کرداروں کے سلسلے کو آگے بڑھایا ہے جس میں وہ کتوں کے ذریعے سے اپنے پیغام کو عام کر رہے ہیں کہ اس افسانے میں چند کتے رات آسمان پہ چمکنے والے چاند پہ بھونکتے ہیں کہ ان میں سے ایک سنجیدہ کتا ان سب کو منع کرتا ہے کہ اس قدر بھونکنے سے کیا چاند کو زمین پر بلانا چاہتے ہو تو لہٰذا سب چپ کر جاؤ اور خود ساری رات ان کو چپ کروانے کے لیے بھونکتا رہتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ شہر کے تمام کتوں نے چاند پر بھونکنا شروع کر دیا۔
>
> صرف ایک کتا خاموش رہا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دوسروں سے کہا۔
>
> "سکوت کو اس نیند سے نہ جگاؤ اور چاند کو اپنی للکار سے زمین پر نہ بلاؤ۔"
>
> دوسرے کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ ہولناک خاموشی چھا گئی۔ لیکن وہ کتا جس نے دوسروں کو چپ رہنے کو کہا تھا۔ ساری رات خاموشی کی تلقین میں بھونکتا رہا!"(۲۰)

اس افسانے میں خلیل جبران نے کئی ایک استعاروں اور علامتوں میں بات کی ہے کہ جس میں ہمیں اس بات کی سمجھ آتی ہے کہ ہم میں بہت سے لوگ دوسرے لوگوں پر اپنے اچھے اور ناصح ہونے کی دھونس جماتے رہتے ہیں مگر وہ خود سب سے بڑے سکون کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں اس کے علاوہ اس افسانے میں یہ بھی بات سمجھ آتی ہے کہ انسان اپنے سے برتر انسانوں سے ہمیشہ خائف رہتا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمالات سے حاسد رہتا ہے اسی لیے ان پر طرح طرح کی باتیں بناتا رہتا ہے۔

خلیل جبران نے افسانہ "نو بار مرنا پڑے گا" میں داستانوی فضا قائم کرکے، اس میں لوک داستانوں جیسا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک دیہاتی اور شاعر دو کردار ہیں کہ دیہاتی سادہ لوح ہے اور شاعر عاقل اور پڑھا لکھا۔ دونوں کی باہم گفتگو ہوتی ہے اور دیر تک ایک دوسرے کو باتیں سناتے رہتے ہیں۔ دیہاتی شاعر سے کہتا ہے:

"میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں، جسے میں نے حال ہی میں سنا ہے۔ ایک چوہا پنجرے میں پھنس گیا اور پنجرے میں قید ہو کر بھی وہ مزے سے اندر پڑا پنیر کا ٹکرا کھا رہا تھا۔ باہر ایک بلی آن کھڑی ہوئی، چوہا پہلے تو ڈرا، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو پنجرے میں قید ہے اور بلی کے پنجوں سے محفوظ! یہ دیکھ کر بلی بولی۔

"میرے دوست، جانتے ہو کہ تم اپنا آخری کھانا کھا رہے ہو!"

"ہاں" چوہے نے جواب دیا۔ "میرا جیون ایک ہے اس لیے موت بھی ایک ہی ہو گی! لیکن تمہارا کیا خیال ہے خالہ؟"

"سنتے ہیں نو جیون ہیں تمہارے۔ اس خیال کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں نو بار مرنا پڑے گا۔"(۲۱)

اس کہانی سے خلیل جبران یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیر کی طرح زندگی گزارو کہ انسان کو وہی زیب دیتا ہے اور چوہے کی طرح ایک بار مرنے اور جینے سے اچھا ہے کہ دوسروں کا در در کھتے ہوئے روز ہی جینے کی تمنا اور مرنے سے بچنے کی تدبیر کی جائے۔ اس افسانے میں داستانوی فضا قائم کر کے جانوروں کے ذریعے سے بات سمجھائی گئی ہے کہ داستانوں کے قدیم کرداروں میں چوہے اور بلی کی چپقلش کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی انھیں اسی طور برتا اور پیش کیا جاتا ہے۔

کتوں پر علامتی و استعاراتی پیرائے میں خلیل جبران نے کئی ایک افسانے لکھے ہیں ہر افسانہ پہلے سے بڑھ کر تعبیر اور تفہیم کا متقاضی نظر آتا ہے، مستزاد اس پر یہ کہ حکائی و داستانوی اسلوب افسانے کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ خلیل جبران کا افسانہ ''شکار اور شکاری'' کتوں اور انسانوں کے درمیان انسان اور حیوان سوچ کے درمیان کی کڑی اور تفاوت پر لکھا ایک شاہکار افسانہ ہے اگرچہ یہ افسانہ مختصر ہے مگر اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے۔

اس افسانے میں افسانہ نگار نے کتوں کی اسی بھونک کا ذکر کیا ہے جو اکثر وہ چاند کو دیکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ کتوں کی باہمی گفتگو سے ایک خاص داستانوی فضا قائم ہو جاتی ہے جس سے نصیحتوں کے کئی رخ سامنے آتے ہیں۔۔ تین کتے اور تینوں ہی اپنی اپنی بڑائی بیان کر رہے ہیں ایک تو یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ انسانوں کی بنائی گئی جدید تہذیب اور سائنس کی چیزیں کوئی فائدے کی چیزیں نہیں ہیں اور ان کوئی فائدہ نہیں ہے یہ بالکل ہی بے کار ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''تین کتے دھوپ میں بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔

ایک کتے نے اونگھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

"آج کتوں کی دنیا میں رہنا بھی کیا غضب ہے۔ دیکو تو ہم کس بے تکلفی سے، ہوا میں، پانی میں اور زمین پر چل سکتے ہیں اور ذرا ان ایجادوں پر بھی غور کرو، جو صرف ہماری آسائش کے لیے اختراع ہوئی ہیں۔ ہماری آنکھ، کان اور ناک کے لیے۔"(۲۲)

اسی طرح جدید دور کی ترقی اور سائنس کی نت نئی دریافتوں پر کتے بیٹھے تنقید کر رہے تھے کہ اچانک ایک طرف سے ایک انسان انھیں جدید ہتھیاروں سے لیس ان کو شکار کرنے آجاتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہی سب دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں اور تہذیبِ حاضرہ سے خائف نظر آتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"۔۔۔۔۔ ان سب نے کتوں کے شکاری کو آتے دیکھا، بس پھر تو بھاگنے لگے سب دم دبا کر۔

تینوں کتے بے تحاشا بھاگ رہے تھے اور ایک چلا چلا کر کہہ رہا تھا ارے بھائی! خدا کے لیے نکل جاؤ جانیں بچا کر کہ تہذیبِ حاضرہ ہمارے تعاقب میں ہے!"(۲۳)

بھاگتے چلاتے کتے کی آخری بات ہی ہمارے انسانوں میں انسان اور کتوں کی ہامی نسل انسان کا فرق بتاتی ہے کہ جو لوگ نئی ٹیکنالوجی، نئی سائنسی ایجادات اور انٹرنیٹ سے خائف ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ خود تو آگے نہیں بڑھنا چاہتے مگر ساتھ میں دوسرے انسانوں کو بھی پتھر کے زمانے میں ہی دھکیلنا چاہتے ہیں۔ مگر کمال بات اس بھاگتے کتے نے کی کہ یہی تہذیب جسے آپ ٹھکرا رہے ہیں آپ کو کچل کر آگے نکل جائے گی اور آپ دیکھتے رہ جائیں گے۔ دنیا آسمانوں پہ کمندیں ڈال رہی ہے، مریخ پہ بستیاں بسا رہی ہے اور ہم میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں اور ہماری ہی صفوں میں ہیں جو کہ انٹرنیٹ اور سائنس کے مخالف ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اچھے سے اچھا موبائل خریدتے ہیں اور گاڑی بھی ایئر کنڈیشن والی استعمال کرتے ہیں۔ اس افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار نے داستانوی اسلوب اور افکار کو استعمال کرتے ہوئے جدید زمانے سے پند و نصیحت کو ملایا ہے۔ شکار اور شکاری یہ داستانوں کی بات اور سائنس، تہذیبی مسائل اور جدید آلات یہ نئے دور کے الفاظ ہیں۔

خلیل جبران نے جانوروں کے ذریعے سے داستانوی سلسلوں کو جوڑنے اور پھر ان سے کہانیاں بنانے کا خوب کام لیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلی کو حضرت نوحؑ نے اپنی کشتی میں چوہوں کے تدارک کے لیے پیدا کیا تھا اور وہاں اس سے اس کی ضرورت کا کام لیا تھا۔ مگر خلیل جبران نے جدید دور میں بلی کی مدد سے مختلف نظریات کے پرچار کا کام لیا ہے اور اپنی سوچ اور خیالات کو ایک بلی کی زبانی بیان کیا ہے اور انسانوں کی غلام ذہنیت کو بیان کیا ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "بوڑھی ملکہ" اسی نوعیت کا دلچسپ افسانہ ہے کہ جس میں ایک بوڑھی ملکہ اپنے تخت پر سوئی ہوئی ہے جس کی گود میں ایک بلی بھی ہے اور چار غلام کھڑے اس کو پنکھا جھل رہے ہیں۔ جو اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بوڑھی ملکہ کو باتیں کر رہے ہیں اور بلی ان کی باتوں کا دلچسپ جواب دے رہی ہے۔ بلی کا کردار اور پھر اس کا بات کرنا، ملکہ، دربار اور درباری یہ سب داستانوی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "پہلے غلام نے کہا۔ "بوڑھیا نیند میں کس قدر بدصورت نظر آتی ہے۔ دیکھو تو اس کا چہرہ کیسے لٹک گیا ہے اور سانس کس طرح لے رہی ہے۔ جیسے شیطان اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔"
>
> بلی نے غراتے ہوئے کہا۔ "یہ نیند کے عالم میں اتنی بدنما معلوم نہیں ہوتی جتنے کہ تم غلام، بیداری کی حالت میں معلوم ہوتے ہو۔"
>
> دوسرے غلام نے کہا۔ "تم یہ سوچ رہے ہوگے کہ نیند میں اس کی جھریاں گہری ہونے کے بجائے نکھر رہی ہیں۔ یہ ضرور کوئی برا خواب دیکھ رہی ہے۔"
>
> بلی نے غرا کر کہا۔ "کاش تم بھی سو کر اپنی آزادی کے خواب دیکھتے۔"
>
> تیسرے غلام نے کہا۔ "غالباً یہ ان لوگوں کا جلوس دیکھ رہی ہے جو اس نے قتل کیے۔"

بلی نے غراتے ہوئے کہا۔ "ہاں یہ تمھارے آباؤ اجداد اور تمھارے ورثا کا جلوس دیکھ رہی ہے۔"

چوتھے غلام نے کہا۔ "اس کے متعلق باتیں کرنا تو ایک اچھا مشغلہ ہے لیکن کھڑے کھڑے پنکھا جھلنا کچھ کم مصیبت نہیں۔"

بلی نے غراتے ہوئے کہا۔ "تم ابد تک پنکھا جھلتے رہو گے۔ جیسے تم زمین پر ہو، ویسے ہی آسمان پر رہو گے۔""" (۲۴)

چاروں غلاموں کی باتوں کے بلی نے خوب جواب دیے ہیں جو آج بھی ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کے غلاموں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان غلاموں کی سوچ پر بلی تبصرہ کرتی ہے اور ان کے مستقبل کا فیصلہ بھی کرتی ہے:

"بلی نے غرا کر کہا۔ "جھلتے جاؤ۔ ہاں پنکھا جھلتے جاؤ بے وقوفو اور اس آگ کو ہوا دیتے جاؤ۔ جو تمھیں لپیٹ میں لے رہی ہے۔" (۲۵)

غلام لوگوں کی ذہنیت پر یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ جس میں خلیل جبران نے مثالی نصائح کی فضا قائم کرتے ہوئے اپنے دور کے غاصب حکمرانوں کے خلاف اپنی قوم کو ایک آواز ہو کر اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دی ہے مگر یہ اس قدر غلامی میں راسخ ہو گئے ہیں کہ انھیں کچھ بھی سمجھ نہیں آتا اور یہ بلی کے مطابق: اسی آگ کو ہوا دے رہے ہیں جو ان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے مضطرب ہے۔

ایسے ہی داستانوی اسلوب میں جانوروں اور جانداروں پہ مبنی خلیل جبران کے ہاں کئی ایک افسانے ہیں کہ جن سے وہ دنیا کو نت نئی کہانیاں بھی دیتا ہے اور خیالات کے ساتھ اخلاقی اسباق اور پند و نصائح بھی۔ خلیل جبران کی ایک کہانی "سکوتِ جنوں خیز" اپنی بنت کے لحاظ سے تو داستان کی طرح سادہ کہانی ہے مگر معنوی اعتبار سے ایک پر مغز کہانی ہے۔ جس میں خلیل جبران نے دو ننھے سے جانداروں کے ذریعے سے کہانی کا پلاٹ

تیار کیا ہے جس میں ایک مینڈک اور ایک مینڈکی ہے کہ جو اپنے ساتھیوں سمیت رات رات بھر شور شرابہ کرتے رہتے ہیں جن سے انھیں خیال آیا کہ اب ہم چپ کر جاتے ہیں کہ ہمارے ٹرانے سے جھیل کے اس پار رہنے والے لوگ پریشان ہوتے ہوں گے اور ان کی نیندیں بھی خراب ہوتی ہوں گی مگر اس کے بعد کیا ہوا دیکھیے:

"اس رات مینڈک خاموش رہے۔اور دوسری رات بھی نہ ٹرائے۔۔۔اور تیسری رات بھی۔

لیکن اس پر قصہ یوں ہوا کہ وہ باتونی عورت جو جھیل کے ادھر والے کنارے پر رہتی تھی تیسری صبح ناشتے پر اپنے گھر والوں سے شکایت کر رہی تھی۔

"میں تین رات سے بالکل نہیں سوئی۔۔۔پہلے جب مینڈک موئے ٹراتے تھے تو کم از کم نیند تو آجاتی تھی۔اب جانیں تین رات سے انھیں کیا ہوا ہے۔سانپ سونگھ گیا ہے کہ بالکل ٹراتے ہی نہیں اور ادھر بے خوابی سے میرا دماغ پھٹا جاتا ہے۔"

مینڈک نے سنا تو مینڈکی کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے بولا۔

"اس خاموشی سے ہم بھی پاگل ہوئے جاتے تھے، نہیں کیا؟"

مینڈکی بولی۔

"ہاں کیوں نہیں۔رات کا یہ سناٹا ہمارے لیے بھی تو وبال ہی بنا ہوا تھا۔مگر تم نے تو دیکھ ہی لیا نا۔کہ ہمارے لیے خاموش رہنا ایک سرے سے ضروری ہے ہی نہیں اور پھر ان کی خاطر جو اپنے خلا کو شور سے بھر ارکھنا چاہتے ہوں!"[۲۶]

اس افسانے سے کئی ایک تعبیریں اور مفاہیم نکالے جاسکتے ہیں سب سے پہلا تو یہ کہ آدمی جب جس بھی ماحول میں رہنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کو وہی ماحول پسند آتا ہے چاہے وہ گھٹیا اور کم تر ہی کیوں نہ

ہو۔ دوسرا یہ کہ آدمی نے ہی اپنے ماحول اور معاشرے کو خراب کیا ہے اور ہم اسے قطعاً بھی ٹھیک نہیں کرنا چاہتے۔ اس افسانے میں شور ایک علامت اور استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے کہ آپ اس کی جگہ آلودگی، دہشت گردی، رشوت اور برائی جیسی کئی ایک بیماریوں اور مسائل کا ذکر کر سکتے ہیں اور مینڈکی نے ٹھیک ہی کہا کہ ہم خود اب ٹھیک ہی نہیں ہونا چاہتے تو ہمیں کوئی کیسے ٹھیک کر سکتا ہے۔ ہے تو خاموشی ایک اچھی چیز مگر ہم شور میں رہنے کے عادی ہیں جس سے چھٹکارا اب ممکن نہیں رہا۔ افسانہ نگار نے کس خوش اسلوبی سے داستانوی پند و نصیحت کی مثالی دنیا بنائی ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "رہبانیت" ایک دلچسپ داستانوی اور حکایت پر مبنی اسلوب کا افسانہ ہے کہ جس میں خلیل جبران نے جانوروں، پرندوں اور چرندوں کے ذریعے سے بات کو سمجھایا ہے کہ ایک راہب تھا جو کہ بستی سے دور بہت دور پہاڑوں پر رہتا تھا اور اس کی پاکیزگی کی وجہ سے کئی جانور، چرند اور پرند اس کے پاس آ کے تعلیمات لیا کرتے تھے ایک رات وہ محبت پہ بات کر رہا تھا تو کیا ہوا سنیے:

"ایک شام جب وہ محبت کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ تو ایک شیرنی نے اپنا سر اٹھایا اور راہب سے پوچھا۔

"حضور آپ ہم سے تو محبت کی کہانیاں کہہ رہے ہیں لیکن خود آپ کی اپنی جورو کہاں ہے؟"

راہب بولا۔

"میری کوئی جورو نہیں ہے۔"

اس پر چرندوں، پرندوں، درندوں کے اس انبوہ میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی، اس کی کوئی نہیں سنتا تھا۔ سب اپنی ہی ہانکتے جاتے تھے۔ قیامت کا شور بے پناہ شور بپا تھا۔

"یہ ہمیں محبت کرنے کا، گھر بسانے کا درس کیوں کر دے سکتا ہے۔ جب کہ اس نے خود نہ کبھی محبت کی، نہ کبھی گھر بسایا!"

اس نفرت میں وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔"(۲۷)

اس اقتباس اور افسانے کے داستانوی بیانیے سے جو پہلی نصیحت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی وہ کام نہیں کہنا چاہیے کہ جو ہم خود نہ کرتے ہوں، ہم وہ کام کیسے کہہ سکتے ہیں جس پر ہمارا خود اپنا کوئی عمل نہ ہو۔ دوسری نصیحت یہ کہ انسان اپنے معاشرے سے کٹ کر دنیا کے لیے بے گانہ ہو جاتا ہے اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا اگرچہ وہ دنیا اور معاشرے کو تیاگ کر پاکیزگی اور نیکی کے اعلیٰ ترین مرتبے پہ کیوں نہ پہنچ جائے اس کی قدر تو چرند پرند اور درند بھی نہیں کریں گے کیوں کہ اس کے پاس انسانیت کے احساس جیسی کوئی شے ہو گی ہی نہیں۔ اس لیے رہبانیت کو مذہب میں منع کیا گیا ہے۔ افسانے میں جانوروں کا ذکر کر کے بات میں اور بھی وزن پیدا کیا گیا ہے ایک اس طرح کہ راہب نیکی کے اس معیار پر متمکن ہے کہ جانور تک زانوئے تلمذ تہہ کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ انسانیت سے کٹ کر آپ جانوروں تک کو مطمئن نہیں کر سکتے اور وہ بھی آپ کو ادنیٰ اور نالائق سمجھ کر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کہانی سے تو پنچ تنتر کی سی داستانوی فضا قائم ہو جاتی ہے اور اسی طرح مثالی نصیحتیں بھی نظر آتی ہیں۔

خلیل جبران کا ایک افسانہ "معمار" حکائی اسلوب میں گندھا داستانوی افسانہ ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے گدھوں کے باہمی مکالمے سے کہانی کو ایک کمال اپج دی ہے۔ افسانے میں ملک انطاکیہ میں موجود دریائے آسی پر بنائے گئے پل کی بابت کہانی بنی گئی ہے جو کہ خچروں اور گدھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر بنایا گیا تھا مگر اس پر بادشاہ نے تکمیل کے بعد اپنا نام لکھوا لیا کہ یہ میں نے بنوایا ہے شاہ انطاکیوس نے۔ مگر ایک پاگل اس تحریر کو مٹا کر لکھ دیتا ہے کہ یہ خچروں کی پیٹھوں پہ پتھر لاد کر بنایا گیا ہے تو لہٰذا جب یہاں سے گزرو تو یہی سمجھو کہ تم خچروں کی پیٹھ سے گزر رہے ہو اس پر لوگوں نے کچھ طنز کیا اور مختلف جملے کسے، مگر خچروں نے بھی کچھ کہا سب باتیں سنیے:

"اور جب لوگوں نے اس جوان کا کتبہ پڑھا تو بعض تو صرگ ہنس دیے۔ بعض اس کی ذہانت پہ حیران رہ گئے اور بعض نے صرف اتنا کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ یہ اس پاگل کا کام ہے۔ جس کے دماغ کے پیچ ذرا ڈھیلے ہو گئے ہیں!"

مگر ایک خچر نے ہنستے ہوئے دوسرے خچر سے کہا۔

"تمھیں یاد نہیں کیا کہ یہ پتھر ہم نے ڈھوئے تھے۔"

"مگر اس کے باوجود آج تک یہی کہا جا رہا ہے کہ یہ پل شاہ انطاکیوس نے بنایا تھا!"(۲۸)

اس افسانے میں جانوروں کا بات کرنا، پاگل کا ایک عقل و دانش مندی کی بات کو لکھنا، بادشاہ کا خدمت کرنے کا دعویٰ اور نیک و پارسا ہونا بالکل داستانوی افکار کی حامل فضا ہے۔ افسانے کے اس اقتباس کو پڑھ کر کئی ایک نصیحتوں پر مبنی باتیں سامنے آتی ہیں جن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں کبھی بھی کسی کے کام کا اعزاز اپنے نام نہیں لینا چاہیے اور ہمیشہ دوسروں کا احترام کرنا چاہیے اور حق حقدار تک پہنچانا چاہیے۔ عقل مند لوگوں کو ہم اکثر پاگل سمجھتے ہیں یا پھر پاگل ہم سے زیادہ عقل مند ہونے کی وجہ سے پاگل ہو جاتے ہیں یا ہم انھیں سمجھ ہی نہیں پاتے اور ان کے کاموں کو فضول ہی جان کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ جانور ہم کو گدھے اور خچر سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم ان سے کام لے کر اپنا نام لکھوا دیتے ہیں اور ہونا چاہیے کہ جس کا کام ہو اس کا نام ہو تو خچروں کے نزدیک بادشاہ خچر اور گدھا ہے کہ اپنا نام لکھوا کر خود ہی گدھا یا خچر بن گیا کیوں کہ سب کو پتا ہے کہ یہ پل خچروں کی پیٹھوں پہ لاد کر لائے گئے پتھر سے تعمیر ہوا تھا۔

خلیل جبران نے ایسی کئی جانوروں اور پرندوں پر مبنی کہانیاں لکھی ہیں کہ جن سے اخلاقیات و نصائح کے ساتھ ساتھ پرانے زمانے کی داستان نگاری کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے۔

اپنے افسانے "عقاب اور لوا" میں خلیل جبران نے زندگی کی اصل حقیقت کو سمجھنے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز اور مخلوق ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں بل کہ اس کی جناب میں سب برابر اور ایک

جیسے ہیں بس شکلیں اور کام مختلف ہیں۔ اپنی اس کہانی میں عقاب اور لوے کی گفتگو کے دوران عقاب کی نخوت کو دکھاتے ہوئے بڑے لوگوں کے غصے کو ظاہر کیا ہے اور عقاب اسی طرح پنجہ مارتے ہوئے لوے کو حقیر کہہ کر دھتکار دیتا ہے مگر لوا اسے کہتا ہے کہ ہم ایک ہی خاندان سے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"لوے نے پوچھا۔

"امید ہے حضور بخیریت ہوں گے۔"

"ہوں" عقاب بولا" اور مابدولت بخیریت ہیں۔۔۔ لیکن کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ہم تمام پرندوں کے بادشاہ ہیں اور تمہیں ہم سے خطاب کی جرات اس وقت تک نہ کرنا چاہیے جب تک ہم خود ایسا پسند نہ فرماویں۔"

لوا بولا۔

"میرا تو خیال ہے کہ ہم سبھی ایک ہی گھرانے سے ہیں۔"

عقاب نے اس کی طرف بڑی حقارت سے دیکھا اور کہا۔

"کس نے پھونکا یہ تیرے کان میں کہ تو اور ہم ایک ہی گھرانے سے ہیں۔"(۲۹)

اس اقتباس سے بڑے لوگوں کی چھوٹوں سے نفرت عیاں ہوتی ہے کہ ان میں نہ جانے یہ اکڑ کہاں سے آ جاتی ہے کہ لوے کا کہنا ٹھیک ہے کہ ہم سب ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم سب ایک ہی جیسے ہیں کسی میں کوئی خوبی ہے اور کسی میں اللہ نے کوئی اور خوبی رکھ دی ہے اور یہی بات لوا عقاب کو سمجھاتا ہے جو اسے سمجھ نہیں آتی اور بگڑ کر لوے کو مارنا شروع کر دیتا ہے کہ لوا بھاگ کر عقاب کی پیٹھ پر چمٹ جاتا ہے اور اس کے پر نوچنا شروع کر دیتا ہے اور عقاب اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر لوا اس کی پیٹھ سے نہیں اڑتا اور نہ ہی اس کی جان چھوڑتا ہے کہ تھک ہار کر وہ عقب دوبارہ اسی چٹان پہ اتر آتا ہے اور نیچے سے

ایک معصوم کچھوی سارا ماجرا دیکھ کر مسکراتی ہے کہ عقاب تولوے کا گھوڑا بنا ہوا ہے۔ پھر عقاب کا رویہ کیسا ہے ، دیکھیے:

”۔۔۔۔۔ایک چھوٹی سی کچھوی نکل آئی اور اس مضحکہ خیز منظر کو دیکھ کر کچھ اس طرح ہنسی کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی، عقاب نے بڑی نخوت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”او زمین پر رینگنے والے کیڑے، بھلا تمہیں کس بات پر ہنسی آ رہی ہے۔“

کچھوی بولی۔

”اس بات پر کہ تم گھوڑا بن گئے ہو۔ ایک ننھا سا چڑا (لوا) تم پر سواری کر رہا ہے اور وہ ننھا چڑا تم سے افضل ہے!“

اس پر عقاب بولا۔

”ارے راستہ ناپو اپنا تم۔۔۔راستہ! یہ ہماری گھریلو بات ہے میری اور میرے بھائی لوے کی۔۔۔۔!“[۳۰]

اس اختتامی اقتباس کو دیکھ کر کئی ایک باتیں سمجھ میں آتی ہیں کہ یہ زور آور اور زردار لوگ پہلے تو کسی کو اپنا جیسا نہیں مانتے اور جب اگلا آدمی ان سے بڑھ کر ہو یا ان کی ٹکر کا ہو تو اس کو بھی اپنے ہی جیسا مان لیتے ہیں، اپنے سے بڑا یا عظیم نہیں مانیں گے، دوسرا یہ کہ ان لوگوں کے اندر کا خناس کبھی ختم نہیں ہوتا اور ان کی زمانے میں جتنی بھی تذلیل ہو جائے یہ غریب غربا اور کمزور لوگوں کو اپنے سے حقیر ہی جانیں گے جیسا کہ عقاب ذلیل اور خوار ہونے کے بعد بھی کچھوی کو طعنے دے رہا تھا اور اسے طنز کے تیروں سے زخمی کرتے ہوئے بھاگ جانے کو کہہ رہا تھا۔ کچھوا کردار تو باقاعدہ داستانوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، پھر عقب اور لوا سے داستانوی خیال کو آگے بڑھانا بالکل مثالی اندازِ نصیحت ہے۔

ایسا حکائی اسلوب اور داستانوی افکار پر مبنی خلیل جبران کے ہاں کافی مواد موجود ہے کہ جن سے افسانہ نگار کے وسیع مطالعے کے ساتھ ساتھ کہانی اور اسلوب پر مکمل گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔

ب۔ انتظار حسین کے افسانوں میں داستانوی افکار کے فنکارانہ اظہار کا مطالعہ:۔

انتظار حسین اردو کے اہم معتبر اور نامور افسانہ نگار ہیں نہ صرف افسانہ نگار بل کہ ناول، تنقید اور اردو کالم نگاری میں بھی وہ ایک بڑا نام ہیں۔ مصنف موصوف کی تحریریں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ انھوں نے دنیا بھر کے ادب اور علم کا مطالعہ کر رکھا تھا اور نہ صرف مطالعہ ہی کر رکھا تھا بل کہ اس مطالعے کو ہضم کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اور پھر اس کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کا جادو اور اسلوب میں کھپانے کا جوگر ان کے ہاتھ آ گیا تھا کم از کم اردو کے کسی افسانہ نگار کے ہاں وہ اسلوب نہیں ملتا۔ گنگا جمنی تہذیب، مسلم ہند ثقافتی جڑیں اور مستزاد اپنی شناخت کا فقدان اور ہجرت کا کرب مل کر ان کے ہاں ایک خاص شخصی تلاش اور شخص کی تنسیخ کا حوالہ بن کر ابھرتے ہیں۔ ان سب میں اسلوب کی چاشنی قصہ کہانیوں کی سمعی روایت، دیومالائی طلسم، داستانوی فضا، مذہبی کہانیاں اور قصے، جاتک کہانیاں، رامائن اور مہابھارت کی جھلک اور قرآنی واقعات کے ساتھ ساتھ عہد نامہ عتیق وجدید کو اپنی کہانیوں میں سمو کر ایک نیا داستانوی اسلوب بنا ڈالا ہے کہ جن کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ اس کے ہاں ایک خاص داستانوی افکار کا نظام پایا جاتا ہے۔ اسی داستانوی اسلوب اور افکار کے بارے قاضی افضال حسین لکھتے ہیں:

> ”انتظار حسین نے تشکیلِ متن کا جو مخصوص اسلوب اختیار کیا اس کا سلسلہ مشرق میں داستانوں کی زبانی روایت سے ملتا ہے۔“(۳۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظار حسین کے پاس جو داستانوی افکار کا سلسلہ ہے وہ مشرقی اقوام کے ربط میں ہے جب کہ انتظار حسین نے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے علاوہ مذاہب کا بھی اچھا خاصا مطالعہ

کیا ہوا تھا جن کے داستانوی اسلوب اور اندازِ فکر کو انھوں نے بڑی ہنروری اور مہارت سے استعمال کیا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا موقف دیکھیے:

> "انتظار حسین کا فن اپنی قوت ان تمام سرچشموں سے حاصل کرتا ہے جو تہذیبی روایات کا منبع ہیں یعنی یادیں، خواب، انبیا کے قصے (داستانیں)، دیومالا، توہمات، ایک پوری قوم کا اجتماعی مزاج اور اس کا کردار اور اس کی شخصیت۔"(۳۲)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے لہٰذا ہم اپنی آسانی اور تفہیم کے لیے پہلے کی طرح داستانوی افکار پر مبنی افسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار

انتظار حسین کے ہاں تو داستانوی افکار کی بھرمار ہے اور ان کا سلوب تو باقاعدہ داستانوی اسلوب ہے کیوں کہ ان کا ماننا ہے کہ کہانی لکھنے کی نہیں بلکہ سننے سنانے کی چیز ہے تو اس سلسلے میں داستانوی اسلوب اور طرز کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔افسانہ نگار کے ہاں داستان کا خاص عنصر مافوق الفطرت عناصر کئی افسانوں میں پایا جاتا ہے مگر یہ عناصر ان کے تیسرے افسانوی مجموعے میں کھل کر سامنے آیا جس میں آخری آدمی، زرد کتا، پرچھائیں، ہڈیوں کا ڈھانچ، کایا کلپ، ٹانگیں، سوئیاں، اور سوت کے تار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ان سارے افسانوں کی فضا داستانوی اور ماحول طلسماتی ہے۔یوں کہہ لیں کہ تیسرے افسانوی مجموعے پر مبنی کتاب "آخری آدمی" میں بالکل سیدھے طریقے سے اور سادہ اسلوب میں داستانوی افکار کا استعمال کیا گیا ہے جس میں مذہبی اساطیر اور جانوروں سے متعلق کئی ایک داستانوں کو پیش کیا گیا ہے۔

آخری آدمی کا افسانہ آخری آدمی اپنی بنت اسلوب اور خیال کے لحاظ سے بالکل داستانوی اور اساطیری ہے کہ اس میں قرآن میں بتائی گئی ایک بستی سے واقعہ لیا گیا ہے اور اسی واقعے سے متعلق کہانی گھڑی گئی

ہے۔ایک آدمی جو اس بستی پر عذاب آجانے کے بعد بچ رہا اور اس نے آخر دم تک کوشش کی کہ وہ خدا کے عذاب سے بچا رہے مگر وہ آخر کار بندر کی جون میں تبدیل ہو ہی جاتا ہے۔اقتباس دیکھیے:

"الیاسف اس قریے میں آخری آدمی تھا،اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔"(۳۳)

افسانہ نگار نے کردار الیاسف کی طرف سے انسان کی ہی جون میں رہنے اور آخر دم تک انسان ہی بنے رہنے کی کوشش کو دکھایا ہے مگر وہ جو اپنی بستی کا سب سے دانا اور زیرک انسان تھا وہ اتنا ہی مکار اور چالاک آدمی بھی تھا کہ اس نے اللہ اور اس کے بندے کے ساتھ مکر کیا تھا اور اللہ تو سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے۔اس نے اللہ سے مکر کی تدبیر لڑائی۔ملاحظہ کیجیے:

"اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا۔اور الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا سمندر سے فاصلہ پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اس کو سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔"(۳۴)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ الیاسف نے خدا سے مکر کیا اور اسے اس کی سزا ملی اور دوسرا اس نے یہ گناہ کیا کہ اللہ کے محبوب کا حکم نہیں مانا اور اس سے ٹھٹھہ کیا۔اسی لیے اس نے ساری بستی کو اپنے سامنے بندر بنتے دیکھا اور ڈر گیا کہ کہیں میں بھی بندر نہ بن جاؤں اس لیے اس نے اسی آدمی کے گھر کا رخ کیا مگر وہ سمجھانے والا شخص جا چکا تھا۔پھر اس کو ایک ایک کر کے وہ لوگ یاد آنے لگے جو اس کی بستی میں بندر بن چکے

تھے اور جسے اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی جون بدلتے دیکھا تھا۔ اسی دوران اسے اپنی محبوبہ بنت الاخضر بھی یاد آئی جو اسے بہت محبوب اور پیاری تھی۔ اس کو یوں یاد کیا:

"اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا اور اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے۔"(۳۵)

مگر اس کے باوجود وہ اپنی بستی کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہے اور کسی بھی طریقے سے وہ اپنی جون نہیں بدلنا چاہتا اور محبوبہ کو بھی چھوڑ بستی سے باہر چلا جاتا ہے۔ وہ سب رشتے ناطے چھوڑ بستی سے چلا گیا مگر اس کی مزاحمت کسی بھی طور اس کے کام نہ آئی۔ وہ نفرت، محبت، غصہ اور خوف سبھی کچھ چھوڑ دیتا ہے کہ ان کی وجہ سے کئی لوگ ہنستے ہنستے بندر بن گئے تھے مگر یہ پھر بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اقتباس دیکھیے:

"الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے (جس میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا تھا)۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے۔ اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔"(۳۶)

اس افسانے کو پڑھ کر عہد نامہ عتیق کی سی داستانوی زبان اور اسلوب نمایاں نظر آتے ہیں اگر چہ کہانی قرآن سے اٹھائی گئی ہے مگر اسلوب عہد نامہ عتیق کا ہے۔ اس افسانے میں انتظار حسین نے مافوق الفطرت نہ صرف کردار دکھائے ہیں بلکہ ایک فضا بھی مافوق الفطرت ہی قائم کی ہے جس میں الیاسف کا بندر بننا، بستی میں لوگوں کا اپنی جون تبدیل کر لینا، مکر اور چالاکیوں کی ترکیب کا استعمال نہایت عمدہ ہے۔ افسانہ نگار نے گناہ کے بعد اپنی سزا سے بچنے کی جو بھاگ دوڑ دکھائی ہے اور اس میں جو جو کاوشیں کار فرما ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔ یہ بالکل انسانی الجھنوں اور پریشانیوں کی ایک لا انتہا بلندیوں تک پھیلے سلسلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جس کے بارے میں مجید مضمر کہتے ہیں:

"آخری آدمی، زمان و مکان سے ماورا اور ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی انسانی الجھنوں اور روحانی اور اخلاقی قدروں کے زوال کا علامتی اظہار ہے۔"(۳۷)

انتظار حسین کا افسانہ "سوئیاں" بھی اپنی بنت اور کہانی کے لحاظ سے داستانوی اسلوب کا حامل افسانہ ہے کہ جس میں داستانوی انداز اپنایا گیا ہے۔ یہ کہانی مافوق الفطرت عناصر، ماحول، کرداروں اور باتوں سے بھری پڑی ہے۔ جو شہزادے، شہزادی اور ایک دیو کی تکون سے تشکیل پاتی ہے جس میں ایک دیو نے شہزادی کو چابیوں کا گچھا دیا اور ایک بات کہی:

"بی بی اس قلعے میں ساتھ کوٹھڑیاں ہیں، ہر کوٹھڑی کی چابی اس گچھے میں ہے تو چھ کوٹھڑیوں کو کھولنا اور جی بہلانا، ساتویں کوٹھڑی مت کھولنا کہ تو اسے کھولے گی تو اپنے سر خرابی لائے گی۔"(۳۸)

اس اقتباس سے ہی ایک طلسماتی اور داستانوی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب وہ شہزادی انسانی فطرت کی طرح روزانہ چھے کوٹھڑیاں تو کھولتی ہے مگر چھٹی کی فکر اور تجسس نے چھٹیوں کی رونق کو ماند کر دیا ہے اور سارے مناظر بے رنگ سے ہو گئے ہیں۔ شدید ذہنی کشمکش کے بعد وہ ساتویں کوٹھڑی کھول ہی لیتی ہے۔ وہاں تھا تو کچھ نہیں بس کسی کی ایک مردہ لاش تھی جس کے بارے میں اب اسے مختلف خیالات آنا شروع ہو جاتے

ہیں۔ کہ یہ اجنبی کون ہے اور یہاں کیسے پہنچا اور اس نے دیکھا کہ اس کے سارے بدن پر سوئیاں چبھی ہوئی ہیں جن کو وہ نکالنا شروع کر دیتی ہے۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں پہلے سے سنی ہوئی کہانی یاد آتی ہے کہ یہ ایک شہزادہ ہے کہ اگر اس کے جسم کی ساری سوئیاں میں نکال دوں گی تو یہ دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ وہ سوئیاں نکال ہی لیتی ہے:

> ”شہزادی نے سر کی سوئیاں ترت پھرت چنیں۔ دھوپ ڈھلتے ڈھلتے اس نے سب سوئیاں نکال ڈالیں۔ بس ایک سوئی بیچ دماغ کے پھنسی رہ گئی اور شہزادی نے اجنبی کے بیدار ہوتے بدن پر ایک نظر ڈالی اور اپنے آپ پر غور کیا کہ جیسے وہ کھل رہی ہے کہ جیسے اس کے چھ در کھل چکے ہیں اور وہ ساتویں در کی دہلیز پہ کھڑی ہے۔“(۳۹)

کہانی میں ایک طلسم، خوف، ڈر اور تجسس کی سی کیفیت ہے اور شہزادی کا ذہن کسی خاص کشمکش میں مبتلا ہے جو اس اجنبی اور اس کے درمیان تعلق کو پیدا نہیں ہونے دیتا۔ کہانی میں خوف اور دہشت لڑکی پر طاری ہے اور وہ پھر بھی انسانی مزاج کے مطابق ممنوعہ چیز کی کشش سے باز نہیں آتی اور ساتویں کوٹھڑی کو بھی کھول ہی لیتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

> ”کہانی کا یہ مرکزی کردار خاصا واضح ہے کہ جس طرح ممنوعہ شے انسان کو ڈراتی بھی ہے اور اسے کھینچتی بھی ہے اسی طرح انجانی حقیقت کی کشش انسان کو کھینچتی بھی ہے اور اس کا خوف انسان کو روکتا بھی ہے۔“(۴۰)

کہانی کا سارا اسلوب داستانوی اور طلسماتی ہے اور داستان کی فضا سارے افسانے پہ چھائی رہتی ہے۔ اس افسانے میں ایک انجانے خوف میں مبتلا انسانی کیفیت کو دکھا کر انسان کے ارزل ہونے اور پھر جانوروں کی حد تک گرنے کا معمہ دکھایا گیا ہے جو کبھی حل ہوتا نظر نہیں آتا اور اس میں انسان کی اپنی معدوم ہوتی شناخت کے خلاف مزاحمت کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جو کہ انتہائی کمزور نظر آتی ہے۔

انتظار حسین کے افسانے "پرچھائیں" میں بھی داستانوی عناصر کی بازگشت نظر آتی ہے جو افسانہ نگار اس کو صحیح داستانوی اسلوب میں گندھتا دکھائی دیتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ یہ عمل جان بوجھ کر کر رہا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "تب اس شخص نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور پکارا کہ میں بایزید کو ڈھونڈتا ہوں اور حضرت بایزید پکارے کہ میں بھی بایزید کو ڈھونڈتا ہوں، مگر وہ مجھے ملا نہیں۔"(۴۱)

یعنی اگر انتظار حسین اپنی اس افسانے میں اسی موضوع کو تھوڑا سا اور طول دیتے اور ایسے کئی اور بھی جملے اور واقعات بنا لیتے جیسے کہ "زرد کتا" کے شیخ عثمان کبوتر میں پائے جاتے تھے اور کچھ نہ کچھ مافوق الفطرت عناصر در آتے تو یہ بھی ایک اچھی خاصی داستانوی اسلوب پر مبنی کہانی بن سکتی تھی۔ مگر انتظار حسین نے شاید دانستہ اس کو ایسے ہی رہنے دیا ہے۔

انتظار کا افسانہ "ہڈیوں کا ڈھانچ" میں بھی داستانوی مافوق الفطرت عناصر ملتے ہیں۔ اس افسانے کے شروع میں ہی ایک طلسماتی اور مافوق الفطرتی ماحول قائم ہوتا دکھائی دیتا ہے اور یوں گھٹنا گھٹتی ہے:

> وہ شخص جو مر کر جی اٹھا تھا، بھوکا تھا۔ اس نے کھانا مانگا۔ مر کر جی اٹھنے کے بعد یہ پہلی خواہش تھی۔ جب سامنے کھانا آیا تو وہ اس طرح ٹوٹا جیسے صدیوں سے بھوکا چلا آتا ہے۔ کھاتے کھاتے اسے پسینہ آگیا اور دستر خوان خالی ہو گیا۔ شام کو اس نے اس سے بھی زیادہ کھایا اور دوسرے دن اسے پچھلے دن سے بھی زیادہ بھوک لگی۔ پھر وہ ہر وقت بھوکا رہنے لگا۔(۴۲)

مگر افسانے میں ایک نفسا نفسی کی کیفیت کو دکھایا گیا ہے اور اس کو داستانوی رویوں سے نہیں گزارا گیا۔ جس سے یہ افسانہ بھی کھل کر اپنے مافوق الفطرت جہات پہ نہیں چل سکا۔ اس افسانے میں بھی اپنے وجود اور حیثیت کو پانے اور اسے حاصل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ داخلی افسردگی اور ملال نے اس افسانے کی فضا کو مغموم کر رکھا ہے۔

افسانہ "ٹانگیں" میں بھی انتظار حسین نے شخصی اور معاشرتی زوال کو بیان کیا ہے کہ انسان جب اپنی روحانی اقدار سے گرتا ہے تو اس کی ٹانگیں انسان کی نہیں بل کہ بکروں جیسی ہو جاتی ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی خیال بھی "آخری آدمی" کے الیاسف اور "زرد کتا" کے ابو قاسم خضری جیسے اپنے آپ کو بچانے کی بڑی کوشش کرتا ہے مگر وہ بچ نہیں پاتا اور آخر پہ اس کی ٹانگیں بھی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے بکرے کی سی ہو جاتی ہیں۔ اسی افسانے میں ایک جگہ مختلف انداز میں داستانوی مافوق الفطرت عناصر کی ایک جھلک ملتی ہے مگر وہ جھلک افسانے میں زیادہ نظر نہیں آتی۔ اقتباس دیکھیے:

> "صاب، برا زمانہ آ گیا، اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر بولنے لگا کسی کا کوئی اعتبار نہیں، نہ مردکا نہ عورت کا، جس عورت کو دیکھو بچھل پائی اور یہ سالا مرد، سب سالوں کی ٹانگیں بکروں کی ہو گئی ہیں۔"(۴۳)

یہ افسانہ بھی انسان کی معدومیت کا نوحہ ہے کہ جس میں انسان کی تباہ ہوتی اخلاقی قدروں کو بیان کیا گیا ہے جس میں معاشرے کے اجتماعی زوال کو دکھایا گیا ہے۔ کہ اگر انسان اپنے معیار سے گر جائے تو وہ انسان کی ٹانگوں کا حامل ہونے کی بجائے بکرے کی ٹانگوں پہ منتقل ہو جاتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان اب انسان نہیں رہا بل کہ انسانیت کے نام پہ ایک بد نما دھبہ ہے۔ یہ ٹانگوں کی تبدیلی ایک مافوق الفطرتی عنصر ہے جس نے افسانے کی فضا کو داستانوی بنا رکھا ہے۔

لہٰذا ان کہانیوں میں جنسی لذت اور معاشرے میں انسان کے اجتماعی تعمیری کردار سے انحراف کی جھلک نظر آتی ہے اور انسان اپنی تمام اچھی اور بھلی صفات سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اس بارے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> """ہڈیوں کا ڈھانچ" اور "ٹانگیں" میں بھی نفس کی اسی کشمکش اور انسان کے اخلاقی وروحانی زوال کی پرچھائیاں ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچ میں ارتکاز پیٹ کی بھوک اور اشتہا

پر ہے جب کہ ٹانگیں، جنسی لذت کی پوشیدہ خواہش اور اس کے دباؤ کے بارے میں ہے۔"(۴۴)

پروفیسر صاحب کی اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تینوں افسانے داستانوی افکار کے ہوتے ہوتے عام سطح کے سادے بیانیے کی نذر ہو گئے اور ان میں وہ عہد نامہ عتیق جیسا یا کسی ملفوظات جیسا اسلوب نہیں آ سکا۔ بس کہیں کہیں مافوق الفطرت رنگ اور توہمات کے شیڈز ان افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

"زرد کتا" افسانہ انتظار حسین کے افسانے "آخری آدمی" ہی کے موضوع اور کردار کو لے کر آگے بڑھتا ہے مگر یہاں داستانوی اسلوب میں مافوق الفطرت عناصر کوئی عہد نامہ عتیق و جدید سے نہیں اور نہ ہی قرآن یا مہابھارت سے لیے گئے ہیں بل کہ صوفیا اور علما و فضلا کے اقوال اور ملفوظات سے کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کہانی میں صوفیا کے دنیا دار ہو جانے اور روحانی زوال میں مبتلا ہو جانے کی کہانی ہے۔ کہ صوفیا پر دنیا غالب اور نفسِ امارہ حکومت کرنے لگا ہے اور دنیا میں اسی سبب سے وہ مغلوب اور خدا سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کو لومڑی کا بچہ اور زرد کتا کہا گیا ہے۔

بلاشبہ انسان کا نفس ہی اس سے برائیاں کرواتا ہے اور اسے انسان کے مرتبے سے گرا کر حیوان کے درجے تک لے آتا ہے۔ ساری کہانی اسی نفسانی کشمکش اور دنیا میں روحانی و معاشرتی زوال پر لکھی گئی ہے۔ ابو قاسم خضری اس کہانی کا راوی ہے اور اسی کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہے کہ جس کا مرشد ایک نیک اور پاکیزہ صفت انسان ہے جس کو عثمان کبوتر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر روحانی زوال آہستہ آہستہ اس پورے ماحول کو کھا جاتا جہاں صوفیا کی بیٹھکیں اور خانقاہیں ہوا کرتی تھیں وہاں اب نقارے بجتے ہیں اور دنیا وہاں راج کرتی ہے۔ فقر کی دولت لٹا کر ایک فقیر سگِ دنیا بن جاتا ہے، دنیاداری کا سوال کرنے پر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ شیخ الجزائری لفظ کی عظمت کو نہ پانے کی وجہ سے زندوں کے بجائے مردوں کو واعظ کرتا ہے، احمد حجری لفظ کی قدر کھو جانے پر جنگل کا رخ کرتا ہے اور شعر کہنا ترک کر دیتا ہے کہ ہر کس و ناکس اب شاعر بنا پھرتا ہے۔ پانچ شاگرد راوی ابو قاسم خضری، شیخ حمزہ، حبیب بن یحیٰ، سید رضی، ابو مسلم بغدادی اور ابو جعفر

شیر ازی سب مل کر شیخ سے اکتسابِ فیض کیا کرتے تھے جن کے کردار میں مافوق الفطرت عناصر اور غیر فطرتی جہات ملتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اور ہمارے شیخ، کہ خاک ان کی مسند اور اینٹ ان کا تکیہ تھی، املی کے تنے کے سہارے بیٹھتے تھے اور اس عالمِ سفلی سے بلند ہو گئے تھے۔ ذکر کرتے کرتے اڑتے، کبھی دیوار پر کبھی املی پر جا بیٹھتے، کبھی اونچا اڑ جاتے اور فضا میں کھو جاتے۔"(۴۵)

شیخ کا عالمِ ناسوت سے بلند ہونا، ہوا میں اڑنا، اڑ کر کبھی دیوار اور کبھی درخت پہ جا بیٹھنا اور اڑتے اڑتے کبھی ہوا میں گم ہو جانا یہ سب طلسماتی، داستانوی فضا میں مافوق الفطرت عناصر کی ہی باز گشت ہے۔

افسانہ "کانا دجال" میں انتظار حسین نے بڑی مہارت کے ساتھ مذہبی داستانوں اور قصص کو استعمال کیا ہے جس میں ہماری احادیث کی روایتوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے اور دجال کے آنے کے بعد کے کئی مناظر بیان کیے ہیں کہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں گے اور اسے ہی اپنا خدا مان لیں گے۔ بڑا تاشا باجا ہو گا اور وہ خود ایک گدھے پر سوار ہو گا۔ پھر کیا ہو گا، اقتباس دیکھیے:

"روایتوں میں یہ آیا ہے کہ کانا دجال جب آئے گا تو مسلمان چن چن کر مارے جائیں گے، آخر میں تین سو تیرہ مسلمان رہ جائیں گے۔"(۴۶)

اس افسانے میں داستانوی اسلوب اور ماحول قائم کیا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے مذہبی قصص کے حوالے ہیں کہ جن پہ ہم آج تک جیتے آ رہے ہیں اور ہمارے یقین کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر قاضی عابد اس افسانوی مجموعے کے بارے میں ایک اجتماعی رائے دیتے ہیں جو یہاں موقع مناسبت سے بڑی وقیع معلوم ہوتی ہے: "شہر افسوس کے افسانوں: شرم الحرم، کانا دجال، دوسرا گناہ، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے اور شہر افسوس۔۔۔ اسلامی اساطیری (داستانوی) پس منظر کے حامل ہیں۔"(۴۷) بلاشبہ انتظار کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار

انتظار حسین کو بچپن سے ہی جانوروں سے خصوصی شغف رہا ہے بالخصوص بندروں سے کہ ان کو بندر تو خواب میں بھی آ کر ستایا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انتظار حسین کے ہاں جانوروں اور حیوانات پر مبنی کئی ایک افسانے پائے جاتے ہیں جن میں جانوروں کے ذریعے پند و نصائح سے داستانوں کی فضا بنا کر ایک خاص چاشنی بھر دی گئی ہے اور پڑھنے والا جہاں محظوظ ہوتا ہے وہاں وہ اپنے معاشرے اور ارد گرد پر بھی نظر کرتا ہے کہ کیا حالات ہوئے جاتے ہیں اور انسان گر کر کس مقامِ اسفل پہ پہنچ چکا ہے۔

"شہرِ افسوس" کے افسانوں میں مذہبی داستانوی حوالے دیکھے جا سکتے ہیں کہ جن کو استعمال میں لا کر افسانہ نگار خود کو ایک زمانی اور مکانی کیفیت سے ماورا کر لیتا ہے اور اس دنیا کے ماحول سے اوپر اٹھ کر لافانی فضاؤں میں کھو جاتا ہے اور ساری دنیا کا درد اپنے دل میں اور جگر میں سمو کر ہم پر کھول دیتا ہے۔ جس سے ایک داستانوی فضا قائم ہوتی ہے مافوق الفطرت عناصر کی جھلک نظر آتی ہے اور ایسا ہی طلسماتی ماحول بنا کر مصنف پند و نصائح کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ جس میں اہم درد مسلمان امت کا ہے کہ جس کی دن بدن ہوتی زبوں حالی کا افسانہ نگار کو بہت رنج ہے اور وہ "شرم الحرم" جیسا افسانہ لکھ کر تمام عالمِ اسلام کو اپنے درد میں شریک کر لیتا ہے اور عرب اسرائیل کی ۱۹۶۷ء والی جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا نوحہ بھی بیان کرتا ہے۔ یروشلم کی شکست ہو جاتی ہے اور وہ بہاروں کی علمبردار خزاؤں کا مسکن بن جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "فلیش یروشلم فال ہو گیا۔ یروشلم، یرمیاہ نبی کا نوحہ، یروشلم گر پڑا۔ اے صبح کے شاندار فرزند تو کیوں کر آسمان سے گر پڑا۔ وہ جو خلائق سے بھری تھی، وہ بیوہ کی مانند ہو گئی۔ وہ جو قوموں کے درمیان بزرگ اور صوبوں کے بیچ ملکہ تھی، خراج گزار ہو گئی۔"(۴۸)

اس کے بعد انتظار حسین کے ہاں وہ خاص کرب اور اضطراب پر مبنی اسلوب غالب آجاتا ہے اور افسانے کی فضا سوگوار ہو جاتی ہے ہماری مذہبی اور تاریخی داستانوی حیثیت رکھنے والی مسجدِ اقصیٰ، یروشلم ہمیں دل وجان سے عزیز ہے اور اسی وجہ سے افسانہ نگار کے ہاں اس کا یوں ذکر آیا ہے۔

"زرد کتا" افسانہ انتظار حسین کے افسانے "آخری آدمی" ہی کے موضوع اور کردار کو لے کر آگے بڑھتا ہے مگر داستانوی اسلوب میں صوفیا کے اقوال اور ملفوظات سے کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ صوفیا کے دنیا دار ہو جانے اور روحانی زوال کی کہانی ہے۔ کہ صوفیا پر دنیا غالب آگئی ہے اور دنیا میں اسی سبب سے وہ مغلوب اور خدا سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کو لومڑی کا بچہ اور زرد کتا کہا گیا ہے۔ جو ایک مثالی نصیحت ہی ہو سکتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا، مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔"(۴۹)

مگر افسانے میں شیخ عثمان کے فوت ہو جانے کے بعد تمام ہی شاگرد اپنے استاد کے فرامین سے مکر جاتے ہیں اور دنیاداری میں کھو جاتے ہیں مگر راوی ابو قاسم خضری پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو نفس کی غلامی سے بچائے اور زرد کتا بننے سے بچائے اور خود بھی بچ جائے مگر ایسا ہوتا نہیں اور وہ سب اپنی شخصیت اور کردار سے دستبردار ہو جاتے ہیں یہاں ابو قاسم پہ وہی کیفیت طاری ہے جو آخری آدمی الیاسف پہ طاری تھی کہ ساری ہی بستی گناہوں میں لت پت ہو چکی تھی اور یہ دونوں اپنے آپ کو بچانے کے در پے تھے۔ جب وہ اپنے دوستوں کو نفسِ امارہ سے بچانے اور سمجھانے جاتا ہے تو پہلے دن وہاں صرف ٹھنڈا پانی پیتا ہے اور چلا آتا ہے اور رقاصہ کے ناچنے سے قبل حدیث سناتا ہے:

"ابو مسلم بغدادی نے اصرا کیا کہ اے رفیق ٹھہر، میں نے کہا کہ اے ابو مسلم بغدادی دنیا دن ہے اور ہم روزہ دار ہیں اور میں وہاں سے چلا آیا۔"(۵۰)

پھر تیسرے دن وہ اپنے دوست اور رفیق کو سمجھانے کی غرض سے جاتا ہے ٹھنڈے پانی کے ساتھ مزعفر بھی کھاتا ہے اور روزہ داری والا مقولہ بھی دہراتا ہے کہ باز آجاؤ۔ پھر وہ اس رقاصہ کو نظر بھر کر دیکھتا ہے اور اس کے جسم کے خدوخال پر نظر کر کے اپنے دل میں لالچ پیدا کر لیتا ہے اور نفس کے ہاتھوں مجبور زرد کتا بننے کی تیاری کر چکتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"پھر رن رقاصہ آئی اور میں اسے ایک نظر دیکھا۔ چہرہ لال بھبھوکا، آنکھیں مے کی پیالیاں، کچیں سخت اور رانیں بھری ہوئیں۔ پیٹ صندل کی تختی، ناف گول پیالہ ایسی اور لباس اس نے ایسا باریک پہنا تھا کہ صندل کی تختی اور گول پیالے اور کولہے اور سیمیں ساقیں سب نمایاں اور مجھے لگا کہ میں نے مہکتے مزعفر کا ایک اور نوالہ لے لیا ہے اور میرے پوروؤں میں کن من ہونے لگی اور میرے ہاتھ میرے اختیار سے باہر ہونے لگے۔"(۵۱)

اب جب راوی بھی اپنے ہم مکتبوں سمیت دنیا دار اور نفس امارہ کے جھانسے میں آجاتا ہے تو اس کی کیفیت بھی تلذذ اور ذہن گناہ پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس پر بھی نفس کی غلامی کے آثار کھلنے لگتے ہیں اور پھر جب وہ اپنے حجرے میں آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے:

"جب میں گھر پہنچا اور حجرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بوریے پر ایک زرد کتا سو رہا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر سکتے میں آگیا اور مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگا۔ پھر میں نے اسے مارا پر وہ بھاگنے کی بجائے میرے دامن میں آکر گم ہو گیا۔"(۵۲)

اب یہاں سے راوی کا روحانی زوال شروع ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے نفسِ امارہ کا غلام بنتا جاتا ہے اور اس کے دوست بھی غلامِ نفس اور یہ بھی سگِ دنیا بن جاتا ہے اور یہ منتج ہوتا ہے اس کے کتے بن جانے پر۔ اقتباس دیکھیے:

> " میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے وہ ابو سعیدؒ کے ہاتھوں کی مثال کٹا ہوا مجھ سے الگ پڑا ہے اور میں نے اسے خطاب کر کے کہا اے میرے ہاتھ، اے میرے رفیق، تو دشمن سے مل گیا ہے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گڑ گڑا کر کہا ایک بار پھر دعا کی۔ بارِ الٰہی آرام دے، آرام دے، آرام دے۔"(۵۳)

یہ افسانہ اپنی بنت اور اسلوب میں سر اسر داستانوی اور علامتی افسانہ ہے کہ جس میں مصنف نے اپنے خاص اسلوب میں کسی معاشرے کے زوال اور روحانی قدروں کے انحطاط کا ذکر کر کے پند و نصائح کی داستانوی فضا قائم کی ہے۔ بے شک زرد کتا انسانی اور روحانی زوال کی کہانی ہے کہ جو ہم میں دن بدن لالچ، طمع دنیا اور نفس پرستی سے پیدا ہوتی ہی چلی جاتی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "کایا کلپ" ایسا ہی ایک افسانہ ہے کہ جس میں انسان کی تنسیخ کو ایک داستانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد کے مطابق یہ افسانہ بھی "آخری آدمی" اور "زرد کتا" کی معنوی توسیع ہے اور اس کا عنوان Ovid کے Metamorphosis کی یاد دلاتا ہے۔(۵۴) اس افسانے میں داستانوی اسلوب، افکار، ماحول، طلسم اور کرداروں کی کئی جہتوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دیو کا ذکر ہے، پری اور شہزادے کا بھی ذکر ہے۔ ایک طلسماتی ماحول بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک قلعے کا سا منظر ہے کہ جس کا مالک ایک دیو ہے کہ جس نے ایک شہزادی کو اپنے ہاں قید کر رکھا ہے جسے چھڑانے کے لیے ایک شہزادہ وہاں آتا ہے جس کو دیو کی نظروں سے بچانے کے شہزادی اپنے منتر سے مکھی بنا دیتی ہے اور پھر صبح اسے انسان بنا دیتی ہے بس یہ عمل کئی دنوں تک جاری رہتا ہے اور وہ شہزادہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اصل

شناخت کیا ہے؟ وہ انسان تھا یا کہ وہ مکھی ہے۔ اسی کشمکش اور انسانی شناخت کی دریافت کا یہ افسانہ ہے جس کو داستانوی اسلوب میں تیار کیا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"اس نے اپنے آپ کو بار بار دیکھا اور کہا میں آدمی نہیں ہوں۔ تو پھر میں مکھی ہوں؟ مگر اس وقت وہ مکھی بھی نہیں تھا۔ تو میں آدمی بھی نہیں ہوں، میں مکھی بھی نہیں ہوں۔ پھر میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں، اس خیال سے اسے پسینہ آنے لگا اور اس نے سوچا کہ نہ ہونے سے مکھی ہونا اچھا ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا کہ آج اس کے خیال کی رو ڈوبتی نبض کی مانند رک رک کر چل رہی تھی۔"(۵۵)

مکھی کی جون میں شہزادے کو بدل دینا انسانیت کا معدوم ہونا ہے اور پھر ایک دیو کا ہماری شناخت کے اوپر ایک بھاری بھر کم بوجھ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کہانی ہمیں معاشرے میں اپنی شناخت کے فقدان اور پھر انسان کی حیثیت ختم ہو جانے کا عندیہ دیتی ہے۔ کیسا مثالی اندازِ نصیحت ہے۔

انتظار کا افسانہ "وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے" اپنی نوعیت کا منفرد اور دلچسپ افسانہ ہے جس میں یاجوج ماجوج اور سدِ سکندری کی فضا کو لے کر افسانے کی کہانی اور پلاٹ کو تشکیل دیا گیا ہے اگرچہ یہ کہانی سانحہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں لکھی گئی ہے مگر اس کا داستانوی اور حکائی اسلوب کہانی کو بہت آگے لے جاتا ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں کے باہمی جھگڑوں اور مسائل کو اس میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دونوں بھائیوں کو یاجوج اور ماجوج سے تشبیہ دے کر علامتی طور پر کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے کہ یہ دونوں بھائی آپس میں ہی لڑتے اور جھگڑتے رہتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

"اب بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہونے پر یاجوج ماجوج نے اپنی اپنی زبانیں نکالیں اور سدِ سکندری کو چاٹنے کے بجائے عالمِ غیظ میں ایک دوسرے کو چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یاجوج ماجوج کے چاٹنے سے اور ماجوج یاجوج کے چاٹنے سے انڈے کی مثال رہ گیا۔"(۵۶)

ساری رات اور سارا دن یعنی ہر وقت آپس میں ہی لڑتے اور جھگڑتے رہتے اور ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے رات رات بھر چاٹا کرتے۔ دونوں بھائیوں کی زبان کے مسئلے پر افسانہ نگار نے کمال مہارت سے تبصرہ نگاری کی ہے اور خوب محاکمہ کیا ہے۔ ایک اور اقتباس دیکھیے جو اس موضوع کو اور بھی واضح کر دیتا ہے:

> "بوڑھے نے افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ وہ سدِ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔"
>
> اور یاجوج ماجوج اپنی لال زبانوں کے ساتھ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔"(۵۷)

اس افسانے میں داستانوی فضا پورے جوبن سے قائم ہے اور مصنف باہمی نااتفاقی کو مثالی طور پر بیان کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شہر افسوس کتاب کا مرکزی افسانہ بھی "شہر افسوس" ہے یہ ایک ایسے شہر کی کہانی ہے کہ جو کبھی وعدوں کی پاسداری کی سرزمین والا شہر تھا پر اب یہ گناہوں کی سرزمین بن چکی ہے اور یہاں افسوس کے سوا اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ لوگ اپنے تشخص کے ساتھ اپنا انسان ہونا بھی بھول گئے ہیں اور ہر کوئی دوسرے کی عزت سے کھیل رہا ہے اور بے نام سی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس افسانے میں حکائی اور داستانوی معنویت کو برتا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "وہ ایک سانولی رنگت والی لڑکی تھی، ماتھے پر لال بندی، زلفیں کمر کمر، ایک سانولا نوجوان اس کے ساتھ تھا، میں نے نوجوان سے پوچھا یہ تیری کون ہے، بولا کہ یہ میری بہن ہے، میں نے کہا کہ تو اسے برہنہ کر۔"(۵۸)

اس اقتباس سے افسانے میں ایک تجسس، اسرار، طلسم، دہشت اور داستانوی رنگ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ آخر یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے اور یہ کیسی بات کہی جا رہی ہے کہ اپنی بہن کو میرے سامنے خود برہنہ کر۔ اور وہ لوگ جو کہ ہجرت کر کے دور دراز سے اس شہر کی برکت اور اچھائی کا سن کر یہاں پہنچے تھے ان سے پوچھنے والا پوچھتا ہے:

”پوچھا کہ اے لوگو سچ بتاؤ، تم وہی نہیں ہو جو اس بستی کو دارالامان جان کر دور سے چل کر آئے اور یہاں پس گئے۔ انھوں نے کہا کہ اے شخص تو نے خوب پہچانا، ہم انھی خانہ بربادوں کے قبیلے سے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ خانہ بربادو تم نے دارالامان کو کیسا پایا۔ بولے کہ خدا کی قسم، ہم نے اپنوں کے ظلم میں صبح کی۔“(۵۹)

اس اقتباس میں انتظار حسین پھر سے ہجرت اور مہاجروں کے مسائل پہ بات کرتے ہیں کہ مہاجر کیا سوچ سمجھ کر پاکستان آئے تھے اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ یہ خانہ برباد تو پاکستان کو دارالامان جان کر آئے تھے مگر یہ تو شہر افسوس نکلا۔ اس کے بعد انتظار حسین زمین کے اوپر اور زمین کے رویے پہ بات کرتے ہیں کہ ہر زمین ظالم ہی ہوتی ہے اور وہ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے بدھ مت کے داستانوی ماحول میں جا پہنچتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

”میں نے یہ دیکھا اور جانا کہ ہر زمین ظالم ہے۔

”جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟“

”ہاں جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو دارالامان بنتی ہے وہ بھی، میں نے گیانام کے نگر میں جنم لیا اور گیا کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے اور نروان کسی صورت نہیں ہے اور ہر زمین ظالم ہے۔“

”اور آسمان“

”آسمان تلے ہر چیز باطل ہے۔“(۶۰)

افسانہ ”دوسرا گناہ“ بھی ایک حکائی اور داستانوی انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے کہ جس میں دنیا کی لالچ، اسٹیٹس کی جنگ اور ہوس میں مبتلا شکاری دکھائی گئی ہے۔ جس میں نیک صفت لوگوں کی بھلائی کے ثمرات اور برے لوگوں کی نجاست اور نحوست کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں سگِ دنیا بننے

والے بھائی اور قناعت پر پابند رہنے والے صابر بھائی کو علامتی طور پر لے کر انسان کو برابری اور عاجزی کا سبق دیا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ پہلے ایک گھرانا آیا اور یہاں پہنچ کر کھلے آسمان میں سخت زمین پر پڑ رہا، پھر دوسرا گھرانا آیا اور زمین کی سختی سے لڑنے لگا، پھر گھرانے آتے چلے گئے اور اونچے درختوں کو سرنگوں کرنے اور سخت زمین کو نرم بنانے پر جت گئے۔

جب وہ سب اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے حشام سے کہا کہ اے حشام! تو ہم میں بڑا ہے۔ پس تو ہمارے بیچ بیٹھ اور منصفی کر! حشام ان کے بیچ بیٹھا اور خوب منصفی کی۔ اس نے تا عمر ٹاٹ پہنا اور سب کے ساتھ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر موٹی روٹی کھائی اور مٹی کے پیالے میں پانی پیا۔ اس نے ایک سو پچھتر برس کی عمر پائی اور جب وہ مرا تو اس کی کمر سیدھی تھی۔"(۶۱)

اس کے بعد حشام کے بیٹے زمران کو منصفی کے لیے چن لیا گیا اور سرداری بھی اسی کے پاس آئی اس کے بعد اس نے برابری چھوڑ دنیا داری کو اپنانے کی ٹھانی اور اپنی روٹی دوسروں سے الگ کر لی۔

"اس باپ کے بیٹے نے بھی بڑی منصفی کی، پھر ایک دن یوں ہوا کہ ابی ملک نے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اجلے پن کو دیکھ کر حیران ہوا، پھر اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اتنی اجلی نہ تھیں، پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر بولا کہ اے حشام کے بیٹے! کیا تُو اب چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ جب گیہوں کی مینگ گیہوں کے چھلکے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہو جاتا ہے، گیہوں تھوڑا اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمیں ہمارا پالنے والا اس

دن سے پناہ میں رکھے کہ ہمارے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ہماری بھوک بڑھ جائے۔"(۶۲)

اس اقتباس میں داستانوی رنگ غالب ہے اور پھر الیملک نے دستر خوان سے اٹھنا ہی بہتر سمجھا اور بغیر کھائے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا جس کا شور و غوغا ہر اور ہونے لگا:

" اس دن الیملک دستر خوان سے بھوکا اٹھا اور جب دستر خوان سے بھوکا اٹھا تو بستی میں اس کا چرچا بہت ہوا۔ لوگ بہت حیران ہوئے اور انھوں نے سرگوشیاں کیں کہ الیملک دستر خوان سے نوالہ توڑے بغیر اٹھ گیا اور اس نے زمران سے اپنی روٹی الگ کر، پھر وہ سچ مچ ڈرے کہ کیا سچ مچ گیہوں اپنے چھلکے سے الگ ہو گیا ہے۔"(۶۳)

اس کے بعد زمران کے اندر بادشاہت اور ملوکیت والی عادتیں آنا شروع ہو گئیں اور الیملک تاریخ کے ایک بڑے داستانوی کردار کی طرح اپنا آپ قربان کر کے دنیا سے چلا گیا۔

"الیملک نے اس پر یہ کہا کہ بے شک اللہ کی زمین بہت وسیع پر اللہ کے بندوں پر ہمیشہ تنگ رہی۔ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔"(۶۴)

اس افسانے کو اشتراکی نقطہ نظر سے بھی دیکھا گیا ہے اور یہ طمع، لالچ، حب دنیا اور اقتدار کی ہوس پر لکھا حکائی اور داستانوی اسلوب کا کمال افسانہ ہے۔ اس میں بادشاہت، ہجرت، محلات، بھائیوں کی دولت کی وجہ سے لڑائی ایک داستانوی فضا قائم کرتے ہیں اور وہی داستانوں جیسا انصاف، مثالی پند و نصیحت بھی پائے جاتے ہیں کہ جو دنیا میں بے ایمانی، ناانصافی اور بد سلوکی کرے گا اس کا انجام برا ہو گا۔ تو لہٰذا اس افسانے میں ایسا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جنگلوں کو آباد ہوتے دکھانا، شہروں کو گناہوں کی وجہ سے چھوڑ کر بیابانوں کی راہ لینا بالکل داستانوی طلسماتی ماحول کی عکاسی ہے۔

اس کے علاوہ بھی انتظار حسین کے پاس کئی ایک داستانوی افکار پر مبنی افسانے موجود ہیں کہ جن میں دہلیز، کٹا ہوا ڈبہ، سیڑھیاں، مردہ آنکھ، رات، دیوار، خواب اور تقدیر، انتظار، خیمے سے دور، کشتی اور کچھوے قابلِ ذکر ہیں۔

ج۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں میں داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: تقابلی مطالعہ

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں ہمیں جہاں مذہبی اخلاقی اقدار کے حوالے ملتے ہیں وہیں داستانوی، روایتی، دیومالائی اور قصے کہانیوں کا اسلوب اور اثر بھی ملتا ہے۔ جس تناظر میں ہم نے دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں داستانوی افکار کا جائزہ لیا ہے۔ اب ہم دونوں افسانہ نگاروں کے داستانوی افکار کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں۔

i. مافوق الفطرت عناصر اور داستانوی افکار

مافوق الفطرت عناصر پر مبنی داستانوی افکار کے افسانے خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ جن میں افسانہ نگاروں نے بھرپور فن اور کہانی کا مظاہرہ کیا ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "پیڑ اور آدمی" داستانوی اسلوب میں ایک خاص طریقے سے غیر فطرتی کرداروں کا چلن نظر آتا ہے کہ جس میں ایک درخت اور ایک آدمی کے درمیان مکالمہ دکھایا گیا ہے کہ جس کے ذریعے سے کہانی باہمی پیار، خلوص، مساوات اور احسان مندی کو بیان کرتی نظر آتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"ایک پیڑ نے ایک آدمی سے کہا۔

"میری جڑیں دور تک سرخ زمین میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں تمہیں اپنا پھل دوں گا۔"

وہ بولا۔۔۔۔۔۔

"کیسی یگانگت ہے ہم میں، میری جڑیں بھی دور تک سرخ زمین ہی میں ہیں۔۔۔۔اور یہ سرخ زمین تمہیں طاقت بخشتی ہے۔ کہ تم ہم پر اپنا پھل نچھاور کرو۔۔۔۔۔۔اور ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم احسان مندی کے ساتھ اسے قبول کریں!"(۶۵)

ایک پیڑ اور آدمی کی گفتگو کے ذریعے سے خلیل جبران نے مخلوقات کے درمیان پیار اور محبت کی ایک خاص فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس میں ہر مخلوق کو ایک دوسرے سے واسطہ ہوتا ہے مگر ہم اس پر غور نہیں کرتے اور ایک دوسرے کا خیال نہیں کرتے مگر اس تمثیلی، حکائی اور داستانوی کہانی سے جس میں مافوق الفطرت عناصر بھی ہیں، یہ پہلو سامنے آتے کہ انسان کو آپسی نفرتیں مٹا کر ایک دوسرے کے احسانات کو ماننا چاہیے جیسا کہ ایک آدمی درخت کے پھل کو پا کر اس کا احسان مند ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم میں گہری یگانگت اور مماثلت ہے وہ اس طرح کہ انسان ہی درخ یا پھر بیج کو زمین میں لگاتا ہے اور اس کی خدمت کر کے اسے پروان چڑھاتا ہے اور یہی درخت بڑا ہو کر آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ انسان کو فراہم کرتا ہے اور اس کے ماحول کو پاکیز بنانے اور اس کے رزق میں اضافہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔

انتظار حسین کی کہانی "کچھوے" میں بھی مختلف مخلوقات اور مافوق الفطرتی کرداروں کا سہارا لے کر کا آپس میں پیار دکھایا گیا ہے کہ جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں آپسی پیار اور محبت کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے اور ایک دوسرے سے مساوات اور وفا کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہر ممکن اور ہر جگہ ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیے اور دوسروں کی خوشیوں کا بھی ایسے ہی خیال رکھنا چاہیے جیسا کہ ہم اپنا رکھتے ہیں۔

اس کہانی میں ایک کچھوے کی یاری مرغابیوں سے ہوتی ہے جو ندی کے سوکھنے پر کچھوے کو مرنے کے لیے اکیلا زمین پر نہیں چھوڑ کر بھاگ جاتیں بل کہ اس کا بھی خیال کرتی ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

" مرغابیوں نے ایک ڈنڈی لا کے کچھوے کے آگے رکھی اور کہا کہ بیچ میں سے اپنے دانتوں سے پکڑ اور دیکھ! بولنا مت، پھر ایک مرغابی نے اپنی چونچ سے ڈنڈی کا ایک سرا اور دوسری نے اپنی چونچ سے دوسرا پکڑا اور اڑ لیے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک نگر سے

گزرے تو بالکوں نے تماشا دیکھا اور شور مچایا کچھوے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ میرے متروں نے مجھے سہارا دیا ہے تم کیوں جل مرے؟"(۶۶)

افسانے کی یہ فضا بالکل داستانوی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کی ہر مخلوق کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعلق میں ہے اور پھر وہ اپنے تعلق کو نبھاتی بھی ہیں مگر انسان ہیں کہ باہمی ایک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے شدید نفرت اور کدورت سے جیتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو انتظار حسین اور خلیل جبران دونوں کی کہانیاں نہایت بلیغ، بامعنی اور شاہ کار ہیں کہ جن سے معنی کی کئی ایک تہیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

خلیل جبران کے ہاں ایسی اور بھی کہانیاں ملتی ہیں کہ جن میں انسان اور دوسری مخلوقات کا آپسی پیار دکھایا گیا ہے جس سے ایک داستانوی پہلو تو پیدا ہوتا ہی ہے مگر انسان کو بھی ایک دوسرے سے پیار، محبت، خلوص اور مساوات سے رہنے کا درس ملتا ہے۔ افسانہ "قبرستان" اس کی بہترین مثال ہے کہ جس میں دو مختلف طبقوں کی وفات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان اور جانور کے پیار کو بھی دکھایا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لیے چلے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت ہے، جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، گود میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کتا ہے، جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف۔

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا، جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی، جو یاس و نومیدی کے آنسو بہا رہی تھی، ایک اس کا بچہ تھا، جو اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا، اور ایک اس کا وفادار کتا، جس کی رفتار سے اس کے رنج و غم کا اظہار ہو رہا ہوتا تھا۔

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور تابوت کو ایک قبر میں اتار دیا، جو مرمریں قبروں سے بہت دور ایک گوشہ میں تھی۔ اس کے بعد وہ پر اثر خاموشی کے ساتھ واپس ہوئے، کتا بار بار اپنے آقا کی آخری آرام گاہ کو دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ وہ سب درختوں میں روپوش ہو گئے۔"(۶۷)

اس اقتباس کو دیکھیں تو کلیجہ منھ کو آتا ہے کہ ایک جانور کہ جسے ہم عمر بھر رذالت اور کراہت سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنے معاشرے میں ایک خاص مقام دینے پر بھی رضامند نہیں ہوتے مگر وہ بعد از مرگ بھی انسان سے محبت کو ترک نہیں کرتا اور آخری پل تک جب کہ اس کے مالک کو قبر میں اتارا جارہا تھا تو وہ دیکھ دیکھ آنسو بہا رہا ہے اور گھر سے چل کر جنازے میں بھی شریک ہوا ہے۔ مگر انسان، آہ! کہ زندگی میں ہی دوسروں کی زندگی کا دشمن اور اس کے حق پر غاصب اور خطرناک منصوبے بنا کر دوسرے انسانوں کو جان سے مار دینے والا جلاد اور قصائی۔ جانوروں سے بدتر اور اسفل۔ مافوق الفطرت کردار کے ذریعے سے ایک طلسماتی فضا قائم کی گئی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک جانور کس طرح انسان کی محبت میں مبتلا ہے۔

خلیل جبران کے اسی افسانے سے معاشرے کے اندر موجود غیر منصفانہ دولت اور آسائش کی تقسیم کے مطابق زمانے اور معاشرے کے بٹوارے اور ایک دوسرے کے درمیان صاف امتیازی سلوک بھی دکھایا گیا ہے کہ امیر اور دولت مند انسان زندگی میں تو دوسرے غریب اور ناداروں سے دھوکا دہی تو کرتے ہیں اور ان کے حقوق کو غصب کرتے ہی ہیں مگر بعد از مرگ بھی امیروں اور غریبوں کا یہ فرق نہیں مٹتا اور لوگ مر کر بھی غریبوں سے افضل رہتے ہیں۔ کسی امیر کا جنازہ ہوتا ہے تو بڑے بڑے علما اور فضلا کے ساتھ ساتھ شہر کے معززاور عمائدین کی ایک خاص بھیڑ نظر آتی ہے مگر غریب کے جنازے میں سوائے اس کے خاندان کے دو چار افراد کے اور کوئی نہیں ہوتا حالانکہ یہ ہمارے مذہب یا کسی بھی مذہب کے مطابق بالکل ہی غلط ہے۔ اس سے معاشرے کی غلط روش اور غلط تقسیمِ زر سمجھ آتی ہے۔ امیر کے جنازے پر لوگوں کی بھیڑ اور لوگوں کی شمولیت کا پیراگراف دیکھیے:

"یہ ایک بہت بڑا ہجوم تھا جس میں عظمت واقتدار کے دیوتا شامل تھے، ایک عظیم المرتبت رئیس کا جنازہ تھا۔۔۔۔ایک مردہ کی ہڈیاں تھیں، جس کے پیچھے پیچھے زندہ لوگ روتے، واویلا مچاتے اور فضا کو نالہ وماتم سے گراں بار کرتے، چلے آرہے تھے۔

جنازہ قبرستان پہنچا۔ پادری جمع ہوئے اور عود ولوبان سلگا کر مردہ کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ ادھر بینڈ بجانے والوں نے ایک طرف ہو کر غم کا بینڈ بجایا۔ اس کے بعد خطیب آگے بڑھے اور نہایت فصیح وبلیغ الفاظ میں مرنے والے پر ماتم کیا، پھر شاعروں نے اپنے اپنے مرثیے پڑھے، جن میں سوز وگداز کے ساتھ ساتھ، معنوی لطافتیں بھی تھیں۔"(۶۸)

خلیل جبران کے افسانے سے ایک خوبصورت مرقع یہ مندرجہ بالا اقتباس ہے کہ جس میں ایک امیر آدمی کے جنازے میں شامل ہو کر سیاسی دیوتاؤں، خطیبوں، پادریوں اور شاعروں نے اپنے اپنے ہنر کا اظہار کیا اور یوں کہہ لیجیے کہ اپنی اپنی حاضری لگوائی۔ جس سے ایک امیر آدمی کی زندگی اور موت اور اس کے بعد جنازے اور تدفین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اب ذرا ایک غریب آدمی کی میت اور جنازے کا عالم دیکھیے:

"میں نے نگاہ اٹھائی اور دیکھا دو آدمی ایک لکڑی کا تابوت اپنے کندھوں پر لیے چلے آرہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت ہے، جس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، گود میں ایک دودھ پیتا بچہ اور پہلو میں ایک کتا ہے، جو کبھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی تابوت کی طرف۔

یہ ایک مفلس کا جنازہ تھا، جس کے پیچھے ایک اس کی بیوی تھی، جو یاس ونومیدی کے آنسو بہا رہی تھی، ایک اس کا بچہ تھا، جو اپنی ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر رو رہا تھا، اور ایک اس کا وفادار کتا، جس کی رفتار سے اس کے رنج وغم کا اظہار ہو رہا ہوتا تھا۔"(۶۹)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں ایک داستان کی سی کیفیت نظر آتی ہے جس سے امیر اور غریب کی زندگی اور جنازے کے درمیان فرق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ امیر کے جنازے میں پادری، شاعر، خطیب اور عمائدینِ شہر مگر غریب کے جنازے میں اس کی بیوی بچے اور ایک کتا۔

انتظار حسین کا افسانہ "دوسرا گناہ" معاشرے میں موجود افراد کے درمیان غیر مساویانہ سلوک پر لکھا بہترین افسانہ ہے کہ جس میں لوگوں میں ایک دوسرے کے ہاں فرق آجانے سے سارا معاشرہ تباہ ہوتا دکھایا گیا ہے۔ بستی کا سربراہ اور عوام جب تک ایک دستر خوان سے کھاتے رہے تو ان میں اتفاق پیار اور برکت رہی مگر جیسے ہی ان کے درمیان امتیازات بڑھتے گئے ان کی بستی تباہی کی طرف بڑھتی گئی اور آخر کار قحط پڑ گیا اور لوگ ہجرت کرنے لگے۔ ایسا داستانوں میں ہی ہوتا ہے کہ ایک مالکِ شہر اور عوام مل کر رہیں اور ایک دستر خوان سے کھانا کھائیں یہی داستانوی فضا افسانے کے اندر ایک فطرت سے بالا اور غیر فطرتی ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "ایک دن یوں ہوا کہ ابی ملک نے دستر خوان پر بیٹھے ہوئے زمران کے آگے رکھی ہوئی روٹی پر نظر کی اور اس کے اجلے پن کو دیکھ کر حیران ہوا، پھر اس نے دوسروں کے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو دیکھا کہ اتنی اجلی نہ تھیں، پھر وہ زمران سے مخاطب ہو کر بولا کہ اے حشام کے بیٹے! کیا تُو اب چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائے گا اور میں نے تیرے باپ سے اور تیرے باپ نے اپنے باپ سے سنا ہے کہ جب گیہوں کی مینگ گیہوں کے چھلکے سے جدا ہو جائے تو گوشت ناخن سے جدا ہو جاتا ہے، گیہوں تھوڑا اور بھوک زیادہ ہو جاتی ہے اور ہمیں ہمارا پالنے والا اس دن سے پناہ میں رکھے کہ ہمارے درمیان گیہوں تھوڑا رہ جائے اور ہماری بھوک بڑھ جائے۔"(۷۰)

یعنی بستی کے سربراہ زمران نے دستر خوان پر کھانے کے لیے اپنی روٹی چھنے ہوئے آٹے سے بنوا کر اپنے اور لوگوں کے درمیان فرق پیدا کیا جس پر سمجھانے والوں نے اسے سمجھایا کہ تو غلطی پر ہے اگر یہ امتیاز

ایسے ہی چلتا رہا تو بستی میں رزق کی کمی اور بھوک بڑھ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ کیوں کہ داستانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی سی غلطی کے بڑے سے بڑے نتائج بھگتنے پڑ سکتے ہیں اور چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کئی سالوں اور ملکوں کے سفر و حضر کی تکالیف اٹھائی جا سکتی ہیں۔

> "پھر یوں ہوا کہ تھوڑے دنوں بعد زمران کی بستی سے ایک اور قافلہ چلا اور بھوکا یہاں پہنچا۔ زمران کی بستی میں قحط پڑ گیا تھا اور وہاں سے پہلے ایک قافلہ چلا اور یہاں آ کر پناہ گیر ہوا، پھر دوسرا قافلہ آیا اور پناہ گیر ہوا، پھر قافلے آتے چلے گئے اور یہاں ڈیرے ڈالتے چلے گئے۔"(۱۷)

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں کے افسانوں میں معاشرتی ناانصافیوں اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم پر افسانے ملتے ہیں اور ان افسانوں میں تو دونوں نے غریب اور امیر میں فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ امیر اور غریب کی صرف زندگی ہی مختلف نہیں بل کہ ان کا مرنا بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

خلیل جبران اپنے افسانے میں صرف معاشرے میں موجود مسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر انتظار حسین کے ہاں عملی طور پر کہانی میں مکافات کا عمل بھی دکھایا گیا ہے جس سے کہانی اپنا مفہوم خود واضح کرتی ہے، قاری نہیں۔ مگر خلیل جبران کی کہانی یک سطحی ہو کر بھی کئی پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتی ہے یہی خلیل جبران کا کمال ہے مگر انتظار حسین نے کہانی میں موجود کرداروں کا فیصلہ خود کیا ہے جس سے بات واضح ہو گئی اور کہانی کا اخلاقی سبق کھل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ دونوں افسانوں کا اسلوب داستانوی افکار سے ماخوذ ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "امید وار جوانی" ایک ایسا افسانہ ہے کہ جس میں جوانی کو تجسیم کے ذریعے سے چلتا پھرتا اور باتیں کرتا دکھایا گیا ہے کہ جس میں مصنف نے واحد متکلم کا کردار اپنے لیے استعمال کیا ہے اور جوانی کے ساتھ اس کی ملاقات ہوتی ہے اور افسانہ نگار اور جوانی دونوں مل کر دنیا کی سیر کرتے ہیں اور جگہ جگہ

مختلف چیزوں، مناظر اور لوگوں پر تبصر ہوتا ہے جس سے کہانی دو آتشہ ہو جاتی ہے اور ہر موضوع کی تفہیم دوبالا۔ ایک داستانوی فضا نظر آتی ہے، حیرت کا باغ لہلہانے لگتا ہے۔

خلیل جبران کے افسانوں میں پہلے بھی ہم نے دیکھا کہ مذہبی لوگوں، واعظین اور پادریوں کے عیب دکھائے گئے اور ان کے قول و فعل میں تضاد بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس افسانے میں بھی افسانہ نگار جوانی کے ساتھ سفر کرتا جاتا ہے تو ایک جگہ اس کو واعظین سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور یہ ان کو ویسے ہی اپنے معیار سے گرا ہوا پاتا ہے جس پر اس کا دل دکھتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "میں نے مذہبی پیشواؤں کو چالاک گیدڑوں کی طرح منہ پر جھاگ پھیلائے دیکھا اور جھوٹے لیڈروں کو انسانی مسرتوں کیخلاف سازشیں کرتے دیکھا۔۔۔۔۔۔۔
>
> پھر میں نے حرص و آز میں مبتلا ان واعظین کو بھی دیکھا جو کمال و عجز و انکسار سے آسمان کی طرف رحمتوں کے لیے ہاتھ پھیلا رہے تھے۔"(۷۲)

اس اقتباس کو پڑھ کر خلیل جبران کی وہی مذہبی پیشواؤں سے بیزاری ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ دوسرے عام لوگوں کو صحیح راستا نہیں سجھاتے بل کہ خود اس قدر نام نہاد اور دکھاوے کی عجز و انکساری کرتے ہیں کہ جس قدر لوگوں کو ان سے عقیدت ہوتی جاتی ہے اسی قدر خدا کو ان پر ترس آتا ہے اور غضب بھی۔ لگتا ہے کہ خلیل جبران کا یہ موضوع ایک مرغوب موضوع ہے جس کی وجہ شاید اس کے گھر میں اس کے باپ کی بے جا مذہبی سختی اور والدہ سے بدسلوکی کا نتیجہ ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی ایسے افسانے ملتے ہیں کہ جن میں ملمع کار مذہبی لوگوں اور رہنماؤں کی طرف سے دھوکے اور چالاکیوں کا بازار گرم نظر آتا ہے کہ یہ اپنے دکھاوے کے لباس میں معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانے میں قرآن کی ایک آیت کو رقم کر کے اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے:

"پس افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور افسوس ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو کچھ وہ اس سے کماتے ہیں۔"(۷۳)

اس کے علاوہ بھی افسانہ نگار کے ہاں اور بھی افسانوں میں مذہبی لوگوں کے انھیں معائب پر کہانیاں ملتی ہیں۔ افسانہ "مردہ راکھ" میں بھی مذہبی لوگوں کے دھوکے اور لالچ کی مثال موجود ہے اقتباس دیکھیے:

"مولوی فرزند علی نے روکھے لہجے میں کہا: "وہ گھوڑا مر گیا؟"

"وہ گھوڑا مر گیا؟"

"دلدل مر گیا؟"

"دلدل؟ دلدل مر گیا؟ کون کہتا ہے؟"

پہلے کسی کو یقین نہ آیا۔ مولوی فرزند علی نے کسی کو یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ خود ہی یقین آ گیا۔

انھیں ایک دم سے اگلی پچھلی ساری باتیں یاد آ گئیں۔ انھیں وہ دن یاد آ گیا، جب پہلی بار کسی نے بتایا تھا کہ دلدل کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تراب علی متولی نے متولی بنتے ہی وہ کچھ کیا تھا کہ اب کسی کے دل میں ان کا ذرہ بھر احترام نہیں تھا۔"(۷۴)

اگرچہ مذکورہ بالا مذہبی شعائر کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے مگر ہے تو مذہبی ہی بات کہ جس کو علامتی طور پر دنیا کے کسی بھی مذہب کے بارے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ لوگ متولی بن کر مسجد کا چندہ کھا جاتے ہیں یا پھر مجاور اور رکھوالے بن کر درباروں اور مندروں کے گلے بھی خالی کر جاتے ہیں اسی طرح ایک امام بار گاہ کے متولی تراب علی نے بھی خزانے میں خرد برد کی ہے اور خوراک کا صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے دلدل گھوڑا بھی مر گیا جس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر جب متولی صاحب سے اس کے بارے پوچھا گیا تو اس کے بہانے دیکھیے:

"تراب علی متولی کہتے تھے کہ چیزیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں۔ میدہ تو کسی بھاؤ نہیں ملتا۔ مولوی فرزند علی تک جب یہ خبر پہنچی تو انھوں نے بہت سرد مہری سے کہا کہ "کچھ چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں اور کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے۔"

افضال حسین نے ٹکڑا لگایا: ہاں! کچھ وقف کی آمدنی کم ہو گئی ہے، کچھ دوسری مدوں میں خرچ ہونے لگی ہے۔"

مگر اس ساری بیزاری کے باوجود اس خبر پر کسی کو اعتبار نہ آیا۔ کوئی لاکھ بے ایمان ہو گیا ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ دلدل کے دانے پانی میں بے ایمانی کرنے لگے۔ جس شخص نے دلدل پر ہنٹر پڑتے دیکھا تھا، وہ یہ خبر سنا کر خود ہی چور بن گیا اور اعتبار نہ کرنے والوں کی برہمی سے ڈر کر اپنا بیان بدلتا چلا گیا۔۔۔۔۔ مگر اب وہ سب خبریں سچی نکلیں۔ مولوی فرزند علی پھر بھی کچھ نہیں بولے، بس انھوں نے ایک ہی فقرہ کہا: "جو شخص بڑا علم رکھ گروی رکھ دے اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہو سکتی۔"(۷۵)

بلاشبہ انتظار حسین نے ہماری عقیدت اور ایمان کی بھی یہاں صحیح نقشہ کشی کی ہے کہ ہم لٹنے پٹنے کے بعد بھی ان مذہبی لوگوں پر شک تو دور کی بات ان کی انسانی غلطیاں دیکھ کر بھی نہیں مانتے اور ایسے لوگوں کو ہمیشہ پاک صاف اور پارسا خیال کرتے ہیں مگر ہم میں ہی ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں کہ جو ان کو سامنے جواب بھی دے دیتے ہیں۔ جیسا مولوی فرزند نے اس افسانے میں کیا اور سب کو سمجھایا کہ جو ایک غلط کام کر سکتا ہے اس سے مذہب کے کسی کام کی توقع رکھنا عبث ہے لالچ انسان کو کس طرح اندر سے کمزور اور کھوکھلا کر دیتی ہے، وہ اس افسانے کا مرکزی خیال ہے کہ مردہ راکھ سے مراد یہی ہے کہ یہ قوم راکھ ہو کر، راکھ کے معیار سے بھی گر چکی ہے۔ سارا افسانہ ہمارے سامنے کے منظر نامے پر مشتمل ہے مگر داستان کا سا ماحول سارے افسانے کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا ہے۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں نے بخوبی سے ان مذہبی ملمع کار اور ریاکار لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور ہمیں ان کی کارستانیوں سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔ خلیل جبران نے اپنے اسلوب میں وہی شعریت، فلسفہ، منطقی طریقہ کار اور علامت کے ساتھ ساتھ تجسیم سے بھی کام لیا ہے۔ مگر انتظار حسین کا یہ افسانہ مذہبی داستانوی اسلوب میں شامل ہوتا ہے اور اس میں علامت اور استعارے کے بجائے ایک سیدھی سادی کہانی کہی گئی ہے۔ خلیل جبران نے کہانی میں کئی ایک پہلوؤں پہ بات کی ہے مگر انتظار حسین کی کہانی جزئیات میں تو بڑی اچھی ہے مگر موضوع میں ایک ہی بات بیان ہوئی ہے۔

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں نے ہر لحاظ سے داستانوی اسلوب اور کہانیوں سے افسانے لکھے ہیں کہ جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے ہر دور میں انسان نے انھیں داستانوں اور اساطیر کے حوالے سے شعور کو سمجھنے اور زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے کہ اس کو سمجھے بغیر تو انسانی عقل ادراک اور وجدان کی کیفیت کے ساتھ ساتھ مذہب، سائنس اور تاریخ تک صحیح طرح نہیں سمجھ سکتی۔ آج جو سائنسی ایجادات ہو رہی ہیں اس میں سے کئی چیزیں داستانوں میں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس معاملے میں پروفیسر عرش صدیقی لکھتے ہیں:

> ”حصولِ روحانیت اور باطنی آگہی کے ادراک میں اپنے اپنے زمانے میں مائیتھالوجی اور داستانوں کی اہمیت دنیا میں ہر جگہ بنیادی اور لازمی رہی ہے اور آج جو صورت ہمارے سامنے ہے وہ مائیتھالوجی کے واقعات پر نہیں بلکہ ان واقعات میں کارفرما احساسات اور خیالات پر ہے۔ داستانوں کا مطالعہ انسان کے شعور پر کائنات کے مظاہر میں ایک جہانِ معنی کی تصویر دکھاتا ہے اور انسان ان کے حوالے سے اپنی ذات اور اپنے باطن سے آگاہی حاصل کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔“(۷۶)

پروفیسر موصوف کا متذکرہ اقتباس پڑھ کر داستانوں اور دیومالا کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان نے ہر دور میں داستانوی افکار سے مدد حاصل کی ہے کہ یہ نہ صرف ادب کا ایک اعلیٰ سرمایہ ہیں بل کہ انسانی

تاریخ اور عقلی دلائل کو سمجھنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہیں کہ جن کے مطالعے سے انسان نے واقعات کے احساسات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کا گُر سیکھا ہے۔ ایک ایک واقعہ خود میں بے شمار معانی کا حامل ہے کہ جسے جانے اور پڑھے بغیر زندگی کے کئی شعبوں کی اصل حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے

ii. مثالی پند و نصائح اور داستانوی افکار

خلیل جبران اور انتظار حسین دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے خاص داستانوی افکار و اسلوب میں حیوانات کی علامتوں، حکایتوں، طلسماتی فضا و حیرت اور مثالی و خیالی دنیا اور پند و نصائح سے کہانیوں کو بیان کیا ہے کہ جس کے ذریعے سے ایک خاص ادبی اسلوب تخلیق پایا ہے۔ خلیل جبران کے ہاں جہاں مثالی و خیالی پند و نصائح کی ایک خاص اہمیت ہے ویسے ہی انتظار حسین کے ہاں بھی مثالی و خیالی پند و نصائح کی ایک خاص معنویت ہے۔ انتظار حسین کے اسی حوالے سے نازیہ ظہور کہتی ہیں:

> ”اُن (انتظار حسین) کے افسانوں میں علامتوں کی تہ در تہ معنویت کارفرما ہے۔ خصوصاً حیوانی علامتوں کی تفہیم کے لیے داستان، اساطیر، مذہب، تہذیب اور تاریخ کے سرچشموں سے رجوع کیا ہے۔“(۷۷)

بالکل اس اقتباس سے انتظار حسین کے ہاں داستانوی افکار اور جانوروں کی علامتوں سے کہانیاں بیان کرنے کے فن اور اسلوب پر نمایاں روشنی پڑتی نظر آتی ہے۔ جس سے افسانہ نگار اپنا مقصد و نصائح بیان کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ خلیل جبران کے ہاں بھی اسی طرح علامتوں اور حیوانات کے استعاروں، کنایوں سے کئی ایک کہانیاں داستانوی افکار کا حصہ بنتی نظر آتی ہیں۔ خلیل جبران کا افسانہ ”سورج اور زمین کے درمیان“ ایک دلچسپ افسانہ ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے ایک حکائی اور داستانوی اسلوب کے ذریعے سے اپنی بات اور کہانی کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کہانی میں بلوط کے بلند و بالا درخت کے سائے اور نرم و چھوٹے قد کی گھاس کے درمیان مکالمے سے کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ جس میں گھاس بلوط کے سائے سے نالاں ہوتی ہے تو

سایہ اسے کہتا ہے میں کیا ہوں سر اٹھا کر اوپر دیکھو تو تمھیں پتا چلے کہ سب کچھ تو درخت ہے اس پر گھاس کیا کہتی ہے:

"""ارے بھئی میں نہیں۔ میں نہیں ذرا آسمان کی طرف دیکھو تو۔۔۔۔ ایک بہت بڑا درخت ہے جو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف جھولتا رہتا ہے۔ سورج اور زمین کے درمیان!"

گھاس نے اوپر دیکھا تو پہلی بار درخت نظر آیا۔

اس نے اپنے دل میں کہا۔

"گھاس! مجھ سے بھی لمبی اور اونچی گھاس!"

اور گھاس خاموش ہو گئی!"[۷۸]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل جبران نے بہت سی ڈھکی چھپی باتوں اور علامتوں میں کئی ایک باتیں کہہ دی ہیں جن کو پڑھ کر سمجھ آتی ہے کہ انسان ہمیشہ کسی کو اپنے مرتبے، معیار اور قد سے ہی جانتا ہے اور دوسرا یہ کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے دوسروں کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ اگر انسان قد کاٹھ میں چھوٹا اور اپنے معیار میں ہلکا ہوتا ہے تو وہ دوسرے کسی شخص کو بھی ویسا ہی سمجھے گا جس میں سوسائٹی کے اندر ایک بگاڑ تو پیدا ہوتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے معیار کو سمجھنے میں بھی دقت اور پریشانی کا سامنا ہوتا ہے ہر شخص اپنی قدر اور پہچان کھونے لگتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ انسان جب تک دوسری چیزوں کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اسے اپنی ذات کے علاوہ اور اپنے ارد گرد کے علاوہ کچھ اور نظر بھی نہیں آتا اور وہ کنویں کے مینڈک کی طرح ہی سوچتا ہے کہ سب کچھ یہی کچھ ہے اور باہر بھی ایسا ہی کنویں کی طرح کا ساماں ہو گا۔ داستانوی اسلوب اور درختوں، جانوروں اور چیزوں کا آپس میں گفتگو کرنا اور پھر اس سے بات کو نصیحت کی طرح پیش کرنا۔ یہ اس افسانے کی خوبی ہے۔

انتظار حسین کا افسانہ "زرد کتا" سے بھی ایسا موضوع اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جس میں انسان کے کسی دوسرے انسان کو سمجھنے اور دوسری چیزوں کی عظمت کو جاننے کی صلاحیت اس کی اپنی حیثیت سے ہی دیکھی جاتی ہے۔ انتظار حسین کے ہاں انسان تو کجا جانور بھی اس صفت سے پُر نظر آتے ہیں۔ احمد حجری جو صرف اس لیے شعر کہنا ترک کرتا ہے کہ اب اچھے برے اور چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رہی، ایک گدھے پر شراب بیچنے لگتا ہے مگر ایک دن گدھا بھی:

"مگر ایک روز ایسا ہوا کہ گدھا ایک موڑ پر آکر اڑ گیا۔ انہوں نے اسے چابک رسید کیا تو اس گدھے نے انہیں مڑ کر دیکھا اور شعر پڑھا جس میں تجنیسِ لفظی استعمال ہوئی تھی اور مضمون یہ تھا کہ میں دوراہے پہ کھڑا ہوں۔ احمد کہتا ہے چل، احد کہتا ہے مت چل۔ احمد حجری نے یہ سن کر اپنا گریبان پھاڑ ڈالا اور آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانے کا برا ہو کہ گدھے کلام کرنے لگے اور احمد حجری کی زبان کو تالا لگ گیا۔ پھر انہوں نے گدھے کو آزاد کر کے شہر کی سمت ہنکا دیا اور خود پہاڑوں میں نکل گئے۔"(۷۹)

احمد حجری کی زبان کو تالا لگنا اس کے بعد تو اس کی دانائی اور فہم کے مطابق بنتا تھا کہ اس حال میں کہ اب گدھے بھی انسانوں سے آگے نکلتے جا رہے ہیں اور انسان کی عظمت سے انحراف کیے جا رہے ہیں۔ اسی افسانے میں ایک اور جگہ دانشوروں اور عام دھوکے باز مفکرین کے درمیان فرق نہ رہنے کا بھی رونا رویا گیا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

"جہاں پناہ جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا: امان ملی۔ تب اس نے عرض کیا۔ خداوندِ نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں رہتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔"(۸۰)

اس اقتباس سے بھی پتا چلتا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں بھی اس مسئلے کا کافی پرچار اور تکلیف نظر آتی ہے کہ اب فرقِ جاہل و عالم مٹ گیا ہے اور اچھے برے میں جو تمیز تھی اب ختم ہوئی جاتی ہے۔ بادشاہ کا ذکر، گدھوں کا شعر کہنا اور مردوں کو وعظ کرنا یہ بالکل داستانوی مثالی پند و نصائح ہی میں ممکن ہو سکتا ہے اور اس افسانے "زرد کتا" کی تو ساری فضا ہی طلسماتی اور حیرت میں ڈوبی ہوئی ہے بالکل داستانوی ماحول نظر آتا ہے۔

خلیل جبران نے اپنے افسانے میں خاص داستانوی، حکائی اور فلسفیانہ اسلوب اپنایا ہے جس میں کہانی بالکل سادہ ہوتے ہوئے بھی تہ در تہ اپنے معانی اور مفاہیم کھولتے نظر آتی ہے۔ اگرچہ بات علامت اور کہانی استعارے میں بیان کی گئی ہے مگر پھر بھی کہانی کا داستانوی فکر کا پہلو صاف نمایاں نظر آتا ہے کہ جس میں ایک گھاس کا تنکا خود کو شاہ بلوط کے درخت کی مانند سمجھنے لگا ہے اور خود ہی یہ تصور کر کے کہ ہم دونوں گھاس ہی ہیں مگر بلوط ذرا اونچی اور لمبی گھاس ہے اور میں چھوٹی گھاس ہوں مگر ہم ہیں ایک ہی۔ یہاں سے تفاوتِ انسانی کے درجے دم توڑنے لگتے ہیں اور افسانہ نگار کا مطمحِ نظر واضح ہو ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین نے ملفوظات اور حکایات سے کام لیا اور ایک داستانوی ماحول بنایا ہے اور علامت کے بجائے حکایت اور ملفوظ کو بلاواسطہ اور کسی بھی علامت کے بغیر بیان کیا ہے جس وجہ سے کہانی سادہ اور بات کی تفہیم یک سطحی نظر آتی ہے مگر اس میں عیب یا جھول نہیں دکھائی دیتا۔ انتظار حسین کی کہانی کے اقتباس میں داستانوی رنگ بھی غالب نظر آتا ہے کہ بادشاہوں کی سی بازی گری اور سخاوت کہانی میں دیکھنے کو ملتی ہے کہ بادشاہ ہر ایک روزانہ نواز رہا ہے اور تفتیش بھی نہیں کرتا اور کسی بھی نام نہاد دانشور سے کوئی علمی یا دانشمندی کا

سوال بھی نہیں کرتا۔ یہی بات تو افسانے میں موجود بادشاہ کے کردار کو شاہی رویے اور آزاد خیال کردار کا آدمی بناتی ہے۔

خلیل جبران کا افسانہ "کورا کاغذ" ایک داستانوی، حکائی مگر تمثیلی اسلوب کا حامل افسانہ ہے کہ جس میں افسانہ نگار نے زمانے اور معاشرے کے ان افراد کا ذکر کیا ہے کہ جو اپنی زندگی میں نیک، پاکیزہ، مال دار اور امیر ہونا تو چاہتے ہیں مگر کبھی کسی بھی صورت محنت نہیں کرنا چاہتے اور اسی وجہ سے وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے کہ انھیں اس بات کا زعم ہے کہ ہم کام نہیں کریں گے اور اپنے آپ کو ان کاموں کے جنجھٹ سے دور ہی رکھیں گے کہ ان کاموں میں الجھنے سے یونہی آدمی بے چین ہوتا ہے اور ہم سکون کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

> "کاغذ کے ایک سفید ورق نے کہا۔" میں بے داغ بنایا گیا ہوں اور ہمیشہ بے داغ ہی رہوں گا اور میں جل کر سفید راکھ میں تبدیل ہونا زیادہ پسند کروں گا بجائے اس کے کہ سیاہی مجھے چھوئے اور داغ میرے قریب آئے۔"
>
> جو کچھ سفید کاغذ نے کہا دوات نے سنا اور اپنے تاریک دل میں ہنس دی لیکن اس کے قریب جانے کی جرات نہ کی۔
>
> رنگ برنگی پنسلوں نے بھی سنا وہ بھی اس کے نزدیک نہ پہنچ سکیں اور کاغذ کا سفید ورق اسی طرح بے داغ رہا، بے داغ اور صاف۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن کورا۔ (۸۱)

خلیل جبران کے اس افسانے میں سیاہی کی گفتگو کمال گفتگو ہے کہ جس میں استعارے اور کنائے میں خلیل جبران نے بہت اعلیٰ باتیں سمجھانے کی کوشش کی ہے سیاہی اس کے قریب اس لیے نہیں جا رہی کہ اسے پتا ہے کہ میں اس کے قریب جاؤں گی تو اپنی عزت اور قدر کھو دوں گی اور وہ خواہ مخواہ کہے گا کہ تُو نے مجھے سیاہ کر دیا۔ کیوں کہ وہ سست اور انا پرست ہے کہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ہی خود کو بدلنا چاہتا ہے کہ خود

کو بدلنے کے لیے جہاں محنت کرنی پڑتی ہے وہیں بہت سے مقامات پہ اپنے معیار سے اتر کر اپنے ہاتھوں کو بھی مختلف کاموں میں گندا کرنا پڑتا ہے۔ جس سے زندگی صاف ہو جاتی ہے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی ایسے کردار پائے جاتے ہیں کہ جو اپنی محنت کو چھوڑ دنیا داری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی کورے کاغذ کی طرح ہی صاف رکھتے ہیں کہ جو فضول اور بے معنی ہوتی ہے۔ اس کے لیے انتظار حسین کا شاہ کار افسانہ "زرد کتا" دیکھا جاسکتا ہے کہ جس میں شیخ عثمان کبوتر کے مریدوں نے مشکل زندگی کو چھوڑا اور دنیا داری کو اپنا لیا تو وہ اپنے معیار سے گر کر زرد کتے کی جون میں ڈھل گئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قاضی عابد لکھتے ہیں:

"بظاہر روحانی سطح پر زندگی گزارنے والے ان کرداروں کے سامنے ابو قاسم بھی رفتہ رفتہ اپنی روحانی شخصیت سے دستبردار ہو جاتا ہے کیوں کہ "اگر پورا معاشرہ بدی کی طرف مائل ہو جائے تو فرد اپنی نیکیوں کو پورے طور پر رکھ ہی نہیں سکتا۔""[۸۲]

جب سارا معاشرہ ہی گناہوں کی دلدل میں دھنس چکا ہو تو کوئی بھی شخص اپنے آپ کو پاک صاف نہیں رکھ سکتا کیوں کہ وہاں گناہ اور ثواب کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ نیکی بدی میں امتیاز چھوڑ دیتے ہیں اور لفظ اپنی عظمت کھو دیتے ہیں۔ یہ ایک داستانوی فکر کی عکاس گفتگو ہے کہ زمانہ جس قدر بھی خراب ہو جائے بہر حال اس میں نیک لوگ ضرور باقی ہوتے ہیں مگر یہاں داستانوی افکار کے ذریعے مثالی پند و نصیحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتظار حسین کے ہاں ایسے اور بھی افسانے ملتے ہیں کہ جن میں افراد نے اپنے فرائض سے بھاگنے کی کوشش کی ہے اور حالات کا مقابلہ نہیں کیا۔ جن میں افسانہ "شہادت" زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ جس میں ایک کردار جو رات کے اندھیرے میں حضرت امام حسینؑ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور روشنی ہونے پر پتا چلتا ہے کہ ایک شخص چلا گیا حالانکہ اسے نہیں جانا چاہیے تھا اور کربلا میں امام کے ساتھ ہی رہ کر دشمن سے لڑنا چاہیے تھا۔ جب اس کی شناخت ہوئی اور مدت بعد اس سے پوچھا گیا تو اس نے اس کا اقرار بھی کر لیا۔ اقتباس دیکھیے:

"تب ایک مرد بزرگ نے اسے فرطِ غضب سے دیکھا" تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو دیکھا اور حق کی شہادت سے روگرداں ہوا" اس جھڑکی پر سر اس کا جھک گیا اور متاسف ہو کے بولا "کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کہ میں حق کا ہمسفر ہوا اور حق سے روگرداں ہو گیا۔ اے لوگو! تم میں سے جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کہ میں دن بھر اس قافلے کے ساتھ رہا۔ جب دھوپ ڈھلی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا جب شام پڑی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ جب رات نے خیمہ ڈالا تو میں اس سے جدا ہو گیا کہ رات دلوں میں خوف اور وسوسہ پیدا کرتی ہے اور قافلوں کو منتشر کرتی ہے۔"(۸۳)

کربلا اور واقعہ کربلا کو ہمارے اسلامی کلچر میں ایک داستانوی حیثیت حاصل ہے اور ان واقعات کو آج بھی ہم عقیدت اور ہمدردی کے جذبے سے دیکھتے ہیں۔ ایسے آدمی کے حصے میں سوائے شرم اور افسوس کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا جو اپنے امام کا ساتھ چھوڑ دے اور زندگی کو بچالے۔

خلیل جبران کا افسانہ داستانوی اور حکائی اسلوب میں لکھا ہوا افسانہ ہے کہ جس کے اندر ایک سے زیادہ تہیں دیکھی اور سمجھی جاسکتی ہیں مگر انتظار حسین کا پہلا افسانہ "زرد کتا" میں نفس کی غلامی کر کے گناہوں کی آسان زندگی اپنانے اور نیکی کی مشکل راہ کو چھوڑ کر کتوں میں شامل ہونے کا ذکر کمال مہارت سے بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح ان کا دوسرا افسانہ "شہادت" بھی اسلامی تاریخی روایت اور جذبات پر مبنی دلکش داستانوی انداز میں لکھا افسانہ ہے کہ جو شہادت کی عظمت اور صداقت کو تو واضح کرتا ہی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے معاملات میں علامتی طور پر ہمارے سامنے پرتیں کھولتا ہے۔ اس لیے اسلوب، تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے انتظار حسین کا افسانہ خلیل جبران کے افسانے سے بڑھ کر ہے۔

خلیل جبران کے ہاں داستانوی عناصر، مافوق الفطرت، مذہبی قصائص، روایات اور جانوروں کے قصوں سے جڑی کئی ایک کہانیاں موجود ہیں جن میں اکثر کا اسلوب داستانوی اور حکائی ہے جس کے کردار

زیادہ ترجاندار ہی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانہ "شاعر اور عالم" ہے جس میں خلیل جبران نے اپنے حکائی اور داستانوی اسلوب سے ایک دلکش کہانی گھڑی ہے مگر کہانی میں علامت زیادہ غالب آگئی ہے کہ اس افسانے میں ایک سانپ ہے جو کہ عالم کا استعارہ ہے اور ایک چنڈول ہے جو کہ شاعر کی علامت ہے۔

اس افسانے میں انھیں دو علامتوں سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور سانپ اور چنڈول کے درمیان باہمی گفتگو ہوتی ہے جس سے دونوں ایک دوسرے پر اپنی اپنی خوبیاں اور رازہائے پنہانی واضح کر کر کے اپنی اہمیت جتلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر اپنے آپ ہی کو افضل مانتے ہیں جب کہ دونوں دوسرے کو ماننے پر تیار نہیں۔ بڑائی بیان کرتے ہوئے اقتباس دیکھیے:

> "ایک سانپ نے ایک چنڈول سے کہا "تم اڑتے ہو، لیکن تم زمین کے ان گوشوں کو نہیں دیکھ سکتے جہاں زندگی کا رس مکمل خاموشی میں حرکت کرتا ہے۔" اور چنڈول نے جواب دیا۔
>
> "بے شک تم بہت سی باتیں جانتے ہو، تم تمام عقلمندوں سے زیادہ عقلمند ہو لیکن افسوس کہ تم اڑ نہیں سکتے۔"(۸۴)

دونوں اسی طرح ایک دوسرے پر اپنی اپنی خوبیاں اور بڑائیاں بیان کرتے رہتے ہیں مگر ایک دوسرے کی عظمت کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ ہمارے معاشرے کا اجتماعی رویہ ہے اور ہم اپنے آپ کو تو افضل اور بڑا سمجھتے ہیں مگر اپنے کسی بھائی کو یا کسی اور رفیق کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اگرچہ خوبیاں ہم میں بھی ہوتی ہیں مگر دوسروں کی خوبیاں بھی مان لینی چاہییں۔ اسی طرح یہ دونوں لڑتے رہتے ہیں اور بات چنڈول کے گانے تک پہنچ جاتی ہے کیوں کہ چنڈول ایک ایسا پرندہ ہے کہ جس کے گانے کی شہرت اور پسندیدگی ہوتی ہے اس لیے اسے شاعر کے لیے علامت بنایا گیا ہے جو اپنی شاعری کے ہی گیت گاتا رہتا ہے اور اس کے سامنے سب کو ہیچ خیال کرتا ہے۔ سانپ اپنی دانائی اور لافانی خوبیوں اور خزانوں کے علم کا ذکر کرتا ہے مگر چنڈول ان سب

خوبیوں کے سامنے بس ایک ہی رٹ لگائے کھڑا ہے کہ کیا تمھیں گانا آتا ہے اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو تم مجھ سے گھٹیا ہو چہ جائیکہ تم کوئی دیوتا بھی بن جاؤ۔ اقتباس دیکھیے:

"سانپ نے کہا" قرمزی رنگ کی ایک ندی ہے جو پہاڑ کی تہہ میں بہتی ہے اور کوئی اس کا پانی پی لے وہ لافانی بن جائے یقیناً کوئی پرندہ یا حیوان اس قرمزی ندی کو پا نہیں سکتا۔"

چنڈول نے کہا" ہاں اگر تم چاہو تو دیوتاؤں کی طرح لافانی بن سکتے ہو لیکن افسوس تم گا نہیں سکتے۔"

سانپ نے کہا" مجھے ایک مدفون مندر کا علم ہے جسے میں دن میں ایک بار ضرور دیکھتا ہوں۔ اسے دیوتاؤں کی ایک معدوم نسل نے تعمیر کیا تھا اور اس کی دیواروں پر زمان ومکان کے اسرار لکھے ہوئے ہیں اور جو کوئی اسے پڑھ لے وہ تمام رازوں کو سمجھ لے گا۔"

چنڈول نے کہا" سچ مچ اکر تم چاہو تو زمان ومکان کے سارے عالم اپنے جسم کے ساتھ لپیٹ سکتے ہو پر اس کا کیا ہو کہ تم اڑ نہیں سکتے۔"

اس پر سانپ کو بہت غصہ آیا جب وہ مڑا اور سوراخ میں داخل ہوا تو اس نے بڑبڑا کر کہا۔

"خالی الذہن گانے والا پرندہ۔"

اور چنڈول یہ نغمہ سرائی کرتا ہوا پرواز کر گیا۔ "افسوس افسوس میرے عقلمند دوست تم اڑ نہیں سکتے۔"(۸۵)

داستانوی فضا بنتی نظر آرہی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے کئی لوگ ہوتے ہیں کہ جو دوسروں کی ہزارہا خوبیوں کو اس لیے نظر انداز کر دیتے ہیں یا کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی کسی ایک خوبی کے حامل نہیں ہیں۔ ایسا ہے کہ اگر کسی میں آپ کی ایک ادنیٰ سی خوبی موجود نہیں تو آپ اس کی اعلیٰ خوبیوں کو

بھی ماننے کے لیے تیار نہیں اور آپ کی نظر میں ان کی تمام خوبیاں اور کمالات مٹی یا راکھ کا ڈھیر ہیں۔ علامتی طور پر خلیل جبران نے اس افسانے میں ایک شاعر کے گھمنڈی ذہن پر طنز کیا ہے اور ایک صاحبِ بصیرت اور عالم بر حق کے علم پر ان تمسخروں اور شعبدہ بازوں کی چالاکیوں کا پردہ چاک کیا ہے کہ یہ شاعر بس کسی کو اس لیے عزت نہیں دیتے کہ وہ گا نہیں سکتا یا پھر ان کی طرح شعر نہیں کہہ سکتا۔ حالانکہ ایک شاعر بھی تو ایک فلسفی کی طرح منطق کے دلائل نہیں دے سکتا یا ایک عالم کی طرح شرع و دین پہ تعدیل و جرح نہیں کر سکتا۔ مگر شاعر ان باتوں سے مطمئن نہیں ہونا چاہتا کیوں کہ آپ گا نہیں سکتے۔

انتظار حسین کے ہاں بھی ایسے شاعر پائے جاتے ہیں کہ جو خود کو بہت بڑے شاعر مانتے ہیں کہ خود کو انوری، سعدی اور خاقانی کے درجے کا شاعر ماننے لگے ہیں جن کی وجہ سے بہت سے اصل شاعروں نے شعر کہنا ترک کر دیا ہے کہ تمیزِ خاص و عام مٹ گئی ہے اور سارا ہی شہر شاعر بنا پھرتا ہے مگر وہ تمام شاعر کسی کو خاطر میں نہیں لانا چاہتے۔ انتظار حسین کا افسانہ "زرد کتا" میں ایسے شاعروں کا احوال ملتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> "احمد حجری اپنے وقت کے بزرگ شاعر تھے مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ شہر میں شاعر بہت ہو گئے۔ امتیاز ناقص و کامل مٹ گیا اور ہر شاعر خاقانی و انوری بننے لگا۔ قصیدہ لکھنے لگا۔ احمد حجری نے یہ دیکھ شعر گوئی ترک کی اور شراب پینی شروع کر دی۔"(۸۶)

شاعروں کی ایک اپنی رمز ہوتی ہے کہ جب وہ کسی بات پر اڑ جاتے ہیں تو زمانہ لاکھ انھیں سمجھائے اور کہے کہ ایسا نہیں ہے مگر وہ کسی بھی طور ایسا ماننے سے گریز کرتے ہیں اور نہیں مانتے چاہے اس کے لیے ان کا کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ ہو جائے۔

ایک بات ہمیں اور بھی سمجھ آتی ہے کہ جب سب ہی اپنے آپ کو عالم فاضل اور شاعرِ حکیم الامت سمجھنا شروع کر دیں تو امتیازِ ناقص و کامل تو مٹنا ہی ہے اس پر مصنف موصوف کا ایک اور اقتباس اسی افسانے سے دیکھیے:

”جہاں پناہ جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔

فرمایا: امان ملی۔ تب اس نے عرض کیا۔ خداوندِ نعمت تیری سلطنت دانشمندوں سے خالی ہے۔

بادشاہ نے کہا: کمال تعجب ہے۔ تو روزانہ دانشمندوں کو یہاں آتے اور انعام پاتے دیکھتا ہے اور پھر بھی ایسا کہتا ہے۔

عاقل وزیر تب یوں گویا ہوا کہ اے آقائے ولی نعمت گدھوں اور دانشمندوں کی ایک مثال ہے کہ جہاں سب گدھے ہو جائیں وہاں کوئی گدھا نہیں رہتا اور جہاں سب دانشمند بن جائیں وہاں کوئی دانشمند نہیں رہتا۔“(۸۷)

انتظار حسین کا یہ افسانہ کئی پہلوؤں سے اہم اور کمال افسانہ ہے جس کا اسلوب بالکل داستان جیسا ہے ۔اس میں بنیادی طور پر تو روحانیات کا زوال دکھایا گیا ہے کہ جس کے ضمن میں کئی ایسی باتیں آگئی ہیں کہ جن سے افسانے کی شیڈز اور تفسیروں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ بزرگوں اور صوفیا کے ملفوظات سے ترتیب دیا گیا ہے مگر اس میں دلکش داستانوی انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

خلیل جبران کے افسانے میں علامتی پیرائے میں ایک شاعر اور عالم کی بات کی گئی ہے مگر انتظار حسین کے افسانے میں حکائی انداز میں ایک شاعر اور عالم و دانشور پہ بات کی گئی ہے۔ خلیل جبران کے مطابق شاعر اپنی چند ایک خوبیوں پہ اس قدر نازاں ہوتے ہیں کہ کسی عالم کی بڑی سے بڑی خوبی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور اپنی ایک خوبی کو ہی بیان کیے جاتے ہیں اور دوسرے کی نہیں سنتے۔ جب کہ انتظار حسین کے ہاں سب شاعروں پہ طنز تو نہیں ملتا مگر یہ جو جگہ جگہ شاعر بن بیٹھے ہیں ان سے احتراز اور چھٹکارے کی ترغیب ضرور ملتی ہے۔ دانشمندوں اور عالموں کی بہتات نے اصل دانشمندوں کو چھپا دیا ہے اور اصل لوگ اب خود بھی کنارہ کر گئے ہیں اور کہیں روپوش ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ خلیل جبران کا اسلوب اس افسانے میں علامتی ہے جب کی انتظار

حسین کا حکائی ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں نے کہانی کی اچھی تفہیم کے لیے زمانہ قدیم کا طریقہ استعمال کیا ہے اور کرداروں کے مابین مکالموں سے بات کو آگے بڑھایا ہے۔

خلیل جبران نے اپنے افسانے "ضمیر کی بیداری" میں ایک حکایت گھڑنے کی کوشش کی ہے جس میں ایک شخص ایک باغ سے تربوز چرا کے لاتا ہے جو کچا نکل آتا ہے اور اس طرح وہ کچھ فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے گناہوں سے توبہ کر کے ہمیشہ کے لیے نیک ہو جاتا ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ گناہ کر کے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ اقتباس دیکھیے:

> "ایک اندھیری رات میں ایک شخص اپنے ہمسائے کے باغ میں داخل ہوا اور اپنی سمجھ میں سب سے بڑا تربوز چرایا اور اسے لے آیا۔
>
> جب اس نے اسے چیرا تو دیکھا کہ وہ ابھی ہی تھا۔
>
> تب ایک معجزہ رونما ہوا۔
>
> اس شخص کا ضمیر بیدار ہوا اور اسے ندامت سے جلانے لگا اور وہ تربوز چرانے سے پچھتایا۔"(۸۸)

اس داستانوی افسانے سے ہمیں یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بعض اوقات انسان کا گناہ اسے توبہ کروا دیتا ہے اور اس کی نیکی اسے غرور و تکبر کی وجہ سے خدا سے دور کروا دیتی ہے۔ اور ایسا گناہ کہ جس سے ضمیر بیدار ہو جائے اس نیکی سے ہزار گناہ افضل ہے کہ جس سے آپ کا ضمیر مر جائے۔ اس افسانے میں دو لفظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں ایک "ہمسائے" کہ انسان ہمیشہ اپنے قرب والوں کو ہی دھوکا دیتا اور ہمیشہ انھیں ہی نقصان پہنچاتا ہے کہ جو اس پر اعتبار کرتے ہیں دوسرا لفظ "اپنی سمجھ میں" کہ انسان اپنی سمجھ میں تو بہت سمجھدار ہوتا ہے مگر اصل تدبیر اور عمل تو خدا کا ہی ہونا ہوتا ہے اور اسی نے غالب آنا ہوتا ہے کہ اس آدمی نے بڑی

کاریگری سے ایک بڑا ساتربوز چرایا کہ اچھا اور خاص ہے آرام سے بے فکر ہو کر کھاؤں گا مگر پروردگار نے اس کی زندگی بدلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اگرچہ راستا غلط تھا مگر اس کی منزل صحیح ٹھہری۔

انتظار حسین نے بھی غلطی سے ضمیر کے زندہ ہونے اور پچھتاوے پر ایک افسانہ "شہادت" لکھا ہے کہ جو شہادت اور صداقت کے فلسفے کو عام کرتا ہے۔ اس افسانے کو مذہبی داستان میں کربلا تک لے جایا گیا ہے اور امامؑ کے اندھیرا کر کے کہنے پر کہ جو جانا چاہتا ہے اندھیرے میں چلا جائے تو ایک شخص چلا گیا تھا جس کی جب ملکِ شام میں شناخت ہو گئی تو افسانہ نگار نے اس کے پچھتاوے اور ضمیر کی بیداری کو یوں بیان کیا ہے:

> "تب ایک مرد بزرگ نے اسے فرطِ غضب سے دیکھا "تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو وہ شخص ہے جس نے حق کو دیکھا اور حق کی شہادت سے روگرداں ہوا" اس جھڑکی پر سر اس کا جھک گیا اور متاسف ہو کے بولا "کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا کہ میں حق کا ہمسفر ہوا اور حق سے روگرداں ہو گیا۔ اے لوگو! تم میں سے جو نہ جانتا ہو وہ جان لے کہ میں دن بھر اس قافلے کے ساتھ رہا۔ جب دھوپ ڈھلی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا جب شام پڑی تب بھی میں اس قافلے کے ہمراہ تھا۔ جب رات نے خیمہ ڈالا تو میں اس سے جدا ہو گیا کہ رات دلوں میں خوف اور وسوسہ پیدا کرتی ہے اور قافلوں کو منتشر کرتی ہے۔"(۸۹)

اپنے لوگوں سے بچھڑنے اور ان کو حالتِ پریشانی میں چھوڑنے کا پچھتاوا اگر آپ کو ضمیر کی بیداری دے تو کہیں اس کی تشفی ممکن ہو سکتی ہے مگر انسان اس غلطی سے نہ سیکھے اور بہانے تلاش کرے تو یقیناً اس نے غلطی پر مستزاد غلطی کی ہے۔

خلیل جبران نے تو ایک حکایت سے بات کو سمجھانے کی بات کی ہے اور ایک حکایت کے ذریعے سے داستانوی پہلوؤں میں کہانی کو جگہ دی ہے مگر انتظار حسین نے تو مذہبی، تاریخی اور روایتی قصص میں کہانی کو جا پہنچایا ہے اور کہانی کا اسلوب بھی بالکل تاریخی اور روایتی ہے کہ پڑھتے ہی دل میں جاہ کرتا ہے۔ انتظار حسین کا

اسلوب اور کہانی کی بناوٹ خلیل جبران کے منطقی اور فلسفیانہ انداز سے کہیں بہتر اور بڑھ کر ہے۔ افسانے کی جزئیات اور کرداروں کی گفتگو مزہ دوبالا کر دیتی ہے۔ جب کہ خلیل جبران کا افسانہ سیدھا سادہ اور سپاٹ سا ہے۔ انتظار حسین اور خلیل جبران میں داستانوی لحاظ سے یہی فرق ہے کہ خلیل جبران جانوروں کی حکایات و داستان اور مذہبی حوالوں اور روایات سے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ مگر انتظار حسین کے ہاں باقاعدہ مذہبی قصے، قرآنی واقعات، داستانوی کہانیوں، اخلاقی کہانیوں اور جاتک کتھاؤں تک کا تسلسل ملتا ہے۔ اس لیے انتظار حسین کے اسلوب میں تہ داری اور پہلوداری ہے جب کہ خلیل جبران کا اسلوب سادہ، عام فہم اور حکائی ہے جس میں اکثر کہانیوں کا سبق اور نتیجہ خود ہی کہانی کار بتا دیتا ہے۔ انتظار کے اسی اسلوب کے بارے ڈاکٹر آصف فرخی بیان کرتے ہیں:

> "وہ واقعیت نگاری کے اسلوب سے گریز کر کے علامت، استعارے اور حکایت کی طرف آئے اور اپنے اس انداز سے انہوں نے اردو افسانے کے تمام ڈھرے متاثر کیا۔ لیکن وہ حکائی اسلوب سے بھی آگے نکل کر اب سماعی روایت کی ان شکلوں کی طرف جارہے ہیں جو افسانے سے مزید دور لے جاتی ہے۔ مگر کہانی سے زیادہ قریب۔"(۹۰)

داستانوی افکار کا سلسلہ کوئی چھوٹا سا سلسلہ نہیں بل کہ اس میں دنیا بھر کا ادب اور مذہبی عناصر کے دھارے نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حکایت، نقل، حیوانی کہانیاں، اخلاقی کہانیاں، لوک کہانیاں، تمثیل، قصص المشاہیر، رزمیہ، رومان، مارکین، دیومالا، جاتک کہانیوں وغیرو کا اگر بغور مطالعہ کریں تو یہ کہیں نہ کہیں آکر داستان اور داستانوی افکار اور اسلوب سے ضرور جڑ جاتی ہیں اور یہیں سے داستانوی فکر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو مذہب، فلسفہ اور سائنس کے ساتھ ساتھ کلاسیک سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ کلیم الدین احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "قصے کہانیاں (داستانیں) اپنے فنی اور ادبی نقائص وحدود کے باوجود بھی ایسی چیزیں نہیں کہ انھیں یک قلم ناقابلِ اعتبار سمجھا جائے۔ ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں

متداول نظر آتے ہیں وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے شعور و تخیل سے آبیار ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کی ابتدائی نوخیز قوتِ پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔ اسی آئینہ میں بہت سی وہ چیزیں نظر آتی ہیں جن میں وہ قوم شروع میں دلچسپی لیتی تھی اور جو اس کی دماغی اور جذباتی قوتوں پر پُرزور محرکات کا کام کرتی تھیں۔ اسی آئینہ میں وہ سب باتیں نظر آتی ہیں، جن میں اسے یقینِ کامل تھا اور جنھیں وہ حقیقت اور جامعیت کا جامہ پہناتی تھی اور اسی آئینہ میں وہ مافوق العادت ہستیاں، واقعات، چیزیں، وہ وہم و گمان کے مرقعے، وہ مذہبی عقائد بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں جنھیں وہ صحیح سمجھتی تھی۔"[۹۱]

مذہب، سائنس، فلسفہ، سماجیات، بشریات اور توہمات کی دنیا کو جاننے کے لیے داستان کا مطالعہ بہت ضروری ہے کہ ان کو جانے بغیر مذکورہ بالا کسی بھی شعبے کو صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ لگتا ہے کہ داستانوی فکر دنیا کے تمام فلسفے، علم اور سائنس کی اساس ہے جس سے ہی تمام علوم کی ابتدائی اشکال واضح ہوئی ہوں گی اور انسانوں نے داستانیں سنتے سناتے کئی مفروضے تشکیل دیے ہوں گے۔ آسمان پر اڑنے والوں بادلوں میں تخیل کی جولانی سے سمندر کی روانی کا تصور باندھ لیا ہو گا۔ گھٹا کا چھا جانا ان کے لیے کالے پرندوں کا تصور رکھتا تھا۔ آسمان پر بجلی کی چمک پہاڑی میں ہونے والا شگاف اور بادلوں کو خزانوں کا پہاڑ بھی سمجھنے لگتے۔ نیلا چرخ ان کے لیے خدا کا درجہ رکھتا تھا جس کی تمام جہانوں پہ حکمرانی تھی جو دن میں اپنے طلائی ہاتھوں میں سورج کو اٹھا کر رکھتا اور رات ایک اژدھے کی صورت سب پہ چھا جاتی۔ کائنات کے آغاز اور پھر اس کے انجام پر موشگافیاں یقیناً انسان کے سوچنے سے لے کر آج تک چلتی آ رہی ہیں۔ اس لیے جو جیسے سوچنے لگا وہ سوچتا ہی چلا گیا داستانوں میں شہزادوں کے معرکے اور دیوتاؤں کی جنگیں اور بادشاہوں کی گستاخیوں کے انجام، ان سب سے بہت حکمت و نصیحت کے موتی کشید کیے جاتے رہے اور اسی طرح علم کا سفر چلتا رہا جس سے کئی مذہبی و سائنسی فلسفوں نے جنم لیا۔

اس باب کے اختتام پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں موجود تمام تہذیبوں، قوموں کے شعور اور مذاہب کی نمو میں کہیں نہ کہیں داستانوی افکار کا ضرور ہاتھ رہا ہے اور ان مذاہب میں بہت سی ایسی باتیں اور واقعات مل جاتے ہیں جن کے مطالعے سے لگتا ہے کہ یہ قصہ پہلے پہل کسی نے گھڑا ہوگا اور بعد میں یہ مذہب کا حصہ بن گیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے ہر خطے، قوم اور تہذیب کی اپنی ہی داستانیں اور کہانیاں ہیں جو بعد میں مذہبی رنگ اختیار کر کے مذہبی معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔ ظاہر ہے شروع میں یہ تمام داستانیں زبانی، کلامی اور سینہ در سینہ ہی چلتے رہے اور بعد میں وقت کی ضرورت کے تحت ان کو قلم بند کر لیا گیا جو آج ایک علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بن کے ہمارے سامنے موجود ہے اور یہی کلاسیکی ادب اور لوک ادب کا بھرپور حصہ ہے۔ داستانوی افکار اور ادب کا تعلق بہت پرانا ہے اور اسی طرح اردو ادب اور داستان کا تعلق بھی بہت جاندار اور کامیاب ہے۔ داستانوی فکر نے ہر دور میں انسان کو سوچنے سمجھنے اور نت نئے خیالات کے سات نئے نئے موضوعات بھی دیے ہیں۔ ایک عام انسان سے لے کر ایک معتبر انسان کا داستانوں کے ذریعے خداؤں کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد کو سمجھنا اور ان تک پہنچ کوئی معمولی بات نہیں۔

انتظار حسین کا داستانوں کے ساتھ مضبوط رشتہ بنا اور تاعمر قائم رہا۔ افسانہ نگار نے دو داستانوی سلسلوں سے اپنا تعلق زیادہ استوار رکھا۔ اسلامی روایات کی داستانیں اور ہندی روایات کی داستانیں۔ اسلامی روایات کی داستانوں سے مراد صوفیا کے ملفوظات، لوک روایات کے ساتھ ساتھ آسمانی صحیفوں میں بیان ہونے والی روایات بھی ہیں۔ عام انسانی اوہام، شیعی عقائد میں غیاب اور ظہور کے ساتھ امام مہدی کے تصور، انسانوں اور داستانوں میں بیان رسم ورواج بھی شامل ہیں۔

خلیل جبران کے ہاں بھی داستانوی فکر کی بھرپور آمیزش پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی مذہبی علوم اور مذہب کا سایہ ہے کہ تمام عمر جبران بھی مذہب ہی کو پینٹ کرتا رہا، مذہب ہی کی تمثالیں شاعری میں پیش کرتا رہا اور اپنی کہانیوں میں بھی مذہبی داستانیں اور مذہبی خیالات و فکر کو بیان کرتا رہا۔ جبران میرونی عیسائی تھا اور جس کی تربیت اس نے اپنی ماں اور مدرسے سے باقاعدہ حاصل کی تھی۔ اس کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی

تشبیہات ہوتیں جن میں مذہبی استعارے اور روایات کا داستانوی رنگ جانوروں کی کہانیوں کے انداز میں جھلکتا۔ جس کی وجہ خلیل جبران کا مدرسے میں عربی ادب کا خصوصیت سے مطالعہ تھا۔ اس بات میں شک نہیں کہ جبران نے عربی ادب کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔اپنی کہانیوں کے ذریعے اس نے عرب و عجم کو متاثر کیا۔اس کی کہانیوں پر بھی روایات،اساطیر اور داستانوں کا اثر پڑا۔ عربی،انگریزی اور فرانسیسی زبان روانی سے بولنے والے جبران نے تینوں زبانوں کا قدیم ادب اور ان کی داستانیں بھی پڑھیں اور جس بھی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اس میں اپنے خیالات کے نقوش ثبت کیے۔اس کی وجہ ہی یہ ہے کہ افسانہ نگار نے کسی بھی زبان کے بھاری بھر کم اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کیے بل کہ ایک عام فہم اور سادہ سے انداز میں کہانی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محفلِ عندلیب، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۹

۲۔ گل خزاں رسیدہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۲۰

۳۔ قبرستان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۴۹

۴۔ نیکی اور بدی کے فرشتے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۶۱

۵۔ بنفشہ کا پھول، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۰۱

۶۔ انمول موتی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۵۳

۷۔ ایک ہزار قید خانے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۵۴

۸۔ رہبانیت، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۵۹

۹۔ آنسو اور قہقہے، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۸۹

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۸۹

۱۱۔ لباس، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۹۰

۱۲۔ تماشا گاہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۰۰

۱۳۔ فلسفہ امن، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۰۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۰۷

۱۵۔ شاہ اردوس، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، مرتب: حیدر جاوید سید، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۰۴

۱۶۔ محفلِ عندلیب، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۰۳

۱۷۔ جل پریاں، مشمولہ: اشک و تبسم، خلیل جبران، مترجم: حبیب اشعر دہلوی، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۳۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۵

۲۰۔ چودھویں کا چاند، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۵۹

۲۱۔ نو بار مرنا پڑے گا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۶۰

۲۲۔ شکار اور شکاری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۶۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۶۶

۲۴۔ بوڑھی ملکہ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۹۱

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۹۲

۲۶۔ سکوت جنوں خیز، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۴۶۱

۲۷۔ رہبانیت، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۵۹

۲۸۔ معمار، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۷۳

۲۹۔ عقاب اور لوا، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۵۷۶

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۷۷

۳۱۔ قاضی افضال حسین، ڈاکٹر، اردو کا مابعد جدید افسانہ، مشمولہ: تنقید، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۷

۳۲۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر، مشمولہ: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۱ء، ص ۵۴۰

۳۳۔ انتظار حسین، آخری آدمی، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۳۷۔ مجید مضمر، انتظار حسین کا فن: گم شدہ ماضی کی بازیافت، مشمولہ: انتظار حسین ایک دبستان،ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (مرتب)، ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۶ء، ص ۶۴۸

۳۸۔ انتظار حسین، سوئیاں، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۲۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۴۰۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر، مشمولہ: انتظار حسین ایک دبستان ،ص ۱۶۲

۴۱۔ انتظار حسین، پرچھائیں، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۴۶

۴۲۔ انتظار حسین، ہڈیوں کا ڈھانچ، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۵۸

۴۳۔ انتظار حسین، ٹانگیں، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۹۵

۴۴۔ گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،انتظار حسین کا فن: متحرک ذہن کا سیال سفر، مشمولہ: انتظار حسین ایک دبستان ،ص ۱۶۶

۴۵۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۱

۴۶۔ انتظار حسین، کانا دجال، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۴۳

۴۷۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، ص ۱۷۵

۴۸۔ انتظار حسین، شرم الحرم، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۳۱

۴۹۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۰

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۵۴۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، ص ۱۷۱

۵۵۔ انتظار حسین، کایا کلپ، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۹۰

۵۶۔ انتظار حسین، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۲۲۰

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۲۳

۵۸۔ انتظار حسین، شہر افسوس، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۲۵۱

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۶۱۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص ۱۶۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۶۴۔ ایضاً، ص۱۶۳

۶۵۔ پیڑ اور آدمی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۱۳

۶۶۔ انتظار حسین، کچھوے، مشمولہ: کچھوے، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۱ء (بار اول)، ص۸۷

۶۷۔ قبرستان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۴۴۹

۶۸۔ ایضاً، ص۴۴۸

۶۹۔ ایضاً، ص۴۴۹

۷۰۔ انتظار حسین، دوسرا گناہ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۱۶۱

۷۱۔ ایضاً، ص۱۶۴

۷۲۔ امیدوار جوانی، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۲۸۷

۷۳۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص۳۳

۷۴۔ انتظار حسین، مردہ راکھ، مشمولہ: شہر افسوس، ص۸۶

۷۵۔ ایضاً، ص۸۷

۷۶۔ عرش صدیقی، دیباچہ، مشمولہ: ہندوصنمیات، مہر عبدالحق، ڈاکٹر، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۳ء، ص۲۱

۷۷۔ نازیہ ظہور، انتظار حسین کے افسانوں میں حیوانات کی علامتی حیثیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص۳۴۱

۷۸۔ سورج اور زمین کے درمیان، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص۶۱۰

۷۹۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۳۲

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۸۱۔ کوراکاغذ، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۷۷۹

۸۲۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، ص ۱۷۰

۸۳۔ انتظار حسین، شہادت، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۳۳

۸۴۔ شاعر اور عالم، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۷۸۰

۸۵۔ ایضاً، ص ۷۸۱

۸۶۔ انتظار حسین، زرد کتا، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۲۹

۸۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۸۸۔ ضمیر کی بیداری، مشمولہ: کلیاتِ خلیل جبران، ص ۷۸۴

۸۹۔ انتظار حسین، شہادت، مشمولہ: آخری آدمی، ص ۱۳۳

۹۰۔ آصف فرخی، ڈاکٹر، چراغِ شبِ افسانہ: انتظار حسین کا جہانِ فن، ،سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲۳

۹۱۔ کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فنِ داستان گوئی، ادارہ فروغِ اردو، لکھنو، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲-۱۳

باب پنجم:

مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات

الف۔ مجموعی جائزہ:

کوئی بھی ادیب اپنے زمانے اور معاشرے کا نباض اور عکاس ہوتا ہے کہ اس نے کئی انسانوں کے دکھ درد اور تکالیف کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی رنگارنگی کو بھی اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے یوں پیش کرنا ہوتا ہے گویا یہ بھی اسی کے دل اور دماغ پہ گزرا ہے۔ ادیب اپنے معاشرے کا سب سے حساس اور نازک انسان ہوتا ہے کہ یہ تو کسی جانور کو دھوپ میں بیٹھا بھی برداشت نہیں کر سکتا، تو انسان پہ ہونے والے مختلف مظالم کو یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے اور اس کی پریشانی اس وقت اور بھی دوچند ہو جاتی ہے کہ جب یہ جانتا ہے کہ انسان ہی انسان پر مختلف پیرائیوں، طریقوں اور حیلوں سے ظلم ڈھا رہا ہے تو انسان مذہب کا راستا اختیار کرتا ہے کہ اس میں امن، پیار، شانتی اور سکون کے کئی ایک راستے موجود ہوتے ہیں۔

مذہب، شریعت اور طریقت ان تمام الفاظ کا معنی "راستہ" ہے۔ مذہب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی " طریقہ، روش، اصل، عقیدہ اور مسلک " کے ہیں اور انگریزی میں اس کے لیے Religion کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا مادہ اطالوی لفظ Religio ہے جس کا مطلب "امتناع اور پابندی" ہے۔ مگر علی عباس جلال پوری نے اس لفظ Religion کا مادہ اطالوی زبان کے ہی لفظ Relegere کو قرار دیا ہے جس کا مطلب ہے "نگرانی کرنا"۔ ان دونوں الفاظ کے معانی کو سمجھیں تو اس کا مفہوم یوں بنتا ہے کہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کے تحت اجازت اور پابندی پر مبنی احکامات کی نگرانی اور دھیان رکھنا ہی مذہب کے تحت ثواب کا باعث ہے وگرنہ انسان گناہ کر بیٹھے گا۔ عقیدہ اور مذہب کسی بھی معاشرے کا ایک عظیم، اہم اور خاص الخاص رکن ہے بل کہ بعض دنیا کے معاشرے ایسے بھی ہیں جن میں مذہب ہی غالب ہے جب کہ معاشرے کے دوسرے ارکان ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں مسلم، ہندو، عیسائی اور یہودی معاشرے سرِ فہرست

ہیں، بدھ مت اور جین مت کو بھی ان میں جزوی طور پر شامل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مذہب کی ضرورت کسی بھی معاشرے کے نظام کو بہتر سے بہترین اور ایک لڑی میں پرونے کے لیے انتہائی ضروری ہے وگرنہ ایک معاشرہ کبھی بھی تمدنی سطح پر ایک جیسا نہیں سوچ سکتا اور اس کی ترقی اور ترویج کے امکانات روشن نہیں ہو سکتے۔

مذہب کسی بھی معاشرے کی اساسی اکائی ہے جو معاشرے کے استحکام اور استقلال کے لیے بہت ضروری ہے لہٰذا اس تناظر میں کوئی بھی ادیب جس بھی معاشرے میں رہ کر ادب تخلیق کرے اسے چاہتے نہ چاہتے مذہبی اقدار کے دامن سے واسطہ پڑتا ہی ہے اور ہاں! اگر کوئی سیکولر ذہن کا آدمی بھی کوئی ادب تخلیق کرے تو وہ اپنی ذہنی عقیدت کو ضرور سامنے رکھتا ہے تو وہ مذہب کے حق میں نہیں تو خلاف لکھتے ہوئے بھی مذہب ہی سے ہو کر گزرتا ہے چاہے ذرا دور کا واسطہ رکھتا ہے۔ ایسے ادب میں بھی مذہبی حوالے بہ کثرت مل جاتے ہیں جن سے مذہب کی عکاسی کسی نہ کسی صورت ہوتی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ باقی مذہبی اقدار کے مطابق اور مذہبی معاشروں کو سامنے رکھ کر تبلیغ کے لیے، اخلاقیات کے لیے اور کسی خاص مذہبی حوالے سے لکھا ہوا ادب تو باقاعدہ مذہبی ادب کہلاتا ہے۔ مذہبی ادب کی ضرورت کسی بھی معاشرے کو رہتی ہے کیوں کہ معاشرے کا استحکام مذہب سے ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ مذہب اور اس سے متعلق اخلاقی، صفاتی اور تبلیغی عناصر کی ترویج و ترقی کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس میں ان مذہبی اقدار کو ایک کہانی اور قصے کی صورت میں بیان کر کے لوگوں کے اندر اخلاق و ہمدردی اور خدا کے تصور و تعلیمات جیسی صفات کو زندہ رکھا جا سکے۔ اس لیے مختلف کرداروں اور واقعات کے ذریعے لوگوں کو اخلاق کی قوت اور انصاف کی طاقت سے روشناس کروایا جائے اور انھیں مذہبی حوالے سے مضبوط ذہن ساز ادب مہیا کیا جا سکے تاکہ ان کے اندر مذہب کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے نہ کہ وہ ایمان اور ایقان کے باوجود متزلزل رہیں اور کسی بھی ادیب کا اپنا ذہنی ربط اور فکری انسلاک کسی بھی مذہب یا پھر کسی مذہبی عقیدے سے ہوتا ہے جس کو وہ چاہتے نہ چاہتے بیان کرتا ہی رہتا ہے اور وہ ادیب اپنی ہی فکر کے مطابق مذہبی حوالوں کو ادب میں جگہ دیتا ہے۔

بعض ادیبوں اور شاعروں کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہوتا ہے کہ انھیں بچپن میں گھر سے ہی مذہبی ماحول ملا ہوتا ہے یا پھر ان کی زندگی میں کسی ایسے آدمی کی آمد ہوتی ہے جو ایک خاص قسم کے نظریات کا حامل ہوتا ہے اور اسی کی قربت میں رہتے رہتے وہ ادیب اور شاعر بھی ویسا ہی سوچنے لگتا ہے۔ کسی استاد کی زندگی میں اس طرح آمد بھی سخت اثرات مرتب کرتی ہے کہ طالبِ علم تمام عمر ان خیالات سے نکل نہیں پاتا اور اسی طرح سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ لوگ اس طالبِ علم کو اپنے استاد کا چربہ بھی پکارنا شروع کر دیتے ہیں اور وہی اس طالبِ علم کی پہچان بن جاتی ہے۔ فکر کے پروان چڑھنے اور اس کے ارتقا میں انسانی معاشرے، لوگوں، کتابوں اور علم کا بہت عمل دخل ہے۔ یا تو آدمی ایک ماحول میں رہ رہ کر ویسا ہو جاتا ہے یا پھر اس ماحول کے خلاف ہو جاتا ہے اور اس کی خامیوں خوبیوں پر اچھی طرح خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے۔

انتظار حسین کے والدِ گرامی ایک مذہبی شخصیت تھے اور ایسے مذہبی آدمی کہ کسی طور بھی مذہب کے اصولوں سے پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔ اتنی سختی سے مذہبی اقدار اور شعار کا پاس و لحاظ کرتے تھے کہ انھیں بنیاد پرست کہا جائے تو بھی بے جا نہ ہوگا اور انتظار حسین نے خود اس رویے کو آج کل کے تناظر میں بنیاد پرستی کہا ہے۔ اس قدر سخت مسلمان تھے کہ شعر پڑھنا کروہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے انتظار حسین کو جو کہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، ایک پکا سچا مسلمان بنانا چاہتے تھے اور زبردستی اسے قران مجید پڑھایا اور نہ صرف ناظرہ بلکہ قران ترجمے کے ساتھ بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر مذہبی رنگ، آہنگ پیدا ہونا شروع ہوا اور اسی کی وجہ سے انھوں نے عمر بھر مذہبی مطالعہ نہ چھوڑا اور مذہبی علامتوں کو اپنے افسانوں میں ہر طرح سے استعمال کیا۔

خلیل جبران کے ہاں بھی ہمیں مذہبی اقدار اور شعار کا کثرت سے استعمال ملتا ہے ان کے ہاں بھی ان مذہبی استعاروں اور علامتوں کے استعمال کی وجہ ان کے ذہن پر مذہبی چھاپ اور مذہبی رنگ کا ہونا ہے۔ جبران اپنے بچپن سے ہی مذہب کے قریب رہا، ماں بھی ایک مذہبی خاتون تھی جس نے جبران کو مذہبی لوک کہانیاں سنا سنا کر اور مذہبی گیت و مناجات سنا سنا کر اس کے ذہن میں مذہب کا قرب اور محبت بھر دی

تھی۔اس کی ماں چرچ میں ایک نن بھی رہ چکی تھی اور وہ عیسائیوں کے قدیم مسلک اور چھوٹے فرقے میرونی کی پیروکار تھی۔ جس کی تبلیغ اس نے اپنے بیٹے کو بچپن سے ہی کی اور اسی فرقے کی مذہبی تعلیمات کا اثر عمر بھر جبران کے دل ودماغ پہ چھایا رہا حتیٰ کہ جبران کا ناول "ابنِ آدم" انھیں عقائد کی ترجمانی کرتا ہے اور یہ ناول میرونی عقائد کے مطابق جنابِ عیسیٰؑ کی سوانح عمری کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اس کی ماں ایک راسخ العقیدہ پادری کی بیٹی تھی جس کی گھر سے ہی تربیت مذہب سے شروع ہوئی اور مذہب پر ہی ختم ہوئی۔

اسی طرح ایک آدمی مذہب سے میلان رکھتا ہو تو اور وہ ادیب بھی ہو تو اس کی تحریر وادب میں مذہبی استعاروں، کنائیوں، تشبیہوں، رموز اور علائم کا آنا بالکل فطری عمل ہو گا۔ایسی فکر رکھنے والے ہر ادیب کے ہاں ایسا ہوتا ہے مگر ہماری مراد یہاں صرف انتظار حسین اور خلیل جبران کی مذہبی فکر اور میلان کے تحت اسلوب پر آنے والے مذہبی اثرات کا جائزہ ہے کہ مذہبی طبعی رجحان کے تحت ان کی کہانیوں میں کس کس طرح مذہبی حوالوں کی آمد ہوئی اور انھوں نے انھیں کس طرح برتا۔

داستان فارسی کا لفظ ہے۔ داستان، کہانی اور قصے کو کہتے ہیں اور گو کا مطلب ہے کہنے والا یا سنانے والا ۔اس کا مطلب؛داستان گو کے معنی ایسا شخص جو داستان سنائے یا کہے۔ ہمارے ہاں جو اردو داستان مشہور ہے وہ ہندوستانی داستان گوئی، درباری داستان گوئی یا ہندوی داستان گوئی بھی کہلاتی ہے داستان گوئی کی اصل عرب ہے اور اسلام جب ایران میں پہنچا تو داستان کا فن بھی ایران پہنچا اور پھر ایران سے ہندوستان پہنچا۔۔ قرآن میں بھی آیا ہے کہ کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ نصیحت پکڑیں۔اس کے علاوہ قرآن میں قصص کا لفظ بھی قصے کہانیوں ہی کی جانب اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ داستان کو انگریزی میں Tale یا Story کہا جاتا ہے ۔جن کے معانی بھی داستان یا قصے، کہانیاں ہی ہیں۔ان میں مزید طلسم، تحیر، مافوق الفطرت اشیاء، واقعات، کردار، جادو کی چیزیں اور واقعات، طلسمی شہر طلسمی خزانے، جن، بھوت اور پری جیسی مخلوقات۔علت اور معلول میں غیر مطابقت، خیالی اور مثالی دنیا کا قیام، مبالغہ، طولت، شاعرانہ عدل وانصاف، تدبیر اور تقدیر کا تقابل، تخیل کی جولانیاں، عصری معاشرت کی ترجمانی، جنسی معاملات میں بے

باکی، مثالی پند و نصائح، تمثیل، تلمیح اور استعارے وغیرہ شامل کر کے کہانیاں بنالی جاتی ہیں جن کو ہم مخصوص اصطلاح میں داستان کہتے ہیں اور انھیں کے بیان کرنے والے اور لکھنے والے کو داستان گو کہا جاتا ہے۔ دلچسپ امر ہے کہ دنیا میں موجود تمام مذاہب میں کہیں نہ کہیں داستان کا ضرور ہاتھ رہا ہے اور ان مذاہب میں بہت سی ایسی باتیں اور واقعات مل جاتے ہیں جن کے مطالعے سے لگتا ہے کہ یہ قصہ پہلے پہل کسی نے گھڑا ہو گا اور بعد میں یہ مذہب کا حصہ بن گیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے ہر خطے، قوم اور تہذیب کی اپنی ہی انفرادیہ داستانیں بھی ہیں اور مشترکا بھی، جو بعد میں مذہبی رنگ اختیار کر کے مذہبی معلومات بھی فراہم کرتی ہیں۔ ظاہر ہے شروع میں یہ تمام داستانیں زبانی، کلامی اور سینہ در سینہ ہی چلتی رہیں اور بعد میں وقت کی ضرورت کے تحت ان کو قلم بند کر لیا گیا جو آج ایک علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بن کے ہمارے سامنے موجود ہے اور یہی کلاسیکی ادب اور لوک ادب کا بھرپور حصہ ہے۔

داستان کی جامعیت اور ہمہ گیریت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہو یا پھر کوئی بھی کام ہو، عقیدہ، مذہب ہو یا فلسفہ، کوئی قانون ہو یا پھر عقلی دلائل پر مبنی صحیفہ یا پھر کوئی سائنس ہو، ادبِ عالیہ ہو یا پھر کسی معاشرے کا اجتماعی شعور ہر چیز کی کڑیاں جا کر داستانوی افکار سے ہی ملتی ہیں۔ انتظار حسین اور خلیل جبران کے بارے میں اوپر لکھا جا چکا ہے کہ دونوں کو بچپن سے ہی مذہب سے واسطہ رہا اور اسی وجہ سے دونوں کہانی نویسوں کے ہاں کسی نہ کسی طرح سے مذہب اور مذہبی حوالوں کی بازگشت بار بار ملتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ جس شخص کو مذہب سے واسطہ ہوتا ہے اسے ضرور بالضرور روایات اور داستانوی افکار سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

انسان جس معاشرے میں بھی رہتا ہے وہاں کے اثرات کا اس کی تحریروں میں کسی بھی طور لازمی دیکھا جا سکتا ہے اور ایسا ہر ادیب اور شاعر کے ہاں دیکھنے کو مل جاتا ہے اور خلیل جبران اور انتظار حسین کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ دونوں ادیب ہی ہجرت کے کرب سے عمر بھر دوچار رہے اور اپنی مٹی اور اپنی تہذیب کی جڑوں کی تلاش نے انھیں عمر بھر دیوانہ بنا کے رکھا۔ دونوں کو بچپن میں ہی گھر سے مذہبی ماحول میسر آیا جس

کی وجہ سے ان کی تحریروں میں لا محالہ ہی مذہبی عناصر کی بازگشت سننے کو مل جاتی ہے۔دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کا تقابل کرتے ہوئے ان کے ہاں داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار بھی دیکھا گیا ہے۔

تقابل کرتے ہوئے دونوں افسانہ نگاروں کے زمانے، تعلیم، گھریلو حالات، ماقبل ہجرت اور مابعد ہجرت کا زمانہ اور ماحول مد نظر رکھا گیا اور انھیں تناظرات میں تقابل کو آگے بڑھایا گیا کیوں کہ تقابل صرف دو انسانوں یا دو افسانہ نگاروں کے درمیان ہی نہیں ہوتا بل کہ تقابل دو تہذیبوں، دو ثقافتوں اور دو ملکوں کی قوموں کی اقدار اور رہن سہن کو بھی واضح کرتا ہے اور دونوں اقوام کے لوگوں کا سوچنے، لکھنے، پڑھنے، کھانے، پینے اور پسند وناپسند کے مابین بھی اشتراکات و افتراکات دیکھے جاتے ہیں۔اسی لیے دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں کو پرکھ کر دیکھا گیا کہ خلیل جبران کے افسانوں میں مذہبی عناصر کی بازگشت ان کے افسانوں کا خاص موضوع رہی ہے اور جن کے لیے ان کے اہم افسانے، انقلاب، شیطان، آزادی، غریب، پروانہ سے، مرغِ بد نما، شاہ اردوس، دو راستے ایک منزل، نغماتِ پر سوز، گل خزاں رسیدہ، جل پریاں، اے ملامت کار، ملاقات، قبرستان، زندگی، خانقاہ، یہ دنیا ہے، چودھویں کا چاند، نوبار مرنا پڑے گا، نیکی اور بدی کے فرشتے، شکار اور شکاری، غلامی، میں کس سے محبت کرتا ہوں، قیدی بادشاہ، تیراک، سکوتِ جنوں خیز، انمول موتی، ایک ہزار قید کانے، رہبانیت، معمار، آنسو اور قہقہے، کشاکشِ حیات، میں اور دانائی، جوانی اور محبت، مرشد کا فرمان اور محبت اور مساوات زیادہ اہم ہیں۔اسی طرح اگر انتظار حسین کے مذہبی خیالات کے پرچار کے لیے نمائندہ افسانے دیکھیں تو قیوما کی دکان، خرید و حلوا بیسن کا، چوک، فجا کی آپ بیتی، اجودھیا، عقیلہ خالا، ایک بن لکھی رزمیہ، پسماندگان، جنگل، کنکری، آخری آدمی، زرد کتا، ہڈیوں کا ڈھانچ، کایا کلپ، ٹانگیں، سوئیاں، شہادت، مردہ راکھ، شرم الحرم، کانا دجال، دوسرا گناہ، وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے، شہر افسوس، کچھوے، کشتی، گونڈوں کا جنگل، مجیدا، بیریم کاربونیٹ اور کلیلہ چپ ہو گیا، زیادہ اہم ہیں۔داستانوی افکار کا تقابل کرتے ہوئے دونوں افسانہ نگاروں کے کچھ اور افسانوں کو بھی مزید داستانوی نگاہ سے دیکھا گیا تو داستانوی سلسلوں میں انتظار حسین، خلیل جبران سے کہیں آگے کے افسانہ نگار معلوم پڑتے ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج:

موضوع" مذہبی اور داستانوی افکار کا فنکارانہ اظہار: خلیل جبران اور انتظار حسین کا تقابلی مطالعہ" کے حوالے سے تحقیقی کام کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

- کسی بھی ادیب کی تحریروں پر اس کے ماحول، علم، صحبت، معاشرے اور زمانے کا اثر ضرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خلیل جبران اور انتظار حسین کے افسانوں میں مذہبی عناصر کی بازگشت، داستانوی افکار کا اظہار اور ہجرت کا کرب نمایاں نظر آتا ہے۔ کیوں کہ دونوں افسانہ نگار مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔
- شاعر اور ادیب اپنے معاشرے کے سب سے حساس شخص ہوتے ہیں اور اپنے زمانے کے بہترین عکاس و نباض بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے ہجرت اور جنگ کی تباہ کاریاں دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جاتی ہیں کیوں کہ خلیل جبران نے جنگِ عظیم اول کا زمانہ بھی دیکھا اور ہجرت کا دکھ بھی جھیلا۔ انتظار حسین نے جنگِ عظیم دوم کو دیکھا اور ہجرت کے ساتھ ساتھ تقسیمِ ہند کے فسادات کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور برداشت کیا۔
- داستانوی افکار کا سلسلہ زندگی کے تمام شعبوں تک پھیلا ہوا ہے اس لیے مختلف روایات اور قصص سے ان کو الہامی کتابوں میں بھی بیان کیا گیا ہے اور دنیا کے ہر بڑے ادب میں ان کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے اس لیے دونوں افسانہ نگاروں نے اپنے علم اور مطالعے کی بنیاد پر تمثیلوں، روایتوں، مذہبی واقعات، توہمات، جانوروں اور جانداروں کے تعلق سے داستانوی اسلوب کو اختراع کیا ہے۔
- خلیل جبران کے افسانوں میں فلسفیانہ، منطقی اور مقصدیت پر مبنی سادہ اسلوب ہی کثرت سے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ انتظار حسین کے ہاں علامتی پیرائے میں، جزئیات نگاری اور ہر کہانی ایک خاص پہلودار اسلوب سے آگے بڑھتی ہے کہ کہانی تہ در تہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جیسے خلیل جبران کی کہانی سطح سمندر پر بپھری لہروں کی مانند ہے اور انتظار حسین کی کہانی سطح سمندر سے نیچے خاموش منجدھار کی طرح علامتوں میں گھومتی رہتی ہے۔

- خلیل جبران کے افسانے میں ایک خاص طرح کا درس ملتا ہے جس کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی آگے بڑھتے رہنے کا نام ہے ، غلامی موت ہے اور آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ جب کہ انتظار حسین کے افسانوں کی خوبی ہے کہ کہانی اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ افسانہ افسانے کی حد تک رہتا ہے کہیں بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف کہیں کوئی درس دے رہا ہے یا تبلیغ کر رہا ہے۔ بل کہ قاری نے اس سے مفہوم خود اخذ کرنا ہوتا ہے اور خلیل جبران اپنی کہانی کا مفہوم سمجھا کر جاتا ہے۔
- دونوں افسانہ نگاروں نے ایک ہی جیسے حالات کا سامنا کیا مگر سوچنے کا انداز مختلف نظر آتا ہے۔ دونوں نے جنگیں دیکھیں اور دونوں نے ہجرت کا دکھ بھی برداشت کیا۔ مگر خلیل جبران زندگی کو مستقبل کے لیے شاندار بنانا چاہتے ہیں اور امید کا دامن کسی بھی طور چھوڑنا نہیں چاہتے بل کہ ہمت اور جذبے کی دولت سے مالا مال کر کے آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جب کہ انتظار حسین حالات کی تباہ کاریوں کے باعث ماضی کے جھروکوں میں سکون کے لمحات کا ذکر کرتے ہیں۔ جدت سے نفرت تو نہیں مگر انحراف ضرور کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنی جڑوں کی بابت بات کرتے ہیں۔ کہانی کو کہانی کی حد تک بیان کرتے ہیں اور اس کے لوازمات کا خیال کرتے ہوئے مقصدیت کو کہانی پر غالب نہیں آنے دیتے۔ درس دینے کی بجائے چپکے سے بات بیان کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔
- انتظار حسین کو اپنی جڑوں کی تلاش تھی اس لیے یہ الف لیلیٰ سے ہوتے ہوئے مہابھارت، پنچ تنتر، قرآنی واقعات، عہد نامہ عتیق وجدید، داستانوں، صوفیا کے ملفوظات اور توہمات سے اپنی تہذیب اور جڑوں کی تلاش کرتے ہیں۔ جب کہ خلیل جبران کے ہاں کہانی سے زیادہ مقصدیت غالب رہی تو اس نے داستانوی افکار کا نظام پریوں جنوں کی کہانیوں، عہد نامہ عتیق وجدید، داستانوں اور جانوروں، جانداروں کی کہانیوں سے بنُا اور حکایات اور روایات کا سہارا زیادہ لیا کہ اس سے بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔
- انتظار حسین کے افسانوں میں منصوبہ بندی کے تحت داستانوی افکار کو جگہ دی گئی ہے اور ان کے سہارے کہانیاں بنیں گئی ہیں جب کہ خلیل جبران کے ہاں ایسی کوئی دانستہ کاوش دکھائی نہیں دیتی مگر

کہانی کی نوعیت کو مدنظر رکھ کر اس کا پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ جس میں داستانوی فکر، مذہبی روایات اور جانوروں کا ذکر ملتا ہے۔

ج۔ سفارشات:

ا۔ خلیل جبران اور انتظار حسین کے تقابلی مطالعے سے بات سامنے آئی ہے کہ خلیل جبران کے ہاں کئی ایسے افکار ہیں کہ اردو کے عالمی سطح کے عظیم شاعر سے بھی اس کا تقابل ہونا چاہیے۔

۲۔ انسانی وجود کی تنسیخ اور معدومیت کے تناظر میں انتظار حسین کا عالمی سطح کے ادیبوں سے تقابل کرنا چاہیے جیسا کہ فرانز کافکا وغیرہ۔

۳۔ زیرِ نظر مقالے میں انتظار حسین اور خلیل جبران کے صرف افسانوں کا تقابل کیا گیا ہے، موضوع کی وسعت اور پھیلاؤ کے لیے ان ادیبوں کے ناولوں کا بھی تقابل ہونا چاہیے۔

۴۔ تقابل کی روایت کو عام کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے دو ادیبوں یا شاعروں ہی سے انسان متعارف نہیں ہوتا بل کہ دو تہذیبوں، دو زمانوں، دو قوموں، دو ثقافتوں اور دو نظریوں کو جاننے کا موقع ملتا ہے اور اردو ادب عالمی سطح کے ادب کے برابر آجاتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

خلیل جبران، کلیاتِ خلیل جبران (مترجم: حیدر جاوید سید)، الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

انتظار حسین، مجموعہ انتظار حسین (افسانے)، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

ثانوی ماخذ:

آصف فرخی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار (انتظار حسین)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

آصف فرخی، ڈاکٹر، چراغِ شبِ افسانہ: انتظار حسین کا جہانِ فن، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، انتظار حسین ایک دبستان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء

اسعد گیلانی, سید، اختر حجازی (مرتبین)، اسلامی نظریہ ادب،، ادارہ ترجمان القران، لاہور، ۱۹۸۸ء

اشفاق احمد ندوی، ڈاکٹر، جبران خلیل جبران: فن اور شخصیت، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

الطاف احمد قریشی، ادبی مکالمے، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء

انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

تقدیس زہرا، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی اردو شاعری میں اساطیری عناصر، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۵ء

حامد رضا صدیقی، انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۷ء

محمد ارسلان رضاؔ، ثنا طارق، دلاور عباس (مرتبین)، کچھ انتظار حسین کے بارے میں، مثال پبلیشرز، فیصل آباد،۲۰۱۹ء

شوقؔ، منشی عبد الرحمٰن، قوم اور مذہب، پبلک بک ڈپو و مسلم ٹریکٹ ایجنسی، امرتسر، س ن

عبادت بریلوی، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانے کی تنقید، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، ۱۹۸۶ء

عبد الحق، مہر، ڈاکٹر، ہندوصنمیات،، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۳ء

علی عباس جلال پوری، کائنات اور انسان، تخلیقات بیگم روڈ، لاہور، ۲۰۱۳ء

غلام رسول چیمہ، پروفیسر، مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء

فرید حسینی، ڈاکٹر، تاریخ، تہذیب اور انتظار حسین، بک ٹائم، کراچی، ۲۰۱۹ء

فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

قاضی عابد، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور اساطیر، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء

قاضی عابد، ڈاکٹر، اساطیر کتھا کہانی اور مابعد جدید تناظر، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۶ء

کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فنِ داستان گوئی، ادارہ فروغِ اردو، لکھنو، ۱۹۷۲ء

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء

محمد اکرم رانا، پروفیسر ڈاکٹر، بین الاقوامی مذاہب، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

منہاج الدین، پروفیسر شیخ، قاموس الاصطلاحات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۲ء

نازیہ ظہور، انتظار حسین کے افسانوں میں حیوانات کی علامتی حیثیت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء،

ہارون الرشید، پروفیسر، اردو ادب اور اسلام، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۸ء

انگریزی کتب:

T.S. Eliot, Religion and literature, in Faith that illuminates, V.A. Demant (ed.), Centenary Press, London, 1935

Cuddon , J.A. The Penguin Dictionary of Literary Terms and Literary Theory. London: Penguin books, 1992

Gibran Kahlil (Gibrān Khalīl Gibrān): Biography and Achievements, Institute of Lebanese Thought at Notre Dame University – Louaize, Lebanon. 1995

The complete works of Kahlil Gibran, Indiana Publishing House, New Delhi, 2009

لغات

اردو جامع انسائیکلوپیڈیا (جلد اول)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات (جلد اول)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

قائم رضا نسیم امروہوی، سید، مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید (مرتبین)، نسیم اللغات، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۳ء

حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، ادبی اصطلاحات کا تعارف، اسلوب، لاہور، ۲۰۱۵ء

ویب سائیٹ

/https://www.wikipedia.org

https://rekhta.org/ebooks

https://www.britannica.com/topic/religion

رسائل وجرائد

ادبیات (انتظار حسین نمبر)، شمارہ ۱۱۲-۱۱۱، جنوری تا جون، ۲۰۱۷ء، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

فنون، شمارہ ۲۹ نومبر دسمبر، لاہور، ۱۹۹۸ء

اردو ادب (سہ ماہی)، نئی دہلی، بھارت، ۲۰۰۶

مخزن (انتظار حسین نمبر)، شش ماہی، شمارہ نمبر ۳۲، قائدِ اعظم لائبریری، باغِ جناح، لاہور

ASIATIC, VOLUME 13, NUMBER 1, JUNE 2019, International Islamic University Malaysia